ایس امتیاز احمد کلیکشن

(ڈر ڈائجسٹ سے انتخاب)

(3)


Compiled by
Abdul Basit

ایس امتیاز احمد کلیکشن

(ڈر ڈائجسٹ سے انتخاب)

شعلے کی موت

شیطان کی بیٹی

شیطانی کھوپڑی

شیطانی محل

عجیب کھوپڑی

قاتل مشین

قبرستان

لقمہ اجل

مجبوری

مندر کا حصار

موت کا تعاقب

موت کی آواز

موت کا گھر

موت کی جیت

موت کے پنجے

میں جن ہوں

نئی قبر

ناگ کا انتقام

ہولناک سانحہ

نیم شب

ہساپو کا بلیدان

مردوں کا جنگل

روحانی لگاؤ

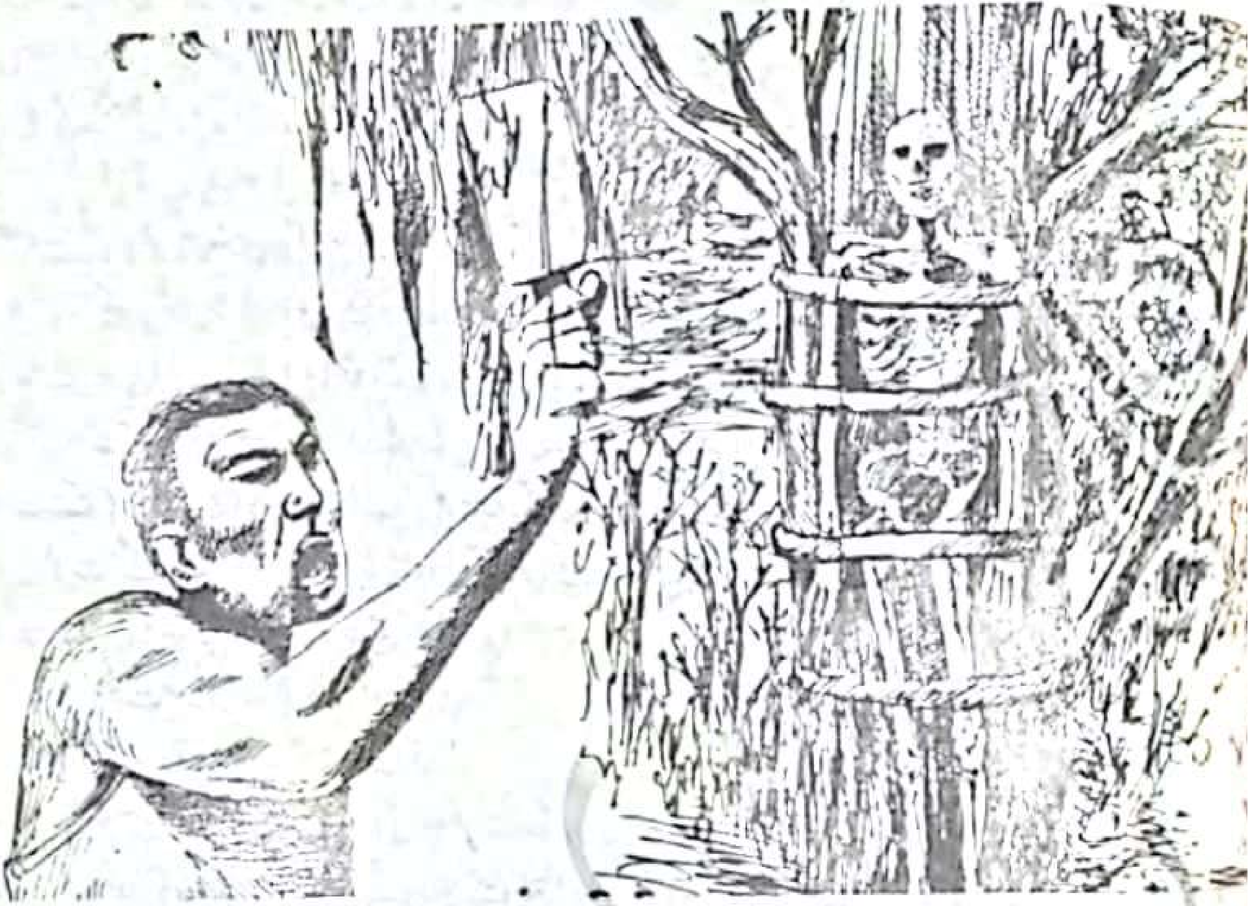
حاضرات

موت کا حصار

آسیبی گھر

حصار

آخری قتل



شعلے کی موت

ایس امتیاز احمد-کراچی

اچھا بھلا چنگا نڈر بہادر اور جنگجو نوجوان کا اچانک ہاتھ جنگل میں پڑتے ہوئے بیلٹ پر پڑا جو کہ سانپ کے مشابہت تھا، نوجوان کی ہیبت بدل گئی، اس کی آواز غراہٹ میں بدل گئی، اور پھر دل کو دہلاتا منظر......

عجیب سحرانگیز......تحیرانگیز اور دل ودماغ دہلاتا اور رونگٹے کھڑے کرتا شاخسانہ

دروازہ کھلتے ہی خنک ہوا کا ایک جھونکا کمرے میں گھس آیا اور میز پر جھکے ہوئے جون کو گرداگرد آتش دان میں ناچتے ہوئے شعلوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ شعلوں کی لو تیز ہوئی اور سرجون نے چونک کر دیکھا، کپتان کارسن اس کے قریب کھڑا تھا۔ سرجون نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"کپتان! بہت اچھا ہوا جو تم آ گئے۔ کئی دن سے میں تمہارا منتظر تھا۔"

"جی......، مجھے افسوس ہے کہ میں وقت پر نہ پہنچ سکا۔" کپتان نے سرجون کے بڑھاپے پر تشویش انگیز نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"افسوس کی کیا بات ہے؟ مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے، کیونکہ تم ہلہام کے دوست ہو۔"

''اوہ پلہام کی موت کتنی ناگہانی اور پراسرار تھی !میں اسے زندگی بھر نہ بھول سکوں گا۔'' کپتان غم زدہ لہجے میں بولا اور خلاء میں گھورتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں پھریکا یک سنبھل کر بیٹھ گیا اور جھر جھری لے کر بولا۔

''کیا آپ پلہام کی پراسرار موت کے متعلق تفصیل کے ساتھ کچھ سننا پسند کریں گے؟''

''کیوں نہیں؟ مجھے اسی لئے تو تمہارا انتظار تھا۔

تم جانتے ہو پلہام میرا اکلوتا بیٹا تھا، میں نے اس کے مستقبل کے متعلق کئی منصوبے بنا رکھے تھے، مگر اس کی موت کے بعد میرے سارے خواب کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ گئے۔ اب صرف اتنا چاہتا ہوں کہ اس کی موت کے صحیح اسباب معلوم ہوجائیں تاکہ یہ وہم نہ رہے کہ میرا لخت جگر کسی سازش کا شکار ہوا ہے۔''

کپتان نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''تو سنیئے !سر جون ہمہ تن گوش ہوکر سننے لگا۔

کپتان گویا ہوا''پلہام کی موت سے تین دن پہلے کا ذکر ہے کہ میں، پلہام اور ہمارے چند ساتھی جرمن سپاہیوں کا اندھا دھند تعاقب کرتے ہوئے اتحادی مورچوں سے بہت دور نکل گئے اور جب ہمیں اپنی اس غلطی کا احساس ہوا تو اس وقت شام ہوچکی تھی اور ہم ایک ایسے گھنے جنگل میں کھڑے تھے جہاں سر شام ہی اندھیرا پھیل چکا تھا اور درندوں کی پراسرار نقل وحرکت جاری تھی۔ فضا کچھ ایسی متعفن اور نم آلود تھی کہ سانس تک لینا محال تھا۔ ہم نے جنگل سے نکلنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکے، کیونکہ راستے دشوار گزار ہونے کے علاوہ اتنے پر پیچ اور غیر مانوس تھے کہ ہمارے لئے ان پر چلنا بڑا دوبھر تھا۔

رات ہوتے ہی درندوں کی تندمزاجی میں اضافہ ہوگیا اور وہ مردم آزادی پر کمر بستہ ہوگئے۔ ہمیں مجبوراً کئی بار گولی چلانا پڑی۔ سب سے پہلی گولی کا نشانہ ایک بھیڑیا بنا جو جھاڑیوں کی آڑ میں نہ جانے کب سے ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ہمیں کئی بار شک بھی ہوا کہ کوئی درندہ گھات لگائے ہمارے ساتھ ساتھ حرکت کررہا ہے، لیکن وہ ہر بار ہماری نظروں سے بچ نکلا۔ ایک بار میں اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا۔ اس نے جھاڑیوں پر سے جست لگائی اور میری راہ میں حائل ہوکر غرانے لگا۔ تاریکی کی وجہ سے میں اسے ابھی تک دیکھ نہیں سکا تھا۔ میں نے اسے نازیوں کا جاسوس کا سمجھ کر گولی ماردی گولی لگتے ہی وہ سات آٹھ فٹ اوپر اچھلا اور جھاڑیوں میں جاگرا۔ اس اثناء میں میرے ساتھی مجھ سے آملے تھے، ہم نے ٹارچوں کی روشنی میں اسے دیکھا، تو لرزہ کررہ گئے۔ وہ سیاہ رنگ کا انتہائی خونخوار بھیڑیا تھا جس کی لمبائی چھ فٹ اور بلندی چارفٹ سے کسی طرح کم نہ تھی۔''

کپتان کا رسن سانس لینے کے لئے رکا، تو سر جون نے عالم اشتیاق میں پوچھا۔

''بھیڑیئے کو دیکھ کر پلہام نے کیا کہا تھا؟''

''اس وقت خیال آرائی کی فرصت کسے تھی؟ ہم تو جلد سے جلد کسی محفوظ مقام پر پہنچ کر اطمینان کا سانس لینا چاہتے تھے۔''

''اچھا، پھر کیا ہوا؟''

''اس واقعہ کے بعد ہم نے وہ راستہ چھوڑ دیا اور دائیں سمت گھوم گئے۔ اب ہم نسبتاً چوڑے راستے پر چل رہے تھے۔ اس طرف جنگل کم گنجان اور بظاہر محفوظ نظر آتا تھا۔ ابھی ہم نے مشکل سے نصف میل کا سفر طے کیا ہوگا کہ اچانک پلہام ٹھٹکا اور سامنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔''وہ دیکھئے وہاں کوئی خطرہ ہے۔''

ہماری نگاہیں سامنے کی طرف مرتکز ہوگئیں۔ ہم سے تقریباً سوگز کے فاصلے پر سرخ رنگ کے دو روشن نقطے دائیں بائیں حرکت کررہے تھے۔ میں نے رائفل سیدھی کی، لیکن فائر کرنے سے پہلے ہی وہ نقطے غائب ہوگئے اور اس کے فوراً بعد ہی ہمارے بائیں جانب جھاڑیوں میں نامعلوم سی سرسراہٹ سنائی دی۔ ہم ادھر متوجہ ہوئے، تو پلہام تڑپ کر پیچھے مڑا اور دوسرے لمحے اس کی رائفل کی آواز سے جنگل گونج اٹھا۔

ہم حیرت زدہ ہوکر پلٹے اور یہ دیکھ کر دنگ رہ

گئے کہ ہم سے چند قدم دور ایک خوفناک چیتا خاک و خون میں لوٹ رہا تھا اور اس کی سرخ انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی آنکھیں زندگی سے محروم ہوتی جارہی تھیں۔"

سرجون نے عالم محویت سے چونکتے ہوئے کہا۔

"مجھے پلہام سے یہی امید تھی۔"

"جی ہاں، آپ کا بیٹا واقعی نڈر، بہادر اور بے خوف نوجوان تھا۔"

"پھر کیا ہوا کپتان؟"

کپتان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا۔

"رات گئے ہمارے حوصلے جواب دے گئے اور ہم درختوں پر پناہ لینے کے بارے میں سوچنے لگے لیکن جیسے ہی ہم درختوں کی طرف بڑھے، اوپر بیٹھے ہوئے بندروں کی چیخ وپکار نے آسمان سر پر اٹھالیا اور ہم دہشت زدہ ہوکر جہاں تھے، وہیں رک گئے۔

اچانک دو تین بندر درختوں پر سے گرے اور لوٹ پوٹ کر ختم ہوگئے۔ موت کی یہ ناگہانی صورت ہمارے لئے بالکل نئی اور غیر متوقع تھی۔ ہم نے گھبرا کر ٹارچیں روشن کرلیں۔ درختوں کے تنوں پر بندروں کی تعداد زیادہ تھی۔ ان پر جگہ جگہ چھوٹے بڑے اژدھے بل کھارہے تھے اور جونہی کوئی بندر کسی اژدھے کی لپیٹ میں آجاتا، بندر کی ہڈیاں چٹخ جاتیں اور اژدھے کی گرفت ڈھیلی پڑتے ہی وہ نیم جان ہوکر نیچے گر پڑتا۔ زندگی اور موت کا یہ عجیب کھیل اتنا روح فرسا اور خوف ناک تھا کہ ہم اس کی تاب نہ لاسکے اور ہم آگے کی طرف بڑھنے لگے۔

صبح کاذب کے وقت ہم جنگل کے وسط سے گزر رہے تھے کہ ہمیں ایک دومنزلہ مکان نظر آیا۔ ہم کچھ سوچے بغیر اس میں داخل ہوگئے۔ مکان بالکل خالی تھا۔ ہم سب نچلی منزل میں لیٹ گئے، کچھ دیر بعد پلہام اٹھا اور ایک شکستہ سیڑھی کے ذریعے اوپر دوسری منزل پہنچ گیا۔ ہمیں اس کے چلنے پھرنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی اور یوں محسوس ہورہا تھا جیسے وہ کوئی چیز تلاش کررہا ہے، میں نے سیڑھی کے قریب جاکر دیکھا، وہ بار بار دیاسلائی جلا رہا تھا، میں نے پوچھا۔

"کیا ہے؟ پلہام!"

"کچھ نہیں، صرف ایک پرانا صندوق ہے۔"

وہ یہ کہہ کر زور زور سے قہقہے لگانے لگا اور پھر خود بخود بولا۔" کپتان! صندوق میں ایک نہایت ہی خوبصورت سانپ بند ہے، اگر دیکھنا چاہتے ہو، تو حاضر کروں۔" سانپ کا نام سنتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا اور میں نے ڈانٹ پلاتے ہوئے پلہام کو نیچے آنے کا حکم دیا، لیکن وہ بدستور ہنستا رہا اور میری پریشانی بڑھتی گئی۔

جب پلہام دروازے سے نمودار ہوا تو وہ بے حد سنجیدہ تھا اور اس کی کمر کے گرد بھورے رنگ کا ایک چمکدار سانپ لپٹا ہوا تھا۔ یہ دیکھتے ہی میری گھگھی بندھ گئی اور باقی تمام ساتھی میری آواز سن کر بیدار ہوگئے اور سیڑھی کے قریب آگئے پھر کسی نے میرا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

"کپتان! ذرا غور سے دیکھو۔"

میں نے غور سے دیکھا، وہ سانپ نہیں تھا، بلکہ چمڑے کی نہایت خوبصورت پیٹی تھی۔ پلہام نے ہمیں یوں گھورتے دیکھ کر اپنے سر کو اپنے دائیں ہاتھ میں مضبوطی سے تھام لیا اور درندے کی طرح غرا کر ہم پر کچھ ایسی نفرت انگیز اور پراسرار نظر ڈالی کہ ہم کانپ کر پیچھے ہٹ گئے۔

"کیا اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی؟" سرجون نے چونک کر پوچھا۔

"جی ہاں! غضب کی قہر آلود نظریں تھیں اس کی۔" کپتان نے جھرجھری لیتے ہوئے جواب دیا۔

"ہوں...... ! کپتان ! کیا تم اس کی نقل اتار سکتے ہو۔؟"

"جی...... جی کیوں نہیں، دیکھئے۔"

کپتان لپک کر میز پر بیٹھ گیا اور اس نے اتنی خوفناک شکل بنا کر سرجون کو گھورا کہ سرجون کے پسینے چھوٹ گئے، اس نے ڈرتے ڈرتے دیکھا، شدت جذبات سے کپتان کے پاؤں کانپ رہے تھے۔ اس نے اپنے آپ پر قابو رکھنے کے لئے میز کے کنارے کو تھام رکھا تھا۔

کپتان نے میز سے اتر کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔"بس یہی سمجھئے کہ پلہام کی حالت اس دیوانے کتے کی سی تھی جو کسی پر حملہ کرنے کے لئے تیار ہو،لیکن فطری کمزوری کے زیر اثر بل کھا کر رہ جائے۔"

"سمجھا......دیوانے کتے کی مثال خوب رہی ،اچھا، پھر کیا ہوا؟"سر جون نے پوچھا۔

کپتان نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔"میں نے پلہام کو بلانے کی کوشش کی،لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا اور چند منٹ کے بعد وہ الٹے پاؤں نیچے اترنے لگا۔اس کا چہرہ ہماری طرف تھا اور ہم یوں محسوس کر رہے تھے جیسے پلہام انسان نہیں،کوئی درندہ ہے جو نہایت محتاط انداز میں قدم بہ قدم آگے بڑھ رہا ہے اور موقع ملتے ہی ہم میں سے کسی پر ضرور جھپٹ پڑے گا۔یقین کیجیے اس میں انسانوں جیسی ہمیں کوئی بات نظر نہ آتی تھی۔

ہم اسے خاموشی سے دیکھتے رہے،وہ نیچے پہنچتے ہی اچھلا اور ہماری طرف دیکھتا ہوا اس طرح دروازے کی جانب بڑھنے لگا کہ اس کا منہ ہماری طرف تھا اور پشت دروازے کی طرف۔اب آپ خود اندازہ کیجیے،کبھی انسان بھی ایسے چلتا ہے۔جونہی اس کی پشت دروازے سے ٹکرائی،اس نے چٹی کو ہاتھوں سے چھوڑے بغیر چٹخنی کھولنے کی کوشش کی اور جب کامیاب نہ ہوا،تو کواڑوں پر ایسی لات ماری کہ کواڑ چرچرا کر کھل گئے۔وہ دروازے میں ٹھہر کر ہمیں دیکھتا رہا اور جب ہم نے اسے پکڑنے کی کوشش کی،تو اس کی آنکھوں سے جیسے شعلے برسنے لگے۔ باچھیں پھیل کر نتھنوں تک آ گئیں،نتھنے پھول کر خرخر کی آواز پیدا کرنے لگے اور وہ غرا کر ہماری طرف بڑھا۔ہم سب سمٹ کر ایک طرف ہو گئے۔وہ پیچھے ہٹا اور ایک دلخراش چیخ مار کر باہر نکل گیا۔ہم اس کے پیچھے بھاگے ،لیکن وہ جھاڑیوں کو پھلانگتا ہوا جنگل میں غائب ہو گیا۔"

کپتان خاموش ہو گیا اور اس نے آتشدان کی طرف دیکھا۔شعلے ابھی تک رقصاں تھے۔اس نے جیب سے سگریٹ نکالا اور سلگائے بغیر اسے ہونٹوں میں دبا کر سر جھکا لیا۔شاید وہ کچھ سوچ رہا تھا۔سر جون نے اسے خاموش دیکھا،تو تڑپ کر کہا۔

"کپتان!میں اپنے لخت جگر کا انجام سننے کے لئے بے تاب ہوں۔"

"میں نے جو کچھ دیکھا،آپ شاید اس پر یقین نہ کریں۔"کپتان نے کسمساتے ہوئے کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"سر جون کی جذبات سے مغلوب آواز ابھری۔

کپتان نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔"پلہام کو غائب ہوئے تین دن گزر چکے تھے۔صبح کا وقت تھا۔اتحادی فوجیں،نازی کیمپ پر حملے کے لئے تیار کھڑی تھیں۔میں بہت مصروف تھا۔سارجنٹ ہاروے نے میرے قریب آ کر آہستہ سے کہا۔"پلہام وہاں ہے۔"

"کہاں ہے؟"میں نے بوکھلا کر پوچھا،سارجنٹ ہانپ رہا تھا۔اس نے رکتے رکتے جواب دیا۔"وہ......وہ......وہاں جنگل کے بالکل نزدیک،وہ ایک درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا ہے۔ آئیے آئیے،جلدی چلیے۔"

جب ہم وہاں پہنچے پلہام گھٹنوں پر سر رکھے یوں بیٹھا تھا جیسے کوئی درندہ گھات میں بیٹھا ہو۔اس کے سامنے جرمن سپاہیوں کی پانچ لاشیں نیم دائرے کی شکل میں پڑی تھیں اور وہ انہیں مسلسل گھور رہا تھا۔میں نے ڈرتے ڈرتے پلہام کے شانے پر ہاتھ رکھا،وہ بالکل بے جان تھا۔میں نے اس کے جسم کو بغور دیکھا،اس کے جسم پر زخم کا نشان تک نہ تھا۔اس سے ظاہر تھا کہ دشمن کی گولیاں اس کی موت کا باعث نہیں بنیں۔بلا ارادہ میں نے جرمن سپاہیوں کی لاشوں کی طرف دیکھا،تمام لاشیں گردنوں پر سے اس بری طرح نچی ہوئی تھیں اور ایسے لگتا تھا کہ جیسے کوئی درندہ انہیں بیدردی سے بھنبھوڑتا رہا ہے۔میں دہشت زدہ ہو کر پلہام کی جانب متوجہ ہوا۔وہ!اس کے ہاتھ اور منہ گاڑھے خون سے لت پت تھے۔میں سمجھ گیا کہ جرمن سپاہیوں کو اس نے شکار کیا۔

اوہ مائی گاڈ!کتنا بھیانک تھا وہ منظر میرا دل

اندر ہی اندر بیٹھنے لگا، میں نے پلہام پر آخری نظر ڈالی۔ اس کی چمکدار آنکھیں ابھی تک کھلی ہوئی تھیں، وہ سچ مچ درندہ نظر آتا تھا۔ مجھ پر کپکپی طاری ہوگئی اور...... اور......"

پھر کپتان کی آواز ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کے خاموش ہوتے ہی سرجون نے سوال کیا۔

"کپتان! اس پراسرار پٹی کا کیا ہوا؟ کچھ اس کے متعلق بھی تو بتاؤ۔"

"کیا کہا؟ پٹی...... جی، ہاں، وہ میرے کٹ بیگ میں موجود ہے۔ وہ پلہام کی لاش کے قریب پڑی تھی اور نہ جانے کس خیال کے تحت میں نے اٹھالیا تھا۔"

"خوب، تم نے بہت اچھا کیا۔ ذرا مجھے بھی تو دکھاؤ۔" سرجون نے مضطرب ہوکر کہا۔

کپتان نے ہچکچاتے ہوئے کٹ بیگ کھولا اور کاغذ میں لپٹی ہوئی پٹی نکال کر سرجون کے سامنے رکھ دی۔ سرجون نے کاغذ نوچتے ہوئے پٹی کو غور سے دیکھا۔ اس کی اوپر والی سطح پر کسی نامعلوم زبان کے الفاظ منقش تھے۔ سرجون نے میز پر پڑا ہوا محدب شیشہ اٹھایا اور اس کی مدد سے پٹی کے معائنہ میں منہمک ہوگیا اور جونہی اس کا انہماک ختم ہوا، وہ پٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"کپتان! جانتے ہو یہ کیا ہے؟"

"جی، یہ چمڑے کی پٹی ہے۔"

"نہیں تم کچھ نہیں جانتے، کاش...... !" سرجون فقرہ مکمل نہ کرسکا۔

"پھر آپ ہی کچھ بتایئے۔" کپتان نے التجا کی۔

"بتاتا ہوں، لیکن پہلے اس پٹی کو اٹھا کر آتش دان میں ڈال دو۔"

کپتان پٹی اٹھانے کے لئے جھکا، تو سرجون نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ روک لئے اور آنکھوں کو سکیڑتے ہوئے انتہائی رازداری سے کہا۔

"دونوں ہاتھوں سے نہیں، صرف ایک ہاتھ سے اٹھاؤ اور وہاں پٹی کو ایک ہی سرے سے اس طرح پکڑو کہ اس کا دوسرا سرا تمہارے بدن کے کسی حصے سے مس نہ ہو، ورنہ نتائج اتنے سنگین ہوں گے کہ ان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔"

سرجون کی تشویش انگیز ہدایات نے کپتان کو مخمصے میں ڈال دیا۔ وہ پٹی کو ہاتھ نہ لگانے کا فیصلہ کرنے ہی والا تھا کہ اس کی مہم جو طبیعت نے جوش مارا، اور اس نے پٹی کو اٹھالیا۔ آتش دان کی طرف جاتے ہوئے وہ بری طرح لڑکھڑا رہا تھا، اس نے سنبھلنے کی کوشش کی اور اس کشمکش میں پٹی کا آزاد سرا اس کے دوسرے ہاتھ سے چھوگیا، وہ جھرجھری لے کر رکا اور پٹی کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر کتے کی طرح غراتا ہوا ایڑیوں پر گھوم گیا۔ اب وہ الٹے قدموں دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس پر پلہام کی سی کیفیت طاری تھی۔

کپتان میں درندگی کے آثار دیکھ کر سرجون نے اسے پٹی پھینک دینے کی ہدایت کی۔

کپتان نے خوف ناک چیخ ماری اور دانت پیستے ہوئے اسے نفرت وحقارت سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے خوف ناک غیظ وغضب مترشح تھا۔ پھر وہ اچھلا اور خونخوار درندے کی مانند نتھنوں اور منہ سے جھاگ اڑاتا ہوا سرجون پر جھپٹ پڑا۔ سرجون نے خوف زدہ ہوکر میز پر سے محدب شیشہ اٹھایا اور پوری قوت سے کپتان کے منہ پر دے مارا۔ ضرب کی شدت اور درد کے احساس نے کپتان کو حواس باختہ کردیا۔ پٹی اس کے ہاتھوں سے نکل کر دور جا پڑی اور وہ سر تھام کر بیٹھ گیا۔

اسی لمحے دروازے کا پردہ اٹھا اور سرجون کے ملازم نے اندر داخل ہوتے ہوئے سہم کر پوچھا۔

"سر کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔" سرجون نے ہانپتے ہوئے بے توجہی سے جواب دیا، لیکن فوراً ہی چونک کر کہا۔

"جروس!"

"جی!"

"چمٹا لاؤ۔"

''چمٹا!'' اس نے حیرت سے پوچھا۔
''ہاں، ہاں چمٹا، آتش گیر، سمجھے'' سرجون نے آتش زیرپا ہوتے ہوئے کہا۔
جروس نے خوف زدہ نظروں سے کپتان کی طرف دیکھا چمٹا سامنے رکھ کر خاموشی سے باہر نکل گیا۔
چمٹا لے کر سرجون پرانی سی کرسی پر بیٹھا ایک ڈائری کی ورق گردانی کررہا تھا پھر وہ نڈھال قدموں سے اٹھا اس نے پٹی کو چمٹے سے پکڑا اور آتش دان میں ڈال دیا۔ شعلے یکدم بلند ہوگئے اور کمرہ عجیب وغریب آوازوں سے گونج اٹھا۔ پہلے کسی درندے کے غضب ناک ہوکر غرانے کی آواز آئی، پھر انسانی قہقہوں، اس کے بعد سسکیوں اوراذیت ناک شور پیدا ہوا، پھر آخر میں ایسی دلدوز چیخیں بلند ہوئیں کہ کپتان نے ہڑبڑا کر سرجون کی طرف دیکھا اور بولا۔
''خدا کیلئے صاف صاف بتایئے یہ کیا راز ہے؟''
سرجون نے ایک نظر سے رنگ بدلتے ہوئے شعلوں کی طرف دیکھا اور کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔
''آج سے بیس سال قبل افریقہ کے دشوار گزار جنگلوں میں سفر کرتے ہوئے میں نے ایک حکایت سنی تھی۔ اس وقت میں نے اسے ایک دیوانے کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی، لیکن آج معلوم ہوا کہ اس کا ایک ایک لفظ صداقت پر مبنی تھا۔ میرے بوڑھے افریقی ملازم نے بتایا تھا کہ ''اس کی بستی کے سردار کے پاس قدیم زمانے سے چمڑے کی ایک ایسی پٹی ہے جسے چھوتے ہی انسان خونخوار درندہ بن جاتا ہے۔''
بوڑھے کے بیان کے مطابق۔ ''یہ پٹی کئی نسلوں سے اس سردار کی ملکیت ہے اور اسے ایک بہت پرانے صندوق میں بند کررکھا ہے۔''
''آخر اس سردار نے اس خطرناک پٹی کو سنبھال کر کیوں رکھا ہوا تھا؟'' کپتان نے مضطرب ہوکر سوال کیا۔
''ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ جو شخص اس پٹی کو ضائع کرنے کی کوشش کرے گا، وہ کبھی زندہ نہیں بچ سکے گا۔''
یہ سنتے ہی کپتان نے خوف زدہ نظروں سے سرجون کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر لہرا گیا جب سرجون نے پٹی کو آتش دان کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں جھونک دیا تھا۔
''فکرمت کرو میرے دوست! اب تو وہ پٹی جل کر راکھ ہوچکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ حکایت کا آخری حصہ صرف اس لئے وضع کیا گیا تھا کہ لوگ اس شیطانی چیز کو ضائع نہ کریں۔''
کپتان یہ سن کر آتش دان کے قریب جا کھڑا ہوا اور حیرانی سے بولا۔
''سرجون! ذرا ادھر آ کر دیکھیے ...... پٹی سے ابھی تک شعلے نکل رہے ہیں۔''
سرجون مسکراتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا اور کپتان کے قریب چلا گیا۔ آتش دان میں پٹی کا بڑا حصہ جل چکا تھا۔ صرف اس کا ایک سرا باقی تھا اور اس سے ہلکے نیلے رنگ کے شعلے نکل رہے تھے۔ پٹی سے اب تک آوازیں آرہی تھیں، لیکن اب ان آوازوں نے کسی عورت کی سسکیوں کا روپ دھار لیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی عورت نوحہ کررہی ہے۔
''آخر میں نے اس منحوس پٹی کا خاتمہ کر ہی دیا۔'' سرجون نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ وہ پیچھے کی طرف مڑنے ہی والا تھا کہ پٹی سے نکلتے ہوئے شعلوں میں سے ایک زبان سی نکلی اور سرجون کے سارے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ خوف سے کپتان کا سارا جسم سن ہوگیا اور وہ چکرا کر فرش پر گر پڑا۔
جب اسے ہوش آیا۔ تو سرجون کا بے چین جسم فرش پر پڑا تھا۔ اس نے آتش دان کے پاس جاکر دیکھا...... آگ سرد ہوچکی تھی۔ پٹی جل چکی تھی اور اس کی راکھ دکھائی دے رہی تھی...... حکایت کا آخری حصہ بھی مکمل ہوچکا تھا۔





ہمدرد روح

ساجدہ راجہ۔ ہنڈواں سرگودھا

برفیلی پہاڑی پر سے اچانک بچے کا پاؤں پھسلا اور وہ لڑھکتا ہوا بڑی تیزی سے نشیب کی طرف انے لگا مگر نیچے کھڑے نوجوان کی اس پر نظر پڑی تو وہ اڑتا ہوا بچے تک پھنچا او بچے کو اس نے یوں پکڑا جیسے کہ وہ ایک کھلونا ہو۔

کیا یہ حقیقت ہے کہ بعض روحیں بھی سالہا سال سرگرداں رہتی ہیں۔ایک دلکش کہانی

گاڑی اونچے نیچے برفیلے راستوں پر آگے ہی آگے بڑھتی جارہی تھی موسم کی پہلی برف باری ہوچکی تھی اور آئندہ بھی متوقع تھی لیکن فی الحال مطلع صاف تھا۔

سڑکوں سے برف صاف کر کے ٹریفک کو بحال کردیا گیا تھا لیکن سڑکیں گیلی اور پھسلن اب بھی موجود تھی اس لئے کار درمیانی رفتار سے چلتی جارہی تھی اس کار میں میاں بیوی موجود تھے مائیکل اور روزی اور ان کے ساتھ ان کا پانچ سالہ بیٹا جیکی بھی تھا جو اپنی عمر سے کہیں زیادہ بڑا لگتا تھا، اور کبھی کبھی وہ ایسی ایسی باتیں کرجاتا تھا کہ مائیکل اور روزی دونوں حیران رہ جاتے تھے۔

اس وقت ان کی منزل آئس لینڈ نامی ایک قصبہ تھا جہاں روزی کے والدین رہائش پذیر تھے پہاڑی



شیطان کی بیٹی

ایس امتیاز احمد۔کراچی

خوبرو حسینہ بارش اور بجلی چمکنے کو بڑے انہماک سے دیکھ رہی تھی کہ اچانک اس پر بجلی گر پڑی اور چشم زدن میں وہ جل کر خاکسر ہوگئی اور اس طرح اس کا نام و نشان مٹ کے رہ گیا۔

اوہ خدایا!......اس کی ٹرین کا ایکسیڈنٹ کیوں نہ ہوگیا، حقیقت کہانی میں پوشیدہ ہے

ہمارا گھر کاسکونی کے ایک غیرآباداور سنسان علاقے میں تھااور وہ اٹھارویں صدی عیسوی کی ایک پرانی حویلی تھی جس کے آگے لمبے لمبے درختوں کی ایک قطار تھی۔ برآمدے کے پاس دوسری منزل کی سیڑھیوں کے کنارے گلاب کا ایک پودا تھا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ 100 سال پرانا ہے۔ پہلی منزل کی کھڑکی کے پاس ایک اور بوڑھا درخت تھا۔ جس کی جھکی ہوئی شاخیں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس درخت کے خوشبودار گلاب آج بھی میرے تصور میں ہیں۔ یاسمین اور لیموں کے درختوں کی خوابیدہ مہک آج بھی رہ رہ کر ایک گزرے ہوئے خوبصورت زمانے کی یاددلاتی ہے۔ وہ حویلی اگرچہ پرانی تھی لیکن بچپن کی سیر وتفریح اور کھیل کود کے لئے شاید ہی کوئی اور جگہ اس سے زیادہ موزوں ہوسکتی ہو۔ آس پاس پھیلے ہوئے انگوروں

کے خوشے ہمارے منتظر ہوتے۔ قریب ہی بہتے ہوئے دریا کا منظر اور بید کے درخت۔ کھیل کود کے دنوں میں ہمیں اور کیا چاہیئے۔

لیکن اس گھر میں ایک ایسی جگہ تھی جہاں بڑا مہیب اندھیرا رہتا تھا۔ ایک خوفناک اور پراسرار جگہ ایک خفیہ اور ویران کوٹھری جو گھر سے کچھ دور باورچی خانے کے پیچھے واقع تھی، میں اور میرا بھائی اسے کسی نامعلوم وجہ سے ''بلیک فیٹ ہاؤس'' کہتے تھے۔ یہ کوٹھری باغیچے کے پاس شاید ہمارے دادا نے تعمیر کروائی تھی۔

اس اندھیری اور پراسرار کوٹھری کا بھید ہمیں اس دن معلوم ہوا جب میں آٹھ سال کا تھا۔ اور میرا بھائی سات سال کا اور ہم دونوں اپنی اتالیق مارتھی کے ساتھ باغ میں آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ اسی دن سے ہم اس تنگ و تاریک کوٹھری کا راز جاننا چاہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی نامعلوم طاقت ہمیں اس کوٹھری کی طرف بلارہی ہے۔

ایک دن حیران اور سراسیمہ اس کوٹھری کے قریب پہنچے۔ لیکن اندر داخل ہونے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا۔

''پہلے تم چلو۔'' میرے بھائی نے مجھ سے کہا۔

''نہیں پہلے تم جاؤ۔'' میں نے جواب دیا۔

آخر بحث و تکرار کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ دونوں اکٹھے اس کال کوٹھری میں داخل ہوں۔ ہم اس کوٹھری میں پہنچے اور جامد اور ساکت حیران ششدر کھڑے ہوگئے۔ بڑے بڑے مکڑی کے جالے اور لٹک رہے تھے۔ اور ہر طرف سے مدھم ڈراؤنی آوازیں آرہی تھیں میرے بھائی آرمنڈ نے فوراً دعائیہ گیت گانا شروع کردیا۔ اس کی عادت تھی کہ جب بھی وہ کسی بات سے خوفزدہ ہوتا تو یہی گیت گاتا تھا اور خدا سے مدد کا طالب ہوتا تھا۔ میں نے بظاہر، حوصلے کا اظہار کیا اور اپنی جیب میں رکھے ہوئے چاقو کو بڑی مضبوطی سے پکڑ کر آنے والی مصیبت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوگیا۔

کچھ لمحہ تک ہم یونہی خوفزدہ کھڑے رہے۔ آخر جب اس گھپ اندھیرے میں کچھ کچھ دکھائی دینے لگا تو ہمیں یہ دیکھ کر بڑا اچنبھا ہوا کہ ساری کوٹھری میں عجیب و غریب، سامان بکھرا ہوا ہے۔

''یہ دیکھو ایک بڑی تین پہیوں کی پرانی سائیکل۔''

آرمنڈ نے سرگوشی میں کہا۔

''اور یہ دیکھو ایک یہ بڑا لوہے کا صندوق ہے۔''

''ہاں اور دیکھو آرمنڈ یہ پتھر کا کتنا بڑا برتن ہے، بالکل میرے قد کے برابر۔'' میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

ہمیں علی بابا اور چالیس چور کی کہانی یاد آگئی۔ اور پھر ہم نے فیصلہ کیا کہ اس جگہ دوبارہ موم بتی اور ماچس لے کر آئیں گے۔

ابھی ہم پلٹنے ہی والے تھے کہ ایک بہت بڑی چمگادڑ ایک زندہ وجود کی طرح ہمارے قریب سے گزرتی ہوئی کہیں دور پرواز کرگئی اور ہم خوف و دہشت کے ساتھ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔

سخت پریشانی اور سراسیمگی کی کیفیت تھی۔ زرد چہرہ، دھڑکتے دل، بے انتہا خوف اور سوالیہ نشان بنے ہوئے ہم بھاگتے رہے۔ بھاگتے رہے اور گھر پہنچنے سے پہلے باغیچے کے اندر جھولوں میں بیٹھ گئے۔ ہمارے پیر بری طرح گرد میں اٹے ہوئے تھے اور ہم اپنے اس راز کے بارے میں سرگوشیاں کررہے تھے...... ''قسم کھاؤ۔'' میں نے اپنے بھائی سے کہا۔ ''تم اس راز کو ظاہر نہ کرو گے۔ خواہ کوئی تمہیں مار ہی ڈالے مگر نہیں بتاؤ گے۔''

''ہاں میں قسم کھاتا ہوں۔ اس راز کو راز ہی رکھوں گا۔'' ...... بھائی نے قسم کھائی۔ قسمیں کھانے کے بعد ہم گھر روانہ ہوئے۔

''بلیک فیٹ ہاؤس۔'' میں ہم روشنی لے کر بھی داخل ہوئے۔ لیکن موم بتی کی روشنی نے بھی اس اندھیری کوٹھری کی وحشت دور نہیں کی۔ بلکہ بعض گوشے تو اور بھی زیادہ تاریک ہوگئے۔ ہم کو اس روشنی میں کچھ لمحوں کے بعد بکھرے ہوئے سامان سے خوف نہ آیا۔ لیکن کچھ نامعلوم آوازیں چمگادڑوں کی پھڑپھڑاہٹ خود اپنے تنفس کی آواز سے سخت دہشت ہورہی تھی۔

یہ تھا ہمارا بچپن اور یہ ہماری تفریح اور بے فکری

کے انداز۔ لیکن اس کے ایک سال بعد جب میں نو سال کا ہوا تو میری زندگی میں ایک ایسا حیرت انگیز واقعہ پیش آیا کہ اس کے بعد میری زندگی میں اور خیالات میں بڑا انقلاب پیدا ہوگیا۔ وہ عجیب واقعہ یہ تھا......

ایک دن آرمنڈ اور میں باغیچہ میں کھیل رہے تھے۔ میری ممی ہمارے پاس بڑی شفقت کے ساتھ آئیں اور ہمارے ساتھ کھیلنے لگیں۔ وہ کہیں باہر جانے والی تھیں اور گاڑی تیار تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ اس وقت ایک بڑی اور پھولدار کناری والا ہیٹ پہنے ہوئے تھیں۔ کچھ لمحے ساتھ کھیلنے کے بعد انہوں نے ہمیں بتایا کہ ہماری اتالیق مارتھی۔ ہمیں چھوڑ کر جانے والی ہے اور ان کی جگہ یہ فریضہ ایک جرمن اتالیق سنبھالے گی۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ ہماری جرمن اتالیق کا نام فریولین نیو برگ ہے۔ وہ ہانوور سے آنے والی ہے۔ جہاں وہ کاؤنٹس وان ڈورز بیچ کے ہاں اس کی لڑکی کی اتالیق کی حیثیت سے ملازم تھی۔

ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ ہماری نئی اتالیق بڑی فاضل عورت ہو اور ہمیں بیالوجی، تاریخ اور پیانو کے علاوہ ڈرائنگ وغیرہ بھی سکھائے گی۔ ہماری ممی نے ہمیں پھر حسب عادت تھپتھپایا۔ ہمارے بے سلیقہ اور بڑھتے ہوئے ناخنوں کو ٹوکا اور چلی گئیں۔

جونہی ان کی گاڑی ہماری نظروں سے دور ہوئی، اور اس کا صرف غبار باقی رہ گیا تو ہم ''بلیک فیٹ ہاؤس'' میں داخل ہوئے اور اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ ہم چپ چاپ بیٹھے تھے جیسے کوئی سانحہ پیش ہو۔ ہماری خاموشی بدلتے ہوئے حالات کی اہمیت کو ظاہر کررہی تھی۔ آخر، آرمنڈ ے نے خاموشی کے طلسم کو توڑتے ہوئے کہا۔

''خدا جانے جرمن کیسے ہوتے ہیں؟''

وہ بہت اداس دکھائی دے رہا تھا۔

''انہوں نے کئی بار پیرس کا محاصرہ کیا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اور کیا تم کو یاد ہے کہ اس وقت کی بات ہے جب ہمارے چچا جنرل تھے۔'' میں نے جواب دیا۔

''ہوسکتا ہے کہ وہ بہت خوب صورت بالوں والی عورت ہے۔'' اس نے کہا۔

''مگر ہم اس کی بولیاں نہ سمجھ سکیں گے۔'' میں بولا۔

''ہوسکتا ہے وہ جس ٹرین میں سفر کررہی ہو اسے حادثہ پیش آجائے۔'' آرمنڈ نے عادتاً کہا۔

جیسے ہی آرمنڈ نے یہ فقرہ ختم کیا، اندھیرے میں ایک بہت بڑا وجود حرکت کرتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ بڑے بوجھل قدموں کے ساتھ حرکت کررہا تھا۔ اتنے بوجھل قدموں کے ساتھ کہ اس کی آواز بڑی دہشت انگیز تھی۔

ہم نے ایک دوسرے کو دھکا دے کر ایک دوسرے سے پہلے کوٹھری سے نکل جانے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں آرمنڈ پرانی تین پہیوں والی بائیسکل سے ٹکرا گیا۔ اور میں اسی کشمکش میں گرگیا۔ ایک بڑی خوفناک سی صورت بڑے غصہ اور جوش میں ہمارے قریب سے گزری، میں نے اپنے ننگے پیروں میں اس کی حرارت اور اس کے تنفس کی گرمی محسوس کی۔

خوف کی شدت سے ہم دیوانوں کی طرح بڑبڑاتے ہوئے گزرے اور اس اندھیرے سے دھوپ کی مہربان روشنی میں پناہ لی۔

ہمارے پاؤں گرد آلود اور حال پریشان کن، آرمنڈ نے دوڑتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں بتایا کہ ''یہاں کوئی زندہ وجود ضرور تھا جس نے ہماری باتیں سن لی ہیں۔ خدا جانے اب ہمارا کیا حشر ہوگا۔'' اس کے بعد اس نے اپنے خاک آلودہ ہاتھ دھوئے اور دعائیہ گیت گانا شروع کردیا۔ اس دن کے بعد ہم پر ایسا خوف طاری ہوا کہ ہم پھر سے 20 کلو میٹر کے دائرے سے، باہر نہ نکلتے تھے۔ قریب کے ایک کھیت سے انجیر یا بادام حاصل کرنے کے علاوہ کہیں اور جانے کے نام سے کانوں میں انگلیاں دیتے تھے۔ ارمنڈ کی دعا پوری نہ ہوئی۔

ہمیں کسی ٹرین کے حادثے کی اطلاع نہیں ملی۔ بلکہ اس کے بجائے فریولین نیو برگ ہماری نئی اتالیق ہمارے گھر ایک حادثے کی طرح پہنچ گئی۔

''یہ سلانشر ہے اور ارمنڈ۔'' میری اس نے ہمارا تعاقب کراتے ہوئے ہماری نئی اتالیق نیو برگ سے

کہا۔اس نے اپنا سیاہ دستانے والا ہاتھ بڑھا کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ کچھ مبہم سے الفاظ کہے اور پھر وہ ارمنڈ کی جانب بڑھی۔ ارمنڈ نے بڑی پھرتی سے اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اس تعارفی ملاقات کے بعد وہ ممی کے ساتھ زینہ چڑھ کر دوسری منزل کی طرف چلی گئی۔

جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی تو میں نے اپنے بھائی کے چہرے کی طرف دیکھا جو بہت زرد ہو رہا تھا۔

''کیا یہ عورت خوفناک نہیں ہے؟ اس کی آنکھیں سفید ہیں، حیرت انگیز سفید۔'' اس نے کہا۔

''مگر تم تو بڑی خوش خلقی سے پیش آئے تھے آرمنڈ میں تو ایک لمحہ کو یہ سمجھا تھا کہ شاید وہ عورت تمہیں اچھی لگی۔''

''نہیں...... بالکل نہیں...... میں ڈر گیا تھا۔'' وہ بولا۔

''ڈرنے کی کیا بات ہے؟'' میں نے ہنستے ہوئے بادلوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''کوئی طوفان تو نہیں آ رہا ہے اس وقت۔''

''نہیں طوفان نہیں وہ سفید آنکھوں والی عورت آئی ہے۔ وہ بہت ڈراؤنی ہے۔ تم سمجھتے کیوں نہیں۔ اوہ خدا! اس کی ٹرین کا ایکسیڈنٹ کیوں نہ ہوگیا۔ جو اسے یہاں لے کر آئی ہے۔''

☆......☆......☆

ہم یک لخت خاموش ہوگئے اور ٹہلنے لگے اور خود بخود بغیر کسی ارادے کے اس راستے کی طرف چل کھڑے ہوئے، جو ''بلیک فیٹ ہاؤس'' یا اندھیری کوٹھری کو جاتا تھا۔ ہمیں اس وقت کوئی خوف اس کوٹھری سے محسوس نہ ہوا۔ چلتے چلتے ارمنڈ بولا۔

''میں نے اور کسی چیز کی طرف دھیان نہیں دیا۔ مجھے تو اس کی سفید آنکھوں سے ڈر لگ رہا ہے۔''

''ایک اور عجیب بات ہے۔'' میں بولا۔ ''وہ نپولین ہیٹ پہنے ہوئے تھی۔ فینسی نپولین ہیٹ۔'' میں نے کہا۔ ''بڑی سی ہیٹ!''

''کیوں اس کے بالوں کو کیا ہوا؟ ہو نہ ہو وہ گنجی ہے۔'' ارمنڈ بولا۔

''تمہارے خیال میں کیا عمر ہوگی اس کی؟''

''خاصی عمر ہے۔ کوئی 30 برس ہوگی۔'' میں نے جواب دیا۔

''اوہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ابھی مرے گی نہیں عموماً لوگ 30 سال سے زیادہ ہی زندہ رہتے ہیں اور ہاں اس نے جرمن زبان میں کچھ کہا بھی تھا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کیا بڑبڑا رہی تھی۔'' ارمنڈ نے اپنے شانے ہلا دیئے اور بولا۔

''میں کچھ کچھ سمجھ گیا ہوں۔ وہ کوئی منتر پڑھ رہی ہوگی۔ ضرور کوئی منتر اگر وہ جادوگرنی یا چڑیل نہیں تو اس کی آنکھیں سفید کیوں ہیں؟''

''ہمیں فوراً واپس آ جانا چاہئے۔ ہوسکتا ہے وہ ہمیں آتے ہی کوئی سبق دینا چاہتی ہو۔ سفید آنکھوں والی بلا۔'' میری آواز میں گھبراہٹ تھی۔ جسے میں اپنے چھوٹے بھائی سے چھپا رہا تھا تاکہ وہ مجھے کم حوصلہ نہ سمجھے...... اگرچہ ہمیں اس دن سبق نہیں دیا گیا۔

لیکن بہرحال ہمارے ہاتھ میں ہفتہ بھر کا پروگرام تھما دیا گیا تفریح، کھیل اور پھول جمع کرنے کا وقت سرخ روشنائی سے تحریر کیا گیا تھا۔ اور ہر روز 6 سے 7 بجے شام کا وقت ہماری خطاؤں کی سزا کے لئے وقف کردیا گیا تھا، دن بھر میں سب سے سنہرا وقت 2 سے 3 بجے کا تھا۔ یہ وقت نیوبرگ نے اپنے آرام کے لئے وقف کردیا تھا۔

☆......☆......☆

یہ ٹائم ٹیبل مکتب میں ٹانگ دیا گیا۔ ارمنڈ نیو برگ سے خلاف توقع سے بڑی سعادت مندی سے پیش آ رہا تھا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ شاید برگ کی باتوں میں ارمنڈ آ گیا ہے۔ بہرحال جب ارمنڈ سے میری اکیلے میں ملاقات ہوئی تو میں نے سوال کیا۔

''تم اس عورت سے اتنی خوش خلقی اور سعادت مندی کیوں برت رہے ہو؟''

''میں ہمیشہ اس سے خوش خلقی برتوں گا جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ اس کا راز کیا ہے؟''

''کیا راز ہے اس کا؟'' میں نے پوچھا۔

’’وہ شیطان کی بیٹی ہے۔‘‘ اس نے کہا۔
’’شیطان؟‘‘
’’ہاں! اس کے پاس جو صوفہ ہے، کالا اور سنہری صوفہ اس کو انسانی بالوں سے بھر دینا چاہتی ہے۔ وہ تمہارے اور میرے بال بھی سزا کے طور پر کاٹ لے گی اور انہیں اپنے صوفے کی، زینت بنائے گی۔‘‘
مجھے جھرجھری سی آ گئی اور شدید وحشت ہوئی۔ لیکن ہم دونوں خاموشی سے ٹہلنے لگے۔
’’ممی سے نہ بتا دینا۔ یہ ٹھیک نہیں ہے، انہوں نے اس عورت کو سفر خرچ دیا ہے۔ وہ اس عورت سے خوش معلوم ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اس شیطانی طاقت کے سامنے اکیلے اور تنہا ہیں۔ مجھے تو یہ عورت کسی یہودی کی بیٹی معلوم ہوتی ہے۔ شاید اس کے خاندان نے ہمارے باپ کو قتل کیا ہو۔ اور کون جانتا ہے، ہوسکتا ہے کہ اسی کے باپ نے پیرس کا محاصرہ کرنے کے بعد ہمارے جنرل چچا کو ہلاک کیا ہو...... وہ تمہارے بال ضرور کاٹ لے گی۔ ہم اس کے ہاتھوں محفوظ نہیں رہ سکتے۔‘‘
ارمنڈ مایوس ہوا جا رہا تھا۔
’’میں اس کی زندگی تلخ کر دوں گا۔ اتنی تلخ کہ وہ اپنا بوریہ بستر باندھ کر چلتی بنے گی۔ اس کا صوفہ بہت جلد اس کے ساتھ روانہ ہو جائے گا۔ کیا سمجھے سیدھے جرمنی۔‘‘ میں نے جواب دیا۔
’’نہیں۔ نہیں ایسا ہرگز نہ کرنا۔‘‘
ارمنڈ کا رنگ فق ہو گیا۔
’’میں یہی کروں گا۔ بالکل یہی کروں گا۔ یہ میرا پکا ارادہ ہے۔‘‘ میں چلایا۔ اس نے میرا بازو زور سے پکڑا اور گڑگڑا کر بولا۔ ’’نہیں۔ خدا کے لئے۔‘‘
’’لیکن کیوں نہیں آخر کس لئے؟ تم کیوں وکالت کر رہے ہو؟‘‘ میں نے پوچھا۔
’’اس لئے کہ اگر وہ مر گئی تو ہم پر شبہ کیا جائے گا۔ ہمیں ہوشیاری سے کام کرنا ہوگا۔ کیا سمجھے؟‘‘
ہم ایک خفیہ لیگ بنائیں گے۔ تم لیڈر رہو گے۔ کیونکہ تم بڑے ہو۔ پھر ہم ہر صبح شیطان مردہ باد کا نعرہ لگائیں گے۔ سب کام خفیہ ہونا چاہئے۔ یاد رکھو۔‘‘
اتنے میں نیوبرگ آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس نے حسب معمول نپولین ہیٹ بڑی شان سے پہن رکھی تھی، وہی اکلوتی ٹوپی جو اس کے پاس تھی۔ یہ ٹوپی ہر وقت اس کے سر پر لدی رہتی تھی۔ ممی کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے البتہ اتار دی جاتی تھی۔
نیوبرگ اب بہت قریب تھی۔
’’تم اپنے ہاتھ صاف کیوں نہیں کرتے؟‘‘ اس نے وہیں سے مجھے ٹوکا۔
میں نے سنی ان سنی کر دی۔ اور ایک پرندہ، کی طرف دیکھنے لگا جو نغمے الاپ رہا تھا۔ ارمنڈ بڑی پھرتی سے صاف نکل گیا۔
’’سلانٹر۔ تم نے میری بات سنی یا نہیں۔‘‘ وہ بولی آواز میں غصہ تھا۔
میں نے پھر ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔
’’جاؤ اور اپنے بال ٹھیک کرو۔‘‘ وہ کہتی ہوئی گزر گئی۔ ’’ہاں ہاں سب کو معلوم ہے پہلے اپنے صوفے میں، رکھے ہوئے بالوں کو دیکھو۔‘‘ وہ جیسے ہی گزری۔ میں بڑبڑایا۔
’’اسی دوران ہمیں اپنی اتالیق کے بارے میں بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئیں۔
اس نے ہمیں جو تعلیم دی، اس میں تعلیم برائے نام اور قصیدے زیادہ ہوتے تھے۔
تعلیم کے دوران ارمنڈ اکثر چپکے سے میرے کان میں کہا کرتا تھا۔
’’یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر شیطان کے بارے میں پوچھو کہ کیا خیال ہے، میم صاحب کا؟‘‘
لیکن میں نے کبھی کوئی ایسا سوال نہیں کیا۔ وہ اکثر سبق کے دوران میرے بالوں کو ٹوکتی تو میں خاموش رہتا..... ہماری ہٹ دھرمی دیکھ کر اکثر اپنی سعادت مند شاگرد، ’’مٹ زیل‘‘ کی اچھی عادتوں کی روزانہ مثال دی جاتی تھی۔ تاکہ ہم کو حیا آ جائے۔ مٹ زیل کے روز

مرہ کے ذکر سے ہمیں اس لڑکی سے بھی چڑ ہوگئی ہم کچھ اور تو نہ کرسکتے تھے۔ شدید نفرت کی کیفیت میں ہم نے ایک دن مٹ زیل کی فرضی قبر کھودی اور بڑے خلوص کے ساتھ اس کی میت پر آنسو بہانے اور اس کی بخشش کی دعا مانگنے کے بعد اس کا فرضی پتلا قبر میں دفنا دیا۔

اور یوں انتقام کی آگ ٹھنڈی ہوئی۔ اس تدفین کے بعد جب اس لڑکی کا ذکر آتا، ہم بے تحاشہ ہنس دیتے۔

دن گزرتے رہے۔ ارمنڈ نے اپنی نئی اتالیق سے سعادت مندی کا رویہ جاری رکھا اور میں نے تلخ برتاؤ میں کوئی کمی نہ آنے دی۔

''آخر کار اسے جانا ہوگا۔'' میں نے آرمنڈ کو آتے ہوئے دیکھ کر اس سے مخاطب ہوکر کہا۔

''وہ تین سال تک غریب مٹ زیل کا ناطقہ بند کرتی رہی ہے۔ تین سال۔ تین سال تو بچوں کی زندگی میں بہت ہوتے ہیں۔''

''خداوندا!'' اس نے کہا۔

جیسے جیسے دن گزرتے گئے۔ حالات خراب سے خرب تر ہوتے گئے۔ ایک دن نیو برگ نے پیانو سکھاتے ہوئے چھڑی سے میری مرمت کردی۔ پھر ایک مرتبہ اس نے مجھے ایک لفظ کو سو مرتبہ لکھنے کی سزا دی......

سزائیں، سفید آنکھیں اور صوفہ میں انسانی بال۔ یہ سب باتیں تلخی بڑھاتی چلی گئیں۔ اس ایک سال کے عرصہ میں بڑی ناخوش گوار باتیں ہوئیں۔ ممی کا رویہ ویسا ہی تھا۔ ایک دن ہم نے ہم نے اپنی ممی کے رویہ کے بارے میں بات کی...... ''یہ بڑی خطرناک بات ہے کہ وہ ممی کو بھی شیشے میں اتار چکی ہے۔'' میں نے ارمنڈ سے تبادلہ خیال کرتے ہوئے کہا۔

اور غریب ممی اس بدروح عورت کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔'' ارمنڈ نے بڑی مایوسی سے جواب دیا۔ ''ہماری مایوسیوں کے ساتھ ساتھ ہماری کوششیں بھی جاری رہیں۔ ہم نے اس سفید آنکھوں والی آسیبی عورت کو بھگانے کے لئے جو کچھ کیا جاسکتا تھا کیا۔ ''طرح طرح کی شرارتیں کی گئیں۔ ارمنڈ اس کی ہیٹ پر بیٹھ گیا۔ ہم دونوں نے ایک چمگادڑ اس کے سونے کے کمرے میں چھوڑ دی۔ انتہا یہ کہ معصوم بچی مٹ زیل کی قبر بھی اپنی اتالیق کو دکھادی۔ جس پر وہ بہت برہم ہوئی۔ سزا بھی دی۔ لیکن گھر چھوڑ کر نہ بھاگی۔ وہ پتھر کا جگر لے کر آئی تھی۔ آخر وہ دن بھی آگیا۔ جب دونوں طرف سے انتہا ہوگئی۔

وہ گرمیوں کی ایک شدید گرم صبح تھی۔ باوجود دروازے بند ہونے کے، تیز دھوپ اسکول میں داخل ہوکر ہمیں پریشان کررہی تھی۔

وہ ہماری پریشانی سے لاپرواہ ہوکر تاریخ کا سبق دے رہی تھی۔ تاریخ زبردستی حلق میں انڈیلی جارہی تھی۔ اور اپنی سفید آنکھوں سے اس طرح گھور رہی تھی جیسے یہ آدم خور شیرنی ہمیں کھانا چاہتی ہے۔ ہمیں دہشت بھی ہورہی تھی اور غصہ بھی آرہا تھا۔ آخر اس نے مجھے ایک سو مرتبہ ایک فقرہ لکھنے کی سزا دی اور ارمنڈ کو کونے میں جاکر کھڑا ہونے کا حکم دیا۔ اور ہمیں گھورتی رہی۔ جیسے ہماری ساری جسمانی طاقت اپنی آنکھوں میں کھینچ لینا چاہتی ہو۔

ممی اس دن لنچ پہ بھی نہیں آئیں۔ ورنہ کچھ لمحوں کو چھٹکارا ہوجاتا۔ انہیں سر کا درد لاحق تھا۔ چنانچہ ہم نیو برگ کی نگرانی میں کھانا کھاتے رہے۔ وہ نپولین ہیٹ پہنے بہت سی چیزیں سامنے رکھے ہوئے آہستہ آہستہ کھانا کھاتی رہی تاکہ ہم پریشان ہوں ہم صبر کرتے رہے۔ ہم کو ''بلیک فیٹ ہاؤس'' مشورہ کرنے کے لئے جانا تھا۔ اگر ہم ذرا بھی بے صبری کرتے تو وہ ہم کو اور سزا دیتی۔ آخر اندھیری کوٹھری میں جاکر صلاح مشورہ کرنے کا وقت نہ ملتا۔ آخر اس کا لنچ ختم ہوا اور وہ کھڑی ہوئی اور یہ ہدایت کرتے ہوئے کہ ہم گھر ہی میں کھیلیں، کیونکہ باہر دھوپ بہت ہے اور شور نہ مچائیں۔ کیونکہ ممی کے سر میں درد ہے، اپنی نپولین ہیٹ کو کرسی پر دانستہ چھوڑ کر مڑی اور اس طرح چلنے لگی جیسے واقعی چلی گئی ہو۔ اور پھر ہیٹ کے بہانے دوبارہ پلٹ کر آئی وہ جانتی تھی کہ ہم اس کے جانے کے بعد اس کے پیچھے اس

کو چڑانے والی صورتیں بنائیں گے اور وہ موقع پر پکڑ کر اس بہانے ہمیں سخت سے سخت سزا دینا چاہتی تھی۔

وہ جیسے ہی دوبارہ واپس ہوئی ہم سزا کے ڈر سے ایسے کھڑے ہو گئے جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ وہ ہمیں کئی منٹ تک ٹکٹکی باندھے گھورتی رہی۔ اپنی خوفناک سفید آنکھوں سے گھورتی ہوئی، وہ آہستہ اور مدھم آواز میں، کوئی منتر پڑھنے لگی اور ساتھ ہی ہمیں بتادیا کہ اب اس کی جانب سے ہمیں اس بدسلوکی کی بدترین سزا ملے گی۔ ایسی سزا جو کہ اب تک نہ ملی تھی اور اس کے بعد ہم اس کے قدموں کی آہٹ سنتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ آہٹ دور ہوتی ہوئی گزر گئی۔ یہ مرحلہ انتہائی نازک تھا ہم سرپٹ دوڑے۔ بہت جلد اس ڈر سے کہ کہیں یہ منحوس صورت عورت دوبارہ نازل ہو کر ہمیں روک نہ دے، پسینے میں شرابور، گرد اور دھول میں اٹے ہوئے ہم بھاگتے رہے۔ ایک وحشت اور سراسیمگی کی حالت جو بیان سے باہر تھی۔

آرمنڈ کا چہرہ خوف اور دہشت سے پیلا ہو رہا تھا۔ بھاگتے ہوئے ہماری کیفیت اس مجرم کی سی تھی جو جیل سے بھاگ رہا ہو۔ اور جسے پھانسی لگنے والی ہو۔ یا جنگی مجرم دشمن کے کیمپ سے فرار ہو رہا ہو۔ ہم بھاگ کر سیدھے ''بلیک فیٹ ہاؤس'' پہنچے اور لرزتے کانپتے زمین پر بیٹھ گئے۔ جہاں آج کی نازک صورت حال پر ہم دو مظلوم بھائیوں کی خفیہ کونسل کا اجلاس ہونے والا تھا۔ ہمیں ایسی بدترین سزا دی جانے والی ہے جو ہمیں اس سے پہلے کبھی نہ دی گئی تھی۔''

خوف زدہ آرمنڈ نے بہت زور سے چیخ کر کہا۔

حالتِ اضطراب میں وہ دیواروں پر ہنٹر مارتا ہوا اور سسکیاں بھرتا ہوا کچھ نامعلوم الفاظ بولتا رہا۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی اور ضبط کی تلقین کی۔ لیکن میں جتنی زیادہ ضبط کی تلقین کرتا اور سمجھاتا، وہ اتنی ہی شدت سے چیختا اور روتا۔ میں اس کی پیٹھ تھپتھپاتا رہا۔ میں نے اس کے سر کے بال نوچے۔ بالکل طوطے کے پروں کی طرح، کیونکہ میں خوف اور صدمے کے مارے زور سے بولنے کی تاب نہ رکھتا تھا۔ آخر اس کی ہچکیوں کا تانتا ٹوٹ گیا۔ اور اس نے ناک سنکتے ہوئے کہا۔

''تم نہیں جانتے کہ وہ کیسی خوفناک سزا دے گی سلانٹر......؟''

''میں کچھ کچھ سمجھتا ہوں۔ میں وہ سزا برداشت نہ کرسکوں گا۔ میں مرجانا بہتر سمجھتا ہوں۔ ہاں مجھے معلوم ہے کہ وہ اب کیا سزا دے گی۔''

''کیا سزا دے گی؟'' میں نے دہشت زدہ ہو کر پوچھا کیونکہ میرا دل ڈوب رہا تھا۔

''ہاں۔ وہ بڑی خوفناک سزا دے گی۔ وہ سب سے پہلے تو ہمارے بال کاٹ لے گی اور پھر اپنی ساحرانہ قوت سے یا صلیب کے ذریعے مار ڈالنے کی کوشش کرے گی۔ اور آہستہ آہستہ ہماری جانب بڑھتی ہوئی موت کا تماشہ دیکھے گی۔ وہ ہمیں اپنی سفید آنکھوں سے گھورے گی۔ وہ ہم سے نفرت کرتی ہے۔ وہ ہم سے انتقام لے رہی ہے۔ شاید ہم چائے کے وقت سے پہلے موت کی آغوش میں ہوں گے۔ خداوند اس نے چار بجے کا وقت دیا ہے۔''

یہ ایک بڑی بھیانک تصویر تھی جو میرے بھائی نے کھینچ دی تھی۔ وہ تصویر ایک پردہ کے منظر کی طرح، میرے ذہن میں ابھرنے لگی جیسے ارمنڈ اور میں مصلوب اور مردہ ہوں اور ہماری لاشوں کے پاس اسکول میں نیوبرگ بڑے اطمینان کے ساتھ کھا پی رہی ہو کیک اور مٹھائی اور ہماری بے خبر ممی اس دلدوز سانحہ سے بے خبر اپنی پیشانی پر پٹی باندھے سر کے درد کی دوا لگائے آرام کر رہی ہوں۔ اپنے بیٹوں کی موت سے بے خبر! ابھی میرے ذہن میں یہ ہیبت ناک تصویر حرکت کر رہی تھی کہ اچانک ارمنڈ نے چونک کر کہا۔ ''سنو، دیکھو، یہ کیا ہے......''

میں نے اپنی ہچکی روک لی۔ اور اس آواز پر کان لگا دیئے مجھے دور فاصلے پر بجلی کی مدھم گرج سنائی دی۔

''طوفان ہے۔'' میں نے ارمنڈ سے سرگوشی میں کہا۔

''ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری کوٹھری میں ایک

بے نام خوف اور دہشت پھیل گئی ہے۔"

"لیکن کہیں بہت دور ہے یہ طوفان۔" ارمنڈ نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔ اتنے میں ایک اور گرج کی آواز خاموشی کے طلسم کو توڑتی ہوئی گزر گئی۔ یہ گرج نسبتاً زیادہ بلند تھی۔

ہمیں فوراً گھر جانا چاہئے۔ ممی ہمارا طوفان میں باہر رہنا ہرگز گوارا نہیں کرسکتیں۔" ابھی ارمنڈ کا یہ جملہ ختم نہ ہوا تھا کہ اندھیری کوٹھری اچانک روشنی کی ایک زبردست چکاچوند کردینے والی موج سے جگمگا اٹھی۔ ساتھ ہی بادل بڑے زور سے گرجا۔ ہم نے اپنے کان انگلیوں سے بند کرلئے اور چندھیا دینے والی تیز روشنی کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے بعد بارش شروع ہوگئی۔ تیز بارش جس کی زبردست بوچھاڑ، کوٹھری میں آرہی تھی، بارش کے ساتھ ساتھ طوفان کی مہیب آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں، پانی کا ایک دھارا کوٹھری کی جانب بڑھ رہا تھا۔ دروازہ یک لخت کھل گیا۔ ہم نے اس سے بچاؤ کے لئے جونہی جست لگائی۔ بجلی کی تیز روشنی نے ایک لمحہ کے لئے نظروں کو چکاچوند کردیا اور ایک زبردست گرج پھر سنائی دی اور پھر فوراً ہی خاموشی چھا گئی۔

اب مٹی سے سوندھی خوشبوئیں ابھرنے لگیں ہوا صاف اور شفاف ہوگئی چمکدار سورج ہنستا ہوا بادلوں سے نکل آیا۔ ارمنڈ مسکرایا اور مجھے ٹھوکا دیا۔ "ہمیں اب یہاں سے بھاگ نکلنا چاہئے۔" میں نے کہا۔ جوتے ہاتھ میں لئے ہوئے ہم "بلیک فیٹ ہاؤس" سے نکلے۔

اچانک ابھری ہوئی دھوپ کی روشنی میں ہم نے نیو برگ کو اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا۔ ہمیں دہشت کے مارے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی ساکت و جامد ہم کھڑے ہوگئے۔ دہشت کی ایک جھرجھری ہمارے جسم میں دوڑ گئی اور ہم آنے والے بھیانک لمحے کے انتظار کرنے لگے۔

نیو برگ ایک لمبا اسکرٹ پہنے ہوئے بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ نپولین ہیٹ اس کے سر پر جوں کا توں موجود تھا۔ لیکن وہ اس کے چہرے پر کوئی کیفیت نہیں پیدا کر رہا تھا۔ اس کی سفید آنکھیں ہمیں گھورنے لگیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی نزدیک سے نزدیک ہوتی گئی۔ لیکن ہمارے قدم من من بھر کے ہوچکے تھے۔ ہم نے اپنی جگہ سے خوف کے مارے، جنبش تک نہ کی۔ پلک تک نہ جھپکی۔ یہاں تک کہ وہ ہمارے قریب سے گزر گئی۔

آہستہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی وہ حیرت انگیز طور پر بغیر کچھ کہے گزر گئی۔ اور دور ہوگئی۔ ہم نے اسے صنوبر کے درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوتے ہوئے دیکھا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی تو ہم گھر کی طرف دوڑے، گھر پہنچتے ہی ہم نے اپنی ممی کو برآمدہ میں پایا، ممی نے ہماری گردن میں بانہیں ڈال دیں اور کمرے کا دروازہ بند کرکے ہمیں یہ خبر دی کہ طوفان شروع ہونے سے ایک یا دو منٹ پہلے نیو برگ پر بجلی گر پڑی۔ وہ بجلی گرتے وقت صدر دروازے میں کھڑی ہوئی تھی اور یہ کہ آدھ گھنٹہ پہلے وہ مرچکی ہے۔

"وہ مرچکی ہے...... آدھ گھنٹہ پہلے...... اور اب وہ کہاں ہے؟" میں نے بڑی حیرت سے سوال کیا۔

"جب ڈاکٹر آگیا تو اس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

"حیرت ہے، سخت حیرت۔" میں نے کہا۔

"کیونکہ میں تو اسے طوفان کے بعد بھی صنوبر کے درختوں کی طرف جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ نپولین ہیٹ پہنے ہوئے تھی۔"

"نہیں۔ نہیں ڈارلنگ وہ نیو برگ نہیں ہوسکتی اسے تو بجلی کے پہلے ہی حملہ نے ہلاک کرڈالا تھا۔"

"لیکن میں سچ کہہ رہا ہوں کہ وہی تھی نپولین ہیٹ پہنے ہوئے۔" میں نے دوبارہ کہا۔ "میں نے اسے اچھی طرح دیکھا تھا۔"

"نہیں۔" ارمنڈ نے مداخلت کی۔ "نہیں غلط ہے۔ وہ ہیٹ پہنے ہوئے نہیں تھی۔ اس وقت۔"

میری اور ممی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اور آرمنڈ دعائیہ گیت گانے لگا۔





شیطانی کھوپڑی

ایس امتیاز احمد-کراچی

خواب گاہ میں بستر پر نظر پڑتے ہی نوجوان دہشت زدہ ہوگیا۔ ایک انسانی کھوپڑی مردہ وجود کے سینے پر براجمان تھی اور نوجوان کا تازہ تازہ خون بستر کی اجلی چادر کو داغدار بنادیا تھا اور پھر......

کیا یہ حقیقت ہے کہ مفاد پرستی انسان کیلئے اکثر باعث نقصان ثابت ہوتی ہے-دل گرفتہ کہانی

کرسٹوفر فرمیٹ لینڈ، آتش دان کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھا تھا، اس کے ہاتھ میں ایک پرانی کتاب تھی اور وہ اس کی جلد کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا زرد چہرہ آتش دان کی آگ کی روشنی میں بھی زرد نظر آرہا تھا اور اس پر تفکر کے آثار نمایاں تھے۔

اس کی ساری توجہ اس پرانی کتاب پر تھی۔ وہ حیران تھا کہ اس کتاب کی جلد بنانے کے لئے انسانی کھال استعمال کی گئی تھی اور وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کررہا تھا کہ یہ کھال مرد عورت یا بچے میں سے کس کی ہوسکتی ہے جب کہ کتاب بیچنے والے نے اسے یقین دلایا تھا کہ اس کتاب کی جلد بنانے کے لئے عورت کی کھال استعمال کی گئی ہے لیکن میٹ لینڈ کو اس بات پر یقین نہیں آرہا تھا۔

کرسٹوفر کا مشغلہ تھا کہ وہ عجیب وغریب قسم کی

چیزیں جمع کرتا تھا اور اس سلسلے میں اس نے کئی لوگوں سے مدد لی تھی، جو برسوں سے اس کے لئے کام کررہے تھے۔ وہ خوش تھا کہ اب اس کے ذخیرے میں ایک اور عجوبہ روزگار کا اضافہ ہوگیا تھا۔ اس کے پاس بہت سی تاریخی کھوپڑیاں تھیں اور قبرستان سے چرایا ہوا خوش قسمت ہاتھ بھی۔ اس کے پاس ایسی بہت سی چیزیں تھیں، وہ غیر معمولی چیزیں جمع کرنے کا شوقین تھا۔

میٹ لینڈ نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب اٹھائی اور اسے آگ کی روشنی کے قریب کرکے دیکھنے لگا۔

''عورتوں کی کھال مردوں کے مقابلے میں زیادہ نازک ہوتی ہے نا؟'' اس نے کہا۔

''میں نہیں سمجھا جناب۔'' آواز پر میٹ لینڈ نے مڑکر دیکھا۔ ہیم اندر داخل ہورہا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' میٹ لینڈ نے پوچھا۔

''وہ شخص پھر یہاں آیا ہے۔''

''کون شخص؟''

''مسٹر مارکو۔''

''اوہ! میٹ لینڈ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ لاپروائی سے ہیم کی طرف دیکھ رہا تھا جو اس کا باورچی تھا اسے خوشی تھی کی ہیم اور اس کے دوسرے دوستوں کی طرح جو اس کے لئے غیر معمولی چیزیں لاتے تھے بلکہ اسے تو میٹ لینڈ کے جمع کئے ہوئے اس خزانے سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔

''مارکو ہی نام بتایا ہے نا؟'' اس نے باروچی سے پوچھا۔ ''بھلا یہ کیوں آیا ہے؟ خیر اسے اندر لے آؤ۔'' اس نے کہا اور ہیم فوراً ہی واپس مڑگیا۔ میٹ لینڈ اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔ اس نے سوچا مارکو اب یہاں بہت جلد ہی دوبارہ آیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بہت اہم بات ہے۔ مارکو اس کے لئے ہمیشہ قیمتی چیزیں لے کرآتا تھا اور میٹ لینڈ کو حیرت ہوتی تھی کہ وہ اتنی اچھی چیزیں کہاں سے حاصل کرلیتا ہے مگر وہ یہ سوچنے میں زیادہ وقت خراب نہیں کرتا تھا۔ اس کے خیال میں یہ مارکو کا مسئلہ تھا کہ وہ قیمتی چیزیں کہاں سے اور کیسے حاصل کرے۔

ویسے مارکو میں یہ خاصت تھی کہ اسے معلوم ہوتا تھا کہ کرسٹوفر کو کیا چیز پسند آسکتی ہے؟

''مسٹر مارکو۔'' ہیم نے آکر اطلاع دی اور واپس چلا گیا۔

مارکو کمرے میں داخل ہوا تو میٹ لینڈ نے اس سے مصافحے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا۔ مارکو کا جسم موٹا اور بھدا تھا، وہ ایک پراسرار مسکراہٹ لبوں پر لئے میٹ لینڈ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن میٹ لینڈ کو ان رسمی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی ساری توجہ مارکو کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بنڈل پر مرکوز تھی، جو وہ اپنے ساتھ ہی لایا تھا، یہ ایک بڑا بنڈل تھا جو ایک کاغذ میں لپٹا ہوا تھا۔ مارکو نے بغیر کچھ کہے وہ بنڈل میز پر رکھا پھر اپنا اوور کوٹ اتار کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے بیٹھنے کے لئے میٹ لینڈ کی اجازت کا بھی انتظار نہیں کیا تھا۔

وہ آگ کے قریب رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا ہوا تھا پھر اس نے میٹ لینڈ کے سگار کیس میں سے سگار نکالا اور اسے سلگالیا۔ میٹ لینڈ کی نظریں ابھی تک بنڈل پر لگی ہوئی تھیں۔ مارکو میٹ لینڈ کی طرف دیکھنے لگا۔

''کیا بات ہے؟'' میٹ لینڈ نے پہل کی اور مارکو کے چہرے پر عجیب مسکراہٹ بکھر گئی۔

''میں بغیر اطلاع کے آنے پر معذرت چاہتا ہوں۔ مسٹر میٹ لینڈ مجھے امید ہے کہ آپ کی تنہائی میں ناگواری کی حد تک مخل نہیں ہوا ہوں گا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اس کی پروا مت کرو یہ بتاؤ پیکٹ میں کیا ہے؟'' میٹ لینڈ نے کہا۔

''بہت ہی منتخب چیز ہے۔'' مارکو نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''ایک عجیب وغریب کھوپڑی۔''

''آخر یہ کسی عورت کی کھوپڑی یا کسی کم عمر نوجوان کی کھوپڑی یہاں لانے سے تمہارا مطلب کیا ہے۔''

''یہی بات ایک کھوپڑیوں کے ماہر نے بھی کہی تھی۔'' مارکو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں کھوپڑیوں کے ماہر کی بات نہیں کررہا۔ مجھے اس کھوپڑی کے بارے میں بتاؤ اس میں کیا خاص بات ہے؟'' لیکن مارکو نے میٹ لینڈ کی بات کا جواب دینے کے بجائے اپنی توجہ پھر کھوپڑی پر مرکوز کردی اور اسے اپنے موٹے اور بھدے ہاتھوں میں لے کر پھر گھمانے لگا۔

''اس کا شیپ کتنا اچھا ہے۔'' مارکو نے کہا۔

''خدا کے لئے مارکو بھلا میں اس عام سی کھوپڑی کا کیا کروں گا؟'' میٹ لینڈ نے بےزاری سے کہا۔

''پلیز! مسٹر میٹ لینڈ! کیا آپ مجھ سے ایسی توقع رکھتے ہیں۔ کیا میں ایک عام سی چیز پیش کرکے آپ کے ذوق کا مذاق اڑاؤں گا؟ اور کیا میں ایک عام کھوپڑی کے لئے آپ سے ایک ہزار پاؤنڈ مانگوں گا؟''

''ایک ہزار پاؤنڈ؟'' میٹ لینڈ نے حیرت سے کہا۔

''ہاں اور اس کی یہ قیمت بھی بہت کم ہے۔'' مارکو نے اسے یقین دلانے والے انداز میں کہا۔ ''جب تمہیں اس کی کہانی معلوم ہوگی تو تم بخوشی یہ قیمت ادا کروگے۔''

''میں نپولین کی کھوپڑی کے لئے بھی یہ قیمت دینے کو تیار نہیں ہوں۔'' میٹ لینڈ نے غصے سے کہا۔

''تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ اس کھوپڑی کا مالک تمہاری قسمت بدل سکتا ہے۔'' مارکو نے کہا۔

''بہت ہوگئی اب مسئلے کی طرف آؤ۔''

''تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ معلوم ہوسکتا ہے اور اپنے وجود میں آنے سے پہلے کے واقعات بھی بتا کرسکتے ہو۔ یہ کھوپڑی ایک فرانسیسی شیطان صفت آدمی کی ہے مارکوئیس ڈی سیڈ کی۔''

میٹ لینڈ مارکوئیس سیڈ کے بارے میں جانتا تھا۔ اس کے ذہن میں مارکوئیس کی ساری تاریخ گھوم گئی۔ وہ ایک کاؤنٹ تھا اور سترہ سو چالیس میں پیدا ہوا تھا۔ جوان ہونے پر اس نے فوج میں شرکت کرلی تھی اور سات سال تک جنگوں میں حصہ لیا تھا وہ زرد رنگت اور نیلی آنکھوں والا شخص تھا اور اس میں شیطانی صفات کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔

تئیس سال کی عمر میں اسے ایک جرم کے سلسلے میں ایک سال کی قید ہوئی تھی۔ اس کی بہت جائیداد تھی جو آج تک کسی کو نہیں مل سکی تھی نشہ کرنا اس کی کمزوری تھی اور اپنی خوب صورتی کی وجہ سے وہ عورتوں میں مقبول تھا۔ وہ ایک ماہر نفسیات تھا۔ اس نے قید کے دوران ایک کتاب لکھی تھی جس میں سیڈ سنک کے بارے میں لکھا تھا جس میں مبتلا ہوکر لوگ نفسیاتی مریض ہوجاتے ہیں اور خود پر اور بچوں پر ظلم کرتے ہیں۔ اس نے اپنے نظریات ترتیب دیئے تھے اور ان میں مہارت حاصل تھی۔ وہ ایک ہی وقت میں کئی عورتوں سے محبت کرتا تھا اور اس کی تمام محبوبائیں ایک ایک کرکے موت کے گھاٹ اتر گئی تھیں۔ اس نے فرانس میں ہونے والی خانہ جنگی میں لاتعداد لوگوں کا خون بہایا تھا اور عمر کے آخری حصے میں اسے لوگوں نے پاگل تسلیم کرلیا تھا۔ اٹھارہ سو چودہ میں وہ مرگیا تھا۔ اس نے جو کتابیں لکھی تھیں وہ حکومت نے ضبط کرلی تھیں۔ اس کی جائیداد اور وصیت پر بھی حکومت کا قبضہ تھا اور وہ کسی کو نہیں دی گئی تھی صرف اس کا نام باقی رہ گیا تھا اور وہ نام بھی شیطانیت کا سمبل بن گیا تھا۔'' میٹ لینڈ نے مارکو کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کھوپڑی کی طرف دیکھا۔

''تم نے ایک ہزار پاؤنڈ ہی کہا ہے ناں؟''

''ہاں۔'' مارکو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ بہت مناسب قیمت ہے اور ان حالات......''

''کن حالات میں؟'' میٹ لینڈ نے پوچھا۔

''تم میرے پاس ایک کھوپڑی لائے ہو لیکن تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ مارکوئیس کی کھوپڑی ہے اور تم نے اسے کیسے حاصل کیا ہے؟''

''میری بات سنو مسٹر میٹ لینڈ۔ تم مجھے جانتے

ہو۔ تمہیں میرے ذرائع جاننے کی ضرورت نہیں ہے، یہ میرے تجارتی اداروں میں سے ایک ہے اور میں اپنے ذرائع کسی کو نہیں بتایا۔'' مارکو نے کہا۔

''ٹھیک ہے لیکن میں بھی صرف تمہارے الفاظ پر اعتبار نہیں کر سکتا مارکو۔ میری معلومات کے مطابق اٹھارہ سو چودہ میں فوت ہونے کے بعد مارکوٹیس کو چیزشن میں دفن کر دیا گیا تھا۔''

''تمہارا یہ کہنا درست ہے۔'' مارکو نے کہا۔

''لیکن تمہارے پاس ایلسز اسٹڈیز کی کوئی کاپی ہے اس میں ''محبت اور درد'' کے مضمون میں ایک چیز ہے جس سے تمہیں دلچسپی ہو سکتی ہے......'' مارکو کی بات پر میٹ لینڈ نے الماری سے اس کی بتائی ہوئی کتاب نکالی اور اسے دی۔ مارکو اس کے ورق الٹنے لگا۔

''یہ دیکھو۔'' اس نے ایک صفحہ پر اشارہ کرتے ہوئے کہا! ''یہ ایلسز کے مطابق مارکوٹیس کی کھوپڑی کا تجزیہ ایک ماہر نے کیا تھا اور وہ اپنے زمانے کا مشہور ماہر تھا۔ اس کے بیان کے مطابق اس نے مارکوٹیس کی کھوپڑی کو ایک عورت کی کھوپڑی کی طرح چھوٹا پایا تھا جیسا کہ ابھی تم نے بھی کہا تھا۔''

''لیکن یہ کھوپڑی تمہیں کیسے ملی؟''

''یہ کھوپڑی کافی عرصے سے ایک ڈاکٹر نوئنڈ کے پاس رہی۔ پھر اٹھارہ سو پچاس میں یہ چوری ہو گئی اور اسے ایک ماہر نفسیات ہی نے چرایا تھا جو اسے انگلینڈ لے گیا تھا۔ ایلسز نے اپنی کتاب میں اتنا ہی لکھا تھا اور یہی کہانی میں تمہیں بتا سکتا تھا، لو یہ مارکوٹیس ڈی سیڈ کی کھوپڑی حاضر ہے۔'' مارکو نے کہا۔ ''کیا تمہیں میری بتائی ہوئی قیمت منظور ہے۔''

''ایک ہزار پاؤنڈ؟'' میٹ لینڈ نے پوچھا۔

''ایسی چھوٹی اور واہیات کہانی کے لئے یہ بہت زیادہ قیمت ہے۔'' میٹ لینڈ نے احتجاج کیا۔

''چلو آٹھ سو ہی سہی۔'' مارکو نے کہا اور میٹ لینڈ کی طرف دیکھنے لگا۔ میٹ لینڈ اسے دیکھ رہا تھا اور کھوپڑی ان دونوں کو۔ ''پانچ سو؟'' مارکو نے قیمت اور کم کی۔

''تم ضرور جھوٹ بول رہے ہو۔'' میٹ لینڈ نے کہا۔ ''ورنہ تم کبھی بھی قیمت کم نہ کرتے۔''

''تم جانتے ہو میٹ لینڈ اگر میں چاہوں تو کسی بھی قیمت پر اڑ سکتا ہوں اور تم سے اپنی بات منوا سکتا ہوں۔'' مارکو نے مسکراتے ہوئے کہا، ''لیکن میں یہ کھوپڑی جلد از جلد خود سے جدا کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیوں؟''

''میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' مارکو نے کھوپڑی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ وہ میٹ لینڈ سے نظریں چرا رہا تھا۔

''بس یوں سمجھ لو کہ میں ایسا قیمتی آئٹم رکھنے کی ہمت نہیں رکھتا بس میرا ذہن اس کے لئے تیار نہیں ہے۔''

''تمہارا ذہن؟''

''مجھے یوں لگتا ہے جیسے کوئی میرا تعاقب کر رہا ہو۔ میں جانتا ہوں کہ یہ میرا وہم ہے لیکن......''

''تم یہ محسوس کرتے ہو کہ پولیس تمہارا تعاقب کر رہی ہو؟ تو یہ درست بھی ہو سکتا ہے کیونکہ تم نے یہ کھوپڑی چرائی ہوگی۔ ہے نا مارکو؟'' میٹ لینڈ نے پوچھا۔

''نہیں۔'' مارکو نے جواب دیا۔ ''یہ بات نہیں ہے بلکہ میں کھوپڑیاں رکھنا پسند نہیں کرتا، جب کہ تم اس بڑے گھر میں رہتے ہو اور یہاں محفوظ ہو۔ میں ایک تنگ سی جگہ میں رہتا ہوں میں تمہیں یہ کھوپڑی بیچنا چاہتا ہوں، تم اسے اپنے انتخاب میں جمع کر سکتے ہو اور جب چاہو اسے دیکھ کر خوش ہو سکتے ہو اور نہ چاہو تو یہ تمہاری نظروں سے اوجھل بھی رہ سکتی ہے یہ تمہاری پریشانی کا سبب نہیں ہوگی اور تم مجھے جو قیمت ادا کرو گے اس سے میں اپنے رہنے کے لئے بہتر انتظام کر لوں گا اور اسی لئے میں اسے فروخت کر رہا ہوں۔ بس اب پانچ سو میں سودا ہو گیا۔''

''میں ابھی سوچنا چاہتا ہوں۔'' میٹ لینڈ نے

جلدی سے کہا۔ ''تم مجھے اپنا پتا دے دو۔ میں تم سے بات کرلوں گا اور کل رقم لے کر تمہارے پاس آ جاؤں گا ٹھیک ہے نا؟'' میٹ لینڈ نے جان چھڑانا چاہی۔

''ٹھیک ہے۔'' مارکو نے جواب دیا اور میٹ لینڈ کو اپنا پتا دے دیا پھر اس نے بڑی عجلت میں اس کھوپڑی کو دوبارہ پیکٹ میں رکھا اور کاغذ لپیٹ دیا۔

''کل میں تمہارا انتظار کروں گا۔'' اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''اور ہاں ایک بات یاد رکھنا جب میرے گھر کا دروازہ کھولو تو ایک کتا تمہارا منتظر ہوگا اگر کوئی بھی اس کھوپڑی کو چرانے کی کوشش کرے گا تو وہ اس کی بوٹیاں نوچ لے گا......'' مارکو نے کہا اور واپس چلا گیا۔

''میٹ لینڈ کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ نقاب پوشوں نے اسے بہت سختی سے باندھ دیا تھا اور وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ انہوں نے اس کے سینے پر اسٹیل کی زنجیریں کیوں لپیٹ دی تھیں پھر ان دونوں نقاب پوشوں نے جلتی ہوئی سلاخوں سے اسے داغنا شروع کردیا تھا اور اس نے سختی سے اپنے دانت بھینچے ہوئے تھے پھر اچانک جیسے اسے ہوش آ گیا۔ اس کے چاروں طرف اندھیرا اور خاموشی تھی۔ نقاب پوش اسے کھول رہے تھے پھر انہوں نے اسے ایک اسٹیل کے فرش پر لٹا دیا تھا اور اسے کانٹوں سے زخمی کررہے تھے۔ وہ چیخ رہا تھا لیکن اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی پھر اسے احساس ہوا کہ وہ تنہا نہیں تھا بلکہ کوئی اور بھی اس کے ساتھ تھا جو حرکت نہیں کررہا تھا اور نہ ہی وہ سانس لے رہا تھا پھر اچانک وہ میٹ لینڈ سے قریب آتا چلا گیا اور جب اس نے میٹ لینڈ کا جسم چھوا تو اسے موت کی سی ٹھنڈک محسوس ہوئی اب وہ جسم میٹ لینڈ سے اتنا قریب تھا کہ وہ اس کا چہرہ دیکھ سکتا تھا جو بالکل سفید تھا۔ وہ ایک دھندلا سا انوکھا چہرہ تھا اس کے خدوخال نمایاں نہیں تھے اور پھر جیسے ہی اس جسم نے دوبارہ اس کے جسم کو چھوا اس سر نے میٹ لینڈ کے سر کو چھوا جیسے ہی اس کے ہونٹ اس اجنبی جسم کے ہونٹوں سے ٹکرائے تو خوف اس کی رگ رگ میں سرایت کرگیا۔ وہ چیز ایک کھوپڑی تھی اور وہ کھوپڑی مارکوئیس ڈی سیڈ کی تھی۔

پھر اچانک ہی اس کی آنکھ کھل گئی تھی اس نے کسی کو بھی اس خواب کے بارے میں نہیں بتایا اور اسی روز سر فنٹرگ سے ملا۔

''مجھے مارکو پر بھروسہ ہے لیکن میں حیران ہوں کہ وہ اس کھوپڑی کو خود سے جدا کیوں کرنا چاہتا ہے؟'' میٹ لینڈ نے اسے کھوپڑی کی کہانی سنانے کے بعد کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم اس شعبے کے ماہر ہو چنانچہ جب میں مارکو کے پاس کھوپڑی لینے جاؤں تو تم میرے ساتھ چلنا اور اس کھوپڑی کی جانچ کرلینا۔''

''اس کی جانچ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' فنٹرگ نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے تم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کی روشنی میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ وہ کھوپڑی مارکوئیس ڈی سیڈ ہی کی ہے۔''

''تمہیں اس بات پر کیسے یقین ہے؟''

''میرے دوست کیونکہ وہ کھوپڑی میرے ہی پاس سے چرائی گئی ہے۔'' فنٹرگ نے کہا۔

''کیا؟''

''ہاں! اور یہ کام دس دن پہلے ہی ہوا ہے۔ میرے گارڈن میں کھلنے والی کھڑکی سے ایک شخص میری لائبریری میں داخل ہوا میرے کسی ملازم کی آنکھ نہیں کھلی اور وہ رات کی تاریکی میں کھوپڑی لے کر فرار ہوگیا ہے۔''

''حیرت ہے۔'' میٹ لینڈ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تم میرے ساتھ تو چلو گے ناں ہم دونوں اس کو شناخت کریں گے اور مارکو کو حقیقت بتائیں گے اور کھوپڑی بھی واپس لے آئیں گے۔''

''نہیں۔'' فنٹرگ نے جواب دیا۔ ''اس کھوپڑی کے چرائے جانے پر مجھے خوشی ہوئی ہے اور میرا مشورہ ہے کہ تم بھی اس سے دور رہو۔ میں نے پولیس میں بھی اس کی چوری کی رپورٹ درج نہیں کرائی اور نہ ہی ایسا کرنے کا میرا کوئی ارادہ ہے کیونکہ وہ

کھوپڑی...... منحوس ہے۔"

"منحوس؟" میٹ لینڈ نے حیرت سے پوچھا۔

"تمہارے پاس مصر کی ممیاں بھی ہیں اور بہت قیمتی ذخیرہ ہے اور تم کیا کہہ رہے ہو کہ وہ کھوپڑی منحوس ہے؟ تم نے پہلے تو کسی چیز کے لئے ایسی بات نہیں کی۔"

"تمہارا کہنا درست ہے۔ میں یہ بات تم سے تب ہی کہہ رہا ہوں جب میں نے یقین کرلیا ہے کہ یہ کھوپڑی واقعی خطرناک ہے اور تمہیں میرے الفاظ پر یقین کرنا چاہئے۔"

میٹ لینڈ حیرت سے اس کی بات سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ شاید اس نے بھی میٹ لینڈ کی طرح ڈراؤنے خواب دیکھے ہوں گے اسی لئے ایسی بات کہہ رہا ہے۔

"میری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آئی، میں تو سمجھا تھا کہ تم فوراً اس کھوپڑی کو واپس حاصل کرنا چاہو گے۔" میٹ لینڈ نے کہا۔

"میٹ لینڈ تم اس کھوپڑی کے متعلق بھی جانتے ہو اور اس کے مالک کی شیطانی قوتوں کے متعلق بھی اور تم پھر بھی اس کو حاصل کرنا چاہتے ہو جب کہ کوئی صحیح الدماغ آدمی اس کو خریدنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔" فنٹرگ نے کہا۔ "میں تمہیں خوفزدہ کرنا نہیں چاہتا۔" اس کی آواز سرگوشی میں تبدیل ہوگئی تھی۔

"لیکن میں بھی اس کھوپڑی کی تاریخ سے واقف ہوں یہ بہت سے لوگوں کے ہاتھ سے گزری ہے ان میں کچھ پرانی چیزیں جمع کرنے کے شوقین تھے اور کچھ جادوئی تنظیموں سے متعلق تھے یہ جن جن لوگوں کے پاس گئی وہ موت سے ہمکنار ہوتے چلے گئے۔

لیکن یہ میرے پاس تو اتفاق سے آگئی۔

میرے پاس بھی چھ ماہ پہلے ایک شخص لے کر آیا تھا۔" فنٹرگ نے کہا۔ "اس نے یہ کھوپڑی مجھے قیمتاً نہیں بلکہ تحفے میں دی تھی کیونکہ وہ اس سے خوفزدہ تھا اور اس وقت میں اس کے بھائی پر ہنسا تھا۔ باقی ایسے ہی جیسے اس وقت تم میرا مذاق اڑا رہے ہو لیکن ان چھ مہینوں میں جب تک یہ کھوپڑی میرے پاس رہی میں پریشان ہی رہا۔ میں خوفناک خواب دیکھتا رہا۔ لوگ کہتے ہیں کہ ڈی سیڈ پاگل نہیں تھا اور میں ان پر یقین کرتا ہوں وہ پاگل نہیں تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ خطرناک تھا اس میں کوئی چیز غیر انسانی تھی جو دوسروں کو متاثر کرتی تھی اور وہی چیز اس کھوپڑی میں بھی ہے۔ جتنے عرصے یہ کھوپڑی میرے پاس رہی مجھے طرح طرح کی فون کالز بھی آتی رہیں اور عجیب و غریب خط بھی اور میرے بعض ملازموں نے رات کو کچھ سائے بھی گھر میں چلتے دیکھے۔"

"ہوسکتا ہے وہ عام چور ہوں۔ مارکو کی طرح اور انہیں کسی چیز کی تلاش ہو۔" میٹ لینڈ نے کہا۔

"نہیں۔" فنٹرگ نے آہ بھری۔ "ان سایوں نے اس کھوپڑی کو تلاش کرنے کے علاوہ بھی بہت کچھ کیا۔ وہ رات کو میرے گھر میں آتے تھے اور اسے استعمال کرتے تھے۔ لیکن اس کھوپڑی کو میں شیشے کے ایک کیس میں رکھتا تھا تاہم ہر وقت وہ اپنی جگہ سے کھسکی ہوئی ہوتی تھی۔ بعض اوقات شیشے کا کیس ٹوٹا ہوا تھا اور کھوپڑی میز پر رکھی ہوتی تھی۔

ایک بار وہ فرش پر تھی۔ میں نے ملازموں سے بھی پتا کیا تھا لیکن ان میں سے یہ کسی کا کام نہیں تھا۔ یہ کسی باہر کے شخص کا ہی کام تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کھوپڑی کے چاہنے والے میرے گھر میں آکر اس کی عبادت کرتے تھے اور جب وہ چوری ہوئی تو مجھے بہت خوشی ہوئی تھی۔ میرا تو تمہیں یہی مشورہ ہے کہ تم اس سلسلے میں دور ہی رہو اور مارکو سے مت ملو۔"

"بہت بہتر۔" میٹ لینڈ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں اس تنبیہ پر تمہارا شکر گزار ہوں۔" اس نے کہا اور سر فنٹرگ سے رخصت ہوا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ مارکو کے دروازے پر کھڑا تھا۔ مارکو کا دروازہ لاک تھا اور اندر سے طرح طرح کی آوازیں آرہی تھیں۔ سر فنٹرگ کی وارننگ نے اسے ہوشیار کردیا تھا اور وہ اپنے ساتھ اپنا ریوالور لایا تھا جس سے اس نے دروازے کا لاک توڑ دیا اور دروازہ کھول کر

کمرے میں دیکھنے لگا۔
اچانک کوئی چیز اس کی طرف آئی اور اس سے ٹکرائی وہ نیچے گر گیا۔ گرنے سے پہلے اس نے فائر بھی کیا تھا۔ کچھ دیر بعد جب اسے ہوش آیا تو مارکو کا کتا اس کے پاس پڑا تھا۔ تب اسے یاد آیا کہ مارکو نے پہلے ہی اسے اس کتے سے خبردار کیا تھا کہ جو کوئی کھوپڑی لینا چاہے گا کتا اس پر حملہ کردے گا لیکن اس کی وجہ میٹ کی سمجھ سے باہر تھی۔ وہ اٹھا اور بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا جہاں مارکو کا بستر تھا اور اس پر بے شمار شکنیں تھیں اور قریب ہی مارکو کی لاش پڑی تھی۔
میٹ لینڈ حیرت سے اسے دیکھنے لگا پھر اس کی نظر کھوپڑی پر پڑی جو مارکو کے قریب ہی پڑی تھی جس پر جگہ جگہ خون لگا تھا۔ میٹ لینڈ کو پہلی بار کھوپڑی کی تاریخ پر یقین آیا اور اسے اس کی شیطانی قوت کا یقین ہوگیا۔ کھوپڑی میں عجیب سی چمک آ گئی تھی اسے مارکو کی بات پر یقین آ گیا تھا۔ اس نے کھوپڑی کو اٹھالیا اور کافی دیر اسے دیکھتا رہا اور پھر کمرے سے نکل آیا اس کے ہاتھ میں کھوپڑی اسی طرح موجود تھی۔ وہ بڑی عجلت میں تھا اور خوفزدہ تھا۔ وہ جلد از جلد وہاں سے چلا جانا چاہتا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ پولیس وہاں پہنچ جائے اور میٹ لینڈ کو مارکو کے قتل کے شبہے میں گرفتار کرلے۔ اسی خوف کے زیر اثر وہ اپنے گھر میں سائیڈ ڈور سے داخل ہوا تھا اور کسی نے نہیں دیکھا کہ وہ اپنے ساتھ وہ کھوپڑی بھی لے آیا ہے جو مارکو اسے بیچنا چاہتا تھا۔
اس شام میٹ لینڈ پر خوف سوار رہا۔ میز پر کھوپڑی اس کے سامنے رکھی تھی اور وہ اسے گھور رہا تھا اور کسی انجانے خوف سے کانپ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ سر فنٹرگ صحیح کہہ رہے تھے اس کھوپڑی کی قوتوں نے میٹ لینڈ کو بھی متاثر کیا تھا اور اس نے اپنے عزیز دوست کی تنبیہ پر بھی یقین نہیں کیا تھا اور اس کھوپڑی ہی کی قوتوں نے اسے ایک مردہ شخص کے پاس سے چرانے کی جرأت بخشی تھی اور اب اسے ایک کمرے میں تنہا بند ہونے پر مجبور کردیا تھا ایک لمحے کو اسے خیال آیا کہ اسے پولیس کو فون کردینا چاہئے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کھوپڑی کو کہیں دور لے جا کر پھینک سکتا ہے لیکن کوئی چیز تھی جو اسے روک رہی تھی وہ تمام حقیقتیں جاننے کے باوجود بھی اس کھوپڑی کے سامنے بے بس بیٹھا تھا اور اسے گھور رہا تھا وہ اس سے ہارنا نہیں چاہتا تھا لیکن خود میں اسے تباہ کرنے کی طاقت بھی نہیں پا رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ پاگل ہوجائے گا پھر اسے ایک خیال آیا جس نے اسے موت کے خوف سے آزاد کردیا۔
اس نے دل برداشتہ ہوکر شراب پی اور فرش پر لیٹ گیا۔ اسے نیند آرہی تھی اس کا خیال تھا کہ صبح اس کا ذہن تھکن سے آزاد ہوچکا ہوگا اور وہ اس مسئلے کا ضرور حل ڈھونڈ نکالے گا۔ اسے سر فنٹرگ کی باتوں نے پریشان کردیا تھا اور آج دوپہر کے واقعے نے اس کی ہمت توڑ دی تھی۔
وہ مارکوٹیس کی کھوپڑی کے بارے میں سوچ سوچ کر اپنے ذہن کو پریشان کرنے کے بجائے سوجانا چاہئے تھا، تاکہ صبح تازہ دم ہوکر کوئی فیصلہ کرسکے پھر وہ اٹھ کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ اس کے بعد اس نے لائٹ بھی آف کردی۔ کھڑکی میں سے چاند کی کرنیں اس کے بستر پر پڑ رہی تھیں۔ ان کرنوں میں میز پر رکھی ہوئی کھوپڑی چمک رہی تھی اور میٹ لینڈ اسے دیکھ رہا تھا پھر اس نے آنکھیں بند کرلیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے سوچا سر فنٹرگ کو فون کرے گا اور یہ کھوپڑی ان کے مشورے سے ملک کے عجائب گھر میں رکھوادے گا۔
پھر سونے سے پہلے اس کی نظریں کسی پریشان کردینے والی چیز سے ٹکرائی تھیں اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مارکو کے کمرے میں ہے اور اسکا کتا اسے گھور رہا ہے۔ کتے پر خون کا کوئی دھبہ نہیں تھا اور یہ حیرت کی بات تھی کیونکہ میٹ لینڈ کی گولی لگنے کے بعد وہ مرگیا تھا اور اس کے جسم سے خون بھی نکلا تھا پھر اس کتے نے میٹ لینڈ کے گلے پر کاٹا تھا لیکن خون نہیں نکلا تھا۔ یہ میٹ لینڈ کے لئے حیرت کی بات تھی۔
پھر اس نے یہ مسئلہ بھی صبح کے لئے اٹھا رکھا،

اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ جیسے ہی سوئے گا اسے خواب نظر آنا شروع ہوجائے گا پھر ایسا ہی ہوا وہ چاندنی رات میں میز پر رکھی ہوئی کھوپڑی کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن وہ وہاں نہیں تھی۔ یہ چیز اس کے لئے حیران کن تھی کوئی بھی اس کے کمرے میں نہیں آیا تھا اور نہ ہی وہ خود اٹھا تھا۔ اگر اسے یہ یقین نہ ہوتا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے تو وہ یہ دیکھ کر ضرور اٹھ بیٹھتا کہ کمرے میں چاندنی کا دریا بہہ رہا تھا اور اس میں کھوپڑی تیر رہی تھی، وہ بار بار گھوم رہی تھی اور اس کے بستر کے قریب آتی جارہی تھی اور پھر جب وہ کھوپڑی بستر کے قریب فرش پر گری تو اس کی آواز میٹ لینڈ کے سوتے ہوئے کانوں نے بہ خوبی سنی تھی پھر اور خوفناک خواب شروع ہوگیا تھا۔

کھوپڑی بستر پر چڑھ آئی تھی۔ اس کے دانتوں نے بستر کی چادر کو پکڑ لیا تھا اور پھر جھول کر بستر پر اس کے قدموں میں آ گری تھی۔ اسے اس کھوپڑی کے گرنے کی دھمک محسوس ہوئی تھی پھر وہ بستر پر لڑھکنے لگی تھی اور اس کے سینے کے قریب آ گئی تھی۔ اسے چاندنی میں کھوپڑی نظر آرہی تھی۔ وہ اس کی گردن سے چھ انچ کے فاصلے پر تھی پھر اسے گلے پر تھوڑا سا دباؤ محسوس ہوا کھوپڑی اب حرکت کررہی تھی پھر وہ ہاتھ پاؤں مارنے لگا اور خواب ٹوٹ گیا۔ اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی لیکن باہر نہیں آ سکی۔ اس کی گردن پر کھوپڑی کے دانت پیوست ہوچکے تھے جو ایک انسانی قوت کے ساتھ اس کی گردن کو کاٹ رہے تھے۔ اس کے نرخرے سے عجیب عجیب آوازیں نکل رہی تھیں جو جلد ہی معدوم ہوگئیں۔

اس کے بعد کھوپڑی میٹ لینڈ کے سینے پر چلی گئی تھی۔ اس کا سینہ اب سانس لینے سے ہل نہیں رہا تھا۔ وہ ساکت ہوچکا تھا اور کھوپڑی اس پر موجود تھی۔ چاندنی کھوپڑی پر پڑ رہی تھی جس سے اس کے خدوخال نمایاں ہورہے تھے۔ اس کھوپڑی میں بے تحاشا چمک محسوس ہورہی تھی جو آہستہ آہستہ غائب ہوتی جارہی تھی۔

میٹ لینڈ کے جانے کے کافی دیر تک فنٹرگ سوچ کی گہرائیوں میں ڈوبا رہا اور پھر شاید کسی خیال پر پہنچ کر وہ مسکرا اٹھا تھا۔

جونہی کلاک ٹاور نے شب کے 10 بجے کا گجر بجایا وہ ریوالور اپنی جیب میں رکھ کر گھر سے باہر نکل آیا۔ اس کے قدموں کا رخ میٹ لینڈ کے گھر کی طرف تھا۔ وہ میٹ لینڈ کی فطرت سے بخوبی واقف تھا اس لئے اسے یقین تھا کہ اب تک میٹ لینڈ وہ کھوپڑی حاصل کرچکا ہوگا اور پھر چودہویں چاند کی یہ شب بھی اس کے ذہن میں کھٹک کر اس کو کسی انجانے خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ اسے شیطانی کھوپڑی سے منسوب ایلمر اسٹڈیز کے بعض حوالے یاد آرہے تھے۔

میٹ لینڈ کے گھر پہنچ کر فنٹرگ کافی دیر تک دروازے پر دستک دیتا رہا مگر اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ فنٹرگ نے ہینڈل کو گھمایا تو دروازہ کھلتا چلا گیا دروازے اور کھڑکیوں سے در آنے والی چاندنی نے کمرے کے تاریک ماحول پر ایک عجیب سا سحر طاری کردیا تھا۔ فنٹرگ نے جیب سے ریوالور نکالا اور اندھیرے ہی میں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا میٹ لینڈ کی خواب گاہ میں داخل ہوگیا۔

خواب گاہ کے اندرونی منظر پر نگاہ پڑتے ہی فنٹرگ دہشت زدہ سا ہوگیا۔ اس نے فوراً لائٹ آن کردی۔ کمرا روشن ہوتے ہی میٹ لینڈ کا مردہ بدن نمایاں ہوگیا۔ اس کی گردن سے بہتے خون نے بیڈ کی اجلی چادر کو رنگ دیا تھا اور مارکوئیس سیڈ کی شیطانی کھوپڑی اپنی تمام تر خباثتوں کے ساتھ اس کے سینے پر براجمان تھی۔ زرد کھوپڑی پر پڑتی روشنی نے اس کی پراسراریت میں مزید اضافہ کردیا تھا۔

فنٹرگ نے دیوانگی کے عالم میں شیطانی کھوپڑی کو میٹ لینڈ کے مردہ بدن سے اٹھا کر فرش پر پٹخا اور پھر ریوالور سے نشانہ لے کر پے در پے گولیاں چلا کر ریوالور خالی کردیا۔ جس کے نتیجے میں کھوپڑی ریزہ ریزہ ہوکر بکھر گئی۔





شیطانی محل

ایس امتیاز احمد-کراچی

پختہ ایمان والے جب ضروریات زندگی کے لئے تنگ و دو کرنے لگتے ہیں تو واقعی ان پر شیطان اپنی گرفت سخت کردیتا ہے اور دنیاوی عیش و آرام کا لالچ دے کر ایمان والے کو کہیں کا نہیں چھوڑتا۔

کیا یہ حقیقت ہے کہ شیطان بڑے بڑے ایمان والوں کا ایمان متزلزل کر دیتا ہے، حقیقی کہانی

”دی نیوز“ کی اس خبر نے سارے شہر میں کھلبلی مچادی تھی۔ یوں خبر بھی کچھ کم حیرت انگیز نہ تھی۔ دی نیوز کے دروازے پر اس وقت خاصی بھیڑ تھی، لوگ ایک ہی بات پوچھ رہے تھے۔

”کیا یہ خبر صحیح ہے؟“

”جی ہاں، یہ خبر صحیح ہے۔“ بے چارہ ایڈیٹر اس جملے کو دہراتا دہراتا عاجز آ گیا تھا۔

بار بار فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔

فون کرنے والے صرف ایک ہی بات پوچھ رہے تھے۔

”کیا یہ خبر صحیح ہے۔“

”جی ہاں، یہ خبر صحیح ہے۔“ ایڈیٹر اب جھنجھلا کر جوا دے رہا تھا۔

لوگ بار بار اس لئے پوچھ رہے تھے کہ ان کو اس

خبر پر کسی طرح یقین نہیں آ رہا تھا، وہ اس کو اخبار کی اشاعت بڑھانے کا ایک ہتھکنڈا سمجھ رہے تھے اور ایڈیٹر اس لئے جھنجھلا رہا تھا کہ لوگوں کو اس کی چھاپی ہوئی خبر پر یقین کیوں نہیں، جب کہ اس نے پوری تصدیق کر کے خبر چھاپی تھی۔

خبر شہر کی جامع مسجد کے امام جناب شیخ عبدالعظیم کے متعلق تھی۔ شیخ عبدالعظیم جن کی عمر ساٹھ سال سے کسی طرح کم نہ تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان کے بدن میں توانائی تھی۔ وہ اب بھی سینہ تان کر چلتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ عاجزی سے ان کی گردن جھکی رہتی تھی۔ رنگ گورا، گالوں پر ہلکی ہلکی سرخی بھرا ہوا چہرہ، چہرے پر دو بڑی بڑی جاگتی آنکھیں جنہیں اب تک شیشوں کی ضرورت نہ پڑی تھی۔ سفید بالوں والی خوب صورت داڑھی۔

وہ بے حد نیک آدمی تھے اور اپنی پرخلوص طبیعت کے لئے بہت مشہور تھے۔

کل رات وہ چھت پر سو رہے تھے۔ قریب ہی ان کی بیوی کا پلنگ تھا کہ ٹھیک بارہ بجے چھت پر ایک ہنڈولا اُترا، اس میں ایک خوب صورت پری بیٹھی ہوئی تھی، اس پری نے اپنے ساتھ لائے ہوئے غلاموں کو اشارہ کیا۔

اشارہ پاتے ہی غلاموں نے شیخ صاحب کو مع پلنگ کے اٹھالیا اور اس پلنگ کو ہنڈولے میں رکھ دیا۔ شیخ صاحب کی بیوی نے یہ پورا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ بول نہ سکیں وہ اسے جاگتی آنکھوں کا خواب سمجھتی رہیں، جب ہنڈولا آنکھوں سے اوجھل ہوگیا اور شیخ صاحب کا پلنگ بھی برابر میں نظر نہ آیا تو انہوں نے اپنے رخسار پر بڑے زور سے طمانچہ مارا، طمانچے کی آواز ہوئی اور ساتھ ہی انہوں نے تکلیف محسوس کی، پھر اٹھ کر وہ کھڑی ہوگئیں، اور چلانے لگیں۔ لیکن اب چلانے سے کیا ہونا تھا۔

پری شیخ صاحب کو اڑا کر لے جا چکی تھی۔

یہ تھا وہ واقعہ جس کو خبر بنا کر "دی نیوز" میں شائع کیا گیا تھا، بات واقعی حیرت انگیز تھی۔ لیکن تھی سچی۔ لوگوں کو یقین نہیں آ رہا تھا تو اس میں لوگوں کا قصور نہیں تھا۔ قصور اس واقعے کا تھا۔ جو کہ اس بیسویں صدی میں پیش آیا تھا۔

دن خاصا چڑھ گیا تھا۔ ہر طرف اس خبر کا چرچا تھا۔

"ارے تم نے سنا۔"

"ہاں یار بڑی عجیب بات ہے، شیخ صاحب کو پری اڑا لے گئی۔"

"کیا اب تک پریوں کا وجود ہے۔"

"اس واقعے سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ پریاں ابھی موجود ہیں۔ ذرا تم سنبھل کر سونا کہیں تمہیں نہ اڑا لے جائیں۔"

"یار مجھے لے جائیں تو مزہ آ جائے، وہ کم بخت عاشق ہوئی تو ایک نمازی پرہیزگار پر، جو بوڑھا بھی تھا، ارے ہم جیسے کڑیل جوانوں کو لے جاتی تو......"

"ہاں یہ تو ہے.....مگر وہ شیخ صاحب کو لے کہاں گئی ہوگی۔"

"کوہ قاف اور کہاں؟"

"اب عیش کر رہے ہوں گے۔ عیش۔"

ایک خوب صورت محل کے سجے سجائے کمرے میں ریشم جیسے ملائم گدگدے بستر پر وہ آنکھیں موندے پڑے تھے۔ کمرے میں ان کے علاوہ کوئی اور نہ تھا، لیکن اس کے باوجود وقفے وقفے سے ان کی داڑھی کے ریشمیں بال اڑنے لگتے جیسے کوئی پاس ہی بیٹھا بہت آہستہ آہستہ پنکھا جھل رہا ہو۔

شیخ صاحب صبح سے ہی بے ہوش پڑے تھے۔ پری نے راستے ہی میں ان کو بے ہوشی کی دوا سنگھا دی تھی، جوں جوں وقت گزرتا جاتا تھا، دوا کا اثر کم ہو رہا تھا اور اب وہ کچھ منٹوں کے بعد ہوش میں آنے والے ہی تھے۔ کمرے کی پوری فضا معطر تھی، اس کے ساتھ ہی خوشگوار اندھیرا ابھی پھیلا ہوا تھا۔

اچانک شیخ صاحب کے جسم میں حرکت ہوئی، ان کا

ہاتھ پہلو سے اٹھ کر سینے پر چلا گیا۔ ہونٹ کھلے آواز نکلی۔

"یا اللہ"

آنکھیں بند ہی رہیں پھر پپوٹوں کو حرکت ہوئی، شیخ صاحب نے سیدھے ہاتھ کی طرف گردن موڑ کر تکیے کو دیکھا، وہاں جانماز کے بجائے کشمشی رنگ کی مخمل دکھائی دی۔

اللہ کے نیک بندے کا دل گھبرایا اور انہیں خود بخود کسی خطرے کا احساس ہوگیا، وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھنے لگے۔

"یا اللہ...... یہ کیا ماجرا ہے؟" دل نے سوال کیا۔

تب ہی کمرے میں ایک باریک سی مترنم ہنسی گونجی۔

"کون؟" شیخ صاحب نے پرچھائیں سے پوچھا۔

جواب میں وہی باریک مترنم ہنسی۔

شیخ صاحب نے دل ہی دل میں کئی آیتیں پڑھ کر اپنے اوپر دم کرلیں تب انہوں نے اطمینان قلب محسوس کیا۔ چہرے پر بھی کسی قدر سکون کے آثار نظر آنے لگے۔

"تو کون ہے بول۔"

پھر وہی باریک مترنم ہنسی۔

"تو کون ہے بتا...... اور اپنے آپ کو ظاہر کر...... مجھے تو کوئی خبیث روح معلوم ہوتی ہے۔ بتا یہ کون سا مقام ہے...... تو مجھے کہاں لے آئی ہے...... اور تیری غرض کیا ہے؟"

کمرے میں کچھ پرچھائیاں سی لہرائیں اور پھر ایک رس بھری آواز سنائی دی۔

"شیخ صاحب آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"پریشان وہ ہوتے ہیں جنہیں خدا پر بھروسا نہیں ہوتا۔" شیخ صاحب نے بات کاٹی۔

"خیر...... میں جو کوئی بھی ہوں...... اپنے آپ کو مناسب وقت پر ظاہر کروں گی...... فی الحال آپ اطمینان سے لیٹیں...... جس چیز کی خواہش ہو حکم کریں...... حکم کی فوراً تعمیل کی جائے گی۔"

"تم مجھ سے کیا چاہتی ہو۔"

"فی الحال کچھ نہیں...... ابھی آپ نہا دھو لیجئے...... ناشتہ کرکے آرام فرمایئے...... پھر اطمینان سے باتیں ہوں گی۔"

پھر نہ جانے کیوں امام صاحب کو اطمینان سا ہوگیا...... انہیں محسوس ہوا جیسے اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔

"آیئے۔" آواز آئی۔

اور وہ آواز کے ساتھ ہی اٹھ گئے۔

جب وہ نہا دھو کر واپس آئے تو انہوں نے مسہری پر ایک بہترین جوڑا رکھا دیکھا، انہوں نے اس طرف کوئی دھیان نہیں دیا اور کہنیاں تکیے سے ٹیک کر لیٹ سے گئے۔

"کپڑے بدل لیجئے۔" وہی آواز آئی۔

"نہیں...... شکریہ...... میرے اپنے ہی کپڑے ٹھیک ہیں۔" شیخ صاحب نے اتنے اعتماد سے کہا کہ آواز اصرار نہ کرسکی۔ جوڑا فوراً غائب ہوگیا۔ مسہری کے قریب ایک چھوٹی سی گول میز آ ٹکی۔ اس پر ناشتہ چنا ہوا تھا۔

شیخ صاحب نے ناشتے کو غور سے دیکھا، مگر وہاں انہیں اپنے مطلب کی کوئی چیز نظر نہ آئی۔

"ہچکچاہٹ کیوں؟"

"اپنے اس ناشتے کو ہٹالو...... مجھے صرف دال روٹی چاہئے۔"

ناشتہ ہٹ گیا اور اس کی جگہ دال روٹی آ گئی، ناشتے کے بعد شیخ صاحب کو حقے کی طلب ہوئی...... ابھی وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ چونک پڑے...... سامنے تازہ بھرا ہوا حقہ رکھا تھا۔ حقہ گڑگڑانے کے بعد ان پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ اور وہ اپنا ہاتھ سر کے نیچے اور ایک ہاتھ گھٹنے پر رکھے رکھے سوگئے۔ دوپہر کو آنکھ کھلی ظہر کا وقت ہوچکا تھا، وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ وضو کیا، نماز پڑھنے کے لئے کسی مناسب جگہ کی تلاش میں تھے کہ ایک کونے میں چوکی اور چوکی پر جائے نماز رکھی

نظر آئی، نماز پڑھی، نماز پڑھنے کے بعد انہوں نے ایک عجیب طرح کا سکون محسوس کیا، ایسا سکون جو کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔

نماز پڑھ کر وہ کمرے یں ٹہلنے لگے۔ تب ہی کمرے کا دروازہ کھلا اس دروازے میں سے انہیں پھلوں سے لدا ہوا ایک خوب صورت باغ نظر آیا، وہ اس باغ کی طرف لپکے۔ تھوڑی ہی دیر ٹہلے ہوں گے کہ ان پر غنودگی طاری ہونے لگی اور وہ وہیں گدگدے فرش پر لیٹ گئے۔ لیٹتے ہی سو گئے۔ مغرب کے وقت آنکھ کھلی نماز پڑھنے کے بعد کھانا ملا۔ حقہ پیا اور پھر سوچنے لگے کہ آج مجھے اتنی نیند کیوں آ رہی ہے اور یہ سوچتے ہی سوچتے ان کی آنکھوں پر خواب کے دبیز پردے پڑ گئے۔

عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد وہ بیٹھے ہی تھے کہ کمرے میں تیز روشنی پھیل گئی۔ یہ روشنی کہاں سے آ رہی تھی اور کیسی تھی، انہیں کچھ معلوم نہ تھا۔ پھر آہستہ آہستہ روشنی کم ہونے لگی۔ روشنی کے کم ہونے کے ساتھ ساتھ شیخ صاحب کی آنکھیں کھلنے لگیں، اس وقت کمرے میں بڑی مدھم روشنی تھی جیسے چھ سات شمعیں جل رہی ہوں۔

پھر کمرے کا ایک دروازہ کھلا اور اس میں رنگین لباس لہرایا۔ شیخ صاحب کی آنکھیں ذرا اور کھل گئیں۔

کمرے میں داخل ہونے والی ایک نوجوان رسیلی لڑکی تھی جس کے باریک لباس سے اس کا جسم پھٹا پڑا تھا۔ شیخ صاحب نے اسے دیکھتے ہی لاحول کا ایک زوردار نعرہ لگایا۔

وہ بڑے کافرانہ انداز میں مسکرئی اور رقص کے انداز میں ہاتھ اٹھا کر ہوش رُبا انگڑائی لی۔ شیخ صاحب تاب نہ لا سکے انہوں نے منہ پھیرلیا اور جلدی جلدی آیتیں پڑھنے لگے۔

''اوہ آپ نے تو منہ پھیرلیا...... آپ نے تو مجھے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی...... لیجئے اب میں نے خود کو ظاہر کر دیا ہے...... مجھے جی بھر کر دیکھیے...... میرا نام گل بانو ہے...... میں ایک پری ہوں اور آپ کی کنیز...... اس وقت آپ میرے محل میں ہیں۔ یہ محل کوہ قاف کی سب سے بلند چوٹی پر آباد ہے، میرا خیال ہے کہ میں نے صبح پوچھے جانے والے ہر سوال کا جواب دے دیا ہے۔''

''تم ایک غیر مرد کے سامنے اتنے باریک لباس میں کھڑی ہو...... تمہیں شرم نہیں آتی۔''

جواب میں مترنم ہنسی گونجی۔

''اور اوپر سے ہنستی ہے...... بے حیا کہیں کی۔''

''شیخ صاحب...... ناراض نہ ہوں میری طرف دیکھئے...... میں نے لباس بدل لیا ہے۔''

شیخ صاحب نے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور فوراً ہی استغفار پڑھتے ہوئے اپنا منہ چھپالیا۔

گل بانو بالکل ننگی کھڑی تھی۔

پھر وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی مسہری کے پاس آ کھڑی ہوئی اور اپنا ہاتھ شیخ صاحب کے سر کے سفید بالوں پر پھیرا۔

''اپنے ناپاک ہاتھوں کو دور رکھو۔'' شیخ صاحب منہ چھپاتے ہوئے بولے۔

''اوہ آپ تو ناراض ہو گئے...... میں نے یونہی مذاق کیا تھا...... اب میری طرف دیکھئے...... میں نے کتنی موٹی چادر لپیٹ رکھی ہے، دیکھئے، دیکھئے ناں۔''

''او...... خبیث عورت اپنی غرض بتا۔''

''شیخ صاحب...... آپ میں ذرا بھی حس نہیں مجھ جیسی نرم و نازک لڑکی کو خبیث کہتے ہیں...... اٹھئے ذرا میری طرف تو دیکھئے۔''

شیخ صاحب نے اپنا سر ہاتھوں سے نکالا، وہ واقعی ایک موٹی چادر اوڑھے کھڑی تھی۔ جس سے اس کا پورا جسم ڈھکا ہوا تھا۔ صرف چہرہ دکھائی دے رہا تھا، وہ مسکرائی۔

''بول۔'' اُن کی آنکھوں میں سرخی گھلنے لگی۔

''اُٹھ کر میرے پاس تو آیئے۔''

وہ تیزی سے اُٹھے۔

''بول تیری غرض کیا ہے۔''

گل بانو مسکرائی۔ اپنے ہونٹوں کو سکیڑ کر دائرہ بنایا

اور بڑے پیار بھرے انداز میں بولی۔
''انہیں چوم لیجئے۔''
شیخ صاحب سر سے پاؤں تک لرز گئے......
آنکھوں میں خون اُتر آیا، اُن کا خود خود بہ خود اٹھا، ہوا میں لہرایا اور اتنی زور سے گل بانو کے گالوں پر پڑا کہ وہ الٹ گئی۔
گل بانو چوٹ کھا کر مسکرائی، اس کے گالوں پر خون کی پانچ لکیریں برابر برابر بہہ رہی تھیں۔
''شیخ صاحب......کل سے آپ کا کھانا بند، اس وقت تک کے لئے جب تک آپ میری یہ معمولی سی خواہش پوری نہ کریں گے۔''
''لعنت ہے تجھ پر اور تیری معمولی سی خواہش پر، دور ہو جا میری نظروں سے۔'' شیخ صاحب کڑکے۔
اور پھر واقعی اگلے دن سے نہ صرف اس نے کھانا پینا بند کر دیا بلکہ حقہ بھی بند کر دیا۔ دو دن شیخ صاحب نے بخیر و خوبی کاٹ دیئے تیسرے دن سے ان کی حالت غیر ہونے لگی۔ کھانے کی بات ہو تو آدمی کسی حد تک برداشت کرے لیکن پیاس کس طرح کوئی برداشت کرلے اور پھر اوپر سے حقے کی طلب۔
جب چوتھا دن لگا تو شیخ صاحب نے محسوس کیا کہ اب وہ زیادہ دن زندہ نہ رہ سکیں گے۔ پیٹ پیٹھ سے جا لگا تھا، رنگ زرد ہو چکا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ ان کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔ بھرا بھرا چہرہ سوکھ گیا تھا۔ ہونٹوں پر پپڑیوں کی تہہ جمی تھی۔
وہ بے جان سے مسہری پر پڑے تھے۔ ان چار دنوں میں گل بانو کئی بار اُن کے پاس آئی تھی لیکن انہوں نے ہر بار اس پر لعنت بھیج کر اسے مایوس لوٹا دیا تھا۔
وہ اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ اپنا ہاتھ پہلو سے اٹھا کر سینے پر نہ رکھ سکتے تھے۔ آنتیں کھانے کے لئے فریاد کر رہی تھیں اور ہونٹ پانی کے لئے ترس رہے تھے۔
لیکن وہاں کھانا تھا نہ پانی...... ہاں ان کے سامنے گل بانو ضرور کھڑی تھی جو آہستہ آہستہ سرہانے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ شیخ صاحب نے آہٹ سن کر بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں۔ گل بانو مسکرا رہی تھی۔
شیخ صاحب اس کی طرف دیکھتے رہے۔ پتا نہیں کس عالم میں۔ گل بانو آہستہ آہستہ ان پر جھکنے لگی۔ اُس کے ہونٹ ان کے پپڑی جمے ہونٹوں کے بالکل قریب آ گئے تو شیخ صاحب نے اپنا ہاتھ اٹھا کر اسے ہٹانے کی ناکام کوشش کی لیکن ہاتھ کو جنبش نہ ہو سکی۔
''مجھے روٹی دو۔'' ہونٹ ہلے اور ایسا لگا جیسے آواز کہیں بہت دور سے آئی ہو۔
''روٹی ملے گی......لیکن پہلے ہمارا کام۔'' گل بانو مسکرائی۔ اور اپنے ہونٹوں کو پپڑی جمے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ شیخ صاحب کو مجبوراً اس کے ہونٹوں کو بوسہ دینا پڑا۔
اور تب ہی گرجدار قہقہہ سنائی دیا۔ اس قہقہے کی آواز سے پورا محل لرز گیا۔ شیخ صاحب کے سامنے گل بانو کے بجائے ایک خبیث صورت آدمی کھڑا تھا۔ گل بانو پتا نہیں کہاں غائب ہو گئی تھی۔
''تم کون ہو۔'' شیخ صاحب نے نحیف آواز میں کہا۔
''میں......شیطان الشیاطین۔''
''کون ابلیس؟''
''ہاں......میں ابلیس ہوں۔''
''لاحول ولا قوۃ۔''
''میرا تجربہ کامیاب ہوا۔'' ابلیس نے زوردار قہقہہ لگایا اور غائب ہو گیا۔ شیخ صاحب بے ہوشی میں ڈوب گئے۔
رانی پور سے دس میل دور مشرق کی طرف آج بھی یہ محل جوں کا توں کھڑا ہے۔ جس میں شیطان نے اپنا تجربہ کیا تھا اس کے اندر ہر چیز ویسے ہی رکھی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی ابھی اس محل کو چھوڑ کر گیا ہو لوگ اسے ''شیطان محل'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ کیا آپ رانی پور گئے ہیں۔
کیا آپ نے رانی پور میں شیطان محل دیکھا ہے؟





عجیب مخلوق

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

طوفان لحظہ بہ لحظہ شدت اختیار کرتا جا رہا تھا، ایسا لگتا تھا کہ آج ہی پوری دنیا نیست و نابود ہو جائے گی ایسے میں کسی کا بچ جانا کسی صورت بھی ممکن نہیں تھا کہ پھر اچانک وہ کچھ ہو گیا جس کا تصور نہ تھا۔

دوسری دنیا سے آنے والی مخلوق کا عجیب و غریب شاخسانہ آنے والے زمانوں کا قصہ

جوھالا کا خلائی جہاز اچانک ایک تیز طوفان کی لپیٹ میں آ گیا، اسے اتنی بھی مہلت نہیں ملی کہ جہاز کا رخ کسی اور جانب موڑ لیتا، اس کے خلائی جہاز کی باڈی دنیا کی مضبوط ترین دھات سے بنائی گئی تھی۔ لیکن ونڈ شیلڈ پر برابر طوفان کا دباؤ پڑ رہا تھا۔ جس سے چنگاریاں بھی نکلتی دکھائی دی تھیں۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ بعض سرکٹ فیوز ہو گئے تھے۔ کنٹرول بورڈ پر خطرے کی سرخ بتی جل اٹھی تھی۔

جوھالا نے آٹومیٹک کنٹرول منقطع کر دیا۔ اور جہاز کو کورس کی شکل میں داہنی جانب موڑ دیا۔ طوفان کی آمد سے تھوڑی دیر پہلے اس نے ایک نئے نظام شمسی کا سروے مکمل کیا تھا۔ اس نظام کے ایک سیارے نے خاص طور پر اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ اس سیارے پر اس کی اپنی نسل سے ملتی جلتی مخلوق آباد تھی۔ وہ پہنچ

مکانوں میں سکونت رکھتی تھی اور بظاہر مہذب معلوم ہوتی تھی۔ سیارے کے گرد گردش کرتے ہوئے اس نے بعض گنجان آباد علاقے بھی دیکھے تھے۔

طوفان لحظہ بہ لحظہ شدت اختیار کرتا جارہا تھا۔ پس اس نے وقتی طور پر قریبی سیارے پر اترنے کا فیصلہ کرلیا اور کوئی سنسان جگہ تلاش کرنے لگا اس نے اپنے اس فیصلے سے خلائی مرکز کو بھی آگاہ کردیا۔ جس کی فوراً ہی اجازت مل گئی۔ تاہم خلائی مرکز نے اسے خبردار کرتے ہوئے کہا "اس سیارے پر بسنے والی مخلوق کے بارے میں کوئی بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی۔ یہ مخلوق ہمیں دیکھ کر سخت خوف زدہ ہوجاتی ہے عام طور پر بھاگ جاتی ہے لیکن کبھی کبھی حملہ بھی کردیتی ہے۔ اس مخلوق کے بارے میں ہمیں بہت کم معلومات حاصل ہوسکی ہیں اس لئے تمہیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اپنے خلائی جہاز کو آبادی سے دور کسی ویران مقام پر اتارنا۔"

جوبالا نے اپنی نہایت طاقتور دوربین سے سیارے کی سطح کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "میں کسی غیر آباد جزیرے کی تلاش میں ہوں۔"

"بہت خوب غیر آباد جزیرہ مناسب رہے گا۔" خلائی مرکز سے جواب ملا۔

چند لمحوں کے بعد جوبالا نے وسیع سمندر کے درمیان ایک چھوٹا سا جزیرہ دیکھا۔ دور سے وہ ایک دھبہ معلوم ہوتا تھا۔ جوبالا نے خلائی جہاز کا رخ اس جزیرے کی طرف موڑ دیا۔ جزیرے پر سرسبز درختوں کا جھنڈ نظر آرہا تھا۔

وہاں آبی پرندوں کے سوا کسی مخلوق کے آثار نہیں تھے جوبالا نے ایک چھوٹی سی پہاڑی کے دامن میں ایک صاف جگہ پر جہاز اتار دیا۔ جہاز کے پیندے سے نکلنے والی گیس نے آس پاس کے درختوں کو لمحہ میں جلا کر خاک کردیا۔ جہاز کے خودکار پائے کئی کئی فٹ تک زمین میں دھنس گئے اور جوبالا نے بڑی شدت کا جھٹکا محسوس کیا وقتی طور پر اس کا جسم مفلوج ہوکر رہ گیا۔

چند لمحوں تک وہ بے حس و حرکت اپنی جگہ پر بیٹھا زائل شدہ قوت بحال کرتا رہا۔ پھر وہ حفاظتی بیلٹ کی پٹیاں کھولنے لگا۔ طویل سفر کی وجہ سے اس کے پنجے اور جوڑ بری طرح درد کررہے تھے اس نے اپنے استخوانی جسم پر چڑھے ہوئے حفاظتی خول کو درست کیا اور پچھلے پنجوں پر کھڑے ہوکر ایک طویل انگڑائی لی پھر وہ خلائی جہاز کا دروازہ کھول کر باہر آگیا اور آنکھیں جھپکاتا ہوا ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

سورج غروب ہونے کو تھا اور ویران جزیرے پر شام کا دھندلکا پھیلا ہوا تھا فضا سمندر کی لہروں اور آبی پرندوں کے شور سے معمور تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے عجیب و غریب سائے رقص کررہے تھے۔ اس نے اس قطع زمین اور سرسبز درختوں کا معائنہ کیا۔ شام کے دھندلکے میں درخت تاریک سایوں کی مانند استادہ تھے۔ لیکن کسی ذی روح کے آثار نہیں تھے۔ کچھ دیر ٹہلنے کے بعد وہ واپس خلائی جہاز میں واپس آگیا اور اپنے کیبن میں سوگیا۔

اگلی صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو موسم خاصا خوشگوار تھا۔ گزشتہ رات پراسرار تاریک دکھائی دینے والا جزیرہ اب خاصا پرکشش نظر آرہا تھا۔ سرسبز درختوں سے پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں آرہی تھیں پس منظر میں لہروں کا دبا دبا سا شور بلند ہورہا تھا۔ سمندر کی طرف سے آنے والی ہوا ٹھنڈی اور خوشگوار تھی۔ جوبالا اس اجنبی سرزمین پر قدم رکھتے ہوئے خاص سنسنی محسوس کررہا تھا۔ اس نے سوچا کہ یہ جگہ اس کی دنیا سے حالانکہ مختلف ہے مگر کتنی مانوس سی لگتی ہے اس کائنات کے اجزائے ترکیبی میں کتنی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ ہر مقام پر زندگی اور زندہ رہنے کی لگن پائی جاتی ہے ہرچند وہ وہاں کی مخلوق کے معاشی اور تمدنی حالات سے قطعی بے خبر تھا۔

تاہم اس نے اپنے خلائی جہاز کے اردگرد جھاڑ جھنکاڑ کی باڑ کھڑی کردی۔ تاکہ کوئی اسے نقصان نہ پہنچاسکے۔ یہ ایک مانی ہوئی حقیقت تھی کہ بیشتر

سیاروں پر بسنے والی مخلوق مشینی اور سائنسی دور میں داخل ہوچکی تھی۔ اس کام سے فارغ ہوکر جوہالا نے اپنے سیارے کے خلائی مرکز سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ پھر اس نے موسم کا جائزہ لیا۔

دور مغرب کی طرف سے گھنے بادلوں کے پرے نمودار ہورہے تھے۔ جن میں گڑگڑاہٹ کے ساتھ ساتھ برقی کوندے بھی لپک رہے تھے۔ یہ گھنے اور سیاہ بادل تیزی سے فضاء پر محیط ہوتے جارہے تھے، جوہالا کے لئے یہ ایک نیا تجربہ تھا اس کے سیارے کی فضا میں دن کو رات میں تبدیل کردینے والے بادل کبھی نہیں دیکھے گئے تھے۔ موجودہ صورتحال کے پیش نظر سفر کا کوئی امکان نہیں تھا۔ یوں بھی گرجتے چمکتے بادلوں کی آمد اس کے لئے ہنگامہ خیز تھی۔ وہ حیرت واشتیاق سے ان کا نظارہ کررہا تھا۔ بلکہ سوچ رہا تھا کہ کاش اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہوتا۔ جس کے ہمراہ وہ اس منظر فطرت کا نظارہ زیادہ شوق کے ساتھ کرتا۔ جس سیارے سے وہ آیا تھا وہاں اکیلا پن سب سے اذیت ناک چیز تھی۔ تاہم ان میں سے بعض کے لئے کائنات کی وسعتوں میں پھیلے ہوئے سیاروں کی تحقیق وتفتیش کے لئے تنہائی کی اذیتوں سے گزرنا ناگزیر تھا۔

چند گھنٹوں کے اندر اندر سیاہ بادلوں نے پوری فضاء کو اپنے پروں تلے چھپالیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ یہ منظر جوہالا کے لئے پہلے سے بھی زیادہ ولولہ انگیز تھا۔ وہ بارش کے قطروں کو اپنے جسم پر محسوس کرتا اور خوشی سے جھوم اٹھتا۔ شام سے پہلے بارش ختم ہوگئی اور مطلع صاف ہوگیا۔ مست ہاتھیوں کی طرح جھوم کر آنے والے بادل فضائے بسیط کی وسعتوں میں کہیں گم ہوگئے تھے، جزیرے کا مختصر سا جنگل نکھر گیا تھا۔ سورج کی رخصت ہوتی ہوئی کرنیں سرسبز جنگل کے خوبصورت رنگوں کو مزید نمایاں کررہی تھیں جوہالا اپنے دل میں عجیب سی ترنگ محسوس کررہا تھا۔ وہ بے اختیار جزیرے کے خاموش جنگل کی طرف چل پڑا۔ بارش کی وجہ سے دھلے ہوئے رنگ برنگے پرندے دوبارہ شاخوں پر جھولتے نظر آرہے تھے۔

کچھ دور جانے کے بعد جوہالا یکایک رک گیا اور منہ اٹھا کر فضا کو سونگھا، قرب وجوار میں کہیں لکڑی جلائی جارہی تھی۔ لمحہ بھر کے بعد اس نے درختوں کے ایک جھنڈ سے پرے دھواں اٹھتا دیکھا۔ وہ جھاڑیوں اور شاخوں سے بچتا بچاتا دھوئیں کی سمت چل پڑا اور بالآخر اس مقام کے قریب پہنچ گیا جہاں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ جنگل کی حدود ختم ہوتے ہی ایک چھوٹی ٹیکری تھی جس کے دامن میں لکڑیوں کا الاؤ جل رہا تھا۔ الاؤ کی داہنی جانب گھاس پھونس کا ایک گھونسلا بنا ہوا تھا اور الاؤ کے سامنے ایک درندہ دبکا بیٹھا تھا وہ انتہائی خوف زدہ اور سہما نظر آرہا تھا اس کے پہلو میں ایک چمکدار سیاہ تالی رکھی تھی۔

جوہالا کو خلائی جہاز کی یہ ہدایت یاد آئی کہ کسی دوسرے سیارے کی مخلوق کے قریب جانے کی حماقت نہ کرے یہ اقدام اس کی سلامتی اور آزادی کے لئے خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ آواز سنتے ہی الاؤ کے سامنے بیٹھا ہوا درندہ بری طرح اچھل پڑا اور اس کا ہاتھ بے اختیار سیاہ تالی پر جا پڑا۔

وہ درندہ جس کو کہ آرسین کہا گیا اس کو اس جزیرے میں پناہ لئے ہوئے پندرہ گھنٹے ہوچکے تھے۔ گزشتہ رات اس کی موٹر لانچ طوفان کی زد میں آگئی تھی۔ انجن خراب ہوگیا تھا اور تیز ہواؤں نے اسے اس جزیرے پر لا پھینکا تھا۔ یہ بھی اس کی خوش قسمتی ہی تھی۔ ورنہ اس طوفانی سمندر اور سیاہ رات میں وہ اپنی زندگی سے قطعی مایوس ہوچکا تھا۔ اس کی لانچ خود بخود ہی جزیرے کے ساحل پر پہنچ گئی تھی۔ رات کا بیشتر حصہ اس نے لانچ پر ہی گزارا تھا۔ اس کے پاس دو تین دن تک کا خشک راشن موجود تھا۔ اس کے علاوہ جزیرے پر جنگلی پھلوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ لہٰذا وہ حالات سازگار ہونے تک بآسانی وہاں وقت گزار سکتا تھا۔

دن کا اجالا پھیلنے کے بعد اس نے ایک چھوٹی سی پہاڑی کے دامن میں درختوں کی شاخوں سے ایک جھونپڑا

تعمیر کرلیا۔ مغرب کی طرف سے گھنے بادلوں کی آمد اس بات کا پتہ دے رہی تھی کہ خوب زوروں کی بارش ہوگی۔

ان حفاظتی انتظامات سے فارغ ہونے کے بعد اس نے لانچ سے ضروری سامان جھونپڑے میں منتقل کرلیا۔ خشک لکڑیاں اکٹھی کرکے الاؤ روشن کیا اور پھر چند پرندوں کا شکار کرکے انہیں الاؤ پر بھوننے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ناشتے کے بعد وہ پورے جزیرے کا سروے کرے گا تاکہ یہ معلوم کرے کہ وہاں کوئی وحشی مخلوق تو آباد نہیں۔ مگر بادل اس کے اندازے سے پہلے ہی سر پر پہنچ گئے اور موسلادھار بارش شروع ہوگئی، پانچ بجے کے قریب بادل جتنی تیزی سے نمودار ہوئے تھے اتنی ہی تیزی سے غائب ہوگئے مطلع بالکل صاف ہوگیا اور جزیرے کا ماحول سورج کی الوداعی کرنوں سے منور ہوگیا۔

آرسین نے دوبارہ الاؤ روشن کیا اور اس کے سامنے بیٹھ کر جزیرے سے نکلنے کی تدبیر سوچنے لگا شام ہونے کو تھی اور ماحول پراسرار سناٹے میں لپٹا ہوا تھا دفعتاً اسی خاموشی میں اسے پتوں کی سرسراہٹ سنائی دی وہ تیزی سے پیچھے مڑا اس کا ہاتھ بے اختیار قریب رکھی ہوئی بندوق پر جاپڑا، عقب میں درختوں کے قریب جو چیز اس نے دیکھی وہ اس کے دل پر سکتہ طاری کرنے کے لئے کافی تھی۔

وہ ایک حیرت انگیز مخلوق تھی جس کی مثل اس نے نہ پہلے کبھی دیکھی تھی اور نہ آئندہ دیکھنے کا امکان تھا۔ اس کی جسمانی وضع قطع کسی عظیم الجثہ ٹڈے کی مانند تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی اور باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ آنکھوں کے اوپر دو لمبے لمبے فیلر نظر آرہے تھے۔ جن کی لمبائی آرسین کے اندازے کے مطابق تین فٹ سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ وہ پچھلے پیروں پر کسی انسان کی مانند کھڑا تھا۔ اس کا قد بلاشبہ سات آٹھ فٹ کے قریب تھا۔ کندھوں کے قریب چار پنجے تھے۔ جو انسانی ہاتھوں کی مانند نظر آتے تھے، اس کا جسم نہایت مضبوط اور لوہے کا بنا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

آرسین نے اپنے خوف پر قابو پانے کی کوشش کی اور بندوق اٹھا کر یکے بعد دیگرے دو فائر جھونک مارے لیکن اس عظیم الجثہ ٹڈے نے اپنے پر کھولے اور کسی ہلکے پھلکے پرندے کی مانند فضا میں بلند ہوگیا۔

جوبالا نے فضاء میں ایک چکر لگایا اور گردن لمبی کرکے نیچے دیکھنے لگا۔ وہ درندہ ہاتھ میں سیاہ نالی پکڑے ادھر ادھر دوڑ رہا تھا۔ اس کی حرکات وسکنات سے دہشت کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ ہلکے پھلکے جسم کا جاندار تھا۔ تنہا اور سہما سہما اس کا جسم نرم ونازک اور پیلے رنگ کا تھا جوبالا نے دیکھا کہ وہ بار بار اوپر دیکھتا اور سر جھٹکتا تھا جوبالا کافی دیر تک فضاء میں چکر لگاتا رہا اور وہ جاندار درختوں کے درمیان دوڑتا رہا۔

کچھ دیر بعد سورج غروب ہوگیا اور جزیرے کی فضا پر شام کا دھندلکا پھیل گیا۔ جوبالا اس جاندار کی حرکات وسکنات کا جائزہ لینے کے لئے معلق فضاء میں چکر لگاتا رہا۔ اس کی تیز نظریں درختوں کے نیچے پھیلے ہوئے اندھیرے میں بھی دیکھ سکتی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ بالآخر وہ جاندار تھک گیا اور ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کے انداز سے بے چارگی اور مایوسی ٹپکتی تھی۔ وہ اس کائنات کی کمزور ترین ہستی معلوم ہوتا تھا۔

تاریکی گہری ہوتی جارہی تھی۔ جوبالا نے اپنا رخ خلائی جہاز کی طرف کرلیا اور پہاڑی کی دوسری جانب پہنچ کر زمین پر اتر گیا۔ پھر وہ باوقار انداز میں اپنے جہاز کی طرف روانہ ہوگیا اسے اپنی اس حرکت پر کچھ افسوس سا ہو رہا تھا وہ جاندار اس کے لئے کسی خطرے کا باعث نہیں تھا وہ جسمانی اعتبار سے اس سے زیادہ مضبوط اور قد آور تھا۔ اسے بہادری کے ساتھ اس کا سامنا کرنا چاہئے تھا۔ ہوسکتا تھا کہ دونوں کے درمیان مفاہمت کی کوئی صورت پیدا ہوجاتی لیکن اس کے خیالات اس کے خیالات سے پہلے حرکت میں آگئے تھے۔

اگلی صبح مطلع صاف تھا چاروں طرف چمکدار دھوپ نکلی ہوئی تھی جوبالا ایک بار پھر جزیرے کے اس

حصے کی طرف جارہا تھا۔ جہاں اس نے گزشتہ رات ایک جاندار کو دیکھا تھا۔ وہ درختوں کے نیچے اگی ہوئی جھاڑیوں سے بچتا بچاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ خشک پتے اس کے پیروں کے نیچے چرمرا رہے تھے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں چاروں طرف کا جائزہ لیتی جارہی تھیں۔ اس کے سر پر نکلے ہوئے فیلرآنکھوں کے ساتھ ساتھ حرکت کررہے تھے۔

ابھی وہ کافی دور ہی تھا کہ اس نے پیلی رنگت والے درندے کو اچھل کر ایک درخت کے پیچھے دبکتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں وہی کل والی سیاہ نالی نظر آرہی تھی۔ جوبالا کسی ڈر کے بغیر آگے بڑھتا رہا۔

دفعتاً اس نے ایک زوردار دھماکے کی آواز کے ساتھ سیاہ نالی کے اندر سے شعلہ نکلتے دیکھا۔ پھر کوئی چیز سنسناتی ہوئی اس کے پہلو سے گزر گئی جوبالا رک گیا اس کے بڑے بڑے پر خودبخود کھل گئے۔

نالی کے اندر سے دوبارہ شعلہ برآمد ہوا۔ کوئی چیز اس کے کندھے کو چھوتی ہوئی گزر گئی اس کے ساتھ ہی اس نے کندھے پر درد کی ایک شدید ٹیس اٹھتی محسوس کی۔ گو وہ زخمی نہیں ہوا تھا تاہم درندے کی اس غیر متوقع حرکت پر دم بخود ہوگیا اور جلدی سے ایک موٹے تنے کی اوٹ میں ہوگیا اسے سخت غصہ آرہا تھا درندے کی سیاہ نالی بڑی تیزی کے ساتھ شعلے اگل رہی تھی۔

جوبالا نے اپنے پہلو کے ساتھ لگا ہوا ہتھیار اتار لیا۔ اور اس کا رخ ایک جھاڑی کی طرف کرکے بٹن دبا دیا۔ ہتھیار کے اندر سے ایک تیز شعاع برآمد ہوئی اور جھاڑی جل کر خاکستر ہوگئی اس نے دانستہ ہتھیار کا رخ اس عجیب وغریب درندے کی طرف نہیں کیا تھا وہ اسے یہ بتانا چاہتا تھا کہ اس کے پاس اس سے بھی زیادہ خطرناک ہتھیار ہیں اور وہ تمام رکاوٹوں کے باوجود اس کا خاتمہ کرسکتا ہے۔

درندہ خوف سے چیختا ہوا درختوں کے درمیان بھاگتا چلا گیا، جوبالا درخت کی اوٹ سے باہر نکل آیا اور اپنا سر جھٹکنے لگا وہ اس جاندار کو خوف زدہ کرنے کا ہرگز کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا لیکن اس کے غیر دوستانہ رویے کی وجہ سے اسے یہ قدم اٹھانا پڑا، اس حقیقت کے باوجود اس کا چہرہ افسوس کے باعث تاریک ہوگیا۔

وہ جاندار انتہائی خوف کے باعث اس کے دوستانہ خیالات کا اندازہ لگانے سے قاصر رہا تھا۔ اس کے خوف کا سبب غالباً یہ تھا کہ جوبالا کا جسمانی ڈھانچہ اس سے بہت مختلف تھا۔ جوبالا نے سوچا کہ خوف کی موجودگی میں ایک مخلوق دوسری مخلوق کے ساتھ ذہنی رابطہ استوار نہیں کرسکتی۔ خوف خیالات اور تاثرات کے اوپر پردہ ڈال دیتا ہے اس پردے کو ہٹانے اور اجنبی جاندار کے ذہن سے رابطہ قائم کرنے کا ایک ہی ذریعہ تھا۔ کہ اسکی خوشی اور غمی میں شریک ہوا جائے پس وہ تیز قدم اٹھاتا ہوا اس سمت چل پڑا جس میں اس نے جاندار کو جاتے دیکھا تھا۔

چند لمحوں کے بعد وہ ساحل کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا، اس کی تیز نظریں آس پاس کا جائزہ لیتی جارہی تھیں دونوں فیلر مستقل حرکت کررہے تھے کچھ دور جانے کے بعد اس نے ایک کشتی کنارے کے ساتھ لگی دیکھی وہ ایک مضبوط رسی کے ساتھ قریبی چٹان کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔

جوبالا کشتی کے قریب جاکر اس کے انجن اور باڈی کا معائنہ کرنے لگا چند لمحوں کے اندر وہ یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ انجن میں کچھ خرابی پائی جاتی ہے۔

یہ کشتی اس جاندار کی تھی اور غالباً انجن کی خرابی کے باعث ہی وہ اس جزیرے پر پناہ لینے پر مجبور ہوا تھا جوبالا انجن اور پنکھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچنے لگا کہ اس قسم کا قدیم انجن غالباً اس نے اپنے سیارے کے عجائب گھر میں دیکھا تھا کسی زمانے میں یہ چیز ان کے سیارے پر استعمال ہوتی تھی مگر اب آثار قدیمہ کا حصہ بن چکی تھی۔

☆......☆......☆

جب آرمین نے جھاڑی کو جل کر راکھ ہوتے دیکھا تو اس کی دونوں آنکھیں باہر کو ابل پڑیں اس نے مقابلے کا ارادہ ترک کردیا اور جان بچا کر بھاگ نکلا وہ

عظیم الجثہ اور کریہہ المنظر مخلوق بلاشبہ ماورائی قوتوں کی مالک تھی اس قسم کی مخلوق کا ذکر یا تو قدیم تاریخ کے اوراق میں ملتا تھا یا دہشت ناک فلموں میں، یہ بات حیرت انگیز تھی کہ اس نے اپنے آتشیں پستول کا رخ جھاڑی کی طرف کر کے فائر کیا تھا غالباً وہ اسے زندہ پکڑنا چاہتی تھی یہ بھی بعید از قیاس نہیں تھا کہ وہ کسی آدم خور ویمپائر کی نسل سے تعلق رکھتی ہو اور اسے زندہ چبانا چاہتی ہو وہ اپنی ٹانگوں کی پوری قوت سے دوڑ رہا تھا اور گاہے گاہے پیچھے مڑ کر بھی دیکھ لیتا تھا وہ بلا اب کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔

آرسین ایک لمبا چکر کاٹ کر پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گیا اور درختوں کے ایک جھنڈ میں چھپ کر ہانپنے لگا اس مقام سے وہ دور دور تک دیکھ سکتا تھا کچھ دیر بعد اس نے خوف ناک مخلوق کو موٹر لانچ کی طرف بڑھتے دیکھا وہ دم سادھے اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس مخلوق کو ہلاک کئے بغیر وہ زندگی کا تصور نہیں کر سکتا تاہم اس کام کے لئے بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔

کشتی کے انجن کا معائنہ کرنے کے بعد جوہالا سیدھا کھڑا ہو کر سوچنے لگا اس کے نقطہ نظر سے انجن میں بہت معمولی خرابی تھی اور وہ بڑی آسانی کے ساتھ اسے دور کر سکتا تھا یہ اجنبی جاندار کے ساتھ اظہار ہمدردی کا بہترین موقع تھا۔ وہ اپنے خلائی جہاز سے ٹول کٹ لے آیا اور انجن کی مرمت کرنے لگا چار ہاتھوں کی وجہ سے اس کے کام کی رفتار خاصی تیز تھی نصف گھنٹے کے اندر اس نے کام مکمل کر لیا اور انجن اسٹارٹ کر کے دیکھا۔

اسی لمحے اس نے ایک زوردار دھماکے کی آواز سنی۔ گولی کشتی کے کنارے پر لگی اور اس کی کرچیاں اڑ گئیں جوہالا کے پر خود بخود کھل گئے اور وہ فضا میں بلند ہو گیا اس نے دیکھا کہ اجنبی جاندار ایک قریبی جھاڑی کے پیچھے دبکا بیٹھا ہوا ہے اور اس نے اپنے ہاتھ میں وہی سیاہ نالی پکڑی ہوئی ہے۔

جوہالا نے شدید غصہ کے ساتھ اپنے پر پھڑپھڑائے اور آسمانی قہر کی مانند اجنبی پر جھپٹا آخر الذکر اس ناگہانی حملے کے باعث اجنبی بری طرح بدحواس ہو گیا اور چند قدم دوڑنے کے بعد زمین پر گر گیا۔

جوہالا دونوں ٹانگیں پھیلا کر اس کے اوپر کھڑا ہو گیا اجنبی بری طرح ہانپ رہا تھا اور دہشت زدہ نظروں سے جوہالا کی طرف دیکھ رہا تھا اس کے منہ سے خوف میں ڈوبی ہوئی چیخیں نکل رہی تھیں جوہالا نے اس کے ہاتھ سے سیاہ نالی جھپٹ لی اور اس کے چار ٹکڑے کر کے فضا میں اچھال دیا پھر وہ زمین پر بیٹھ گیا اور ہولے ہولے اجنبی کی پشت اور سر پر ہاتھ پھیرنے لگا انداز ایسا ہی تھا جیسے کوئی جنگلی خرگوش کو رام کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

آرسین ہولے ہولے اٹھ کر بیٹھ گیا اور غیر یقینی نظروں سے جوہالا کی طرف دیکھنے لگا گو فوری دہشت کا اثر کم ہو گیا تھا مگر اس کی آنکھیں بوجہ خوف اپنے حلقوں سے باہر نکلی جا رہی تھیں اس کے چہرے سے نفرت کراہت کا اظہار ہو رہا تھا۔

جوہالا نے اپنے پنجے سے کشتی کی طرف اشارہ کیا آرسین اس اشارے کا کوئی مطلب نہ سمجھ سکا تاہم وہ ہولے ہولے پیچھے ہٹنے لگا جوہالا نے کوئی تعرض نہیں کیا اس بات سے حوصلہ پا کر آرسین بدستور پیچھے ہٹتا چلا گیا آخر وہ کھڑا ہو گیا اور بے تحاشہ کشتی کی طرف بھاگتا چلا گیا۔

کشتی میں اس کی دوسری رائفل موجود تھی جو سابقہ گن کے مقابلے میں زیادہ طاقتور تھی اور یقیناً اس کا بہتر دفاع کر سکتی تھی لیکن جب وہ کشتی کے اندر داخل ہوا تو یہ دیکھ کر دم بخود رہ گیا کہ انجن اسٹارٹ تھا اس نے رائفل کا خیال ترک کر دیا اور جلدی سے رسی کھول کر کشتی کو پوری رفتار کے ساتھ آگے بڑھا دیا۔

آرسین سوچ رہا تھا کہ انجن کا خود بخود اسٹارٹ ہونا بلاشبہ ایک معجزہ تھا حالانکہ اس سے پہلے اس نے کبھی معجزات پر یقین نہیں کیا تھا شاید خدا کو اس کی کوئی نیکی پسند آ گئی تھی۔



نہیں کہوں گی جب تک تم میرے خلاف کچھ نہ کرو۔" یہ کہہ کر سارہ چلی گئی تو وہ وہیں بیٹھی رونے لگی۔

☆......☆......☆

کرسٹن نے ایک ماہ کی چھٹی لے لی لیکن وہ دن میں گھر پر نہیں رہتی تھی دن بھر بھٹکتی پھرتی تھی اور شام کو گھر لوٹ آتی تھی، اس دن کے بعد اس نے سارہ سے کوئی بحث نہیں کی وہ بیڈ پر بیٹھ کر حکم چلاتی رہتی اور وہ اسے کا ہر کام کسی فرض شناس ملازم کی طرح کرتی مثلاً سارہ اسے اپنے بالوں میں کنگھی کرنے کو کہتی نت نئے فرمائشی کھانے بنواتی جسے وہ چپ چاپ مان لیتی شاید اس نے سارہ کی طاقتور حیثیت کو مان لیا تھا لیکن یہ حقیقت تھی کہ وہ دل ہی دل میں اس منحوس لڑکی سے چھٹکارے کا طریقہ سوچ رہی تھی کیونکہ اگر یہ باتیں وہ کسی اور کو بتاتی تو کوئی بھی اس کی بات کا یقین نہ کرتا۔

آخر ایک دن اسے وہ راستہ نظر آ ہی گیا اسے پتہ تھا کہ سارہ لوگوں کی کمزوری پکڑ کر ان کو اسی چیز سے ماردیتی ہے جس سے انسان نفسیاتی طور پر خوف زدہ ہو، وہ خود بھوتوں سے ڈرتی تھی۔ "لیکن میں اگر کسی طریقے اپنی یہ کمزوری ختم کردوں تو وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ پائے گی۔" یہ سوچ کر اس نے ہارر موویز دیکھنی شروع کردیں ایک ایک دن میں وہ پانچ چھ موویز دیکھ لیتی تھی شروع شروع میں موویز دیکھ کر وہ کافی ڈر جاتی تھی لیکن آہستہ آہستہ وہ اس کی عادی ہوگئی اور ایک ماہ بعد اس میں اتنا اعتماد آ گیا کہ اسے پورا یقین تھا کہ اب اسے حقیقی بھوت بھی نہیں ڈرا سکتا۔ یہ سوچ کر وہ ایک شام اپنے گھر گئی آج اس کا ارادہ سارہ کو قتل کرنے کا تھا سارہ معمول کے مطابق ٹی وی دیکھنے میں مصروف تھی۔

"آج تو میرے ہاتھوں سے نہیں بچے گی۔"

کرسٹن اسے دیکھ کر غرائی تو سارہ ہنس پڑی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے کہ ہارر موویز دیکھ کر تم اتنی بہادر بن جاؤ گی کہ مجھ سے نہ ڈرو گے۔" اتنا کہنا تھا کہ سارہ کے چہرے کی رنگت سیاہ ہونے لگی اور آنکھیں سرخ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ اتنی سیاہ ہوگئی کہ اس کی سرخ آنکھیں اور زبان، اسے اس کے چہرے کی ہیبت کا پتہ چلتا تھا کرسٹن نے ایک لمحے میں خوف کو جھٹک دیا۔ "یہ سب مجھے خوف زدہ کرنے کے لئے ہے اگر میں نہ ڈری تو میں اسے آسانی سے ختم کرسکتی ہوں یہ سوچنا تھا کہ اس میں بجلی بھر گئی اور اس نے لپک کر سارہ کی گردن پکڑ لی جیسے ہی اس نے خوف کو جھٹکا تو سارہ اسے عام سے لڑکی دکھائی دینے لگی وہ پھر بھی پوری طاقت سے اس کا گلہ دبانے میں لگی رہی وہ چیخنے لگی لیکن کرسٹن اس وقت بالکل بے رحم بن چکی تھی۔ "میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی منحوس لڑکی۔" کرسٹن چلائی اتنے میں دروازہ کھلا اور پولیس آفیسر اندر آئے۔ "کرسٹن اسے چھوڑو۔" وہ سارہ کو اس سے چھڑانے لگے بڑی مشکل سے انہوں نے سارہ کو اس سے الگ کیا۔

"سارہ ایک پولیس آفیسر سے لپٹ کر رونے لگی۔" مجھے چھوڑو بے وقوف افسر مجھے اس لڑکی کو مارنے دو یہ انسان نہیں شیطان ہے۔" کرسٹن چلائی۔

میرے خیال میں آفیسر کرسٹن تم مکمل طور پر پاگل ہوچکی ہو ارادہ قتل میں تمہیں کم از کم سات سال کی قید ہوگی لے جاؤ اسے۔" آفیسر نے دیگر اہلکاروں کو کہا اور وہ کرسٹن کو گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ سارہ ابھی تک رو رہی تھی۔

"شکر ہے کہ تمہیں پہلے ہی شک پڑ گیا تھا اور تم نے ہمیں کال کردی ورنہ وہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہوجاتی۔" آفیسر نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

"انکل پلیز! مجھے اپنے ساتھ گھر لے جائیں گے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" سارہ نے کانپتے ہوئے معصومیت سے کہا۔

"ہاں بیٹا کیوں نہیں میرے دو بیٹے ہیں اور آج کے بعد پیاری سی بیٹی بھی ہے۔" آفیسر نے اسے پیار سے چوم کر کہا اور سارہ کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔





قاتل مشین

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

صحت مند تندرست و توانا شخص مشین کے کیبن میں بیٹھا اور پھر جیسے ہی مشین کا لیور اٹھا تو چکا چوند روشنی نظر آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ شخص روشنی کے ذرات میں ڈھل گیا کہ پھر......

کیا کوئی دوسروں کو اذیت دے کر سکھی رہ سکتا ہے اس کے مصداق غور طلب انوکھی کہانی

پروفیسر چیلنجر کا موڈ اس روز بہت خراب تھا۔

صبح سویرے اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی میں ٹھٹھک گیا۔ میرا ہاتھ ابھی تک دروازے کے ہینڈل پر تھا۔ اور پاؤں فرش پر رکھے ہوئے پائیدان پر۔ صورت حال اتنی پریشان کن تھی کہ میں جہاں تھا وہیں رک گیا۔ اندر سے پروفیسر چیلنجر کی غصے میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دے رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا وہ ٹیلی فون پر کسی سے الجھ رہا ہے۔

''اس کم بخت فون نے تو ناک میں دم کر دیا ہے۔ سمجھ نہیں آتا جب لوگوں کو اصل نمبر کا علم نہیں ہوتا، تو دوسروں کا وقت کیوں ضائع کرتے ہیں؟ جب ریسیور اٹھاؤ، غلط نمبر ملانے والے الٹی سیدھی ہانک رہے ہیں۔ میں ایک سائنسدان ہوں اور میرا وقت اتنا سستا نہیں کہ

وہ شخص جس کی جیب میں فون کرنے کے لئے ایک آدھ سکہ موجود ہے، مجھے پریشان..... کیا کہا؟''

''ہاں منیجر سے بات کرادو، تم منیجر بول رہے، تو تم کیا خاک منیجری کرتے ہو..... بہر کیف اپنے سپرنٹنڈنٹ سے کہو مجھ سے بات کرے.....''

''خوب، بہت خوب تو سپرنٹنڈنٹ صاحب تشریف نہیں رکھتے۔''

''مجھے اس امر سے بحث نہیں کہ تم کون ہو اور تمہارے اختیارات کیا ہیں، میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ اگر اب کسی نے مجھے فون کیا اور پھر ''معاف کیجئے گا، غلط نمبر مل گیا'' کہا تو میں تمہیں گریبان سے پکڑ کر عدالت میں لے جاؤں گا۔''

جونہی اس نے اپنی گفتگو ختم کی۔ میں اس کے پاس چلا گیا۔ جوش غضب سے اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ لمبی داڑھی کے بال الجھے ہوئے تھے، کان کی لویں سرخ تھیں اور آنکھوں سے جیسے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ شیر کی طرح دھاڑا۔

''بدتمیز، بے ہودہ اور جاہل۔ جب میں اپنی شکایت لکھوار ہا تھا، تو کئی بار ان کی، بی دبی ہنسی سنائی دی۔ مجھے یقین ہے یہ لوگ جان بوجھ کر مجھے پریشان کر رہے ہیں۔ اور اب میری ایک صبح کا ستیاناس ہو چکا ہے، تم آ پہنچے ہو تا کہ سارا دن ضائع کر سکو۔ اچھا اب یہ بتاؤ تم یہاں کسی ذاتی کام سے آئے ہو یا اپنے نامعقول اخبار کے لئے کوئی مال مسالہ ڈھونڈنے۔ ایک دوست کی حیثیت سے تمہیں خوش آمدید کہا جا سکتا ہے لیکن بطور صحافی تم نہایت گستاخ اور باتونی ہو اور اس قابل نہیں ہو کہ تمہیں گھر میں گھسنے کی اجازت دی جائے۔''

پروفیسر چیلنجر یہ تقریر کر رہا تھا، تو میں نے جلدی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تا کہ مسٹر میکارڈل کا وہ خط تلاش کر سکوں جو انہوں نے مجھے لکھا تھا۔ اچانک پروفیسر کو کوئی بات یاد آ گئی، وہ بات کرتے کرتے رکا اور پوری قوت سے میز پر ہاتھ مار کر بولا۔

''تم خوشامد کے فن میں ماہر ہو، لیکن اس بار تم سے ایک فحش غلطی کا ارتکاب ہو گیا ہے، میری حالیہ تحقیقات کے بارے میں تم نے اس طول طویل مضمون میں لکھا ہے کہ مسٹر جی..... ای چیلنجر جن کا شمار موجودہ دور کے عظیم سائنسدانوں میں ہوتا ہے.....''

میں نے بات کاٹ کر کہا۔ ''میں نے کوئی مبالغہ نہیں کیا جناب، آپ کا شمار واقعی.....''

''ہوں، تو کیا تم ان سائنسدانوں کے نام گنوا سکتے ہو جنہیں تم عظیم سمجھتے ہو اور جن کے ناموں کے ساتھ تم نے میرا نام لیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں تم نے ان میں سے بعض کو مجھ سے عظیم اور باقیوں کو میرے برابر قرار دیا ہے۔ یہ سب کون لوگ ہیں، ذرا میں بھی تو سنوں۔'' اس کے لہجے میں طنز کا عنصر نمایاں تھا۔

''میں معافی چاہتا ہوں پروفیسر، یہ جملہ غلطی سے لکھا گیا۔ دراصل مجھے لکھنا چاہئے تھا کہ مسٹر جی۔ ای چیلنجر جو موجودہ دور کے عظیم ترین سائنسدان ہیں.....''

''میرے نوجوان دوست، یہ نہ سمجھنا میں اپنی تعریف سن کر خوش ہوتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے ہم عصر سائنسدانوں سے، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ان لوگوں سے جو اپنے تئیں سائنسدان سمجھتے ہیں، مجھے شدید علمی اختلافات ہیں اور میں یہ پسند نہیں کرتا کہ میرا نام ان کے نام کے ساتھ لیا جائے۔ میرا مطلب سمجھ گئے ہو نا۔ میں جس نہج پر کام کر رہا ہوں وہ خالصتاً میرے ذہن کی پیداوار ہے۔ بہرحال اب تم آ ہی گئے ہو تو بیٹھ جاؤ اور مزید وقت ضائع کئے بغیر اپنی آمد کا مقصد بیان کرو۔''

میں نے جیب سے مسٹر میکارڈل کا خط نکالا اور اسے کھولتے ہوئے پروفیسر چیلنجر سے پوچھا۔

''جناب! اگر آپ اجازت دیں تو اپنے اخبار کے ایڈیٹر مسٹر میکارڈل کا خط پڑھوں۔''

''میکارڈل، اچھا یاد آ گیا۔ یہ شخص مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں۔ دیگر اخبار والوں کی طرح اسے بھی گپ لگانے کی عادت ہے۔''

''پروفیسر، میں ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں، آپ مسٹر میکارڈل کے بارے میں جو

رائے چاہیں قائم کریں، لیکن وہ آپ کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ جب کبھی انہیں سائنسی میدان میں اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک کسی شخص کی مدد کی ضرورت ہو، ہمیشہ آپ کی طرف رجوع کرتے ہیں، اب بھی کچھ ایسی ہی مشکل آن پڑی ہے۔''

''لڑکے میں پھر بتا رہا ہوں۔ مجھے خوشامد سے سخت نفرت ہے۔ صاف صاف بیان کرو۔ یہ تمہارا میکارڈل مجھ سے کیا چاہتا ہے۔''

اس ڈر سے کہ پروفیسر پر پھر غصے کا دورہ نہ پڑ جائے۔ میں نے جلدی سے میکارڈل کا خط نکال کر اس کے حوالے کردیا۔ جس میں میکارڈل نے پروفیسر سے درخواست کی تھی کہ وہ سائنسدان نائمر کی اس مشین کی حقیقت معلوم کرے جو اس نے حال ہی میں بنائی تھی۔ جس کے ذریعے انسان کو غائب کیا اور دوبارہ کسی بھی وقت پہلی شکل میں لایا جاسکتا تھا۔

خط پڑھنے کے بعد پروفیسر نے کہا۔ ''مجھے ایسی بات پر یقین نہیں بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان مشین کے ذریعہ غائب ہوجائے اور پھر دوبارہ سابقہ حالت میں آجائے۔''

لیکن میں نے اسے کسی نہ کسی طرح راضی کرہی لیا۔ چنانچہ ہم فوراً ہی روانہ ہوگئے۔ جب ہم نائمر کی رہائش گاہ کے قریب پہنچے تو کچھ روسی وضع قطع کے آدمی اس کی رہائش گاہ سے نکل رہے تھے۔ ہم نے اپنی آنے کی اطلاع نائمر کو پہنچائی۔ اس نے فوراً ہمیں بلایا اور آنے کا مدعا پوچھا۔

پروفیسر نے وقت ضائع کئے بغیر اپنا مطلب بیان کیا کہ ''ہم وہ مشین دیکھنے آئے ہیں جو آپ نے تیار کی ہے۔ جس سے انسانی جسم غائب اور دوبارہ ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ دراصل میں ایسی لغویات پر یقین نہیں رکھتا اور میرے اب تک تجربے کے مطابق ایسی مشین تیار کرنا ممکن نہیں۔''

نائمر اپنے دعوے کو سچ ثابت کرنے کے لئے ہمیں اس عجیب وغریب مشین کے پاس لے گیا جس پر سنسنی خیز تجربہ ہونے والا تھا۔

''یہ ہے میری ایجاد، میں آپ کو مشین کی کارکردگی دکھاؤں گا۔ ایک چیز ذہن میں رکھئے۔ یہ مشین دراصل ایک طرح سے میری ایجاد کا مختصر سا ماڈل ہے اور اس کا اثر خاصا محدود ہے۔

اس کے باوجود آپ دیکھیں گے کہ میری یہ ایجاد بخوبی کام کرتی ہے اور یہ ماڈل بھی اتنی صلاحیت رکھتا ہے کہ آپ کو باریک ذرات میں تبدیل کردے، جب میں چاہوں گا آپ کے ایٹوں کو یکجا کرکے مشین دوبارہ آپ کا مکمل مجسم تیار کردے گی پروفیسر، آپ میری ایجاد کی افادیت کا اندازہ نہیں کرسکتے لیکن وہ غیر ملکی حکومت جس کے نمائندے ابھی ابھی یہاں آئے تھے، بخوبی جانتی ہے کہ یہ مشین مستقبل میں دنیا کا نقشہ بدلنے کی تمام تر صلاحیت رکھتی ہے۔''

''کیا ہم اسے دیکھ سکیں گے؟'' پروفیسر نے استفسار کیا۔

''یقیناً، بلکہ اگر آپ میں اتنی جرأت ہو، تو خود آپ کے اجزا فضا میں منتشر کئے جاسکتے ہیں۔''

''جرأت؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں آپ کے جملے پر زبردست احتجاج کرتا ہوں جناب، ایک سائنسدان نئے تجربات سے کبھی خوفزدہ نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہو، تو صفحۂ ہستی سے علوم کا خاتمہ ہوجائے۔''

''مجھے افسوس ہے کہ میرے جملے سے آپ کو تکلیف پہنچی میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ آپ کے جذبات مجروح کروں۔ بہرکیف جیسا کہ آپ نے شروع میں کہا تھا، مشین دیکھنے سے پہلے یہ بتاؤں گا کہ یہ کس اصول پر کام کرتی ہے۔ آپ جانتے ہیں جب نمک یا کھانڈ کی قلمیں پانی میں ڈالی جائیں تو پگھل جاتی ہیں اور کہیں دکھائی نہیں دیتیں، لیکن یہی پانی کسی برتن میں گرم کریں تو پانی بخارات بن کر اڑ جاتا ہے اور برتن کی تہہ میں دوبارہ نمک یا کھانڈ کی قلمیں بچی رہتی ہیں۔ ہم بعینہ اس کلیئے کے تحت ایک ایسا نظام وضع کرسکتے ہیں

جس میں کسی بھی زندہ جسم کو فضا میں تحلیل کرنے کے بعد معکوس عمل سے یہ جسم واپس مادی شکل میں لایا جاسکتا ہے۔''

''بالکل غلط، میں تسلیم کرسکتا ہوں کہ آپ ایک خاص حد تک مادی جسم کو غائب کرسکتے ہیں، لیکن ان منتشر اجزاء کو دوبارہ جمع کرنا اور وہ بھی اسی ترتیب کے ساتھ جو پہلے تھی، ناممکن ہے۔ گویا آپ ایک شخص کو غائب تو کرسکتے ہیں، لیکن دوبارہ وجود میں نہیں لاسکتے۔'' پروفیسر چیلنجر نے اعتراض کیا۔

''آپ خود ہی فیصلہ کیجئے کہ اگر میں اس اصول کی جزئیات بیان کردوں جس کی بنیاد پر یہ مشین تیار کی گئی ہے، تو میرے پاس کیا رہ جاتا ہے، تاہم میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے جو کچھ کہا، حرف بحرف صحیح ہے۔ غائب ہونے والے جسم کا ایک ایک ایٹم ٹھیک اپنی جگہ لوٹ آتا ہے اور جسم کی ہیئت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں ایک اور مثال سے آپ پر اپنا مطلب واضح کرتا ہوں۔ آپ نے مشرق اور مغرب کے بے شمار جادوگروں کے بارے میں سنا اور پڑھا ہوگا، اور ہوسکتا ہے زندگی میں کبھی خود بھی ان کا تماشا دیکھا ہو، یہ لوگ ہاتھ ہلائے بغیر ایک چیز کو غائب کردیتے ہیں اور پھر یہی چیز دوسری جگہ نظر آتی ہے۔ پہلی جگہ سے دوسری جگہ لے جانے میں انہیں لازمی طور پر اس چیز کے ذرات فضا میں منتشر کرنے اور بعد ازاں جمع کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ کچھ لوگ اسے نظر بندی کا نام دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کرتب دکھانے والا مسمریزم کی مدد سے تماشائیوں کی بصارت اپنے مطلب کے مطابق تبدیل کرلیتا ہے، مگر.....''

''معاف کیجئے گا نمائمر، میں ایک مصروف آدمی ہوں اور میرے پاس آپ کے قصے کہانیاں سننے کے لئے وقت نہیں، میں نہ تو جادو پر یقین رکھتا ہوں اور نہ مسمریزم نظر بندی پر۔ اگر واقعی کوئی ایسی مشین آپ نے بنائی ہے، تو الٹ سلٹ باتیں کرنے کے بجائے اسے دکھایئے، وگرنہ میں اجازت چاہوں گا۔''

''بہتر جناب،'' نائمر نے ہار مانتے ہوئے کہا۔ ''میرے ساتھ آیئے اور اپنی آنکھوں سے اس بات کی تصدیق کرلیجئے کہ میں سچائی پر ہوں یا آپ۔''

بہت سی سیڑھیاں طے کرنے کے بعد ہم ایک مقفل کمرے کے سامنے پہنچے۔ نائمر نے قفل کھولا اور ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔ کمرے کی دیواروں پر تازہ سفیدی کی گئی تھی۔ فرش سے چھت تک تانبے کے بے شمار تار دکھائی دے رہے تھے۔ ایک چبوترے پر بھاری مقناطیس رکھا تھا جس کے سامنے لیور سے مشابہ کوئی چیز تین فٹ لمبی تھی اور اس کا قطر ایک فٹ تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک پیچیدہ مشین تھی جس کے عین وسط میں ایک کرسی نظر آرہی تھی کرسی کے نیچے ایک جست کا ایک چبوترہ تھا اور اس کے گرد تانبے کا ایک تختہ جس میں سے تار نکل کر کرسی تک پہنچ رہے تھے، مشین کے بہت سے ڈائل تھے جن میں بے شمار سوئیاں لگی ہوئی تھیں۔

''جناب والا، یہ رہی میری تخلیق۔'' نائمر نے فخریہ لہجے میں پوچھا۔

''مجھے یقین ہے جو بات آپ میری زبان سے نہیں سمجھ سکے، اس کی زبان سے ضرور سمجھ لیں گے۔ مستقبل میں دنیا پر وہی ملک حکمرانی کرے گا جس کے پاس یہ مشین ہوگی۔ پروفیسر صاحب، کیا آپ اس امر کے لئے تیار ہیں کہ میں آپ کو کرسی پر بیٹھا کر آپ کے جسم کے ایٹم فضا میں منتشر کردوں۔''

چیلنجر کی ڈائری میں خوف کا لفظ ہی نہ تھا، وہ فوراً آگے بڑھا لیکن میں نے اسے بازو سے پکڑ لیا اور آہستہ سے کہا:

''پروفیسر صاحب، آپ اس کرسی پر نہیں بیٹھیں گے۔ آپ کی جان بہت قیمتی ہے۔ علاوہ ازیں آپ کے پاس اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ مشین میں سے دوبارہ آپ زندہ واپس آسکیں گے۔ اس مشین سے ملتی جلتی میں نے زندگی میں ایک ہی چیز دیکھی ہے اور وہ ہے سنگ سنگ کے قید خانے میں موت کے سپرد کئے جانے والے مجرموں کے لئے برقی کرسی۔ بخدا،

’’آپ کو کسی قیمت پر نہ جانے دوں گا۔
میں اس کام کے لئے رضاکارانہ طور پر اپنے آپ کو پیش کرتا ہوں۔‘‘
پروفیسر چیلنجر انا بازو چھڑاتے ہوئے بولا۔
’’عزیزم! گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اگر مجھے کچھ ہوگیا، تو کم از کم تم اس بات کی گواہی دو گے کہ میں نے ایک عظیم مقصد کی خاطر جان دی۔ تمہیں معلوم ہے سائنس دان کا اصل مقصد حقیقت کی تلاش ہے۔‘‘
’’لیکن پروفیسر، اگر آپ کو کچھ ہوگیا، تو وہ سارا علمی سرمایہ ضائع ہوجائے گا جس کے لئے آپ برس ہا برس سے محنت کررہے ہیں اور یہ سائنس کی دنیا کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان ہوگا۔ بہتر یہی ہے کہ آپ مجھے جانے دیں۔ اگر تجربہ کامیاب رہا تو مجھے آپ کی کرسی پر بیٹھنے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔‘‘
’’تمہاری دلیل میں کوئی وزن نہیں۔‘‘ پروفیسر نے فوراً کہا۔
’’ایک آخری درخواست ہے۔ اگر آپ کرسی پر بیٹھ گئے، تو آپ خود معمول ہوں گے اور یہ اندازہ نہ کرسکیں گے کہ آپ غائب ہوئے یا نہیں، اس کے برعکس میرے کرسی پر بیٹھنے سے آپ ایک ناظر کی حیثیت سے ہر شے کا بخوبی مشاہدہ کرسکتے ہیں۔‘‘
یہ بات پروفیسر چیلنجر کے دل کو لگی۔ وہ پیچھے ہٹ گیا اور مجھے راستہ دے دیا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔
نائمر نے کرسی سے دائیں طرف مشین سے نکلا ہوا ایک لیور دبایا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے یہ محسوس ہوا جیسے آنکھوں کے سامنے دھند سی چھاگئی ہو، پھر میں سنبھل گیا اور ہر چیز صاف دکھائی دینے لگی نائمر میرے سامنے کھڑا مسکرارہا تھا اور پروفیسر چیلنجر، اس کی حالت قابل دید تھی، چہرے کا رنگ زرد پڑگیا تھا، آنکھوں میں انتہائی دہشت اور خوف کے آثار تھے۔
’’کیوں صاحب، میرے لئے کیا حکم ہے؟‘‘ میں نے سوال کیا۔
’’آپ فارغ ہیں، تجربہ ختم ہوچکا۔‘‘ نائمر نے

جواب دیا، پھر مڑ کر چیلنجر سے کہا۔ ''کیوں جناب، آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ آپ کا ساتھی غائب ہوگیا تھا۔''

پروفیسر چیلنجر خاموش رہا۔ یوں معلوم ہوا اسے سانپ سونگھ گیا ہے، تھوڑی دیر بعد وہ مجھ سے بولا۔

''میلون، بخدا تم غائب ہوسکتے تھے، میں کوشش کے باوجود تمہیں نہ دیکھ سکا۔''

''لیکن مجھے تو محسوس تک نہیں ہوا۔ میں کتنے منٹ غائب رہا تھا؟'' میں نے کہا۔

''تقریباً تین منٹ، میں مسلسل کرسی کی طرف دیکھتا رہا، تمہاری کرسی پونے تین منٹ تک خالی رہی اور پھر اس شعبدہ باز نے بھئی میں تو اسے شعبدہ باز ہی کہوں گا، دوبارہ اس لیور کے کان مروڑے اور تم نہ جانے کہاں سے آکر کرسی پر براجمان ہوگئے۔''

''اچھا صاحب۔'' ٹائمر نے پروفیسر چیلنجر سے مخاطب ہوکر کہا۔ ''اب آپ کی باری ہے۔ کیا آپ کرسی پر بیٹھنا پسند کریں گے؟''

پروفیسر چیلنجر اپنی حیرت پر قابو پاتا ہوا کرسی کی طرف بڑھا، ٹائمر نے پھر لیور دبایا اور اگلے ہی لمحے کرسی خالی پڑی تھی۔ خوف کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ ٹائمر بولا۔

''کتنی دلچسپ بات ہے کہ پروفیسر چیلنجر، دنیا کا عظیم سائنسدان اس وقت کروڑوں ایٹمی ذرات کی شکل میں اسی شہر کی فضا میں کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ اگر میں چاہوں تو یہ ذرات ہمیشہ اسی طرح معلق رہیں۔ اس شخص نے مجھ پر بدگمانی کی، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ میری بے عزتی کرنے کی کوشش کی۔ کیا خیال ہے تمہارا، اگر اسے تھوڑا سا سبق دیا جائے۔ میرا مطلب ہے کہ۔''

''نہیں تم ہرگز ایسا نہیں کرسکتے، میں تمہیں عدالت میں لے جاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

''ناراض کیوں ہوتے ہو میرے دوست، میں ابھی پروفیسر کو واپس لے آؤں گا! البتہ اگر تم چاہو، تو دلچسپ تماشا دکھا سکتا ہوں۔ مسلسل تجربات سے مجھ پر یہ بات واضح ہوئی کہ بال انسانی جسم کا حصہ ہونے کے باوجود گوشت اور ہڈیوں سے قطعی مختلف مادے سے بنے ہیں لہٰذا میں مشین کی مدد سے پروفیسر کے جسم سے تمام بال غائب کرسکتا ہوں۔ لو اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔''

میرے منع کرنے سے پیشتر ٹائمر نے کئی ایک کل پرزے مروڑے، پھر وہی لیور دبایا اور پروفیسر چیلنجر کی جگہ کرسی پر ایک عجیب و غریب مخلوق دکھائی دی۔ ضبط کی کوشش کرنے کے باوجود میری ہنسی نکل گئی۔

پروفیسر چیلنجر کا سر جہاں چند لمحے پیشتر گھنے بال تھے، صاف سپاٹ چندیا میں تبدیل ہوگیا تھا۔ اس کی لمبی داڑھی غائب تھی اور سفید سفید کلے یوں نظر آرہے تھے جیسے کسی نابالغ لڑکے کے گال، مجموعی طور پر شکل صورت سے وہ قدیم اور پیشہ ور رومی جنگجو دکھائی دیتا جیسا کہ ہم فلموں میں دیکھتے ہیں۔

میرا خیال ہے چیلنجر نے فوراً محسوس کرلیا کہ اس کی صورت میں کچھ تبدیلی آگئی ہے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سر سے ٹکرائی ہوئی ٹھنڈی ہوا نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کردیا ہو۔ بہرکیف، اس کا ہاتھ فوراً اپنی چندیا کی طرف اٹھ گیا۔ سر پر ہاتھ پھیر کر اس نے اپنے گال چھوئے، فوراً ہی کرسی سے اتر کر ٹائمر کی طرف بڑھا۔ ٹائمر صورت حال کی سنجیدگی دور کرنے کے لئے ہنسا، مگر پروفیسر شدید غصے کے عالم میں تھا، اس کی آنکھوں میں خون اُمڈ آیا تھا، ٹائمر نے اپنے آپ کو بچانے کے لئے بہت کوشش کی مگر چیلنجر کا ہاتھ اس کی گردن تک بڑھا۔ اسی ہی لمحے چیلنجر نے کوتاہ قد ٹائمر کو اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ میں نے لپک کر چیلنجر کو پکڑ لیا اور گھسیٹا کر کہا۔

''پروفیسر، ہوش میں آؤ۔ اگر یہ شخص مر گیا تو ہم کبھی اس شیطانی مشین کا بھید معلوم نہ کرسکیں۔''

بات پروفیسر چیلنجر کی سمجھ میں فوراً ہی آگئی۔ اس نے ٹائمر کو کوٹ کے کالر سے پکڑ کر اٹھایا اور اس کے کان میں چیخ کر کہا۔

''اگر تم نے پانچ منٹ کے اندر اندر میرے بال نہ لوٹائے تو میں اسی جگہ تمہیں جان سے مار ڈالوں گا۔''

غریب ٹائمر چند لمحوں تک اپنی گردن سہلاتا رہا، پھر لڑکھڑائی ہوئی آواز میں بولا۔

''پروفیسر، میں نے دوست سمجھ کر آپ سے مذاق کیا تھا۔ اگر آپ کو برا لگا ہو، تو میں معافی چاہتا ہوں۔ کرسی پر تشریف رکھئے، میں ابھی آپ کے بال لے آتا ہوں۔''

پروفیسر چیلنجر نے مجھے قریب بلا کر کہا۔

''میلون، تم اس شخص کا خیال رکھنا، اگر تم دیکھو کہ اس نے پھر کوئی گڑبڑ کی، تو اس کی ایسی مرمت کرنا کہ...'' جملہ نامکمل چھوڑ کر چیلنجر کرسی کی طرف بڑھا۔

میں ٹائمر کے پیچھے کھڑا ہوگیا۔ چیلنجر کرسی پر بیٹھا اور ٹائمر فوراً ہی اسے پہلی حالت میں لے آیا۔ اس بار چیلنجر میرے پاس آیا، تو اس کا موڈ پہلے کی نسبت بہت اچھا تھا۔ وہ ٹائمر سے بولا۔

''اب میں آپ سے چند ضروری سوالات کرنا چاہتا ہوں، کیا اس مشین کا راز صرف آپ تک محدود ہے؟''

''جی ہاں، اور کوئی شخص نہ تو یہ مشین بنا سکتا ہے ورنہ اس کے اصول سے واقف ہے، جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، میں نے یہ خفیہ طاقت یورپ کے ایک ملک کے ہاتھ فروخت کرنے کا وعدہ کیا ہے جونہی رقم مل گئی سودا مکمل ہوجائے گا۔''

''کیا وہ کاغذات جن میں مشین کی تفصیلات درج ہیں، آپ کے پاس ہیں؟''

''میں اتنا احمق نہیں کہ کاغذات میں سب کچھ لکھ دوں، ہر چیز میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ جو ملک اس ایجاد کی قیمت ادا کردے گا، میں اس کے لئے خود کام کروں گا۔ مسٹر چیلنجر، ذرا اس وقت کا تصور کیجئے جب میں صرف ایک بٹن دبا کر آپ کا شہر لندن، بلکہ ٹائمز کی ساری وادی کے انسان، حیوان، چرند، پرند، عمارتیں اور کارخانے سب کچھ صفحہ ہستی سے غائب کردوں گا۔ یہ مشین تو محض ایک ماڈل ہے، مکمل مشین سے کسی ملک کی ساری آبادی غائب کی جاسکتی ہے۔''

چیلنجر کچھ دیر خاموش رہا، پھر ماڈل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''غالباً یہ مشین بجلی سے چلتی ہے؟''

''جی ہاں، آپ نے یہ کیسے اندازہ لگایا؟''

''میرا خیال ہے ماڈل تیار کرنے میں آپ نے کچھ زیادہ احتیاط سے کام نہیں لیا۔ جب میں کرسی پر بیٹھا، تو یوں محسوس ہورہا تھا جیسے خفیف سی برقی رو کرسی کی پشت میں سے میرے جسم میں داخل ہورہی ہوں۔ شاید تاروں میں کچھ گڑبڑ ہے۔''

''ہرگز نہیں، آپ کو یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''غلط فہمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، آپ اس کی تصدیق کرسکتے ہیں۔''

ٹائمر فوراً کرسی کی طرف بڑھا اور اس پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''مجھے تو کچھ محسوس نہیں ہوا۔''

''ریڑھ کی ہڈی پر بھی نہیں؟'' پروفیسر چیلنجر نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''جی نہیں۔''

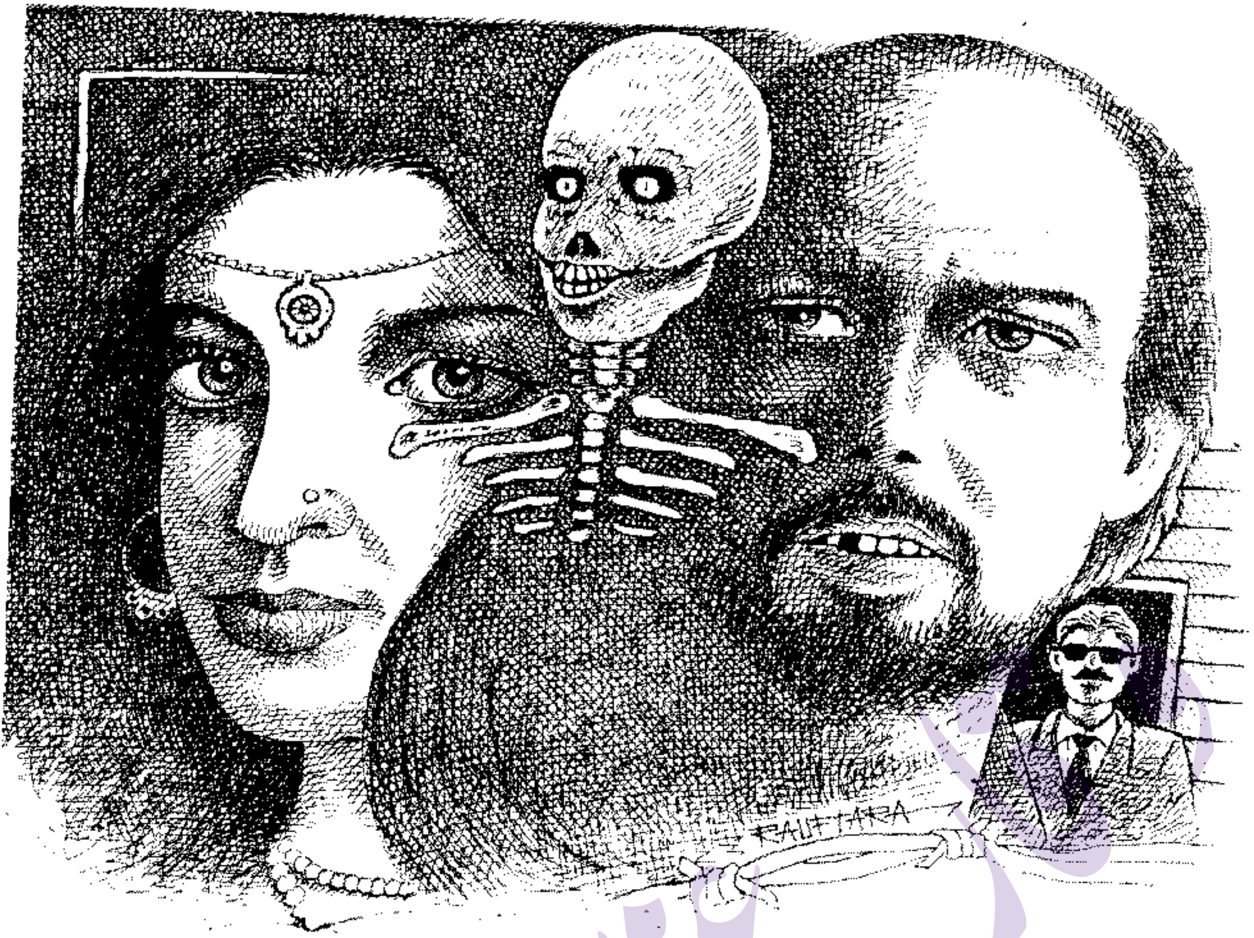
اچانک پروفیسر چیلنجر نے وہ لیور دبا دیا جسے دبا کر ٹائمر نے پہلے مجھے اور بعد میں اسے غائب کیا تھا۔ ٹائمر کی کرسی خالی ہوگئی۔ وہ اپنے کھودے ہوئے گڑھے میں خود ہی گر پڑا تھا۔

''یہ تم نے کیا کیا پروفیسر؟'' میں نے حیران ہو کر پروفیسر چیلنجر سے دریافت کیا۔

''جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔ اگر یہ شخص زندہ رہ جاتا، تو دنیا میں ایک قیامت برپا ہوجاتی، اسے کیفر کردار تک پہنچانا ایک نیک کام ہے، جاتے ہوئے ہم اس کمرے کو نذر آتش کردیں گے تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری، لوگوں کو یہی سمجھنے دو کہ تھیوڈور ٹائمر جل کر مرگیا اور ساتھ ہی اس کی شیطانی مشین بھی۔ ویسے آج کی صبح کچھ بری نہیں رہی۔''

اور میں پروفیسر کو داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔





قبرستان

ایس امتیاز احمد-کراچی

ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے والا گھٹا ٹوپ اندھیرا اور ویران و سنسان قبرستان میں رونما ہونے والا دل دہلاتا و لرزہ براندام کرتا ناقابل برداشت واقعہ جس نے اچانک عاشق پر لرزہ طاری کردیا اور پھر......

ایک بامراد عاشق کا عجیب قصہ جس نے عاشق کو دہلا کر رکھ دیا تھا، سبق آموز کہانی

اماوس کی کالی رات تھی، چاند دور کہیں اندھیرے کی چادر اوڑھے محوِ خواب تھا۔ ستارے بھی شاید چاند کی تلاش میں آسمان سے غائب تھے۔ قبرستان میں ہولناک سناٹا طاری تھا۔ گھپ اندھیرے نے قبروں کے نشان تک نگلے ہوئے تھے۔ کیکر کی خاردار جھاڑیوں سے دھیمی ہوا کی چھیڑ چھاڑ پراسرار سرسراہٹ پیدا کررہی تھی۔ وقتاً فوقتاً کسی پرانی قبر میں دبکا ہوا گیدڑ اپنی روتی ہوئی آواز نکال کر قبرستان میں کسی ذی روح کے ہونے کا اعلان کررہا تھا۔ ایسے میں ایک سایہ قبرستان میں داخل ہوا۔ وہ اندھیرے ہی کا حصہ معلوم ہورہا تھا اس نے پشت پر اپنی قامت سے ذرا کم ایک بوری لاد رکھی تھی۔ بوری اپنے حجم کے مطابق وزنی معلوم پڑتی تھی لیکن وہ سایہ باآسانی اس بوری کو لادے قبروں کے بیچ سے گزر رہا تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کے

لبادے میں خود کو ڈھانپ رکھا تھا۔

گھپ اندھیرے اور عجیب وضع قطع کے لبادے کی وجہ سے اس کی شناخت ممکن نہیں تھی۔ وہ اتنی تاریکی کے باوجود خاردار جھاڑیوں اور قبروں کے درمیان سے اس طرح گزر رہا تھا جیسے اسے قبرستان کے راستے ازبر ہوں۔ وہ گویا قبرستان میں اڑا جا رہا تھا۔

آخر قبرستان کے انتہائی شمالی حصے میں پہنچ کر وہ رکا۔ وہاں ایک قبر کھدی ہوئی تھی۔ اس نے بوری کو جلدی جلدی اس قبر میں پھینکا، قبر سے نکالی ہوئی مٹی کے اوپر ایک بیلچہ رکھا ہوا تھا۔ اس نے اس بیلچے کی مدد سے جلدی جلدی قبر کو مٹی سے پر کرنا شروع کردیا۔ آدھے گھنٹے میں وہ اپنے کام سے فارغ ہو چکا تھا وہاں ایک قبر تیار تھی گمان گزرتا تھا کہ کسی بہت ماہر گورکن نے قبر تیار کی ہو۔

وہ دن میں کبھی قبرستان نہیں گیا تھا کہ اسے رات کے بارہ بجے کے بعد قبرستان آنا پڑا تھا، اور وہ بھی تنہا روبی کو حاصل کرنے کے لئے وہ کچھ بھی کرسکتا تھا وہ روبی کا دیوانہ یا عشاق نہیں تھا۔ لیکن روبی نے جس طرح اسے ٹھکرایا تھا اور حقارت سے کہا تھا۔ ''انکل جایئے اپنے لئے کوئی آنٹی تلاش کیجیے۔'' حقارت اور غرور حسن میں بولے گئے ان لفظوں نے اس کو جلا کر راکھ کردیا تھا اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ اب اس شوخ و چنچل چڑیا کو اپنے بیڈ روم کے پنجرے میں بند کر کے ہی رہے گا۔

وہ اسمارٹ تھا، وجیہہ تھا، پیسے والا تھا اگر وہ عمر میں روبی سے پندرہ سال بڑا تھا تو اس میں کیا حرج تھا۔ یہ تو وہی جانتا تھا کہ وہ روبی سے عمر میں پندرہ سال بڑا ہے وگرنہ اگر وہ روبی کے ساتھ کھڑا ہو جاتا تو موازنہ کرنے والی آنکھ ان دونوں کی عمر زیادہ سے زیادہ پانچ سال کا فرق ہی بتا سکتی تھی اس نے پیار، پیسہ، دھونس اور ہر ہتھکنڈا آزمالیا تھا جس کے ذریعے وہ روبی کو حاصل کرسکتا تھا لیکن وہ ناکام رہا تھا بلکہ اس کی بعض حرکتوں کی وجہ سے روبی اس سے مزید نفرت کرنے لگ گئی تھی۔

روبی لگژری اپارٹمنٹ کے فورتھ فلور پر اپنے ریٹائرڈ آفیسر باپ کے ساتھ رہتی تھی۔ جبکہ وہ یعنی شاہد احمد اس اپارٹمنٹ کے تھرڈ فلور پر تنہا رہتا تھا۔ شاہد کی پہلی بیوی پانچ سال قبل زچگی کے دوران بچے سمیت فوت ہوگئی تھی۔

شاہد نے ایک مشہور اخبار میں پورے صفحے کا ایک اشتہار پڑھا کہ ''سنگدل محبوب صرف 3 یوم میں آپ کے قدموں میں۔'' اشتہار عامل خاقانی بابا کی جانب سے دیا گیا تھا۔ خاقانی بابا نے اسے کچھ سامان کی فہرست تھمادی تھی اور رات بارہ بجے کے بعد مطلوبہ سامان کے ہمراہ قبرستان پہنچنے کو کہا تھا۔ بابا نے شاہد کو تنہا بلایا تھا۔

قبرستان کے شمالی حصے میں کیکر کے درخت تلے اپنا ٹھکانہ بھی اسے سمجھا دیا تھا جہاں بیٹھ کر وہ اپنا مخصوص عمل کیا کرتا تھا۔ ''ولایتی شراب کی بوتل، انڈا کالا مرغا، الو، بن بیاہی بکری کا سینگ اور اس کی دستی کی ثابت ہڈی؛'' اور اسی طرح کے کچھ دیگر سامان کی فہرست بابا نے شاہد کو دی تھی، خنزیر کی چربی کے بارے میں بابا نے کہا تھا کہ وہ تمہیں کہیں نہیں ملے گی جبکہ اس چربی کا تمام عمل میں کلیدی کردار ہے۔ اس کے استفسار پر بابا نے ایک تاریک مکان کا پتا اسے دے کر کہا تھا کہ ''یہاں ایک بڈھا جارج رہتا ہے وہ بہت مہنگے داموں پر یہ چربی فروخت کرتا ہے۔''

یہ تمام تفصیل جان کر شاہد نے محسوس کیا کہ اس میں یہ سب کچھ کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ اس میں کچھ اس کی کم ہمتی کا عمل دخل تھا تو کچھ یہ وجہ بھی تھی کہ وہ ایک مسلمان ہے۔ وہ مذہب سے لاکھ دور سہی لیکن بالآخر مسلمان تو تھا۔

لیکن روبی کو پانے کا خیال اس کے تمام احساسات پر غالب رہا اور وہ کسی نہ کسی طرح بابا کی مطلوبہ تمام اشیاء حاصل کر کے طے شدہ پروگرام کے مطابق قبرستان پہنچ گیا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لوہے

کی پتلی تاروں سے بنا ہوا پنجرہ تھا جس میں الو تھا جبکہ دوسرے ہاتھ میں ایک چرمی بیگ تھا جس میں مرغا سمیت دیگر سامان تھا۔ ٹوٹی ہوئی دیوار کو عبور کرکے اس نے جب قبرستان کی حدود میں قدم رکھا تو پہلے ہی سے سہمے ہوئے اس کے دل نے خوف سے زور زور سے دھڑکنا شروع کردیا تھا۔

ہولناک تاریکی اور پراسرار خاموشی نے اس کے رونگٹے کھڑے کردیئے تھے۔ اس نے یہیں سے واپس لوٹ جانے کا سوچا، لیکن پھر روبی کی صورت اس کے سامنے آگئی۔ ''بزدل۔'' اس نے اپنے کپکپاتے ہاتھ کی گرفت پنجرے پر مضبوط کی اور آگے کی جانب قدم بڑھادیئے۔ مرغے کو نہ جانے کیا ہوا کہ اس نے بے چین آواز میں ککڑوں کوں کرنا شروع کردیا تھا۔

عامل خاقانی بابا درخت کے نیچے چوکڑی مارکر بیٹھا تھا۔ اس نے گلے میں ایک ہار پہن رکھا تھا جس میں مختلف شکلوں کی ہڈیاں پروئی ہوئی تھیں۔ اس نے سیاہ رنگ کا چوغہ بھی پہن رکھا تھا۔ اس کے سامنے مٹی کا ایک کونڈا رکھا تھا۔ جس میں آگ بھڑک رہی تھی۔ آگ سے درخت کے اردگرد کا ماحول نیم روشن تھا۔ بابا اور کونڈے کے درمیان ایک انسانی کھوپڑی رکھی ہوئی تھی۔ کھوپڑی کے گرد گول دائرے میں لکیر کھنچی ہوئی تھی۔ بابا نے اپنے چہرے پر نجانے کیا مل رکھا تھا۔ آگ سے پیدا ہونے والی روشنی اس کے چہرے پر جیسے جم کررہ گئی تھی۔ بابا کے چہرے پر شیطانیت رقص کررہی تھی۔ بابا کو شاہد کا انتظار تھا اس نے شاہد سے ایک لاکھ روپے معاوضہ طے کیا تھا۔ 50ہزار روپے وہ پیشگی وصول کرچکا تھا جبکہ 50ہزار کام ہونے کے بعد وصول کرنے تھے۔ بابا کو شیطانی علم پر دسترس حاصل تھی۔ اسے یقین تھا کہ بقیہ پچاس ہزار بھی جلد ہی اس کے پاس آجائیں گے۔ وہ وقتاً فوقتاً اپنے بائیں جانب بیضوی شکل کے رکھے ہوئے برتن میں سے مٹھی بھر کوئی سفوف نکالتا اور بھڑکتی ہوئی آگ میں پھینک دیتا۔ سفوف جیسے ہی آگ میں پڑتا تو آگ سے گول بڑی گیند کی شکل کا شعلہ تقریباً کئی فٹ تک فضا میں اٹھتا اور ہوا میں تحلیل ہوجاتا۔

اس مرتبہ بابا نے سفوف آگ میں چھڑکا اور بولا۔ ''درگا دیوی حاضر ہو......! درگا دیوی حاضر ہو! درگا دیوی حاضر!'' بابا کی آواز بہت بھیانک اور پراسرار ہورہی تھی وہ مسلسل اپنے جملے کی تکرار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد عین اس جگہ جہاں آگ کا شعلہ فضا میں تحلیل ہوا تھا وہاں ایک نہایت ہی خوفناک شکل کا ہیولہ نمودار ہوا اور بولا۔ ''کیا حکم ہے میرے آقا۔''

ہیولے کو دیکھ کر بابا معنی خیز انداز میں مسکرایا اور بولا۔ ''فی الحال واپس چلے جاؤ۔'' اس کے بولتے ہی ہیولہ فوراً غائب ہوگیا۔ بابا کی مسکراہٹ مزید گہری ہوتی چلی گئی۔ اب اسے شاہد کا انتظار تھا۔ تاکہ اس کا شیطانی کھیل مزید آگے بڑھ سکے۔

ادھر جوں جوں شاہد آگے بڑھتا جارہا تھا مرغے کی ''ککڑوں کوں'' میں مسلسل اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ سخت سردی کے باوجود اس کی پیشانی پسینے سے تر ہوچکی تھی۔ اس کے جسم میں خوف سے لرزہ طاری تھا۔ گھپ اندھیرے میں قبروں کے بیچ راستہ بنا کر چلنا ناممکن تھا۔ وہ قبروں سے ٹکراتا، لڑکھڑاتا ہوا چل رہا تھا۔

وہ روبی کو پانے کے جنون میں اتنا آگے نکل آیا تھا کہ اب واپس ہونا بھی چاہتا تو یہ کام اس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ اندازے سے قبرستان کے شمالی حصے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اندازے کی غلطی سے جب اس کا پاؤں کسی قبر سے ٹکراتا تو اسے محسوس ہوتا کہ قبر سے مردے نے نکل کر اس کی ٹانگ پکڑلی ہے اور نیچے کی جانب کھینچ رہا ہے، اسے اپنے پاؤں منوں وزنی محسوس ہورہے تھے۔ لیکن وہ جیسے تیسے، ڈرتا، گرتا پڑتا قبرستان کے وسط میں پہنچ چکا تھا۔ بار بار ببول کی جھاڑیوں میں الجھ کر اس کا سوٹ کئی جگہ سے پھٹ چکا تھا۔ اس کے جسم پر جابجا خراشیں پڑچکی تھیں۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں جانب دیکھا۔

اچانک پھڑپھڑ کرتی ہوئی ایک چمگادڑ اس کے

چہرے سے ٹکرائی۔ اس کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی چمگادڑ کو بھی شاید اس کا چہرہ پسند آ گیا تھا۔ وہ اس کے چہرے ہی پر چپک گئی۔ شاہد کو گمان ہوا کہ اس مرتبہ وہم نہیں ہوا ہے بلکہ حقیقت میں کوئی بھوت یا چڑیل اسے آ کر چمٹ گئی ہے، اس کے ہاتھ سے پنجرہ اور بیگ گر گئے۔ وہ خود بھی گرنے ہی والا تھا کہ چمگادڑ نے از خود ہی اس کا چہرہ چھوڑ دیا اور پھڑ پھڑ کرتی ہوئی کہیں اندھیرے میں گم ہوگئی۔ خوف سے اس کا سینہ دھونکنی کی طرح پھولنا اور پچکنا شروع ہوگیا۔ اس نے سراسیمگی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھا تو اسے چاروں جانب قبریں ہی قبریں نظر آئیں۔

وہ روبی اور عامل خاقانی بابا کو بھول گیا تھا۔ ایک چمگادڑ نے اس کے تمام جنون ہوا کر دیئے تھے۔ اس نے بمشکل اپنے کھوئے ہوئے حواسوں کو قابو کیا اور واپسی کا راستہ تلاش کرنے کے لئے نظریں دوڑائیں تو اسے معلوم ہوا کہ وہ سمت کا تعین کرنے سے قاصر ہو چکا ہے۔ اب اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کس سمت سے آیا تھا اور اس کو کس سمت جانا تھا۔ اس نے ''ککڑوں کوں'' کرتے ہوئے مرغے کو اور بیگ کو وہیں چھوڑا اور اندازے سے اس نے واپسی کا سفر کر دیا۔

وہ دل ہی دل میں روبی کے حصول کے لئے کالا جادو کروانے سے تائب ہو چکا تھا۔ وہ جلد از جلد اس قبرستان سے باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ اس کے سینے پر دباؤ مسلسل بڑھتا جا رہا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اگر وہ کچھ دیر اس قبرستان میں مزید رہا تو خوف سے اس کا دل بند ہو جائے گا۔ وہ ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ اس کے قدموں کے پاس سے ایک گیدڑ بھاگتا ہوا نکلا اور اس کی ٹانگوں کے درمیان میں سے نکل کر اس جانب چلا گیا جہاں وہ پنجرے میں بند مرغا چھوڑ آیا تھا لیکن گیدڑ کا اچانک اس کے پیروں میں سے نکلنا اور پھر تقریباً اس کو دھکا دیتے ہوئے بھاگ جانا۔ اس لمحے اس کے لئے کسی قیامت سے کم نہیں تھا۔ کچھ لمحے کے لئے اس کا دل تو شاید بند ہی ہوگیا تھا۔

حلق میں کانٹے پڑ چکے تھے۔ خوف سے اس کا جسم اس طرح لرز رہا تھا جیسے بھاپ کی کیتلی کے ڈھکن پر لگی ہوئی سیٹی لرزتی ہے۔ اس مرتبہ اس نے اٹھ کر چلنے کے بجائے دوڑنا شروع کر دیا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے بہت سارے بھوت مل کر اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔ قبرستان میں دوڑنا اور وہ بھی گھپ اندھیرے میں؟ ایک ناممکن کام تھا۔ لہٰذا وہ بھی تھوڑی ہی دیر میں ایک ٹھوکر لگنے پر منہ کے بل گر پڑا۔ اس کے سر پر شدید ضرب آئی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا آج ہی اس قبرستان میں اس کی قبر بنے گی۔

انسان جب بالکل بے بس اور مجبور ہو جاتا ہے تو اسے اللہ یاد آ جاتا ہے۔ اس کو بھی اللہ یاد آ گیا تھا۔ اب اس میں کھڑے ہونے کی ہمت نہیں تھی۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے اس کو بھی ایک تنکا نظر آ گیا تھا۔ وہ بھول گیا تھا کہ اس کے پاس موبائل فون بھی ہے، وہ کسی کو مدد کے لئے بلا سکتا تھا۔ اس خیال نے اسے تقویت بخشی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اس نے موبائل فون نکالا اور کانپتی ہوئی انگلیوں سے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

ادھر بابا کو انتظار سے کوفت ہو رہی تھی۔ اس کو دی گئی اطلاع کے مطابق ایک گھنٹے قبل شاہد قبرستان میں داخل ہوا تھا۔ اسے زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ میں اس تک پہنچ جانا چاہئے تھا۔ لیکن اب تو ایک گھنٹے سے زائد وقت گزر چکا تھا۔ بابا نے اپنے عجیب و غریب لباس میں ہاتھ ڈال کر موبائل فون نکالا اور کال ملنے پر بولا۔ ''کہاں مر گیا ہے وہ بندہ؟ یہاں اب تک نہیں پہنچا۔''

دوسری طرف کا جواب سننے کے بعد وہ پھر بولا۔ ''تم نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ وہ شاہد ہی تھا؟'' اس نے دوسری جانب کا جواب سنا اور کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''پھر تم ایسا کرو اسے قبرستان میں تلاش کرو، یقیناً راستہ بھٹک گیا ہوگا۔'' یہ کہہ کر بابا نے کال اینڈ کر دی اور پھر سے آگ میں سفوف ڈال ڈال کر شعلہ بھڑکانے لگا۔ اس کے خیال میں شاہد بس کسی بھی

لمحے یہاں پہنچ سکتا تھا۔

☆......☆......☆

فون کرنے کے بعد شاہد کو کچھ ڈھارس بندھی وہ اٹھ کر ایک کچی قبر کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہاں سے جاتے ہی وہ سب سے پہلے روبی سے معافی مانگے گا۔ اس نے ایک مرتبہ کرائے کے بدمعاشوں کے ذریعے روبی کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی اور پھر خود ہیرو بن کران بدمعاشوں کو راہ فرار پر مجبور کر دیا تھا لیکن وہ ڈرامہ اتنا ناقص اور بھونڈا تھا کہ کند سے کند ذہن بھی فوراً سمجھ جاتا کہ روبی کو متاثر کرنے کے لئے اغوا کا ڈرامہ رچایا گیا۔ روبی تو پھر بے حد ذہین لڑکی تھی وہ فوراً بھانپ گئی تھی کہ شاہد نے یہ ڈرامہ رچایا ہے۔

دراصل روبی کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ خود بھی ایڈوانچر پسند ہے اور ایسے ہی لوگوں کو پسند بھی کرتی ہے اسی لئے شاہد نے خود کو روبی کی نظر میں بہادر اور ایڈوانچر پسند ثابت کرنے کے لئے ڈرامے رچائے مگر بدنصیبی سے وہ کامیاب نہ ہوسکا۔ نہ صرف اس کی اوٹ پٹانگ حرکتوں سے کئی مرتبہ روبی کو تکلیف پہنچی بلکہ وہ شاہد سے نفرت کرنے لگی تھی اور اس نے واشگاف الفاظ میں شاہد کو کہہ دیا تھا کہ ''اگر اس نے اس کا رشتہ مانگنے یا اسے متاثر کرنے کے لئے ڈرامہ رچانے کی کوئی کوشش کی تو شاہد کو جیل بھجوادے گی۔'' روبی کے والد ریٹائرڈ پولیس آفیسر تھے۔

وہ قبر کے پاس بیٹھا ہوا خیالوں میں حسین وجمیل روبی سے معافی مانگ رہا تھا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس کے نیچے سے زمین کھسک رہی ہے۔ خوف سے ایک مرتبہ پھر اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ زمین مسلسل کھسکتی جارہی تھی اس نے اٹھنا چاہا۔ لیکن اٹھ نہ سکا۔ اس کے اعصاب جواب دے چکے تھے۔ سانس پھر رکنے لگی۔ اس نے اپنے جسم پر نوکیلے پنجے گڑتے ہوئے محسوس کئے۔ پنجوں نے اس کے جسم پر حرکت کرنی شروع کردی۔ پنڈلی کے اوپری حصے پر جہاں جوتے کی حدود ختم ہورہی تھی اسے محسوس ہوا وہاں سے کسی نے

گوشت نوچا ہے۔ درد کی لہر پنڈلی سے دماغ تک پہنچی تو اس کے خوف سے سوئے ہوئے اعصاب جاگ اٹھے اور وہ زوردار چیخ مار کر اٹھ کھڑا ہوا اور جدھر کو منہ پڑا، ادھری ہی کو دوڑ پڑا اور وہ جہاں سے اٹھا تھا وہاں بہت سارے چوہے دوڑ رہے تھے۔ وہ ہانپتا کانپتا کچھ ہی دور گیا ہوگا کہ سامنے دکھائی دینے والا منظر اسے دہشت سے ماردینے کے لئے کافی تھا۔

اس کے بالکل قریب سیاہ لبادے میں ملبوس ایک ہیولہ کھڑا تھا۔ وہ سرتا پیر لبادے میں ڈھکا ہوا تھا۔ چہرے کی جگہ پر دو انگارے اندھیرے میں دہکتے ہوئے نظر آرہے تھے اس نے ہاتھ میں بیلچہ اٹھا رکھا تھا جو اندھیرے میں بہت ہی عجیب وغریب ماورائی ہتھیار لگ رہا تھا۔ جس بھوت کو شاہد مسلسل اپنے پیچھے بھاگتا ہوا محسوس کررہا تھا وہ بھوت اس کے عین سامنے آچکا تھا۔ جو کہ اب کسی بھی لمحے اپنے نوکیلے دانتوں سے اس کا خون پی سکتا تھا۔ یہ آخری منظر تھا جو اس نے دیکھا۔ اس کے بعد وہ چکرا کر گر پڑا اور ہر قسم کے خوف سے بے نیاز ہوگیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو کچھ دیر تو اسے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ اچانک اسے قبرستان اور ایک ڈریکولا کا ہیولہ یاد آیا تو وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ یہ دیکھ کر اسے شدید حیرت اور خوشی ہوئی کہ وہ اپنے بیڈروم میں اپنے نرم اور آرام دہ بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ اور اس کے سامنے کرسی پر اس کا بچپن کا دوست انسپکٹر خالد بیٹھا ہوا تھا۔ خالد کو دیکھ کر وہ فوراً بیڈ سے اتر آیا۔ دائیں پنڈلی میں درد محسوس ہوا تو اس کو یاد آیا کہ ڈریکولا نے یہاں کاٹا تھا۔ ’’خالد تم یہاں کیسے؟ اور میں یہاں کس طرح پہنچا؟ میں تو وہاں قبرستان میں...... وہ ڈریکولا...... رات...... مجھے گھر تک کون لایا ہے۔‘‘ اس نے ہکلاتے ہوئے جلدی جلدی جتنے سوال اس منہ میں آئے خالد کے گوش گزار کردیئے۔ وہ خوشی سے پاگل ہوا جارہا تھا اس کو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ زندہ بچ چکا ہے۔

خالد کے ہاتھ میں اخبار تھا۔ جواب میں خالد نے ایک خبر کی نشاندہی کرتے ہوئے اخبار شاہد کی جانب بڑھادیا۔ ’’یہ دیکھ لو‘‘

خبر دیکھ کر شاہد کو اور زیادہ شدید جھٹکا لگا۔ اخبار میں شاہد کی تصویر چھپی تھی اور شہ سرخی میں لکھا ہوا تھا کہ فلاں جگہ کے رہائشی بہادر جوان نے پراسرار خونی قاتل گرفتار کروادیا۔ ’’بہادر جوان کی جگہ شاہد کا نام درج تھا‘‘ پراسرار خونی قاتل نے گزشتہ چند مہینوں سے کچھ علاقوں میں دہشت پھیلائی ہوئی تھی۔ وہ نوجوان لڑکیوں کو قتل کرکے ان کا سر موقع واردات ہی پر پھینک دیتا تھا اور دھڑ کو بوری میں بند کرکے قبرستان میں دفنا دیتا تھا اس نے اب تک پانچ قتل کردیئے تھے۔

’’خبر کے مطابق قاتل ایک نفسیاتی مریض تھا جو اپنی محبوبہ کی بے وفائی کے بعد تمام عورتوں کو قتل کرنے کا ارادہ کیے بیٹھا تھا۔

پولیس اپنی سرتوڑ کوشش کے باوجود اس قاتل کو اب تک گرفتار نہیں کرسکی تھی۔ شاہد کی مدد سے پولیس نے اسے قبرستان سے رنگے ہاتھوں گرفتار کرلیا، جب وہ نسیم نامی ایک نوجوان دوشیزہ کی لاش کو دفن کرکے واپس آرہا تھا۔

ذیل میں ایک اضافی خبر اور بھی درج تھی کہ قبرستان پر چھاپے کے دوران پولیس نے ایک نوسرباز ٹھگ عامل کو بھی گرفتار کرلیا ہے۔ عامل خاقانی بابا قبرستان میں اپنے گاہکوں کو بلاتا تھا جہاں اس نے ایک جدید پروجیکٹر نصب کررکھا تھا۔ وہ پروجیکٹر سے فضا میں تصویر دکھا سکتا تھا۔ اس پروجیکٹر کی مدد سے عامل بابا اور درگا دیوی نامی فرضی شیطانی قوت سے لوگوں کی ملاقات کرواتا اور ان سے لاکھوں روپے ٹھگ لیتا تھا۔‘‘ اخبار والوں نے دونوں کارنامے شاہد کے سرمنڈھ دیئے تھے۔ اور شاہد کی تعریف میں بڑھا چڑھا کر لکھا گیا تھا۔

’’یہ سب کیسے ہوا؟‘‘ شاہد نے حیرانی سے خالد سے پوچھا۔

’’تمہارا فون آیا تھا کہ میں قبرستان میں بھٹک

گیاہوں مجھے یہاں سے نکالو۔ تمہاری خوش قسمتی اور حسن اتفاق سے اس وقت میں قبرستان کے قریب موبائل کے ساتھ گشت پر تھا۔ لہٰذا فوراً ہی پہنچ گیا۔ وہ قاتل تمہارے سر پر بیلچہ مارنے والا تھا کہ ہم نے اسے گرفتار کرلیا پھر ہم نے قبرستان کو گھیرے میں لے لیا تو وہ عامل خاقانی بابا بھی گرفتار ہوگیا۔

''تمہیں اٹھا کر گھر لے آیا۔ میں نے سوچا چلو ہمارے یار کو ہیرو بننے کا بہت شوق تھا لہٰذا میں نے اخبار والوں کو اس طرح بریفنگ دی کہ گرفتاریوں کا کریڈٹ تمہیں بھی ملے جو تم اخبار میں پڑھ چکے ہو اور آج کا سارا دن تم اخبار والوں کو انٹرویو دیتے ہوئے گزارو گے۔ میں اب چل رہا ہوں۔ میری بھی ترقی ہونے کا امکان ہے۔ شام کو آؤں گا پھر تفصیل سے بات کریں گے۔'' یہ کہہ کر انسپکٹر خالد تیزی سے دروازے کی جانب بڑھ گیا اور وہ روکتا ہی رہ گیا۔

شاہد پھر سے بیڈ پر لیٹ گیا اور جان بچنے پر خدا کا شکر ادا کرنے لگا۔ اسے نیند آگئی۔ مسلسل دروازے کی اطلاعی گھنٹی بجنے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ کسمساتے ہوئے بیڈ سے اترا اور کڑوے منہ بناتا ہوا دروازے کی طرف چل دیا۔ اسے اس طرح نیند کا ٹوٹ جانا بہت برا لگا تھا۔

وہ خواب میں روبی کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے کھلے ہوئے تازہ گلاب کی طرح روبی کھڑی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں اخبار تھا اور دوسرے ہاتھ میں پھولوں کا گلدستہ تھا۔ روبی کو دیکھ کر اس کی سانسیں ایک مرتبہ پھر رک گئیں۔ اس نے سوچا کہ ابھی روبی سے معافی مانگ لے اور اسے بتادے کہ وہ اب کبھی اس کے خواب نہیں دیکھے گا لیکن اس کے منہ کھولنے سے پہلے ہی روبی بول پڑی۔ ''یہ پھول ہیں تمہارے لئے۔''

اس نے لرزتے ہاتھوں سے پھول لے لئے۔

''تمہیں ابو نے شام کو چائے پر بلایا ہے۔''

شاہد کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

''اور ہاں ابو کہہ رہے تھے کہ شاہد سے کہنا کہ اس کے خاندان میں کوئی بزرگ ہے تو وہ شام کو چائے پر اسے ساتھ لے کر آئے۔'' یہ کہہ کر وہ واپس جانے کے لئے مڑ گئی اور وہ گونگا کھڑا رہا۔ جاتے جاتے وہ پھر پلٹی۔ اس کے پلٹنے میں ایک خاص شرمیلی ادا شامل تھی۔ حالانکہ وہ بہت بولڈ اور آزاد خیال لڑکی تھی۔ ''اور ہاں یہ اخبار بھی تمہیں دینا تھا۔ شاید تم نے اب تک پڑھا نہیں ہوگا۔ مجھے تم جیسے بہادر اور مہم جو شریک سفر ہی کی تلاش تھی۔'' کہہ کر وہ تقریباً دوڑتی ہوئی سیڑھیوں تک پہنچی۔ پھر مسکرا کر شاہد کی جانب دیکھا جو دروازے پر کھڑا ہوا اسی کو تک رہا تھا اور وہ کھٹ کھٹ کھٹ سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔

دفعتاً فون کی بیل بج اٹھی اس نے دیکھا خالد کا نمبر تھا۔ اس نے کال ریسیو کی خالد کہہ رہا تھا کہ ''عامل خاقانی بابا نے تمہارا سب کیا دھرا بھی اگل دیا ہے اور تمہارے پچاس ہزار بھی برآمد کردیئے ہیں۔'' یہ سن کر اسے ایک مرتبہ پھر اپنی کشتی ڈوبتی نظر آئی۔ اسے ایک مرتبہ پھر روبی کی آنکھوں میں اپنے لئے نفرت اور حقارت نظر آئی۔ اگر خاقانی بابا کا قصہ روبی کو پتا چل جاتا تو روبی پھر اس کے ہاتھ سے نکل جاتی اس نے خالد سے کہنا چاہا کہ خالد پلیز کچھ کرو اور اس بات کو وہیں تھانے میں دفن کردو۔

مگر خالد اس کے کہنے سے پیشتر ہی بول پڑا۔'' لیکن تم گھبراؤ نہیں تمہارے پچاس ہزار میں نے عملے میں تقسیم کردیئے ہیں۔ کوئی زبان نہیں کھولے گا۔ یہ بات کسی اخبار تک نہیں پہنچے گی۔'' خالد نے یہ کہہ کر فون بند کردیا۔

اور شاہد سوچنے لگا کہ خدا نے اس کی توبہ کا صلہ کتنی جلدی دے دیا ہے پھر وہ اپنے ایک رشتے کے چچا کو فون کرنے لگا تاکہ انہیں شام کو روبی کے گھر چائے پر اپنے ساتھ لے جاسکے۔



اس کی بات سنتے ہی غیر ارادی طور پر میں نے
ہاتھ اپنے حلق پر رکھ لیا۔ جونہی اس کو چھوا درد سے
کراہ اٹھا۔ میری کراہ سنتے ہی وہ سب اکٹھے ہو گئے کچھ
زینوں سے کود پڑے۔ اس پرسکون آفیسر کی آواز
دوبارہ سنائی دی۔

''ہاں..... ایک کتا..... جیسا کہ میں نے کہا ہے
اگر ہم نے کچھ اور بتایا تو لوگ ہم پر ہنسیں گے اور
اعتبار نہیں کریں گے۔''

اس وقت ہم میونخ شہر کے مضافات میں تھے۔
ہمیں ایک بگھی اتفاقاً مل گئی۔ فوجیوں نے اس گاڑی
بان سے بات کی اور انہوں نے مجھے اس گاڑی میں بیٹھا
دیا جس نے ہمیں ہوٹل پہنچا دیا۔ نوجوان آفیسر میرے
ہمراہ تھا باقی دستہ گھوڑوں پر پیچھے تھا۔ کچھ واپس اپنی
بیرکوں میں چلے گئے تھے۔

جب ہم ہوٹل کے سامنے پہنچے تو ہرڈیل برک
بھاگتا ہوا باہر آیا اس کے انداز سے یوں لگتا تاہ جیسے وہ
میرا ہی منتظر تھا۔ میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر وہ مجھے آرام
سے اندر لے گیا۔ آفیسر نے مجھے سیلوٹ کیا اور واپسی
کے لئے مڑ گیا۔ میں نے اس کا ارادہ سمجھ کر اس کو اصرار
کر کے اپنے کمرے میں بلایا۔ وائن کا گلاس پیتے
ہوئے میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کے بہادر
فوجیوں کا بھی جنہوں نے مجھے بچایا۔ آفیسر نے بھی اپنی
خوشی کا اظہار کیا۔ ہرڈیل برک بھی ان کا شکریہ ادا
کر رہا تھا۔ اس کا لہجہ اور انداز ذومعنی تھا آفیسر نے بھی
اس کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ پہلے میں
یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ فوجی دستہ اتفاقاً وہاں آنکلا اور انہوں
نے مجھے بچا لیا مگر اب حالات سے یوں لگتا تھا جیسے وہ
وہاں صرف مجھے ہی کھوجنے گئے تھے ان کو میری مصیبت
کا علم تھا۔ اس لئے میں ہرڈیل برک سے دریافت
کرنے لگا۔

''لیکن..... ہرڈیل برک..... کیسے اور کیوں یہ
سپاہی میری تلاش کے لئے وہاں پہنچے؟''

اس نے لاپرواہی سے اپنے کندھے یوں
اچکائے جیسے وہ کچھ چھپانا چاہ رہا ہو۔

''مگر تم کو کیسے پتہ چلا کہ میں کھو گیا
ہوں.....؟'' میں نے پھر پوچھا۔

''آپ جس گاڑی میں یہاں سے روانہ ہوئے
تھے اس کا گاڑی بان اپنی ٹوٹی پھوٹی گاڑی کے ساتھ
سیدھا یہاں آیا اس کی گاڑی گھوڑوں کے بگٹٹ بھاگنے
کی وجہ سے ٹوٹ چکی تھی۔''

''مگر یقیناً..... تم صرف اس ایک وجہ سے ایک
فوجی دستہ میری تلاش میں نہیں بھیج سکتے تھے۔ اس گاڑی
بان کو علم نہیں تھا کہ میں کس مصیبت میں پھنسا ہوں وہ
تو مجھے صرف وہاں چھوڑ کر آ گیا تھا اس وقت ہر چیز
درست تھی۔''

''اوہ..... نہیں.....'' اس نے جواب دیا.....''
مگر جب گاڑی بان یہاں پہنچا مجھے ایک ٹیلی گرام اس
کی طرف سے ملا جس کے تم مہمان تھے.....'' پھر اس
نے اپنی جیب سے ٹیلی گرام کا ایک کاغذ نکالا اور مجھے
تھما دیا۔ میں اسے پڑھنے لگا اس میں لکھا تھا۔

''میرے مہمان کا خیال رکھو اس کی حفاظت
بہت ضروری ہے۔ اس کے ساتھ کچھ ہو سکتا ہے، یہ
بھٹک گیا ہے۔ اس کو ہر قیمت پر تلاش کرو اور اس کی
حفاظت یقینی بناؤ۔ وہ انگریز مہم جو ہے اس کے لئے
اس رات میں برف اور بھیڑیوں کے خطرات ہیں کوئی
لمحہ ضائع مت کرو۔ اگر اس کو کچھ نقصان پہنچا تو تمہیں
اس کا جواب دینا پڑے گا..... (کاؤنٹ ڈریکولا)

میں ٹیلی گرام اپنے ہاتھ میں تھامے اپنی جگہ
سن ہو کر رہ گیا۔ کمرہ گھومتا محسوس ہو رہا تھا اور
اگر ہرڈیل برک مجھے تھام نہ لیتا تو یقیناً میں فرش
پر گر جاتا۔ میں اس دور دراز ملک میں کس پراسرار ہستی
کی حفاظت میں تھا جو مختصر وقت میں مجھے برف کی نیند
اور خون آشام بھیڑیوں کے پنجوں اور جبڑوں سے بچا
کر نکال لے آیا۔





لقمۂ اجل

ایس امتیاز احمد - کراچی

محافظ نوجوان کے سامنے اچانک لرزہ براندام اور دل دہلاتا منظر رونما ہوا، چند آدم خوروں نے گائیڈ کو گھیر کر دبوچ لیا اور پھر بڑی بے دردی سے اسے بھنبھوڑنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا گوشت نوچنے لگے لیکن پھر......

لفظ لفظ سطر سطر خوف و ہراس کے بھنور میں ڈولتی ایک عجیب و غریب دلخراش کہانی

میری زندگی کا بیشتر حصہ خطرناک مہمات کو سر کرنے میں گزرا ہے اور میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ بارہا میری جان کو خطرہ لاحق ہوا لیکن کبھی میں خوف زدہ نہ ہوا لیکن افریقہ کے پرخطر جنگلات میں مجھے جو وحشت ناک اور رونگٹے کھڑے کردینے والے واقعات و حادثات پیش آئے ان کے تصور ہی سے آج بھی میری راتوں کی نیند حرام ہوجاتی ہے۔ اس خوف ناک مہم پر روانہ ہونے سے قبل میں بلند حوصلہ، انتہائی طاقت ور اور جری شخص تھا۔ میں ہر رکاوٹ کو سر کرنے اور ہر طاقت سے ٹکرا جانے کی ہمت رکھتا تھا۔ لیکن اس جہنم میں پھنس جانے کے بعد میرے حوصلے جواب دے گئے۔ میں یہاں سے جلد از جلد نکل بھاگنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن وہ کیا چیز تھی جس نے مجھے اس قدر خوف زدہ کردیا تھا؟ وہ چیز ایک کریہہ المنظر عفریت

تھا جو افریقہ کے گھنے جنگلات سے نکل کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ گو میرے پاس ریوالوار تھا لیکن جب میں نے ہولسٹر سے نکالنا چاہا تو یوں محسوس ہوا جیسے میری ہاتھوں کی قوت سلب ہوگئی ہو۔ یہ وہی درندہ صفت مخلوق تھی جس کی تلاش میں، میں نے افریقہ تک کا دشوار گزار طویل سفر طے کیا تھا۔ یہ وحشی مخلوق افریقہ کے ان گھنے جنگلات میں پائی جاتی ہے جہاں آج تک کسی کو جانے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔ یہ جنگلات دریائے پیراک کے شمال مغرب میں واقع ہیں۔

''بھاگو، خدا کے واسطے بھاگو!'' یہ آواز میرے ساتھی پیٹر کی تھی، پیٹر بھی انتہائی نڈر اور بلند حوصلہ نوجوان تھا، لیکن ان عفریتوں کو دیکھ کر اس کی سٹی بھی گم ہوگئی اور وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ میرے ساتھ ہی ہمارا گائڈ جونی کھڑا تھا ان عفریتوں کو دیکھ کر وہ خوف سے زمین بوس ہوگیا یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ دیوتاؤں سے زندگی کی بھیک مانگ رہا ہو۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب وہ عفریت اور آگے بڑھا تو میں نے ریوالور نکال کر دو گولیاں اس درندہ نما مخلوق پر چلائیں۔ لیکن اس عرصے میں وہ میرے گائیڈ جونی کو اٹھا کر بھاگا جا رہا تھا اور مجھے یہ بھی اچھی طرح یاد ہے کہ دونوں گولیاں اس ریچھ جیسے بالوں والی مخلوق کے چوڑے چکلے سینے میں پیوست ہوگئی تھیں۔ لیکن میرے تعجب اور خوف کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ انتہائی قریب سے چلائی جانے والی دو گولیاں بھی اس عفریت کا بال بیکانہ کرسکیں اور وہ شیطانی مخلوق ہمارے گائیڈ کو اٹھا کر برق رفتاری سے رفو چکر ہوگئی۔ یہ دیکھ کر میرے پسینے چھوٹ گئے اور میں دہشت سے تھر تھر کانپنے لگا اور میرا سارا بدن پسینے میں ڈوب گیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں ابھی نہا کر نکلا ہوں پھر بھی ہمت کر کے میں نے اس بھاگتے ہوئے عفریت کی پیٹھ میں دو گولیاں اور جھونک دیں۔

''یا خدا یہ تو ناقابل یقین واقعہ ہے۔ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا؟'' میں نے لازون کو کہتے سنا، وہ بھی خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔

''ہمیں اس کا پیچھا کرنا چاہئے۔'' میں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

''ہمیں جونی کو لانا ہوگا۔''

''لیکن بابو کو کیا ہوا؟ وہ کہاں گیا؟'' لازون نے گھبرا کر پوچھا۔

اس بلائے ناگہانی نے ہمارے ہوش و حواس معطل کردیئے تھے گھبراہٹ میں ہمیں دوسرے گائیڈ بابو کا خیال تک نہ آیا۔ بابو ایک تیس سالہ نہایت طاقت ور اور تندرست و توانا شخص تھا، بابو اور جونی صرف یہی دو گائیڈ ایسے تھے، جو دریائے سینکھو سے آگے ہمارے ساتھ آنے پر رضامند ہوگئے تھے، انتہائی خطرناک علاقہ ہونے کی بنا پر کوئی یہاں آنے کی جرأت بھی نہ کرتا تھا۔ ادھر ادھر دیکھا، لیکن بابو کا کہیں پتہ نہ تھا۔

''خیر اسے تو چھوڑو۔'' لازون نے کہا۔ آؤ اس عفریت کا پیچھا کریں۔''

ان درندوں کا پیچھا کرنا موت کے منہ میں جانا تھا اور ہم دونوں کو یہ بات بخوبی معلوم تھی لیکن یہ حقیقت تو اسی زوم عیاں ہوگئی تھی، جب ہم نے ستمبر 1915 میں فرانس کی اکیڈمی آف سائنس کی دعوت منظور کرلی تھی۔

اس مہم کے آغاز سے پہلے لیون میں پروفیسر ڈاکٹر پیری گرونڈن نے مہم کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا ''ہمیں حکومت افریقہ اور ریاست پیراک کا اجازت نامہ حاصل ہے کہ علم الانسان کے تین فرانسیسی ماہرین دریائے پیراک کے علاقے میں بڑے دانتوں والی اس وحشی مخلوق کے بارے میں تحقیقات کرسکتے ہیں، آپ دونوں نے چونکہ موزمبیق میں بہترین خدمات انجام دی ہیں، اس لئے میں آپ کو افریقہ جانے کی دعوت دیتا ہوں۔ لیکن اس دعوت نامے کو منظور کرنا نہ کرنا آپ پر موقوف ہے۔''

''جناب ہمیں یہ دعوت بسر و چشم منظور ہے۔'' میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی لازون بول پڑا۔ ''ہمیں کب جانا ہوگا؟'' اس نے بے صبری سے پوچھا۔

اس کی عجلت پسندی اور سادگی کو دیکھ کر پروفیسر گرونڈن مسکرا دیئے۔ اور نہایت ملائمت سے بولے۔ ''میرے خیال میں یہی مناسب رہے گا کہ آپ پورے غور و خوض کے بعد فیصلہ کریں کہ اس مہم پر جانا چاہتے ہیں یا نہیں۔ اچھا یہ تو بتایئے آپ دونوں پیراک اور افریقہ کے جنگلوں میں بسنے والے بڑے دانتوں والے انسان نما درندوں کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟''

میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''جناب ہم تو کچھ بھی نہیں جانتے، لیکن جاننے کے خواہش مند ہیں۔''

پروفیسر نے نہایت سنجیدگی سے ہمیں بتاتے ہوئے کہا۔ یہ 1950ء کا واقعہ ہے کہ کچھ فوجی، کمیونسٹ گوریلوں کا پیچھا کرتے ہوئے اس گھنے جنگل میں گھس گئے، وہاں انہوں نے اس خوف ناک مخلوق کو دیکھا، اس طرح مہذب دنیا کو پہلی بار اس عجیب و غریب انسانی مخلوق کا علم ہوا، اس کے بعد سے آج تک متعدد عینی شاہدوں نے اقرار کیا ہے کہ ان جنگلات میں ایک عجیب و غریب مخلوق موجود ہے جو آدم خور ہے۔''

''کیا وہ انسان ہیں جناب؟'' لازون نے فکر مند ہو کر پوچھا۔

''اس بارے میں ہم وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔'' پروفیسر نے اقرار کرتے ہوئے کہا۔ '' ہمیں افریقہ کے قدیم باشندوں کے محکمہ کے ڈائریکٹر آرلاتون سے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں، ان کے مطابق یہ مخلوق انسانی ہی ہوسکتی ہے۔ ہاں یہ بھی یاد رکھیئے کہ معاہدہ کے تحت افریقہ جانے والے افراد اپنے ساتھ صرف ایک ریوالور لے جا سکتے ہیں اور وہ بھی صرف اپنے دفاع کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ آپ لوگ سمجھ گئے؟''

ہم نے سر ہلا کر اقرار کیا۔

''اس مہم کا مقصد یہ ہے کہ اس مخلوق کے بارے میں تفصیل سے معلوم کیا جائے کہ وہ کہاں رہتی ہے، عادات و اطوار کیا ہیں، ان کا تعلق نسل انسانی سے ہے یا وہ حیوانی مخلوق ہے۔

آیئے میں آپ کو ان کے بارے میں تفصیل سے بتاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر پروفیسر نے ڈیسک پر رکھی ہوئی ایک فائل کو کھول کر بتایا۔

''اس سال جون کے مہینے میں ایک برطانوی باشندہ ایوان فیلڈ جس کی عمر اکتیس سال تھی، سمائی گائیڈوں کے ساتھ دریائے پیراک کے کنارے جنگلی جانوروں کی تصاویر اتار رہا تھا کہ اس نے ایک انجانی مخلوق کو دیکھا۔ دو عجیب و غریب درندے جن کا قد چھ فٹ تھا۔ ایک نر تھا اور ایک مادہ۔ دونوں انسانوں کی طرح چل رہے تھے، وہ انسانوں سے اس قدر مشابہ تھے کہ فیلڈ نے انہیں قدیم وحشی نسل کے افراد سے تعبیر کیا۔

جب سمائی باشندوں نے انہیں دیکھا تو وہ خوف زدہ ہو کر بھاگ نکلے اور فیلڈ تنہا رہ گیا۔ وہ دونوں وحشی فیلڈ کی طرف بڑھے جب ان کا فاصلہ سات فٹ کے قریب رہ گیا تو مادہ نے چھلانگ لگا کر کمر سے پکڑ لیا اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ فیلڈ سخت مزاحمت کے باوجود خود کو آزاد نہ کرا سکا۔

مرد نے فیلڈ کی ٹانگیں پکڑ لیں اور اس طرح وہ دونوں اسے تین میل دور جنگل میں گھسیٹ کر لے گئے۔ ایک صاف جگہ انہوں نے اسے زمین پر ڈال دیا۔ اس خوف ناک حادثے نے فیلڈ کو حواس باختہ کر دیا۔ لیکن موت کو سامنے دیکھ کر اس نے حواس مجتمع کئے اور انتہائی صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا۔ اس نے جنگلی جانوروں کی شکل و شباہت اچھی طرح ذہن نشین کر لی۔ اس کے بقول عورت کا رنگ کھلتا ہوا تھا، اور وہ افریقہ کے قدیم باشندوں سے قطعی مختلف تھی۔ اس کے تمام جسم پر بال تھے لیکن چھوٹے چھوٹے اور ملائم تھے اس کا سینہ عورتوں کی طرح تھا اور ٹانگیں کولہے اور ناک نقشہ بھی عورتوں جیسا تھا۔ لیکن سر انسانی سر سے کافی بڑا تھا۔ بڑی بڑی لٹیں اس کے شانوں پر لٹک رہی تھیں۔ ایک

بڑا فرق یہ تھا کہ اس کی آنکھیں انتہائی چھوٹی اور اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ ناک چھوٹی اور ہونٹ موٹے اور بھدے تھے، وہ خصوصیت جو انہیں عام انسانوں سے الگ کرتی تھی، ان کے سامنے کے دو بڑے بڑے لمبے اور خوف ناک دانت تھے جو اوپر کی جانب خم کھائے ہوئے تھے۔

فیلڈ یہ تمام خصوصیات اچھی طرح ذہن نشین کر ہی رہا تھا کہ اچانک مرد اس کے قریب آ کر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اس سے پہلے کہ فیلڈ سمجھ سکے اس کا ارادہ کیا ہے، مرد نے اس کی ٹانگ پکڑ لی اور منہ میں اس کی پنڈلی دبا کر گوشت کا ایک بڑا سا بوٹا اتار لیا۔

اس وقت آپ فیلڈ کی خوف اور دہشت کا خود اندازہ کر سکتے ہیں۔ جب اسے یہ احساس ہوا کہ یہ آدم خور درندہ اسے زندہ کھانا چاہتا ہے تو اس کا خون خشک ہو گیا۔" اتنا کہہ کر پروفیسر نے توقف کیا پھر کہنے لگے۔

"لیکن فیلڈ نے موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے انتہائی ہوشیاری اور آہستگی سے ریوالور نکالا اور جب درندہ اس کا گوشت کھانے میں مصروف تھا اس نے نشانہ لے کر آدم خور کے سر میں گولی داغ دی لیکن اب درد اور شدید تکلیف کی وجہ سے وہ سخت کرب میں مبتلا تھا۔ گولی کھاتے ہی درندہ اٹھا۔ لیکن فیلڈ نے دو گولیاں اس کے سینے میں اور جھونک دیں۔ پھر وہ بے ہوش ہو گیا، اسے ہوش آیا تو وہ تنہا تھا۔ وہ درندے جا چکے تھے، اسے کچھ خبر نہ تھی وہ کہاں ہے۔ اس نے اپنی پنڈلی کو سختی سے باندھا تاکہ خون نہ بہے، پھر سر کتا اور لڑکھڑاتا ہوا دریا کی طرف بڑھنے لگا۔

دو دن کی تگ و دو کے بعد اسے زندگی کے آثار نظر آئے۔ وہ ایک چھوٹی سی بستی میں جا پہنچا، اس کی حالت غیر دیکھ کر لوگوں نے اسے دس میل دور ایک دوسرے گاؤں میں پہنچا دیا جہاں ایک عیسائی راہب نے فیلڈ کو اسپتال بھجوا دیا۔ لیکن خون میں زہر سرایت کر جانے کی وجہ سے دس دن بعد وہ مر گیا۔

"کیا اس کی موت زخم سے واقع ہوئی تھی؟" لازون نے پوچھا۔

پروفیسر گرونڈن بولے۔ "ہمیں بس اتنا ہی معلوم ہے کہ اس کی موت زہر پھیل جانے سے ہوئی تھی لیکن یہ ہماری بڑی خوش قسمتی ہے کہ مرنے سے پہلے اس نے ڈاکٹر کو تمام واقعات بتا دیئے۔"

"جناب آپ ان آدم خوروں کے بارے میں، بس اتنا ہی جانتے ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"نہیں اس کے علاوہ بھی ہمیں کچھ واقعات معلوم ہوئے ہیں۔" پروفیسر بولے پھر فائل کے حوالے سے کہنے لگے۔ "یہ 16 اکتوبر 1955ء کا واقعہ ہے کہ اس جنگلی مخلوق میں سے ایک کو ترولک کے علاقے میں ایک نوجوان لڑکی نے دیکھا۔ اس عفریت کو دیکھ کر وہ ڈر کے مارے چیخ پڑی۔ چیخ سن کر لوگ اس کی مدد کو دوڑ پڑے اور انہوں نے بھی اس جنگلی کو دیکھا کہ سرپٹ بھاگتا ہوا گھنے جنگل میں گم ہو گیا۔ پھر یہ 17 اگست 1957ء کا واقعہ ہے، جو کہ بین نامی ایک برطانوی پولیس نے افریقہ کے نہری علاقے میں اس جنگلی انسان کو دیکھا۔ وہ کمیونسٹ گوریلوں کا پیچھا کرتے ہوئے گھنے جنگلوں میں جا گھسا تھا۔ پہلے تو وہ اسے گوریلا سمجھا، پھر اس نے اندازہ لگایا کہ یہ تو کوئی دوسری انسان نما مخلوق ہے، اس کے بیان سے فیلڈ کے بیان کی تصدیق ہوئی۔

1957ء میں اسی علاقے میں برطانوی کیپٹن ایڈورڈ ہالینڈ اپنے ساتھیوں کے ساتھ پیراشوٹ کے ذریعے اترا، وہاں اس نے ان جنگلیوں کو دیکھا اور گولی چلا دی۔ لیکن اسے معلوم نہ ہو سکا کہ گولی نشانے پر لگی یا نہیں۔ کارپورل ایڈورڈ ونر اور پرائیویٹ جان تھارٹن نے جو اس کے ساتھ تھے اس عجیب و غریب مخلوق کا پیچھا کیا اور کئی گولیاں چلائیں گو انہیں یقین تھا کہ گولیاں نشانے پر لگی ہیں لیکن وہ مخلوق گھنے جنگلوں میں روپوش ہو گئی اور پھر ان کا پتہ نہ لگا سکے۔

پیراک میں ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اس وحشی مخلوق نے سائی قبیلے کی متعدد عورتوں اور مردوں کو اغوا

کرلیا اورانہیں کھا گئے۔ یہ آدم خور انہیں گھسیٹ کر میلوں دور گھنے جنگلوں میں لے جاتے ہیں، جہاں عام انسانوں کا قدم رکھنا بھی ناممکن ہے۔ پھر وہاں سب بیٹھ کر اطمینان سے شکار کو کھاجاتے ہیں۔ فرانسیسی قونصل سے معلوم ہوا ہے کہ چھ ہفتہ قبل تین آدم خوروں نے دریائے سلم کے کنارے ایک گاؤں پر حملہ کردیا اور دو نوجوانوں اور ایک لڑکی کو اٹھا کر لے گئے، لڑکی کی ادھ کھائی لاش گاؤں سے ایک میل دور مل گئی لیکن نوجوانوں کا آج تک سراغ نہ مل سکا۔

اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ مہم کتنی خطرناک اور غیر معمولی قسم کی ہے۔ ان آدم خوروں کے بارے میں ہمیں اور بھی باتیں معلوم ہیں لیکن وہ سب ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ ٹروح نامی علاقے میں برطانوی محکمہ جنگلات کے افسراعلیٰ مسٹر مچل نے بھی جنوری 1958ء میں دو جنگلیوں کو دیکھا تھا، وہ پچاس پولیس والوں کو لے کر ان کے تعاقب میں گئے لیکن وہ ہاتھ نہ لگے۔ کیونکہ افریقہ کے اس علاقے میں جنگل بہت گھنا اور خطرناک ہے۔ اس میں قدم رکھنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔"

گو ہم دونوں نے متعدد انتہائی خطرناک مہمات میں حصہ لیا تھا اور بارہا موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نکل آئے تھے لیکن اس مہم نے حقیقتاً ہماری حالت دگرگوں کردی، کیونکہ یہاں تو مقابلہ آدم خوروں سے تھا۔ میں نے لازون کے تاثرات کا اندازہ کرنے کے لئے اس کی طرف دیکھا۔ لازون بھی کوئی معمولی شخص نہ تھا، وہ انتہائی نڈر اور خطرات میں کود پڑنے والا مہم جو تھا۔ ہم دونوں نے فرانس کی خفیہ تحریک کی جانب سے دشمنوں کے خلاف حصہ لیا تھا اور چند ماہ قبل ہی کانگو میں دریائے نائجر کے قریب موت کے چنگل سے نکل آئے تھے۔ یہ مہم چونکہ ہمارے لئے چیلنج کی حیثیت رکھتی تھی اس لئے ہم نے اسے قبول کرلیا اور ہم سفر کی تیاریوں میں مصروف ہوگئے۔

دو ہفتے بعد ہم نے افریقہ کی سرزمین پر قدم رکھا۔ دریائے پیراک کے کنارے پہنچ کر ہم نے آئندہ اقدام کے بارے میں مشورہ کیا۔ ہمیں ان درندوں کا علاقہ معلوم نہ تھا۔ سرکاری رپورٹوں کے مطابق پیراک سے لے کر دریائے سلم تک وسیع وعریض علاقے میں لوگوں نے اس مخلوق کو گھومتے پھرتے دیکھا تھا لیکن زیادہ خیال یہ تھا کہ وہ دریائے سنگوہ کے آس پاس بھی بودوباش رکھتے ہیں۔

ہمارے پاس دفاع کے لئے صرف ایک ریوالور اور ایک شکاری چاقو تھا۔ لیکن ہم بالکل خوف زدہ نہ تھے اس لئے کہ ہم دونوں کے نشانے پر بے خطا تھے، ہم دونوں فوجی تربیت یافتہ تھے اور جنگ میں عملی طور پر حصہ لے چکے تھے۔ اب ہم اس وحشی آدم خور مخلوق سے دودو ہاتھ کرنے آئے تھے۔ ہمیں ان کے فوٹو بھی اتارنے تھے اور ان کی عادات وخصائل کا قریب سے جائزہ لینا تھا۔ ہمارے ساتھ گائیڈ بھی تھے لیکن جلد ہی ہمیں محسوس ہونے لگا کہ یہ گائیڈ ہمارے کسی کام کے نہیں، وہ ہماری مدد کرنے کے بجائے ہم پر بوجھ بن گئے تھے۔ ہم جس علاقے میں جارہے تھے اس سے وہ قطعی ناواقف تھے۔ اگر انہیں رات کو پہرہ دینے کے لئے تعینات کیا جاتا تو کچھ دیر بعد دونوں خواب خرگوش کے مزے لوٹنے لگتے تھے۔ اس پرخطر علاقے میں ذرا سی لغزش بھی ہمیں موت سے ہم کنار کرسکتی تھی، اس لئے ہم نے خود ہی باری باری پہرہ دینے کا فیصلہ کیا۔ نو بجے رات سے ایک بجے تک میں پہرہ دیتا تھا، ایک بجے سے صبح تک لازون رکھوالی کرتا تھا پہلی شب ہی ہمیں ایک خطرناک حادثے سے دوچار ہونا پڑا۔

پہرہ دیتے وقت میں نے خفیف سی آہٹ سنی۔ یہ آواز قریبی جنگل سے آئی تھی، میری چھٹی حس نے مجھے خطرے کا احساس دلایا۔ میں نے غور سے دیکھا تو دوشعلہ بار آنکھوں کو جھاڑیوں سے جھانکتے پایا۔ میں نے لازون کا شانہ ہلا کر اسے ہوشیار کیا اور ساتھ ہی خاموش رہنے کا اشارہ دیا۔

ابھی لازون اٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک وحشی

درندہ جنگل سے نکل کر ہمارے سامنے آ کھڑا ہوا، اس کے ساتھ ہی بجلی کی سی پھرتی سے لازون کے ریوالور سے شعلہ نکلا، ابھی اس کے فائر کی آواز گونج ہی رہی تھی کہ میرے ریوالور سے دو گولیاں اور شیر کی پیشانی میں پیوست ہوگئیں۔ لیکن یہ درندہ اتنا طاقت ور اور جری تھا کہ تین گولیاں کھانے کے بعد بھی غیظ و غضب میں دھاڑتا ہوا ہم پر آ پڑا۔ میں گولی چلانے کے لئے ریوالور اٹھا ہی رہا تھا کہ اس نے میرے شانے پر حملہ کردیا اور اسے چشم زدن میں ادھیڑ کر رکھ دیا درد و کرب سے میری جان نکل گئی، اس کا منوں وزنی لاشہ مرے اوپر تھا۔ لازون نے تین فائر اور کئے، اتنی گولیاں کھانے کے بعد درندے کی گرفت ڈھیلی پڑی اور وہ مجھ پر ہی گر پڑا۔ کافی جدوجہد کے بعد میں خود کو آزاد کرا سکا۔ لیکن لازون کو اب بھی یقین نہ تھا کہ وہ مر چکا ہے اس نے دو گولیاں اور اس کے دل کے قریب پیوست کردیں۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ سائی گائیڈوں پر بھروسہ نہ کرکے ہم نے خود ہی پہرہ دینا شروع کردیا تھا ورنہ آج ہم زندہ نہ ہوتے، ہم نے ان سے پوچھا ''رات کو جو حادثہ پیش آیا اس وقت وہ کیا کر رہے تھے؟''

تو ہمیں بڑا تعجب ہوا، جب وہ بولے۔ ''ہم تو سو رہے تھے۔''

کیونکہ میں شدید زخمی تھا اور بہت سا خون نکل جانے کی وجہ سے کمزور بھی ہوگیا تھا۔ اس لئے ہم نے دو دن تک آرام کیا، پھر وہاں سے چار میل دور جا کر پڑاؤ ڈالا، ناشتے کے بعد آٹھ بجے سائی مددگاروں کو لے کر ہم گھنے جنگل میں داخل ہوتے وقت احتیاطاً درختوں پر نشان لگاتے گئے تاکہ راستہ نہ بھٹک جائیں، آگے جھاڑیاں بہت گھنی اور خطرناک تھیں، ہم انہیں کاٹتے ہوئے آگے بڑھے موسم نہایت گرم تھا ہم پسینے میں نہائے ہوئے تھے۔

''یا خدا!'' لازون چیخا۔ ''وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب ہم اس مہم پر روانہ ہوئے تھے، تم پیرس وائر لیس پر پیغام بھجواؤ کہ ہم آگے نہیں بڑھ سکتے اور اس مہم سے دست بردار ہوتے ہیں۔''

لازون کی اس بات پر میں مسکرائے بنا نہ رہ سکا اور بولا۔ ''بس گھبرا گئے ہمت کیوں ہارتے ہو، ہمارے لئے یہی کیا کم فخر کی بات ہے کہ ہم اس سرزمین پر چل رہے ہیں جہاں آج تک کسی انسان کے قدم نہیں پہنچے۔'' ابھی میں اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ لازون کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''اوہ میرے خدا، ذرا دیکھو تو سہی۔''

جوں ہی میں مڑا، میری نظریں ایک انتہائی بدصورت اور خوف ناک انسانی چہرے پر پڑیں اور میں خوف سے لرز گیا، اس انسان نما درندے نے جوبنی کو اپنے منہ میں دبا رکھا تھا اور دو خوفناک بڑے بڑے دانت باہر نکلے ہوئے تھے لیکن وہ تھا کوئی انسان ہی، جسم پر گھنے بال تھے اور اس کا رنگ افریقہ کے قدیمی باشندوں سے زیادہ صاف تھا۔ ہم دونوں نے اس خوفناک مخلوق کا پیچھا کرنا شروع کردیا۔ راستہ انتہائی دشوار اور خطرناک تھا۔ پسینے کی وجہ سے ہاتھ سے ریوالور بھی پھسلا جا رہا تھا، ہماری ٹانگیں زخمی ہوگئی تھیں اور جگہ جگہ سے خون رس رہا تھا لیکن ہر تکلیف سے بے نیاز ہم اس درندے کا پیچھا کر رہے تھے جو ہمارے گائیڈ جوبنی کو اٹھائے لئے جا رہا تھا۔ ہم اسی کے بنائے ہوئے راستے پر چلے جا رہے تھے۔

بے چارہ جوبنی۔ اتنی دور گھسیٹے جانے پر تو وہ مر ہی گیا ہوگا۔

چلتے چلتے ہم تھکن سے چور ہوگئے۔ ہمارا سانس پھول گیا اور پیاس کے مارے حلق میں کانٹے پڑ گئے۔ ایک درخت کا سہارا لے کر چند گھونٹ پانی پیا اور ہم آگے بڑھنے ہی والے تھے کہ ایک غراہٹ سنائی دی۔ لازون نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ خوف سے اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ اس کا ہاتھ ریوالور پر تھا۔ آواز ہماری بائیں جانب سے آئی تھی۔ اس طرف اس نے اشارہ کیا اور نہایت دبے پاؤں چلنے لگا تاکہ ہماری

موجودگی ظاہر نہ ہو سکے، چند منٹ بعد ہم ایک کھلی جگہ پر آ گئے یہ نشیبی علاقہ ایک وادی کی طرف جاتا تھا، ابھی ہم غراہٹوں کی سمت متعین کر ہی رہے تھے کہ سبز رنگ کے ایک سانپ نے درخت سے اچھل کر لازون کے شانے پر ڈس لیا۔

وہ درد سے چیخ اٹھا، میں نے فوراً اس تین فٹ لمبے سانپ کی گردن دبوچ لی اور شکاری چاقو سے اس کی گردن اڑا دی، لازون دوزانو ہو گیا، میں نے فوراً سرنج نکال کر انجکشن لگایا تاکہ زہر کام نہ کر سکے، مجھے اس سانپ کا اثر معلوم نہ تھا۔ نہ ہی یہ معلوم تھا کہ زہر کتنی دیر بعد اثر کرتا ہے کیونکہ اس علاقے میں ایسے متعدد زہریلے سانپ موجود تھے جن کے بارے میں ہمیں کوئی علم نہ تھا پھر میں نے تیز دھار چاقو سے لازون کے شانے پر زخم کے قریب گہرے گھاؤ لگائے، اس کے بازو سے خون کا فوارہ پھوٹ نکلا اور پھر دو منٹ بعد میں نے زخم کو باندھ دیا۔

''کیا تم آگے چل سکو گے؟'' میں نے پوچھا۔ ''واپس چلیں؟''

''کیا مطلب؟ تم چاہتے ہو فرانس سے ہزاروں میل کا سفر طے کر کے یہاں آئیں اور خالی ہاتھ واپس چلے جائیں؟ نہیں ہرگز نہیں ہم آگے چلیں گے۔'' اس نے نہایت پامردی سے جواب دیا لیکن میں آگے بڑھنے کے خلاف تھا، اس لئے کہ لازون کو زہریلے سانپ نے کاٹا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا، میں نے اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔ ''ہم ابھی واپس چلتے ہیں جب تمہاری حالت ٹھیک ہو جائے گی تو ہم پھر مہم پر روانہ ہو جائیں گے۔'' میں نے کہا۔

لیکن اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''نہیں ہم واپس نہیں جائیں گے۔''

بہر حال ہم آگے بڑھے، اب غراہٹ صاف سنائی دے رہی تھی، یہاں تک کہ ہم آواز کے بالکل قریب پہنچ گئے، ہم لوگ مغربی افریقہ میں کچھ دن

محبت کیا ہے؟

محبت ایک انمول احساس ہے، ایک ان دیکھا جذبہ، ان دیکھی خوشی ہے۔ محبت ایک بیش قیمت خوشبو ہے جو کائنات کو معطر کر دیتی ہے۔ زمین کے سفر میں اگر کوئی چیز آسانی ہے تو وہ محبت ہے، محبت سے آشنا ہونے والے کی زندگی نثر سے نکل کر شعر میں داخل ہو جاتی ہے۔ وہ ہنستا ہے تو بے سبب روتا ہے بلا جواز محبت کی عمارت میں داخل ہونے والا ہر فرد کسی بھی داستان الفت کو کم و بیش اپنا ہی قصہ سمجھتا ہے وہ اپنے غم کا عکس دوسروں کے افسانوں میں محسوس کرتا ہے۔ ہم لحہ وقت جس ذات کے قریب رہنا چاہتے ہیں وہ کوئی بھی ہو وہی محبوب ہوتا ہے اور محبوب - حال میں حسین ہوتا ہے کیونکہ حسن تو دیکھنے والے کا اپنا انداز نظر ہوتا ہے، محبت نصیب والوں کو حاصل ہوتی ہے یہ کوشش یا محنت سے کبھی حاصل نہیں ہوتی اور جس کو حاصل ہو جائے اس کی منزل پایہ تکمیل کو پہنچ جاتی ہے اسے کسی اور چیز کی خواہش اور حسرت باقی نہیں رہتی۔

(راجہ باسط مظہر۔ حامد جھنگی)

گزار چکے تھے۔ ہم نے اندازہ لگایا کہ یہ آوازیں بون کی آوازوں سے مشابہہ تھیں۔ ''وہ کہاں ہیں؟'' لازون نے غنودگی کے عالم میں پوچھا۔

میں اسے آدھے گھنٹے سے دیکھ رہا تھا، اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی اور اسے معلوم ہی نہ تھا کہ قدم کہاں پڑ رہے ہیں۔ نہ ہی اسے زخموں کی پرواہ تھی۔ یہ صورتحال بہت خطرناک تھی اس لئے کہ کوئی بھی زہریلا سانپ یا مکڑی اسے ڈس سکتی تھی۔ ہم ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھ رہے تھے۔ اب ہماری رفتار بہت سست تھی کچھ دیر بعد سورج غروب ہونے والا تھا اور مجھے یہ فکر بھی دامن گیر تھی کہ اندھیرا پھیلنے سے قبل ہر صورت میں کیمپ میں پہنچنا ہے۔ اس پرخطر اور اجنبی جنگل میں جہاں قدم قدم پر موت منہ پھاڑے کھڑی تھی، رات بسر کرنا زندگی سے ہاتھ دھونے کے مترادف تھا، شیر، چیتے، زہریلے سانپ اور مکڑیاں اس علاقے میں کثرت سے تھیں، مکڑیاں بھی اتنی زہریلی آن واحد میں انسان موت سے ہمکنار ہوجائے۔

''گونج!'' اچانک لازون بولا جیسے خود سے باتیں کررہا ہو۔

''گونج سے تمہارا کیا مطلب ہے؟'' میں نے پوچھا، شاید سانپ کے زہر نے اس کے حواس معطل کردیئے تھے اور وہ غنودگی میں بڑبڑا رہا تھا۔

''ارنسٹ یہ وادی ایسی ہے جہاں آواز گونجتی ہے، یہاں آوازیں دھوکا دیتی ہیں، آواز کسی طرف سے ہے اور محسوس یہ ہوتا ہے کہ کہیں اور سے آرہی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے مغرب کی طرف اشارہ کیا۔

''تو آواز کدھر سے آرہی ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''شمال سے'' لازون بولا۔ اس وقت وہ سخت تکلیف میں تھا۔ یہ آوازیں یقیناً شمال سے آرہی ہیں تم اسی طرف بڑھو میں بھی پیچھے پیچھے آرہا ہوں۔'' وہ بولا۔ میں نے گھڑی دیکھی تین بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ کیمپ تک پہنچتے پہنچتے دو گھنٹے اور لگ جاتے۔ کیونکہ میں اس کی حالت سے مطمئن نہ تھا، میں اس سے واپس چلنے پر اصرار کرتا رہا۔ ابھی ہم یہ باتیں کرہی رہے تھے کہ سامنے ایک سات فٹ اونچا باڑ نظر آیا لکڑی کا یہ باڑ اور درخت کی چھالوں سے بندھا ہوا تھا۔ میں نے لازون سے پوچھا۔ ''یہ باڑ دیکھتے ہو؟''

لازون نے نگاہ پرزور ڈالتے ہوئے دیکھا۔ لیکن بے سود، میں سمجھ گیا کہ سانپ کے زہر نے اس کی نگاہ پر بھی اثر ڈالا ہے۔ بعض سانپ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا زہر انسان کو اندھا کردیتا یا جسم اکڑ جاتا ہے اور انسان کی موت واقع ہوجاتی ہے۔ بہرحال کچھوے کی رفتار سے ہم رینگتے ہوئے باڑے کے قریب جا پہنچے، یہ باڑا بیس گز لمبا تھا اور ایک طرف کو مڑ گیا تھا، دوسری جانب پندرہ گز لمبا تھا پھر مڑ گیا تھا۔

''لازون۔'' میں نے سرگوشی کی۔ ''ہم اس باڑے کے ساتھ ساتھ چلیں گے، ہوسکتا ہے کہ آگے چل کر ہم صاف طور پر کچھ دیکھ سکیں۔'' میں آگے آگے چل رہا تھا، ابھی دس بارہ قدم ہی چلا تھا کہ میں نے محسوس کیا کہ لازون کے قدموں کی چاپ سنائی نہیں دے رہی ہے، میں نے مڑ کر دیکھا تو لازون کو سر پکڑے جھکے ہوئے پایا تو میں نے دوڑ کر اسے سہارا دیا۔

''مجھے نیند آرہی ہے۔ میرا سر چکرا رہا ہے۔''

لازون بولا۔ پھر اس نے سر کو جھٹکا دیا اور بولا۔ ''تم فکر نہ کرو، میں ابھی ٹھیک ہوجاؤں گا۔'' میں نے اسے برانڈی پلائی پھر وہ بولا۔ ''ارنسٹ تم آگے بڑھو، واپسی پر میں تمہیں یہیں ملوں گا۔''

''نہیں ہرگز نہیں، یہ کبھی نہیں ہوسکتا، میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

یہ جنگل اتنا خطرناک تھا کہ ہر لمحے کسی درندے کے حملہ آور ہونے کا خدشہ لگا رہتا تھا۔ اچانک مجھے بھی ڈر محسوس ہونے لگا، کیونکہ لازون کی غیر حالت نے

حالات بہت سنگین کر دیئے تھے۔ میں اس منحوس گھڑی کو کوسنے لگا جب ہم نے اس منحوس مہم پر روانہ ہونے کا ارادہ کیا تھا۔

جبکہ ہم اس سے قبل بارہا موت کے منہ سے نکل کر آئے تھے اور متعدد انتہائی خطرناک مہمات میں حصہ لیا تھا۔ لیکن نہ معلوم کیوں اس وقت شدید گھبراہٹ اور خوف سے دوچار تھا۔ میرے ہوش حواس معطل ہو گئے تھے، رہ رہ کر مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم کسی سنگین حادثے سے دوچار ہونے والے ہیں، پھر لازون لڑکھڑاتے ہوئے اٹھا اور کہنے لگا۔ ارنسٹ آؤ اس باڑے کو دیکھ لیں پھر ہم واپس چلیں گے۔"

"مگر کچھ دیر بعد تو اندھیرا چھا جائے گا اور اس خطرناک جنگل میں ہم راستہ کیسے تلاش کریں گے؟" میں نے کہا۔ "آؤ واپس چلیں، مگر لازون بھلا کب میری بات ماننے والا تھا۔" وہ بولا۔ "ہرگز نہیں۔"

میں اسے اس ارادے سے باز نہ رکھ سکا۔ چاروناچار ہم آگے بڑھے اس چھوٹے سے خطے کو پار کرنے میں ہمیں ایک گھنٹہ لگ گیا۔ موڑ پر پہنچے ہی اچانک میں نے سامنے دیکھا اور لازون کا شانہ پکڑ اسے بھی دکھایا۔ سامنے میدان میں وہی خوفناک بڑے دانتوں والے جنگلی انسان بیٹھے تھے۔ ان میں کچھ عورتیں تھیں، ان کی شکل وشباحت اور ڈیل ڈول پروفیسر گروینڈن کے بتائے ہوئے حلیئے سے ملتی جلتی تھی، ہم سے چالیس قدم کے فاصلے پر وہ نصف دائرے میں بیٹھے تھے۔ "یا میرے خدا" میرے منہ سے نکلا، سامنے منظر انتہائی خوف ناک اور رونگٹے کھڑے کر دینے والا تھا۔ ان آدم خوروں کے سامنے ایک انسانی لاش پڑی تھی پھٹے ہوئے لباس سے میں نے پہچان لیا، وہ ہمارے گائیڈ کی لاش تھی۔

وہ آدم خور اسے نہایت بے دردی سے نوچ نوچ کر کھا رہے تھے، ہر آدم خور مزے لے لے کر اس کا کچا گوشت نوچ نوچ کر کھانے میں مشغول تھا۔ وہ وحشت ناک منظر دیکھ کر میرے ہوش وحواس گم ہو گئے مجھے یہ بھی خیال نہ رہا کہ لازون میرے قدموں میں گرا پڑا ہے، اس کا سر اس کے ہاتھوں میں تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ دعا مانگ رہا ہو۔ میں نے فوراً جھک کر اسے دیکھا، اس وقت ہم سخت خطرے میں تھے جلد یا بدیر ان جنگلوں کو ہماری موجودگی کا علم ہونا لازمی تھا اور ان کے سامنے ہمارے ریوالور بھی ناکارہ تھے۔ ہوسکتا تھا کہ ہم دوچار کو ختم کر دیتے لیکن آخرکار وہ ہم پر قابو پا لیتے ہمیں بھی اپنا حشر گائیڈ جیسا ہوتا نظر آیا۔ میرا اندازہ یہ تھا کہ وہ کسی قدیم نسل کے انسان تھے جو موجودہ دور اور ترقی یافتہ دنیا سے قطعی نابلد تھے گھنے جنگلوں میں ان کا ٹھکانہ تھا، گو وہاں انسان کا گزرنا ممکن تھا لیکن کمیونسٹوں کا پیچھا کرتے ہوئے فوجیوں نے انہیں یہاں دھکیل دیا تھا۔

میں نے لازون کو ٹھوکا مارا لیکن وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ میں نے اسے اٹھانا چاہا تو اس کا سر ڈھلک گیا۔ اگر میں اسے پکڑ نہ لیتا تو وہ زمین پر زور سے گرتا اور وحشیوں کو فوراً ہی ہماری موجودگی کا علم ہو جاتا، ہم ان آدم خوروں کے اتنے قریب تھے کہ ان کے بولنے اور حرکت کرنے کی آوازیں صاف سن رہے تھے۔ لیکن خوش قسمتی سے وہ ہمارے گائیڈ کی لاش کھانے میں ایسے منہمک تھے کہ ہماری موجودگی سے قطعی بے خبر تھے، انہوں نے گائیڈ کو زندہ ہی کھانا شروع کر دیا تھا اور اس بات کا خطرہ تھا کہ اگر لازون کے منہ سے آواز نکل گئی تو یہ جنگلی ہماری موجودگی سے باخبر ہو جائیں گے اور پھر ہمارا زندہ بچنا ناممکن ہوگا۔

بہرحال نہایت آہستگی سے میں نے اسے اٹھایا اور کمر پر لاد کر واپس ہوا۔ ابھی میں چند قدم ہی چل پایا تھا کہ تیز غراہٹ سنائی دی مڑ کر دیکھا تو ایک دیوقامت آدم خور ہاتھ میں گائیڈ کے گوشت کا ایک ٹکڑا لئے ہمیں گھور رہا تھا اسے دیکھ کر میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ میں لازون کی دو من وزنی لاش کو پیٹھ پر اٹھا کر پوری قوت سے بھاگ نکلا۔ جوں ہی میں جنگل میں داخل ہوا باڑے سے کچھ کھسر پھسر کی آوازیں

آ ئیں، میں اندھیرا ہونے سے قبل ہی کیمپ پہنچنا چاہتا تھا لیکن اب دعا مانگ رہا تھا کہ جلد سے جلد اندھیرا چھا جائے اس لئے کہ اب اندھیرا ہی ان وحشیوں کے چنگل سے بچا سکتا تھا۔

اس وقت میں سخت خوف زدہ تھا۔ میرا بدن پسینے سے شرابور تھا اور میں جلد سے جلد ان عفریتوں کی پہنچ سے دور نکل جانا چاہتا تھا اب میرا سانس پھول چکا تھا اور تھکن سے ایک قدم بڑھانا بھی دشوار تھا۔

اچانک میں نے لازون کے جسم میں حرکت محسوس کی میں نے اسے آہستہ سے زمین پر بیٹھا دیا اور پوچھا ''کیا اب وہ ٹھیک ہے؟''

''ہاں اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' وہ بولا۔

میں نے اسے بتایا کہ وہ آدم خور مخلوق ہمارا پیچھا کررہی ہے، دور سے ہم نے ان کی غراہٹیں سنی تھیں لیکن شاید وہ ہمارا پیچھا نہیں کررہے تھے میں نے پوچھا۔ ''لازون کیا تم چل سکتے ہو؟''

''ہاں اب میں سہارے سے چل سکتا ہوں۔'' وہ سرگوشی میں بولا۔

رات بھر ہم اس خطرناک جنگل میں چلتے رہے۔ اندھیرے میں خاردار جھاڑیوں سے الجھتے رہے اور صبح کو مرتے کھپتے، گرتے پڑتے دریا کے کنارے جا پہنچے۔ ہمارے جسم کے ہر حصے سے خون رس رہا تھا اور ہم تھکن سے چور چور تھے۔ اب ہم مغرب کی جانب چل دیئے تاکہ کیمپ پہنچ سکیں لیکن سامنے جنگل اتنا گھنا ہوا چلا تھا کہ آگے جانے کی ہمت نہ ہوئی۔

''ہم یقیناً راستہ بھٹک گئے ہیں۔'' میں نے لازون کو بتایا ہم رک گئے۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کرنا چاہئے کہ سامنے دریا میں ایک کشتی آتی نظر آئی۔ پہلے تو مجھے خوف محسوس ہوا کہ یہ کشتی کہیں آدم خوروں کی نہ ہو۔ لیکن قریب آنے پر دیکھا کہ اس میں پیراک کا ایک پولیس والا بیٹھا تھا، اسے دیکھ کر میں خوشی سے چلا اٹھا، کشتی کو چار مقامی باشندے چلا رہے تھے کشتی قریب آکر رکی چند لمحے پولیس والا ہمیں غیر یقینی انداز میں گھورتا رہا۔ پھر اس نے کچھ کہا اور کشتی سے نکل کر ہمارا استقبال کیا، ہماری طرح وہ بھی انگریزی زبان سے نابلد تھا لیکن پھر بھی اشاروں سے اس نے سمجھ لیا تھا کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔

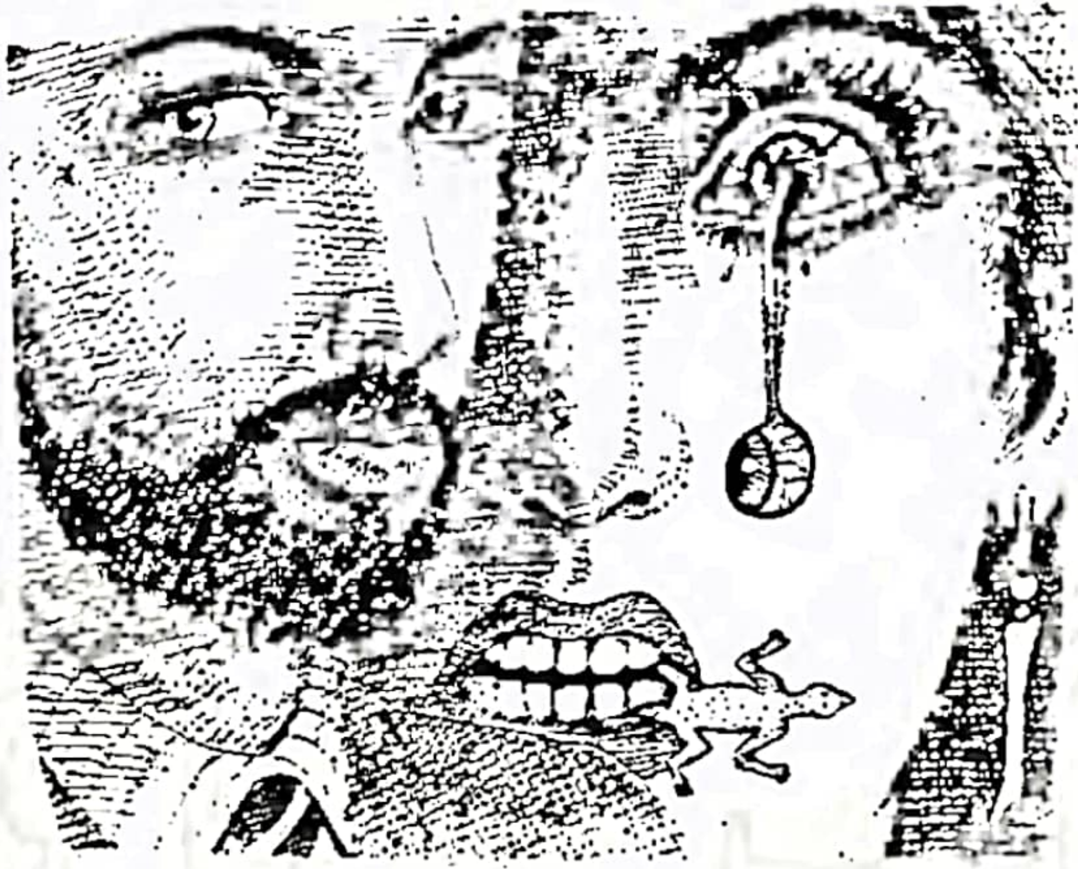
ہم کالاگر جانا چاہتے تھے۔ وہ خود وہاں نہیں جانا چاہتا تھا لیکن اس نے یقین دلایا کہ وہ ہمیں وہاں بھجوا دے گا۔

وہ پارٹی اصل میں ایک مفرور قاتل کی تلاش میں آئی تھی، ہماری خوش قسمتی تھی کہ راستے میں مل گئی ورنہ آج ہم زندہ نہ ہوتے۔

بہر حال ہم کالاگر پہنچے تو لازون بے ہوش ہو چکا تھا، اس کو ایک سو چار ڈگری بخار تھا، بخار بڑھتا ہی جارہا تھا، تین دن کی مسلسل دیکھ بھال کے بعد ایک برطانوی ڈاکٹر نے خوش خبری سنائی کہ اب لازون خطرے سے باہر ہے۔ سات ہفتے آرام کرنے کے بعد وہ سفر کے قابل ہوسکا۔

آخر کار اس انتہائی خطرناک اور جان لیوا مہم سے فارغ ہوکر ہم فرانس واپس پہنچ گئے۔ وہاں تفصیل سے ہم نے حکام کو تمام احوال کوائف سے آگاہ کیا۔ ہماری رپورٹ کی روشنی میں ایک دوسری سرکاری پارٹی کو ان وحشی انسانوں کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا میں اس مہم پر ساتھ جانے کی پیش کش کی گئی۔ لیکن ایک مرتبہ ان آدم خوروں کا لقمہ بننے سے بال بال بچ جانے کے بعد ہم دوبارہ موت کے منہ میں جانا نہیں چاہتے تھے لہٰذا ہم نے اس پیش کش کو مسترد کردیا۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ ان آدم خوروں نے ہمیں جس دہشت ناک تجربے سے دوچار کیا تھا، اسے ہم عمر بھر نہیں بھول سکتے۔ اب بھی تصور میں ان کی خوف ناک شکلیں دیکھ کر ہم پر لرزہ طاری ہوجاتا ہے۔





مجبوری

ایس امتیاز احمد۔کراچی

انجان سنسان اور کسی بھی ذی روح سے خالی جزیرہ پر موجود لوگ قلقوں سے ہراساں ناقابل حالات سے دوچار موت کے منہ میں جانے لگے مگر ایک ایسا شخص بھی تھا جس کا وزن بڑھتا گیا آخر کیوں۔

لفظ لفظ اور سطر سطر دل و دماغ پر خوف کا سکہ بیٹھاتی۔۔۔محیر العقول قابل غور کہانی

ٹونی گریک کو یقین تھا کہ نیلا آسمان کھلا سمندر اور خاموشی، مضطرب ذہن اور زخم خوردہ دل کے لئے مرہم ثابت ہوں گے لیکن تجربے نے اس یقین کو غلط ثابت کردیا۔ ٹونی مختلف ماہناموں کے لئے سنسنی خیز مضامین لکھتا تھا۔ اس نے کئی سوانح عمریاں بھی لکھی تھیں۔ آمدنی بہت معقول تھی لیکن بیوی کو طلاق دینے کے بعد اس کے لئے دو مسئلے پیدا ہوگئے، پہلا مسئلہ مطلقہ کے ماہانہ خرچ کا تھا کیونکہ اس کا ایک سات سال کی عمر کا بچہ بھی تھا جو اپنی ماں کے ساتھ رہ رہا تھا......اور دوسرا مسئلہ بیوی کی یاد کو دل سے بھلانا چاہتا تھا چنانچہ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ کسی ایسی جگہ چھٹیاں گزاری جائیں جہاں دور دور تک نیلا آسمان اور کھلا سمندر نظر آتا ہو جہاں سکون اور تنہائی ہو۔

اس نے اپنی چھٹی کا پہلا ہفتہ یونان کے ایک

جزیرے پر گزارا۔ وہ سارا دن ہوٹل میں اپنے کمرے میں لیٹا رہتا تھا۔ اس نے ساحل پر کھلے آسمان کے نیچے دراز ہو کر آفتابی شعاؤں سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کی لیکن اسے پہلے ہی روز اس امر کا احساس ہو گیا کہ وہ ایگورا فوبیا کا شکار ہے اس لئے کسی بھی کھلی جگہ پر لیٹنے سے وہ وحشت زدہ ہو جائے گا۔

ایک ہفتہ بعد وہ ایک چھوٹے سے اسپینی جزیرے پر چلا گیا۔ وہاں بھی اسے سکون نہیں مل سکا حالانکہ اس جزیرے کی آبادی کم تھی اور جگہ بھی بہت پرسکون تھی۔ خوش قسمتی سے وہاں اس کی ملاقات کرنل فیکسرا سے ہو گئی تب اسے احساس ہوا کہ اسے زخموں پر مرہم لگانے کے لئے نیلے آسمان کھلے سمندر اور خاموشی کی ضرورت نہیں تھی بلکہ اسے اپنی ذہنی غذا پراسراریت کی ضرورت تھی جس کے بغیر وہ ہر وقت بے چین اور کھویا کھویا سا رہتا تھا۔

کرنل فیکسرا کو اس نے پہلی مرتبہ ساحل پر اپنی ٹوٹی پھوٹی کار میں بیٹھا ہوا دیکھا۔ وہ سگار نوشی کرتے ہوئے کھڑکی سے باہر خلا میں کچھ گھور رہا تھا۔ کرنل کا ڈرائیور خاکی وردی میں ملبوس ریت کے اندر گھونگے جمع کرنے میں مصروف تھا۔ کرنل پر پہلی نظر ڈالتے ہی اس کی یادداشت میں کھلبلی مچ گئی۔ کرنل کا چہرہ جانا پہچانا تھا اور اس کا نام اس کے ذہن میں آ کر بار بار پھسلا جا رہا تھا۔ ٹونی کو اپنی یادداشت پر بہت تعجب ہوا کیونکہ اس کی یادداشت غیر معمولی طور پر تیز تھی اور وہ لوگوں کے نام اور ان کے چہرے یاد رکھنے میں دور دور تک مشہور تھا لیکن اس وقت اسے کرنل کے متعلق کچھ بھی یاد نہیں آ رہا تھا کہ یہ چہرہ اس نے کہاں دیکھا ہے؟ کرنل کا کیا نام ہے؟ اور کرنل کی وجہ شہرت کیا ہے؟

ہوٹل واپس آ کر اس نے منیجر سے کرنل کے بارے میں دریافت کیا۔ کرنل کی شخصیت بے حد اسرار اور مشہور ثابت ہوئی۔ ہوٹل کے منیجر نے اس کو کرنل کا پورا نام بتلایا جو بہت طویل تھا اور اسے صرف کرنل فیکسرا کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ کسی کو علم نہیں تھا کہ کرنل کا عہدہ اسے کیسے ملا ہے۔

جزیرے کی غربت کے پیش نظر کرنل کی معاشی حالت بہت اچھی تھی اور اسے دولت مند تصور کیا جاتا تھا کیونکہ اس کا اپنا ایک مکان تھا، ایک کشتی تھی، ایک موٹر تھی اور ایک ملازم تھا کرنل غیر شادی شدہ تھا کسی کو اس کے کسی عزیز رشتے دار کا علم نہیں تھا۔ پورے مکان میں وہ تنہا اپنے گونگے ملازم کے ساتھ رہتا تھا۔ ملازم کا نام ڈریگو تھا۔ وہی کرنل کا باورچی ڈرائیور کشتی کھینے والا گھر کی صفائی کرنے والا، پہرے دار اور سودا سلف لانے والا تھا۔ پہرے دار اور سودا سلف لانے والا تھا۔ کرنل کا مکان جزیرے میں سب سے اونچا تھا۔ اس کے مکان میں داخل ہونے کے لئے ایک سو پندرہ سیڑھیاں چڑھنی پڑتی تھیں۔ کرنل جزیرے کی آبادی سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ اس کا کوئی دوست نہیں تھا۔

ٹونی نے دوسری مرتبہ جب کرنل کو دیکھا تو ان کے درمیان صرف تین گز کا فاصلہ تھا۔ فاصلے کے بارے میں یقینی طور پر اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ دونوں ایک تین گز لمبے کپڑے کے مخالف سروں پر کھڑے ہوئے تھے جسے اس دکان کی ملازم لڑکیوں نے تانا ہوا تھا۔ ٹونی اس روز جزیرے میں سیاحوں والے انداز میں بلا مقصد گھومتا پھرتا ایک دکان میں گھس گیا۔ کرنل فیکسرا اس دکان میں سگار خریدنے آیا تھا جنہیں وہ دکاندار خاص طور پر کرنل کے لئے درآمد کرتا تھا۔ وہ کرنل کی آواز سن کر ہی چونکا تھا وہ دکاندار سے وہی سگار طلب کر رہا تھا جو خود ٹونی کے پسندیدہ تھے۔ پسند کی یکسانیت نے دونوں کو ایک دوسرے سے متعارف کروایا۔ ٹونی کو یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ کرنل نہ صرف گفتگو پر رضا مند نظر آتا ہے بلکہ وہ اس سے بڑی روانی کے ساتھ انگریزی میں گفتگو بھی کر سکتا ہے۔

کرنل درمیانے قد، دہرے جسم اور کسرتی بدن کا مالک تھا۔ اندازاً اس کی عمر ستر سال کے لگ بھگ تھی اس کے چہرے کو غور سے دیکھ کر ایک مرتبہ پھر ٹونی کو شدت سے احساس ہوا کہ کرنل کا چہرہ اس کے لئے

اجنبی نہیں ہے لیکن باوجود ذہن پر زور دینے کے وہ کرنل ٹیکسراا اور اس چہرے میں کوئی تعلق پیدا نہیں کرسکا۔

جب وہ دونوں جدا ہونے لگے تو کرنل نے اخلاقاً اس سے دوبارہ ملنے کی خواہش کا اظہار کیا جسے ٹونی نے فوراً قبول کرلیا۔ اسے معلوم تھا کہ اسپین کے باشندے گپ شپ کے لئے اپنے دوستوں کو گھروں میں مدعو نہیں کرتے بلکہ کسی ریستوران میں محفل جمتی ہے اسی لئے اس نے کرنل سے ریستوران کا نام دریافت کیا جہاں وہ بیٹھ کر کچھ دیر گفتگو کرسکیں۔

کرنل نے ریستوران کا نام بتلایا جو جزیرے کے تین ہوٹلوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ وہ دونوں شام کو اس ریستوران میں ملنے کا وعدہ کر کے جدا ہو گئے۔

ٹونی طلاق کے اسباب اپنی بیوی اور اپنے بچے کو بھول کر تمام دن اسی الجھن میں مبتلا رہا کہ اس نے کرنل ٹیکسرا کو کہاں دیکھا ہے یہ تو ظاہر تھا کہ کرنل ٹیکسرا کا تعلق اسپین کی مسلح افواج سے رہا ہوگا، شام کو جب وہ کرنل سے گپ شپ کرنے کے لئے ریستوران پہنچا تو اس کو اپنا منتظر پایا۔ اس کے سامنے شراب کا گلاس رکھا ہوا تھا اور وہ آنکھیں بند کئے نشست سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ کرنل کی میز ریستوران میں بالکل علیحدہ اور ایک گوشے میں تھی۔ وہ دونوں بہت دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ جزیرے کے متعلق جزیرے کے رہنے والوں کے متعلق سمندر اور اس کی مچھلیوں کے متعلق۔ دنیا بھر کی باتیں جب بھی ٹونی نے کرنل سے اس کے ماضی کے متعلق کوئی سوال کیا تو کرنل بڑی خوب صورتی سے سنی ان سنی کر کے ٹال گیا۔ گفتگو کے دوران کرنل کی یادداشت بیدار ہوتی لیکن اس عرصے میں ٹونی کو اس امر کا یقین ہو گیا کہ وہ اس شخص کو جانتا ہے اور اس شخص کے ماضی سے کوئی ایسا واقعہ وابستہ ہے جس کی وجہ سے اسے بے حد نیک نامی یا بدنامی ہوئی تھی کوئی مشہور واقعہ۔

ٹونی دور دور تک کرنل ٹیکسرا کے بارے میں سوچتا رہا۔ تیسرے روز وہ اسی ریستوران میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا کہ اچانک اس کے ہاتھ سے کھانے کا کانٹا چھوٹ کر زوردار آواز کے ساتھ فرش پر گر گیا۔ تو اسے کرنل کے ماضی کے ساتھ ہی وہ واقعہ بھی اچانک ہی یاد آ گیا تھا۔ اس واقعے کی یاد ہی اس قدر سنسنی خیز تھی کہ کانٹا نہ جانے کب اس کی انگلیوں سے پھسل کر گر گیا۔

اس واقعے کے ساتھ اسے کرنل کا اصلی نام بھی یاد آ گیا جو نقلی نام کی طرح بے حد طویل تھا لیکن مختصراً وہ کرنل ملاگرا کے نام سے مشہور تھا۔ جلدی جلدی کھانا ختم کر کے وہ کرنل کی آمد کا انتظار کرنے لگا لیکن اس رات کرنل ریستوران میں نہیں آیا۔

ٹونی کی چھٹیاں ختم ہونے میں صرف چار روز باقی تھے اور اسے اس وقفے میں اس سوال کا جواب حاصل کرنا تھا جس کا جواب اس کے ذہن میں تیار تھا۔ لیکن جس کی تصدیق یا تردید صرف اور صرف کرنل ملاگرا (یا کرنل ٹیکسرا ہی) کرسکتا تھا۔ دوسری شام وہ جلدی ریستوران پہنچ گیا۔ اس روز اسے مایوسی نہیں ہوئی کرنل کے بیٹھتے ہی وہ بلا کسی مقصد کے شروع ہو گیا۔

ٹونی نے کہنا شروع کیا "جب میں اسکول میں پڑھتا تھا تو دوسرے لڑکوں کے برعکس مجھے ڈاک ٹکٹ سکے یا ایسی کسی چیز کے جمع کرنے کا شوق نہیں تھا بلکہ میں

خاص نمبر

قارئین کرام! خوش خبری ہے کہ اگلا شمارہ یعنی جنوری 2015ء کا ڈر ڈائجسٹ "خاص نمبر" ہوگا، جس میں اچھی اچھی دل و دماغ کو مبہوت کرتی حیرت انگیز چونکا دینے والی خوفناک کہانیاں شامل اشاعت ہوں گی۔"

ضخیم صفحات کے ساتھ قیمت -/70 روپے

ادارہ
ڈر ڈائجسٹ

پرانے رسالے جمع کرتا تھا مجھے پرانے رسالے جمع کرنے کا جنون تھا۔ ان رسالوں کے چند مضامین ایسے ہیں جو میں کبھی نہیں بھلا سکوں گا خاص طور پر ایسے واقعات جو دنیا کے لئے آج تک معمہ بنے ہوئے ہیں۔

مجھے اس وقت ایسی ہی ایک کہانی یاد آرہی ہے جو اسپین کی مسلح افواج کے ایک افسر کے بارے میں تھی۔ یہ واقعہ 1933ء یا 1934ء میں پیش آیا تھا۔ اسپین کی فوج اس زمانے میں مسافر بردار طیاروں کے ذریعے دور دراز علاقوں میں فوجی نقل و حرکت کے تجربات میں مصروف تھی۔

ایک روز میڈرڈ سے صبح کے وقت ایک طیارہ اڑا جس میں فوج کے ایک اعلیٰ افسر کے ساتھ بارہ عدد جوان اور چھوٹے افسران تھے۔ وہ طیارہ اس صبح آسمانوں میں بلند ہو کر غائب ہوگیا۔ بے حد تلاش کے باوجود اس طیارے کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ پھر ایک روز مچھیروں نے سمندر میں ایک ہوائی جہاز کے ٹوٹے ہوئے حصوں کو تیرتا ہوا دیکھ کر حکام کو اطلاع دی۔"

ٹونی نے خاموش ہو کر کرنل کے چہرے پر ردعمل دیکھنے کی کوشش کی لیکن اسے بے حد مایوسی ہوئی کیونکہ کرنل کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

"مچھیروں کی اطلاع پر چھان بین کے لئے کئی بحری جہاز روانہ کئے گئے اور آخرکار ایک برطانوی تباہ کن جہاز اس مختصر سے جزیرے پر پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ جہاں وہ جہاز اس صبح میڈرڈ سے پرواز کر کے گر کر تباہ ہوا تھا۔ جہاز میں کل تیرہ فوجی تھے اور جب وہ برطانوی جہاز وہاں پہنچا تو صرف ایک مسافر زندہ تھا اور وہ مسافر اس طیارے کا کمانڈنگ آفیسر تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کمانڈنگ آفیسر کا زندہ بچ جانا اتنا بڑا معجزہ تھا کہ اس کے بارے میں رسالوں میں بے شمار مضامین لکھے گئے۔ ہر مصنف نے اس معجزے پر قیاس آرائی کی۔ مجھے ذاتی طور پر اتنی دلچسپی پیدا ہوگئی کہ میں نے لائبریری میں جا کر اس زمانے کے تمام اخبارات اور رسالے پڑھ ڈالے لیکن اس کے باوجود قیاس آرائی مجھے مطمئن نہ کرسکی۔ کہیں بھی مجھے حقیقت کا سراغ نہیں مل سکا کیونکہ زندہ بچنے والے کمانڈنگ آفیسر نے ایک بیان دے کر اپنی زبان بند کرلی تھی۔ اس افسر کا نام ملاگرا تھا۔ وہ کرنل ملاگرا کے نام سے مشہور ہوا۔"

ایک مرتبہ پھر ٹونی نے کرنل کا چہرہ غور سے دیکھا اسے ایک متوقع ردعمل کی تلاش تھی۔ اس مرتبہ اسے مایوسی نہیں ہوئی کیونکہ کرنل ملاگرا ساکت و جامد اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

کرنل ملاگرا کی کہانی بہت سیدھی سادھی تھی، ٹونی نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اس کا بیان تھا کہ میڈرڈ سے پرواز کے بعد منزل مقصود سے کچھ فاصلے پر جہاز کے پیٹرول ٹینک میں سوراخ ہوگیا تھا۔"

ایک مرتبہ پھر ٹونی نے کرنل کا چہرہ غور سے دیکھا اسے ایک متوقع ردعمل کی تلاش تھی۔ اس مرتبہ اسے مایوسی نہیں ہوئی کیونکہ کرنل ملاگرا ساکت و جامد اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

کرنل ملاگرا کی کہانی بہت سیدھی سادی تھی، ٹونی نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اس کا بیان تھا کہ میڈرڈ سے پرواز کے بعد منزل مقصود سے کچھ فاصلے پر جہاز کے پیٹرول ٹینک میں سوراخ ہوگیا۔ پائلٹ کے سامنے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ سمندر میں پھیلے ہوئے ان چند جزیروں میں سے کسی ایک جزیرے پر طیارہ اتارنے کی کوشش کرے جو غیر آباد، سنسان اور چھوٹے چھوٹے تھے۔ پائلٹ نے اپنی پوری کوشش کی کہ وہ جہاز کو حفاظت سے کسی جزیرے پر اتار دے اور اس کی کوشش کسی حد تک بار آور ثابت ہوئی۔ اس نے طیارے کو آتش فشاں پہاڑ کے لاوے سے بنی ہوئی ایک پتلی اور لمبی سی چٹان پر اتار دیا۔ اس کوشش میں جہاز ٹوٹ پھوٹ گیا۔ طیارے کا پائلٹ اور دو فوجی ہلاک ہوگئے۔ لیکن بقایا مسافر زندہ بچ گئے جن میں سے چند ایک زخمی تھے۔

کرنل ملاگرا چونکہ اس مہم کا کمانڈنگ آفیسر تھا اس لئے صورتحال پر قابو پانے کی ذمہ داری اس کے

کاندھوں پر تھی۔ یہ اس کا فرض تھا کہ وہ زندہ بچ جانے والوں میں نظم وضبط قائم رکھے اور انہیں اس وقت تک سنبھالے رکھے جب تک کوئی امدادی پارٹی انہیں تلاش کرتی ہوئی نہیں آ جاتی۔ اس کی کوششوں کو بالآخر ناکام ہونا تھا اس جزیرے پر پینے کے پانی کے علاوہ کھانے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ جھاڑیوں کے پتے بھی نہیں تھے۔ زندہ بچ جانے والوں کو اپنا انجام فوراً نظر آ گیا۔ ظاہر تھا اگر ان کی تلاش میں کوئی امدادی پارٹی وہاں نہیں پہنچتی تو فاقوں کی موت ان کا مقدر تھی اس لئے ان کا تمام وقت دعائیں مانگنے اور سمندر میں کسی جہاز کو دیکھنے میں صرف ہونے لگا۔ راتوں کو وہ خوابوں میں انواع و اقسام کے کھانے دیکھتے تھے......"

ٹونی نے کرنل کو ایک گہرا سانس لیتے ہوئے دیکھا۔ "کرنل ملاگرا کو کوئی اندازہ نہیں تھا کہ اسے اس جزیرے پر آئے ہوئے کتنا عرصہ گزر چکا ہے۔ اسے آٹھ ہفتے ہوئے تھے جزیرے پر فاقوں سے مرنے والوں کی کوئی لاش موجود نہیں کیونکہ لاشوں کے بے گور و کفن کھلے آسمان کے نیچے پڑے رہنے سے وبائی امراض پھیلنے کا اندیشہ تھا اس لئے کرنل نے حکم دیا کہ ہر مرنے والے کی لاش کو بھاری پتھروں سے باندھ کر سمندر میں پھینک دیا جائے اور یہ کام اس نے خود اپنے ذمے لے رکھا تھا۔

جزیرے کے قریبی سمندری علاقے کو جب کھنگالا گیا تو صرف دو لاشیں دستیاب ہوسکیں۔ لاشوں کی ظاہر حالت سے معلوم ہوتا تھا کہ انہیں سمندر کی خوفناک شارک مچھلیوں نے اپنا پیٹ بھرنے کے لئے استعمال کیا ہے کیونکہ لاشوں کے جسم جگہ جگہ سے نچے ہوئے تھے۔

کرنل کا اس طرح زندہ بچ جانا ہی سنسنی خیز تھا اس لئے دنیا بھر کے اخباروں نے اس واقعے کو خوب اچھالا لیکن پھر اچانک لوگوں کی توجہ چند دوسری حقیقتوں کی طرف مبذول ہوگئی جس پر پہلے کسی کی نظر نہیں پڑ سکی تھی وہ سوال ایسا دہشت ناک تھا جسے کوئی بھی صحافی با آواز بلند دہرانا پسند نہیں کرتا تھا لیکن وہ سوال ہر صحافی کے ذہن سے چپکا ہوا تھا مختصر الفاظ میں اس سوال کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ جس روز طیارہ میڈرڈ سے اڑا تھا اس سے صرف ایک روز پہلے کرنل ملاگرا کا وزن کیا گیا تھا کیونکہ یہ ہوائی فوج کا ایک قاعدہ ہے۔ آٹھ ہفتوں کے دوران اس جزیرے پر آٹھ آدمی فاقوں سے ہلاک ہوگئے۔ لیکن خود کرنل ملاگرا کی صحت پہلے سے کہیں زیادہ بہتر ہوگئی، اس کے رخساروں پر سرخی آ گئی تھی اور وہ مکمل طور پر صحت مند تھا......"

ٹونی نے رک کر کرنل کی آنکھوں میں جھانکا۔ اسے ان آنکھوں میں کچھ بھی نظر نہیں آیا۔

"ان حقائق کے سامنے آتے ہی طرح طرح کی افواہوں کا اڑانا قدرتی امر تھا۔" ٹونی نے اپنی کہانی جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "لوگ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھتے، بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ آٹھ انسان بھوک سے مرجائیں اور نواں آدمی اور موٹا تازہ ہوجائے؟"

کرنل نے اس سوال کا جواب ہنسی میں ٹالنے کی کوشش کی۔ اس نے کہا کہ "پرواز سے پہلے جس مشین پر اس کا وزن کیا گیا تھا اس میں یقیناً کوئی نقص تھا اور اس نے اس کا وزن زیادہ بتلایا تھا۔" کرنل نے یہ بھی کہا کہ "پرواز سے پہلے وہ اس سے بھی زیادہ موٹا تھا۔ جتنا وہ اب نظر آتا ہے۔" لیکن کرنل کے ساتھیوں نے اس کی تردید کردی اور بتلایا کہ کرنل کی صحت پرواز سے پہلے اتنی عمدہ نہیں جتنی کہ اب ہے اور وہ بلاشبہ پہلے کی نسبت موٹا اور تندرست ہوگیا ہے۔"

ایک صحافی نے کسی طرح وزن کرنے کی اس مشین کو غائب کردیا جس پر پرواز سے ایک روز قبل کرنل کا وزن کیا گیا تھا۔ ماہرین نے معائنے کے بعد متفقہ طور پر اس مشین کو بالکل درست قرار دیا۔ ان پراسرار حقائق کے باوجود کرنل ملاگرا سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کی گئی۔ اس پر کسی عدالت میں مقدمہ نہیں چلایا گیا اس پر کوئی الزام عائد نہیں کیا گیا۔ اور کسی سرکاری کاغذ میں وہ

الفاظ استعمال نہیں کیا گیا جو سب کے ذہنوں میں گونج رہا تھا جو ہر شخص کے لبوں پر تھا۔ ''آدم خور......'' مگر کسی نے بھی بلند آواز سے کرنل ملاگرا کو آدم خور نہیں کہا۔''

کرنل ملاگرا نے بجھے ہوئے سگار کو دوبارہ جلایا اور ہاتھ کے اشارے سے ٹونی کو خالی گلاس میں مزید شراب انڈیلنے کا اشارہ کیا۔ ٹونی نے کرنل کا گلاس شراب سے بھر دیا اور پھر آگے جھکتے ہوئے اپنی کہانی دوبارہ شروع کی۔

''کرنل کے وزن بڑھنے کا جواب بہت آسان نظر آتا تھا۔ کرنل ملاگرا اس مہم کا کمانڈنگ آفیسر تھا۔ طیارے کی تباہی کے بعد بھی وہ کمانڈنگ آفیسر رہا۔ زندہ بچ جانے والوں میں نظم و ضبط برقرار رکھنا اس کی ذمہ داری تھی اور مردوں کو پتھروں سے باندھ کر سمندر میں پھینکنے کا اصول بھی اس نے وضع کیا تھا اور مردوں کو سمندر میں پھینکنے کا کام وہ خود ہی انجام دیتا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ کرنل ان لاشوں کو سمندر میں ضرور پھینکتا تھا لیکن......اپنا پیٹ بھرنے کے بعد۔''

کرنل ٹیکسرا نے شراب کے بڑے بڑے گھونٹ لے کر گلاس خالی کر دیا اور پھر اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا۔

''شب بخیر سینور'' کرنل نے کہا۔ ''اب میرے جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ میں تمہاری مہمان نوازی اتنی عمدہ کہانی سے دل بہلانے پر بے حد مشکور ہوں۔''

ٹونی کرنل کو باوقار انداز میں جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ اس کے انداز نے اسے بے حد مرعوب کر دیا تھا۔ پھر اس نے دروازے کے قریب کرنل کو لڑکھڑاتے ہوئے دیکھا تو تیزی سے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔ کرنل کے احتجاج کے باوجود ٹونی اسے سہارا دیتا ہوا اس کی گاڑی تک لے آیا۔

''تم اس غلیظ کہانی کو آئندہ کبھی مت دہرانا۔'' کرنل ٹیکسرا نے عجیب انداز میں کہا۔ ''یہ سب بکواس ہے اور میں وہ کرنل نہیں ہوں! تم کیوں میرا سکون غارت کرنے پر تلے ہوئے ہو؟''

پھر کرنل نے جھنجھوڑ کر اسٹیئرنگ وہیل کے پیچھے اونگھتے ہوئے ملازم کو جگایا اس کا گونگا ملازم ہڑبڑا کر جاگ گیا۔ ٹونی اس وقت تک کرنل کی گاڑی کو دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔

دوسری صبح کرنل کا گونگا ملازم اس کے پاس کرنل کا ایک تحریری پیغام لے کر آیا جس میں کرنل نے اس سے سہ پہر کے وقت اپنے گھر آنے کی درخواست کی تھی۔ ٹونی نے کرنل کی درخواست قبول کر لی اسے کرنل کے مکان تک پہنچنے کے لئے ایک سو پندرہ سیڑھیاں چڑھنی پڑیں۔ وہ مکان اتنا بڑا نہیں تھا جتنا وہ ساحل سے نظر آتا تھا۔ اس میں صرف چار کمرے تھے ایک کھانا کھانے کا، دوسرا کھانا پکانے کا، ایک خواب گاہ اور آخری کمرہ ڈرائنگ روم کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا تھا مکان کا فرنیچر پرانی طرز کا تھا۔ کرنل ملاقات ہوتے ہی بغیر کسی مقصد کے مطلب کی طرف آ گیا۔

''تمہارے کیا ارادے ہیں سینور ٹونی؟'' کرنل ٹیکسرا نے پوچھا۔ ''تم نے بتایا تھا کہ تم ایک صحافی ہو اور ایک صحافی کی اخلاقی قدریں عام انسانوں سے مختلف ہوتی ہیں کیا تم اپنے ملک واپس جا کر دوبارہ اس کہانی کی تشہیر کرو گے؟''

ٹونی کوئی جواب دینے سے پہلے کچھ جھجکا۔

''ہاں کرنل میں اس مسئلے پر غور کر رہا ہوں۔'' ٹونی نے جواب دیا۔ ''لیکن تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، میں یہ نہیں لکھوں گا کہ تم سے میری ملاقات کسی مقام پر ہوئی تھی اور میں تمہارا موجودہ نام بھی لکھنے کا ارادہ نہیں رکھتا اس لئے تمہیں کسی قسم کی تشہیر سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں......؟''

''لیکن فکر مند ہونا اب میری عادت ہو گئی ہے سینور'' کرنل نے کہا۔ ''اس واقعے کو سینتیس سال گزر چکے ہیں۔ آج بھی جب میں گھر سے باہر نکلتا ہوں تو ہر وقت میرا دل اس لفظ کو سننے کے خوف سے لرزتا رہتا ہے۔ مجھے ہمیشہ یہ خوف رہتا ہے کہ میری ملاقات کہیں کسی ایسے آدمی سے نہ ہو جائے جو میرے ماضی سے واقف ہو۔ اب تم سمجھے سینور۔ میں فطری طور پر تنہائی پسند

نہیں ہوں میری زندگی فوج میں گزری ہے، جہاں پہلے ہی روز سے دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہنا و کام کرنا سکھایا جاتا ہے۔ مجھے دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرنے کا بھی بہت شوق ہے۔ لیکن میں یہاں اس جگہ اس غیر معمولی اور مختصر سے جزیرے کی ایک پہاڑی پر تنہا اپنے ایک گونگے ملازم کے ساتھ اپنی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ کیوں؟ صرف مجبوری کے تحت! میں سیاحت نہیں کرسکتا، میں لوگوں کے ساتھ نہیں مل جل سکتا۔ میں تنہائی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں، میرے دوست مجھ پر دنیا کی ہر آسائش اور خوشی حرام ہو چکی ہے.....''

''تم اس جزیرے سے باہر نہیں جاتے؟ میں نے سنا تھا کہ تمہاری اپنی ایک کشتی ہے۔'' ٹونی نے کہا.....

''بے شک میری اپنی کشتی ہے لیکن اسے صرف میرا ملازم استعمال کرتا ہے..... میں ایک قیدی ہوں۔ اپنی مرضی سے کہیں نہیں جاسکتا، میں اپنے خوف کا قیدی ہوں، پہچانے جانے کا خوف وہ خوف جس کی شدت میں پچھلے چھتیس سالوں سے کمی واقع ہو رہی تھی اب پھر تم آ گئے کسی دہشت ناک خواب کی طرح۔''

''کرنل ملاگرا'' ٹونی نے کہا۔ ''میں تمہیں دھوکا نہیں دینا چاہتا..... میں ایک صحافی ہوں اس لئے میں ان چیزوں کو فراموش نہیں کرسکتا جنہیں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ میں یہ فرض نہیں کرسکتا کہ تمہارا کوئی وجود نہیں ہے اور مجھے تم سے ایسا کوئی دلی تعلق بھی نہیں ہے کہ اس محبت کی خاطر میں خاموش رہوں، لیکن یہاں ایک ایسی چیز بھی موجود ہے جو مجھے اپنے پیشے سے بھی زیادہ عزیز ہے۔''

''وہ کیا؟''

''سچائی جسے جاننے کے لئے میں بچپن ہی سے بے تاب ہوں۔''

''میں سمجھا نہیں سینور؟''

''میں سچائی جاننا چاہتا ہوں کرنل، میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس جزیرے پر مرنے والے ان آٹھ آدمیوں کا دراصل کیا حشر ہوا تھا؟ جب تمہارے آٹھ ساتھی فاقوں سے ہلاک ہو رہے تھے تو آخر کیوں تمہارا وزن بڑھ رہا تھا اور چہرے پر سرخی آرہی تھی؟ میں وہ جواب سننا نہیں چاہتا جو چھتیس سال پہلے تم نے اخباری نمائندوں کو دیا تھا کرنل..... میں حقیقت جاننا چاہتا ہوں جو مجھے مطمئن کردے۔ اس کے عوض میں تمہیں زبان دیتا ہوں کہ جو کچھ تم مجھے بتلاؤ گے وہ ہمیشہ میرے سینے میں دفن رہے گا اور کبھی میرے قلم کی نوک پر نہیں آئے گا۔''

ٹونی کو دو باتوں کی توقع تھی حقیقت کے اظہار سے صاف انکار کردیا اس بات پر اصرار کہ اس نے 37 سال پہلے جو کہا تھا وہی حقیقت تھی۔ کرنل اپنی نشست سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔

وہ سگار نوشی کرتے ہوئے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھر اچانک اس نے رک کر ٹونی کو دیکھا۔

''بہت اچھا سینور۔ مجھے تمہاری شرط منظور ہے ممکن ہے کسی کو سچائی بتلا کر میرے سینے کا بوجھ بھی کم ہو جائے۔'' کرنل نے کہا اور باوقار انداز میں چلتا ہوا اس کے سامنے بیٹھ گیا..... پھر اس نے کہا.....

''میں آدم خور نہیں ہوں سینور میں اس سے بھی بدتر ہوں.....''

کرنل کے جواب سے ٹونی کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔

''چونکہ میں آدم خور سے بھی بدتر ہوں اس لئے میں 37 سال پہلے دنیا کو حقیقت سے آگاہ نہیں کرسکا۔ میری خاموشی سے انہوں نے نتائج اخذ کئے، وہ میرے لئے بالکل غیر متوقع تھے لیکن اس کے باوجود میری زبان بند رہی، میں اس کے بعد بھی دنیا کو سچائی سے آگاہ نہیں کرسکا۔ میں اپنے گندے کرتوتوں پر اس قدر شرمندہ تھا۔''

کرنل کی خاموشی ناقابل برداشت تھی اس لئے ٹونی نے فوراً ہی لقمہ دیا.....

''آخر وہ کیا حرکت تھی کرنل جو آدم خوری سے بھی زیادہ بدتر ہو سکتی ہے؟''

''بزدلی۔'' کرنل نے جواب دیا۔ پھر چند لمحے

توقف کے بعد اس نے کہا۔ ''کچھ تفصیلات ایسی تھیں جو اخباروں میں شائع نہیں ہوئیں۔ مثلاً یہ حقیقت کہ اس طیارے میں بارہ سے زائد مسافر سوار تھے اور یہ حقیقت کہ اس طیارے میں کافی مقدار میں کھانے پینے کا سامان موجود تھا۔ تم حیران ہو رہے ہو سینور، واقعی اس طیارے میں کھانے پینے کی کافی مقدار موجود تھی۔ اتنی مقدار جو ایک طویل سفر کے دوران ایک درجن سے زائد مسافروں کا خوب اچھی طرح پیٹ بھر سکے وہ مقدار اتنی نہیں تھی جو درجن بھر آدمیوں کو دو ماہ تک زندہ رکھ سکے لیکن وہ غذا دو ماہ تک...... ایک انسان کو ضرور زندہ رکھ سکتی تھی......''

ٹونی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''جب پائلٹ نے طیارے کو اس جزیرے پر اتارا تو میں نے طیارے کا ڈھانچہ سمندر میں پھینکنے سے پہلے اس کے اندر سے کھانے پینے کا سارا سامان نکال لیا تھا۔ ڈھانچے کو سمندر میں پھینکنے سے میرا مقصد یہ تھا کہ ممکن ہے کسی ملاح کی نظر اس پر پڑ جائے۔ کھانے پینے کا سامان میں نے اس جزیرے کے دوسری طرف چھپا دیا۔ اس وقت میرا ارادہ یہی تھا کہ امدادی پارٹی کے آنے تک میں کھانے کی اس قلیل مقدار کو زندہ بچنے والوں میں اس طرح روزانہ تقسیم کروں کہ وہ امداد آنے تک ہمیں زندہ رکھے مجھے اس امر کا بخوبی اندازہ تھا کہ اگر میں نے وہ سارا سامان ان لوگوں کے سامنے رکھ دیا تو وہ ایک وقت سے زیادہ نہیں چل سکے گا۔ اس جزیرے کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد یہ بات واضح ہو گئی کہ اگر جلد ہی کوئی امدادی پارٹی ہمیں بچانے نہیں آئی تو ہم سب فاقوں سے مر جائیں گے کیونکہ اس جزیرے پر پینے کے پانی کے علاوہ کھانے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا، اس جزیرے پر صرف اور صرف نیلے رنگ کی چھپکلیاں پائی جاتی تھیں جیسی کہ تم نے اس جزیرے پر دیکھی ہوں گی جہاں ہم اس وقت بیٹھے ہوئے ہیں۔

اس کے علاوہ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اگر ان لوگوں کو بند گوشت کے چند ڈبوں اور بسکٹوں کے چند پیکٹوں کے بارے میں معلوم ہو گیا تو ہر شخص وہ تمام خوراک حاصل کرنے کی کوشش کرے گا اور اس کوشش میں وہ ایک دوسرے کو جان سے مار ڈالیں گے۔ میرے پیش نظر یہ بات بھی تھی کہ ان لوگوں میں نظم و ضبط قائم رکھنے کی تمام ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے کیونکہ میں اس مہم کا کمانڈنگ آفیسر تھا اور ہر قسم کے حالات کی تمام تر ذمہ داری مجھ پر ڈال دی جائے گی اس لئے میرے لئے اپنی جسمانی قوت بحال رکھنا بے حد ضروری تھا تا کہ میں ان کے درمیان نظم و ضبط بحال رکھ سکوں اور ان پر قابو پائے رہوں۔

اس لئے سینور اس وقت میں نے جو کچھ بھی کیا اپنے خیال میں بہتر ہی کیا تھا لیکن شاید میں غلطی پر تھا یا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جوں جوں دن گزرتے گئے اور یہ واضح ہوتا گیا کہ ہم لوگوں کی قسمت میں فاقوں سے مرنا لکھا ہے تو میرا خوف میرے ذہن پر چھا گیا۔ میری زندہ رہنے کی خواہش شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی۔''

کرنل خاموش ہو گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر شراب کا گلاس اس طرح اٹھایا جیسے وہ گلاس منوں وزنی ہو۔ ٹونی جو سناٹے کے عالم میں کرنل کی کہانی سن رہا تھا چونک گیا۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

''شکریہ کرنل مجھے سچائی سے آگاہ کرنے کا بہت بہت شکریہ، اس وقت تم پر جو کیفیت طاری ہوگی میں اسے سہہ سکتا ہوں۔

''شکریہ سینور تم نے میرا بوجھ بہت ہلکا کر دیا۔'' کرنل نے متشکرانہ انداز میں کہا۔ ''کم از کم اب مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ اس دنیا میں ایک ایسا شخص ضرور موجود ہے جو جذبات سے عاری ہو کر اس وقت جو کیفیت مجھ پر طاری تھی اسے محسوس کر سکتا ہے۔ اب تم سمجھ گئے ہو گے سینور کہ جس وقت میرے آٹھ ساتھی بھوک سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہے تھے۔ اس وقت آخر کیوں میرا وزن بڑھ رہا تھا...... تمہیں تمہارے سوال کا جواب مل گیا، تم نے مجھے مجبور کیا کہ میں ان اذیت ناک باتوں کو دہراؤں جنہیں میں پچھلے پینتیس سال سے بھولنے کی

کوشش کر رہا ہوں...... مجھے...... مجھے امید ہے کہ اب تم اپنا وعدہ پورا کرتے ہوئے یہ سب کچھ بھلا دو گے...... یہ راز تمہارے ساتھ تمہاری قبر میں دفن ہو جائے گا؟''

''بے شک کرنل میں اپنے وعدے پر قائم رہوں گا۔ میں وعدہ خلاف نہیں ہوں۔'' ٹونی نے جواب دیا......

ٹونی فوراً ہی کرنل کے مکان سے واپس اپنے ہوٹل آ گیا۔ وہ اس معمے کے حل ہو جانے پر خوش تھا اور اسے ہمیشہ اپنے سینے میں دفن رکھنے پر افسردہ بھی تھا۔ وہ اس راز سے دنیا کو آگاہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنے پڑھنے والوں کو ایک بے حد سنسنی خیز کہانی سے محروم رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ غیر شعوری طور پر وہ بہت دیر تک اس کہانی کا عنوان سوچتا رہا۔ وہ اس کہانی کو شائع کرانے کے لئے غیر شعوری طور پر ماہناموں کا انتخاب کرتا رہا۔ پھر وہ اس امکان پر غور کرنے لگا کہ آیا اس کہانی کو پھیلا کر ایک پوری کتاب پر محیط کیا جا سکتا ہے۔ وہ تصوراتی نظروں سے اپنی اس کتاب کو بک اسٹالوں پر نمایاں جگہ پر لگے ہوئے دیکھنے لگا۔ اسے یقین ہو گیا کہ یہ کتاب اس کی پیشہ ورانہ زندگی میں ایک انقلاب برپا کر دے گی۔ اس کی پوری زندگی تبدیل ہو جائے گی۔ وہ اس کتاب کے ساتھ اس کے مصنف کی حیثیت سے امر ہو جائے گا۔

اچانک اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ضرور اس کتاب کو لکھے گا اور اس طرح اس انداز میں کہ پڑھنے والے اسے پڑھنے کے بعد کرنل ملاگرا سے نفرت کے بجائے ہمدردی کرنے لگیں۔ وہ اس کتاب کے ایک ایک لفظ کو اپنے جذبات کی قوت سے متحرک کر دے گا...... اس طرح کہ پڑھنے والوں کا دل اس کے قلم سے نکلے ہوئے ہر لفظ کے ساتھ دھڑکتا رہے۔ وہ ابھی اور اسی وقت کرنل کے پاس جائے گا اور بلا تمہید اس سے کہے گا۔

''کرنل ملاگرا میری بات غور سے سنو اور پوری بات سننے کے بعد ہی تم اس بات کا فیصلہ کرنا کہ میں تمہاری کہانی لکھوں یا نہیں۔

سنو 35 سال سے تم دنیا سے الگ تھلگ قید

تنہائی کی زندگی بسر کر رہے ہو۔ تم اپنے چہرے کو اس قدر بدنما تصور کرتے ہوئے کہ اسے دنیا بھر کی نظروں سے روپوش رکھنا چاہتے ہو۔ تمہیں اپنے نام سے بھی اتنی نفرت ہوگئی ہے کہ تم نے اسے بھی تبدیل کر دیا۔ کس لئے؟ صرف اپنے ایک احمقانہ اور بے بنیاد خوف کی وجہ سے تم سمجھتے تھے کہ اگر تم نے دنیا پر حقیقت کا اظہار کر دیا تو کوئی بھی سمجھنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ کوئی بھی تم سے ہمدردی کا اظہار نہیں کرے گا...... کسی غلطی کی تصحیح کے لئے شاید 37 سال کا عرصہ بہت زیادہ ہوتا ہے کرنل لیکن اگر یہ تصحیح تمہاری جگہ کوئی دوسرا آدمی کرے گا؟

اگر کوئی دوسرا آدمی دنیا کو اس سچائی سے آگاہ کرے کہ اس وقت تم نے جو کچھ بھی کیا پوری دیانتداری اور پوری سچائی سے حالات کا جائزہ لے کر کیا تھا۔ غلط یا صحیح تمہارا عمل پر خلوص تھا۔ تمہیں یہ ڈر تھا کہ کھانے کے سامان کا علم ہونے پر وہ سب اسے حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کا گلا کاٹ دیں گے۔ یہ عین ممکن ہے کرنل بلکہ مجھے پورا یقین ہے کہ ایک غیر متعلق غیر جانبدار آدمی کی زبانی پوری حقیقت جاننے کے بعد دنیا تمہیں صاف بری کر دے گی۔ لوگ تمہیں سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ تم سے ہمدردی کا اظہار کریں گے جو کچھ ہوا اس پر تاسف کا اظہار کیا جائے گا اور پھر...... پھر تم آزاد ہو جاؤ گے...... اپنے خوف سے اور اس قید تنہائی سے۔ تب تم ایک مرتبہ پھر اپنا پرانا نام استعمال کر سکو گے۔ کرنل ملاگرا پھر تمہیں لوگوں سے اپنا چہرہ نہیں چھپانا پڑے گا پھر تم اپنی مرضی کی زندگی گزار سکو گے......''

ہوٹل سے کرنل کے مکان کا درمیانی فاصلہ ٹونی نے اپنے ذہن میں ان دلائل کو دہرانے، یاد کرنے اور انہیں مرتب کرنے میں صرف کیا جو وہ کرنل کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا کرنل کے مکان کی ایک سو پندرہ سیڑھیاں طے کرتے وقت وہ با آواز بلند اپنی اس بے حد جذباتی تقریر کو دہرا رہا تھا۔ اس نے مکان کے دروازے پر دستک دی۔

دروازہ بے حد موٹی لکڑی کا بنا ہوا تھا اس لئے وہ دستک کی آواز ہضم کر گیا۔ ٹونی نے دروازے کو دھکیلا تو وہ بلا آواز کھلتا چلا گیا۔ وہ کرنل کو تلاش کرتا ہوا کھانے کے کمرے میں پہنچا۔ کرنل اس وقت کھانے کی میز پر بیٹھا ہوا۔ رات کا کھانا کھانے میں مشغول تھا۔ اس کا گونگا ملازم اس کے قریب کھڑا ہوا شراب کی بوتل سے میز پر رکھا ہوا مٹی کا ایک پیالہ شراب سے بھر رہا تھا۔

ٹونی نے انہیں متوجہ کرنے کے لئے کھنکار کر گلا صاف کیا، کھنکارنے کی آواز سنتے ہی کرنل کے جسم کو جیسے بجلی کا جھٹکا لگا۔ وہ اس تیزی سے مڑا کہ اس کی کرسی الٹتے الٹتے بچی۔

ٹونی اس طرح بغیر کسی اطلاع کے گھر میں گھس آنے پر معذرت طلب کرنے لگا لیکن پھر اچانک اس کی نظر کرنل کے سامنے رکھی ہوئی پلیٹ پر پڑی جب اسے احساس ہوا کہ اس پلیٹ میں کیا رکھا ہوا ہے تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

یہ جاننے کے بعد کہ کرنل نے اسے جو کچھ بتلایا تھا وہ سب جھوٹ تھا الفاظ اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئے۔ کرنل کی نظریں ٹونی کی نظروں کا تعاقب کرتی ہوئی اپنے سامنے رکھی ہوئی پلیٹ پر آ کر رک گئیں جس میں پانچ سات نیلی چھپکلیاں کٹی ہوئی رکھی تھیں۔

ٹونی کے کانوں میں کرنل کے الفاظ گونجنے لگے۔ ''اس جزیرے پر صرف اور صرف نیلے رنگ کی چھپکلیاں پائی جاتی تھیں جیسی کہ تم نے اس جزیرے پر دیکھی ہوں گی۔''

''تو کیا اس جزیرے پر کرنل دنیا کا غلیظ ترین اور کراہیت آمیز جانور چھپکلیاں کھاتا رہا اور چھپکلیاں کھانے کی عادت اسے اس جزیرے پر مقید کئے ہوئے ہے۔'' کرنل نے رحم طلب نظروں سے اسے دیکھا۔

''پلیز سینور، پلیز۔'' کرنل نے اسے گھگھیاتے ہوئے کہا۔ ''تم سمجھنے کی کوشش کرو سینور، ایک مرتبہ کوئی چیز منہ کو لگ جائے تو......''



ہوگئی تھی اور اسے سگریٹ کی طلب بھی محسوس ہورہی تھی۔

جب وہ اپنی چیزیں سمیٹ رہی تھی تو اس کا سگریٹ کا پیکٹ ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جاگرا اور اچھل کر بیڈ کے نیچے چلا گیا۔ پیکٹ نکالنے کے لیے اس نے چادر کا کنارہ ہٹا کر نیچے دیکھا مگر سگریٹ کا پیکٹ بیڈ کے نیچے دور چلا گیا تھا۔ ایک گہری سانس لیتے ہوئے وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور بیڈ کے نیچے ہاتھ پھیرا۔

کسی نے ایک دم اس کی کلائی کو تھام لیا اور بیڈ کے نیچے اپنی طرف کھینچا، اس کا چہرہ بری طرح بیڈ کے ساتھ ٹکرایا، اسے یوں لگا جیسے اس کے دانت ٹوٹ جائیں گے۔ یہ سب اتنا تیزی سے ہوا کہ وہ چلا بھی نہ سکی۔ وہ اپنے پہلو کے بل فرش پر گر گئی اور وہ اسے سینے کے بل بیڈ کے نیچے لیٹا ہوا نظر آ گیا۔ اس نے نرسوں والا لباس پہن رکھا تھا اور اس کے بال بری طرح الجھے ہوئے تھے اس کی آنکھوں میں وحشت تھی اور سانسوں میں باسی مچھلی کی بو۔

''عورت......؟ تمہیں بیڈ کے نیچے جھانکنا نہیں چاہیے تھا......'' خرخراتی ہوئی آواز سرگوشی نما تھی جس میں دنیا جہاں کا خوف سمایا ہوا تھا۔ اس کے الفاظ سے دہشت ٹپک رہی تھی۔ اس کا لہجہ جہنمی تھا۔

اسٹیفنی کے ذہن میں تیزی سے تانے بانے جڑنا شروع ہو گئے ہوں جیسے تالے کھلنا شروع ہو گئے ہوں اور پھر اس سے پہلے کہ وہ زیادہ کچھ سمجھ سکتی اس بدبو دار آدمی نے ایک جھٹکے کے ساتھ اسے بیڈ کے نیچے اپنی طرف کھینچ لیا۔

☆......☆......☆

''کیا یہ وہی عورت ہے......'' پولیس آفیسر کی ٹارچ کی روشنی اس کے ننگے پاؤں پر پڑی پھر وہ رینگتی ہوئی برہنہ ٹانگوں سے ہوتی ہوئی اس کے بازوؤں پر آ گئی جہاں دانتوں کے کاٹنے کے گہرے سرخ نشان نمایاں تھے جب روشنی اس کے چہرے پر پہنچی تو ڈینیل صرف سر ہلا کر رہ گیا۔

چہرہ اس بری حالت میں تھا کہ پہچاننا مشکل تھا کہ یہ وہی عورت ہے جو گزشتہ رات دریا کے کنارے والے کمرے سے غائب ہوگئی تھی۔ اس کے چہرے پر جہاں کبھی خوبصورت اور دلکش آنکھیں ہوا کرتی تھیں اب دو سیاہ سوراخ تھے۔

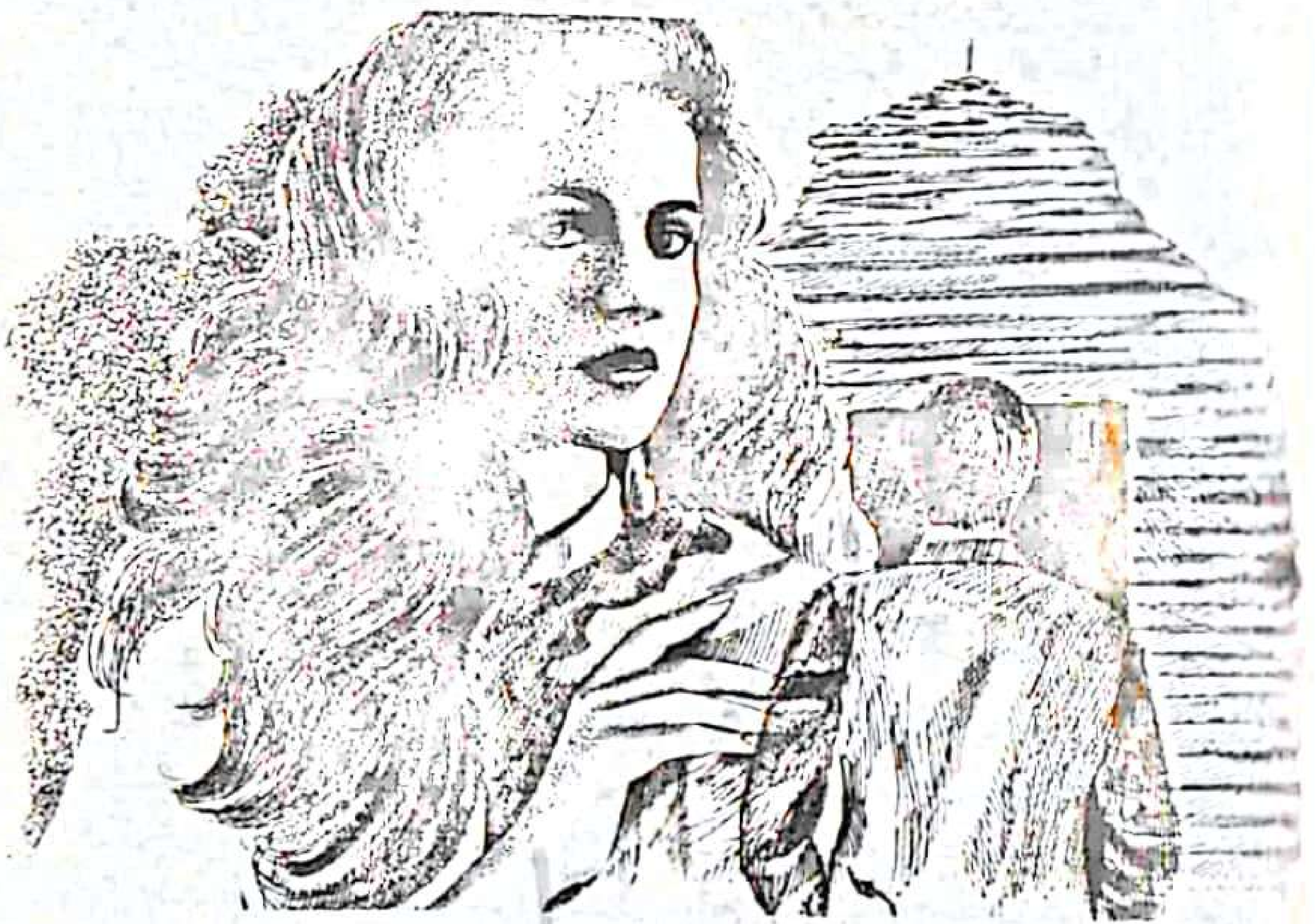
''ہاں...... یہ وہی ہے......'' ڈینیل بمشکل بول سکا۔

''اوہ......'' آفیسر نے اپنا سر ہلایا اور پیچھے مڑ کر بروک شائر سرائے کی طرف دیکھا۔ لاش سرائے سے کافی فاصلے پر جھاڑیوں کے پیچھے پولیس کو ملی تھی۔ ڈینیل اس وقت کو یاد کرتا رہا جب وہ کمرے کو صاف کیا کرتا تھا اس وقت اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی اسے چھپ کر دیکھ رہا ہے۔

تقریباً چار گھنٹے بعد پولیس نے کمرہ نمبر 110 کا معائنہ ختم کر لیا اور انہوں نے اس کے باہر پیلی ٹیپ لگا دی تھی تاکہ کوئی اندر نہ جا سکے۔ جب کہ اسٹیفنی کی کار کمرے کے بار پارک تھی۔ ڈینیل کچھ سوچ کر کمرے کے عقبی حصے کی طرف چل پڑا وہاں سوائے خاموشی اور ویرانی کے کچھ بھی نہ تھا مگر بیڈ روم کی کھڑکی کے باہر چوکھٹ پر ہاتھوں کے خون آلود نشانات تھے۔

وہ واپس دفتر جانے کے لیے مڑا تو اسے اپنی گردن کے پیچھے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا محسوس ہوا' وہ فوراً مڑا اور اپنی آنکھیں جھپکانے لگا۔ اس کی نظر سیدھی کھڑکیوں کی طرف اٹھی جہاں صرف ایک لمحے کے لیے وہ اسے نظر آئی۔ اس کی آنکھوں کی جگہ خالی گڑھے تھے جن سے لہو بہہ رہا تھا، اس کا منہ چیخنے کے لیے کھلا ہوا تھا مگر کھڑکی کی بند شیشوں کے پیچھے سے آواز سنائی نہیں دے رہی تھی ڈینیل کی مٹھیاں بھنچ گئیں......اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا آس پاس کچھ بھی نہیں تھا' غیر ارادی طور پر اس نے دوبارہ کھڑکی کی طرف دیکھا مگر......اب وہ خالی تھی وہاں کچھ بھی نہ تھا...... اور وہ سوچنے لگا کہ......کیا یہ اس کا تخیل تھا۔





مندر کا حصار

ایس امتیاز احمد - کراچی

کالی ماتا کے ایک مندر کی پراسرار داستان حیرت جو انسانوں سے صدیوں کے فاصلے پر چلا گیا تھا۔ ایک میل کا فاصلہ جس تک پہنچنا سائنس کے اس دور میں بھی ناممکنات میں سے ہے......!!

اچنبھے میں ڈالتی، عقل و شعور میں نہ آتی اور چونکا دینے والی ایک پراسرار حقیقی کہانی

کس قدر عجیب بات تھی، وہ مندر گاؤں سے صرف ایک میل کے فاصلے پر تھا لیکن ایک میل کا یہ فاصلہ میں اور شاہد علی صبح سے اب تک طے نہیں کر سکے تھے۔ دوپہر کے بارہ بج چکے تھے۔ دھوپ میں بلا کی شدت آ چکی تھی۔ ہمارے جسم پسینے میں تر تھے۔ دم لبوں پر آ گیا تھا۔ اس پر بھی میں مندر تک جانے کے لئے بضد تھا اور ایک میل کا فاصلہ بدستور قائم تھا۔

میں شاید اس گاؤں میں کبھی نہ آتا، اگر شاہد اس شدومد سے اصرار نہ کرتا۔ وہ میرا کالج کے زمانے کا دوست تھا۔ موجودہ بنگلہ دیش کا شہر سلہٹ سے تیس چالیس میل کے فاصلے پر اس کا گاؤں تھا۔ گاؤں کی پرسکون اور سرسبز و شاداب زندگی پر اکثر باتیں کیا کرتا۔ شہروں کے ہنگامے اسے ناپسند تھے۔ شور شرابا اس کے حواس پر گراں گزرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ مجھے

گاؤں میں چند دن گزارنے کی دعوت دیا کرتا۔ میں اس کی خواہش تعلیم کے زمانے میں تو پوری نہ کر سکا البتہ والد کی وفات کے بعد جب میں نے کاروبار سنبھالا اور زندگی یکساں نیت کا شکار ہوگئی تو ایسے میں ایک بار پھر شاہد کا خط ملا۔ اب وہ بھی گاؤں میں اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔

اس کا خط ماحول کی یکسانیت سے فرار کا ایک راستہ نظر آیا اور میں گاؤں جانے کے لئے تیار ہوگیا۔ میں نے اسے بذریعہ تار اطلاع بھی دے دی کہ میں فلاں تاریخ کو آرہا ہوں۔

شاہ آباد ایک چھوٹا سا گاؤں ہے اس کی مناسبت سے اسٹیشن بھی چھوٹا ہی ہے۔ اسٹیشن پر اترنے والے صرف تین چار آدمی تھے جن میں سے ایک میں تھا۔ گرمیوں کے دن تھے چلچلاتی دھوپ میرا مزاج پوچھ رہی تھی لیکن شاہد کو پلیٹ فارم پر موجود دیکھ کر میری ساری کوفت دور ہوگئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف لپکے اور بغل گیر ہو گئے۔ بہت دنوں کے بعد ملاقات ہوئی تھی اس لئے کافی دیر تک ایک دوسرے کے گلے لگے رہے۔

گاؤں میں ٹیکسیاں اور رکشے نہیں تھے اس لئے ہم ایک تانگے پر بیٹھ کر روانہ ہوئے۔ ہر طرف کھیت ہی کھیت لہلہا رہے تھے۔ کہیں کہیں کنوئیں اور ہٹ بھی دکھائی دیئے۔ آخر ہم ایک بڑے سے پختہ مکان کے سامنے تانگے سے اترے۔ گھر کا دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو صحن میں ایک عورت اور ایک نوجوان لڑکی بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھی۔ لڑکی فوراً اٹھ کر اندر چلی گئی۔ شاہد نے اپنی والدہ اور بہن کا ذکر اکثر کیا کرتا تھا۔ اچٹتی سی ایک نظر میں میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کی بہن کا رنگ سانولا تھا اور اس کے چہرے میں کوئی کشش بھی نہیں تھی۔ ہمیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر شاہد کی والدہ کے سبزی کاٹتے ہاتھ رک گئے۔ ان کے چہرے پر ایک پرشفقت مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ ایسی مسکراہٹ میں نے صرف اپنی والدہ کے چہرے پر دیکھی تھی۔

"یہ میری امی ہیں اور تمہیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر جو اندر بھاگ گئی، میری بہن شمائلہ ہے۔" شاہد نے تعارف کرایا۔

"اور امی یہ ہے میرا گہرا دوست۔ بس میں نے زندگی میں انور کو ہی دوست بنایا ہے۔"

میں نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور شاہد مجھے ایک کمرے میں لے آیا۔ گھر کا ماحول حد درجہ پرسکون تھا۔ ہر چیز صاف ستھری تھی۔ کہیں کوئی بے ترتیبی نظر نہ آئی۔ جس کمرے میں شاہد نے مجھے ٹھہرایا، اس میں ایک پلنگ بچھا تھا جس پر سفید چادر موجود تھی۔

پلنگ کے ساتھ ایک چھوٹی سی میز تھی اور میز کے دوسری طرف ایک کرسی۔ شاہد مجھے پلنگ پر بیٹھانے کے بعد خود کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔ "میری بہن بہت شرمیلی ہے، میں نے اس سے کہہ بھی دیا تھا کہ تم سے پردہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ تمہارے گھر میں بھی مجھ سے کبھی پردہ نہیں کیا گیا لیکن اس کے باوجود وہ تمہیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر اندر چلی گئی۔ تم کوئی خیال نہ کرنا۔ وہ بہت سیدھی ہے۔ شہری آب و ہوا اور ماحول سے اسے ذرا بھی واقفیت نہیں۔" جواب میں میں مسکرا اٹھا اور بولا۔ "کوئی بات نہیں پردہ کرنا تو بہت اچھی عادت ہے۔"

میں دوسری صبح شاہد کے ساتھ غسل خانے کی طرف جانے کے لئے باہر نکلا تو پھر شمائلہ پر نظر پڑی اور یہ دیکھ کر قدرے حیرت ہوئی کہ کل اس کے جو نقوش پھیکے نظر آئے تھے ان میں اس وقت ایک عجیب سی جاذبیت تھی۔ میں اس جاذبیت کی کوئی وجہ نہ جان سکا۔ اسے کوئی معنی نہ پہنا سکا۔ لڑکی تو وہی تھی نقوش بھی وہی تھے پھر ایک ہی رات میں اس قدر فرق کیسے رونما ہوگیا تھا۔ تو کیا کل میری نظر اس پر غلط رخ سے پڑی تھی؟ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقفے میں یہ خیالات میرے ذہن میں گھوم گئے۔ اتنے میں شمائلہ پھر اٹھ کر کمرے میں چلی گئی تھی۔

میں نے اپنے سر کو ایک جھٹکا دیا اور خود کو لعنت ملامت کی کہ دوست کی بہن کے بارے میں سوچنا بھی گناہ ہے لیکن ذہن پھر پھرا کر اس کی طرف منتقل ہوتا رہا۔

نہا دھو کر ناشتے سے فارغ ہوئے تو گاؤں کی سیر کی ٹھہری۔ ہم گھر سے باہر نکلے۔ اس وقت میری نظر اس مندر پر پڑی۔ مندر صبح کو دھوپ میں چمک رہا تھا۔ اس کی آب و تاب اور چمک دمک نے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔ میں نے شاہد سے پوچھا۔ ''کیا یہاں ہندو بھی آباد ہیں؟'' وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے مسکرایا اور کہنے لگا ''کبھی تھے۔ اب یہاں صرف مسلمان آباد ہیں۔'' مجھے یہ سن کر اور بھی حیرت ہوئی کیونکہ مندر تو بالکل نیا نظر آتا تھا۔ مجھے حیران دیکھ کر شاہد بولا۔ یہ حقیقت ہے کہ مندر بالکل نیا نظر آتا ہے لیکن یہ بہت پرانا ہے۔

ہم پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے مندر کی طرف بڑھنے لگے۔ میں مندر کے بارے میں متجسس ہو گیا تھا اور چاہتا تھا کہ اسے اندر سے دیکھوں۔ میری اس خواہش کے جواب میں شاہد نے بتایا کہ ''ہم قیامت تک بھی چلتے رہیں تو مندر تک نہیں پہنچ سکیں گے۔''

''کیا مطلب؟'' میں بری طرح چونکا۔

''نہ جانے کتنے لوگ مندر تک جانے کی کوشش کر کے ہار چکے ہیں۔ لیکن آج تک کوئی بھی پہنچ نہیں سکا۔''

''لیکن مندر تو بہت نزدیک ہے۔''

شاہد نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ میرے تجسس میں لحظہ بہ لحظہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ہم نالے تک پہنچ گئے۔ اس نالے میں بارش کا پانی بہہ رہا تھا۔ شاہد نے بتایا کہ ''اس نالے سے مندر کا فاصلہ صرف ایک میل ہے۔''

''تو پھر ہم ایک میل کا یہ فاصلہ چند منٹ میں طے کر لیں گے۔ آخر ایسی کیا بات ہے کہ لوگ ایک میل کا یہ مختصر سا راستہ طے نہیں کر سکتے ضرور تمہیں وہم ہو گیا ہے۔'' میں نے کہا۔

میرا اصرار حد سے بڑھ گیا تو شاہد میرے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو ہی گیا۔ ہم نے ایک چھلانگ میں نالہ پار کیا اور پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ یہ پگڈنڈی سیدھی مندر کی طرف جاتی تھی۔ میں دل ہی دل میں شاہد پر ہنس رہا تھا جس کے خیال میں ایک میل کا یہ مختصر سا راستہ ہم قیامت تک بھی طے نہیں کر سکتے تھے، جبکہ میرا خیال تھا کہ ابھی تھوڑی دیر بعد ہم مندر کے پاس موجود ہوں گے۔

اچانک مجھے ایک ٹھوکر لگی۔ میں نے سنبھلنے کی بہت کوشش کی مگر منہ کے بل دائیں ہاتھ کی طرف کھائی میں گرا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ میرے ساتھ ہی شاہد کو بھی ٹھوکر لگی تھی اور وہ بھی گرا تھا۔ کپڑے جھاڑتے ہوئے ہم اٹھے اور دوسرے ہی لمحے حیرت کا ایک پہاڑ مجھ پر ٹوٹ پڑا کیونکہ ہم دونوں اس جگہ کھڑے تھے جہاں سے ہم نے نالہ پار کیا تھا۔

چند لمحے تک میں سکتے کے عالم میں کھڑا رہا۔ یہ بات میری سمجھ سے بالاتر تھی کہ ہم دونوں واپس اس جگہ کیسے پہنچ گئے؟ ٹھوکر تو ہم نے نالے کے پار تقریباً ایک فرلانگ دور کھائی تھی۔ شاہد کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ اگرچہ اسے پہلے ہی معلوم تھا کہ کیا ہوگا۔ اس کے باوجود وہ بھی سکتے کے عالم میں تھا۔ میں نے اس کے شانے پر ایک تھپکی دی اور بولا۔ ''فکر نہ کرو دوست ہم سے ضرور غلطی ہوئی ہے۔ ہم ایک بار پھر کوشش کریں گے اور انشاءاللہ اس دفعہ مندر تک پہنچ کر ہی دم لیں گے۔''

''شاہد تھکے تھکے انداز میں مسکرایا اور کہنے لگا۔ ''یہی تمہاری بھول ہے میرے دوست! میں کہہ چکا ہوں کہ ہم مندر تک نہیں پہنچ سکتے۔'' میں نے سر جھٹک دیا اور ''آؤ'' کہتا ہوا نالہ پار کر گیا۔ شاہد کو مجبوراً میرا ساتھ دینا پڑا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''دھیان رکھنا ٹھوکر ہرگز نہ کھانا۔ اگر ہم نے ٹھوکر نہ کھائی تو کامیابی ضرور ہمارے قدم چومے گی۔'' شاہد نے کوئی جواب نہ دیا اور میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

ایک بار پھر ہم اسی راستے پر چلے جا رہے تھے لیکن تھوڑی دیر بعد وہی ہوا جو پہلے ہو چکا تھا۔ پھونک

پھونک کر قدم رکھنے کے باوجود ہم نے ٹھوکر کھائی اور نالے کے دوسری طرف آرہے۔

سورج اب سر پر آگیا تھا۔ دھوپ نے شدت اختیار کرلی تھی۔ حبس اور گھٹن میں بھی اضافہ ہو چلا تھا۔ ہمارے کپڑے گرد اور کیچڑ میں لتھڑ گئے تھے۔ سانس پھولنے لگا تھا جیسے میلوں کا فاصلہ دوڑ کر طے کر چکے ہوں اور کھیتوں سے اٹھنے والی بساندہ گھبراہٹ میں اضافہ کررہی تھی۔ شاہد نے مضمحل لہجے میں کہا۔

''اب کیا ارادہ ہے دوست؟''

میں نے جھلا کر کہا۔ ''ایک بار پھر کوشش کریں گے۔''

شاہد نے مجھے باز رکھنے کی بہت کوشش کی۔ اس نے میرا بازو پکڑا اور گھر کی طرف کھینچتے ہوئے بولا۔

''مان جاؤ دوست، ہم عمر بھر بھی چلتے رہیں گے تو بھی یہ ایک میل کا فاصلہ کم نہ ہوگا، جوں کا توں رہے گا۔ یہ گاؤں آخری آبادی ہے یہاں دوسری جگہوں سے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ لہٰذا کسی زمانے میں تو لوگوں کو جنون سا ہوگیا تھا۔ انہوں نے بار بار کوشش کی اور ہر بار منہ کی کھائی۔ یہاں تک سب تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ لہٰذا آؤ گھر چلتے ہیں۔ کھانے کے ساتھ جب ٹھنڈی چھاچھ پئیں گے تو ساری کوفت اور تھکن دور ہو جائے گی۔''

اس کی لمبی چوڑی تقریر کا مجھ پر ذرہ برابر بھی اثر نہ ہوا اور ایک بار پھر میں نے نالے کے پار چھلانگ لگادی۔ وہ آخر میرا دوست تھا۔ اسے میرا ساتھ دینا ہی پڑا لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات رہا۔ اس وقت میں نے خوفزدہ انداز میں پوچھا۔ ''کیا یہ جادو کا مندر ہے؟ اس نے نفی میں سر ہلادیا۔ یہ ہماری تیسری کوشش تھی لیکن میں ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ آخر یہ راز کیا ہے؟ میں نے شاہد سے کہا۔ ''بس ایک مرتبہ اور کوشش کریں گے۔ اگر پھر بھی نہ پہنچ سکے تو میں ہار مان لوں گا۔''

ہم دونوں نے چھلانگ لگائی اور نالے کے پار پہنچ گئے۔ میں نے جیب سے رومال نکالا اور نالے کے کنارے موجود ایک درخت کی شاخ سے باندھنے لگا۔

''یہ کیا کررہے ہو؟'' شاہد کے لہجے سے اس مرتبہ طنز کی جھلک عیاں تھی۔

''میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ وہی نالہ ہے جسے ہم بار بار پار کرچکے ہیں یا کوئی دوسرا نالہ ہمارے سامنے آتا ہے۔''

شاہد کو میری بات سن کر ہنسی آگئی تاہم وہ رکا نہیں۔ پگڈنڈی بادی النظر میں بالکل سیدھی تھی اور مندر تک چلی گئی تھی۔ اس مرتبہ میں نے ہر ممکن احتیاط سے کام لینے کی ٹھان رکھی تھی اور اس سلسلے میں پہلے تر کیب یہ کی کہ شاہد کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ اب اگر ہم میں سے کسی کو ٹھوکر لگتی تو گرنے کا احتمال نہیں تھا۔ ہم چلتے گئے لیکن فاصلہ کسی صورت کم ہوتا نظر نہیں آرہا تھا۔ شاہد کا گھر بھی نالے سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر تھا اور عجیب ترین بات یہ تھی کہ یہ فاصلہ بھی زیادہ ہوتا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ فاصلہ نہ کم ہورہا تھا نہ زیادہ ہم ہر حال میں وہیں کے وہیں تھے۔ اس پر بھی میں قدم اٹھانے سے باز نہیں آیا۔ شاہد کے ہاتھ پر میری گرفت مضبوط تھی۔

''خوب ہوشیاری سے قدم اٹھاؤ، خبردار اس مرتبہ ہم ٹھوکر ہرگز نہیں کھائیں گے۔'' میں نے شاہد کو تنبیہ کی۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا، البتہ سر ضرور ہلادیا۔ لیکن جو کچھ ہونا تھا، وہ تو پلک جھپکنے میں ہی ہوگیا۔

''سس...... سانپ!''

بدحواسی کے عالم میں شاہد کے منہ سے نکلا۔ بس اسی لمحے میری توجہ پگڈنڈی سے ہٹ گئی اور میں اچھل کر ویران کھیت میں جا پڑا۔ مجھے ہوش آیا تو اسی مقام پر ہم کھڑے تھے اور نالے کے دوسرے کنارے پر ناریل کے درخت سے اڑسا ہوا رومال ہوا میں لہرا رہا تھا۔ شاہد کے چہرے پر طنز آمیز مسکراہٹ میں تھکن کی آمیزش بھی تھی۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ ''اب کیا خیال ہے بیٹے؟ میں جھلا

اٹھااور اس سے بولا۔

''یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا تم نے بلاوجہ مجھے ڈرادیا، حالانکہ وہاں سانپ کا نام ونشان نہیں تھا۔''

شاہد نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔''سانپ یقیناً تھا، میں نے اسے تمہارے پیروں کے عین نیچے دیکھا تھا۔''

اور میں حیرت زدہ رہ گیا۔ اگر شاہد سچ کہہ رہا تھا تو پھر سانپ مجھے کیوں نظر نہ آیا؟ اور پھر یہ بھی کچھ کم حیران کن حقیقت نہیں تھی کہ ہر بار ہم نالے کے اس پار پگڈنڈی سے لڑھکتے تھے اور خود کو نالے کے اس پار یعنی شاہد کے گھر کی سمت میں پاتے تھے۔ خدا جانے کیا چکر تھا۔ آخر میں نے کہا۔

''آؤ، ایک بار پھر کوشش کریں۔''

''ٹھہرو! پہلے ایک کہانی سن لو اس کے بعد کوشش کرتے رہنا، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ شروع میں میں نے تمہیں یہ کہانی اس لئے نہیں سنائی تھی کہ تم اسے کسی مجذوب کی بڑ نہ سمجھو۔ پہلی مرتبہ جب تم نے مندر کے بارے میں پوچھا تھا تو اس وقت میں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ کوئی شخص بھی اپنے پیروں سے چل کر مندر تک نہیں جاسکتا۔ بس تم پر بھوت سوار ہوگیا۔ اب تم جان چکے ہو کہ میں نے غلط نہیں کہا تھا۔''

''تو اب تم مجھے کوئی کہانی بھی سناؤ گے۔ خیر سناؤ، اس طرح دم لینے کا موقع بھی مل جائے گا۔''

شاہد نے کہنے کے لئے ہونٹ ہلائے ہی تھے کہ پھر رک گیا۔ پھر کہنے لگا۔''نہیں اس طرح تمہیں اس کہانی پر یقین نہیں آئے گا، آؤ گھر چلیں وہاں ہمارے ایک بزرگ کی ڈائری موجود ہے۔ اس ڈائری میں اس مندر کے متعلق پوری تفصیل موجود ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم اس ڈائری کا مطالعہ کرلو لیکن اس سے پہلے ہم کھانا کھائیں گے کیونکہ بھوک خوب چمک اٹھی ہے۔''

میں نے اس کی تجویز کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور کپڑے جھاڑے اور اس کے ساتھ قدم اٹھانے لگا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی شمائلہ اور اس کی والدہ کی نظر ہم پر پڑی اور میں نے شاہد کی والدہ کی آنکھوں میں حیرت دیکھی جبکہ شمائلہ عجیب سے انداز میں مسکرائی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ اٹھی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ شاہد شاید اپنی ماں کو یہ بتانے کے لئے رک گیا تھا کہ ہمارے حلیے کیوں بگڑے ہوئے ہیں۔

کھانے سے فارغ ہوئے تو شاہد نے کتابوں کی الماری سے ایک چمڑے کی جلد والی ڈائری نکال کر میرے آگے رکھ دی اور بولا۔''اب تم لیٹ جاؤ اور لیٹ کر اس ڈائری کی ورق گردانی کرو۔ اس کے بعد تمہیں مجھ سے کوئی سوال پوچھنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ یہ ڈائری پڑھنے کے بعد بھی اگر تم مندر تک جانے کا ارادہ ترک نہیں کرو گے تو میں اس وقت تک تمہارا ساتھ دوں گا جب تک کہ تم تھک نہیں جاؤ گے۔''

یہ کہتے ہوئے وہ باہر نکل گیا اور میں نے پلنگ پر لیٹ کر ڈائری کی جلد الٹ دی۔ شاہد سے یہ تک پوچھنے کا خیال نہ رہا تھا کہ جس شخص کی یہ ڈائری ہے اس کا خود شاہد سے کیا رشتہ تھا۔ پہلے ہی صفحے پر لکھا تھا۔''یہ ڈائری سید بشیر احمد کی ملکیت ہے۔'' میں نے ورق اُلٹ کر دیکھا۔ یہ کوئی باقاعدہ تاریخ وار ڈائری نہیں تھی۔ صرف ایک نوٹ بک تھی اور اس پر فوراً ہی وہ کہانی شروع ہوگئی تھی جو شاہد مجھے سنانے والا تھا۔ کہانی کچھ یوں تھی۔

یہ گاؤں میرے والد حضرت شاہ خیر اللہ نے بسایا تھا۔ وہ اپنے وقت کے عالم باعمل اور بہت بڑے بزرگ تھے۔ وہ حضرت شاہ جلال مجرو سلہٹی کے مقرب خلیفہ تھے۔ حضرت شاہ جلال نے تبلیغ کی غرض سے سلہٹ کو اپنا مرکز بنایا تو اپنے مقرب شاگردوں کو بنگال کے مختلف علاقوں میں جا کر تبلیغ کا حکم دیا۔ میرے والد کو شمال مغرب کی طرف کوچ کا حکم ملا۔ وہ سلہٹ سے روانہ ہوئے تو اس جگہ آ پہنچے اور یہ جگہ انہیں کچھ ایسی بھائی کہ اپنے پیرو مرشد کی اجازت سے یہیں سکونت اختیار کرلی۔ ان کے ساتھ ان کے اہل

خانہ کے علاوہ نو مسلموں کی بھی اچھی بھلی تعداد تھی۔ وہ سب لوگ بھی یہیں آباد ہوگئے۔ پھر آہستہ آہستہ گاؤں کی آبادی بڑھنے لگی۔ میرے والد کا فیض عام ہوگیا۔ ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور بہت سے بے خانماں لوگ بھی یہاں آ کر بسنے لگے۔ اکثر غیر مسلم ان کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد کچھ ہندو ادھر آ نکلے۔ انہوں نے قبلہ والد سے اس گاؤں میں بسنے کی اجازت چاہی۔ والد صاحب نے انہیں بخوشی اجازت دے دی۔ شاید انہوں نے سوچا ہوگا کہ ہوسکتا ہے ان میں سے بھی بہت سے ہندو مسلمان ہو جائیں۔ چنانچہ ہندوؤں نے بھی کچے پکے مکان تعمیر کر لئے اور رہنے لگے۔ ان کے مکانات اس مندر کے آس پاس تھے۔ اس وقت یہ مندر نہیں تھا۔ مسلمان اور ہندو ایک دوسرے سے دور دور نہیں رہتے تھے۔ آپس میں بات چیت بھی کرتے تھے اور دکھ درد میں بھی شریک ہوتے تھے۔

ان ہندوؤں میں سے ایک کا نام رام داس تھا۔ اس کی ایک بیٹی بھی تھی جس کا نام روپا تھا۔ میں نے اسے اکثر پانی بھرنے کے لئے گھڑا لئے گاؤں کے کنوئیں کی طرف جاتے دیکھا تھا اور نہ جانے کیوں وہ مجھے اچھی لگتی تھی۔ جب بھی وہ مجھے نظر آتی، میں بے سدھ ہوکر اسے تکنے لگ جاتا۔ اس نے کئی بار میری محویت محسوس کیا مگر برا نہیں مانا۔ مجھے اس کی پیشانی پر بل نظر نہیں آئے۔ اس کے نقوش بہت تیکھے تھے اور ان تیکھے نقوش پر اس کا سانولا رنگ سونے پر سہاگہ تھا۔ اس کی ناک پتلی اور ہونٹ بھرے بھرے تھے جن کا رنگ جامنی سا تھا۔ چہرہ کتابی اور پیشانی کشادہ تھی۔ گردن بہت لمبی تھی، شاید ایسی ہی گردنوں کو صراحی دار کہا جاتا ہے۔ میں نے کبھی اس سے بات کرنے کی کوشش نہ کی، نہ اس کی طرف قدم بڑھائے، بس صرف دیکھتے رہنے پر اکتفا کیا کیونکہ اس کی طرف نہ دیکھنا میرے بس سے باہر تھا۔ اس نے بھی مجھ سے بات کرنے کی کبھی کوشش نہ کی۔

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ ایک ننگ دھڑنگ سا دھو گھومتا گھومتا اس گاؤں میں آ نکلا۔ ہندوؤں نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی اور پھر وہ بھی ان کے ساتھ ہی رہنے لگا۔ مسلمانوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ اس وقت کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ سادھو کے عزائم کیا ہیں۔ اگر معلوم ہوتا تو شاید اسے گاؤں میں گھسنے ہی نہ دیا جاتا۔ شروع شروع میں سادھو نے کوئی غلط حرکت نہ کی۔ وہ نہایت شریفانہ انداز سے رہتا رہا۔ ہندو اسے بہت پہنچا ہوا بزرگ خیال کرتے تھے۔ وہ اس کے آگے بچھے جاتے لیکن مجھے وہ ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ میں نے کئی بار یہ بات محسوس کی کہ وہ روپا کو بری طرح گھورتا ہے۔ لیکن میں مسلمان تھا، اسے روپا کے سلسلے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔

پھر سادھو نے پر پرزے نکالنے شروع کردیئے۔ سب سے پہلے اس نے ہندوؤں کو کالی مائی کا مندر تعمیر کرنے کی ترغیب دی۔ ہندو تو پہلے ہی اس کی باتوں پر عمل کرنا اپنا دھرم جانتے تھے۔ انہوں نے فوراً مندر کی تعمیر شروع کردی۔ میرے والد بزرگوار بھلا اس پر کیوں معترض ہوتے، وہ کسی کے مذہبی معاملات میں ٹانگ اڑانا پسند نہیں کرتے تھے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے مندر تعمیر ہوگیا۔ ہندو اس میں باقاعدہ پوجا پاٹ کرنے لگے۔ اب تو میرے والد بھی سوچنے پر مجبور ہوگئے۔ مندر میں پوجا کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہونے کا مطلب یہ تھا کہ اب ہندو طاقت پکڑ جائیں گے اور تبلیغ کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا۔ لیکن اب تو مندر بن چکا تھا، ہو بھی کیا سکتا تھا، وہ خاموش ہو رہے۔

انہی دنوں تبلیغ کے لئے والد صاحب کو چند مہینوں کے لئے گاؤں سے باہر جانا پڑا۔ یہ واقعہ ان کے جانے کے دو تین دن بعد کا ہے۔

ایک صبح لوگ بیدار ہوئے تو ایک نوعمر لڑکا غائب تھا۔ لڑکے کے ماں باپ نے اسے ادھر ادھر تلاش کیا، جب نہ ملا تو ایک ایک سے پوچھتے پھرے لیکن لڑکا تو اس طرح غائب ہوا جیسے کبھی اس کا وجود ہی دنیا میں نہ تھا۔

انہیں ابھی تک ہندو گھروں تک نہیں گئے تھے اب انہیں وہاں بھی جانا پڑا۔ ان سے پوچھ گچھ کی گئی لیکن لڑکے کا کوئی پتہ نہ چلا۔ لڑکے کے ماں باپ رو رو کر بے حال ہوگئے۔ خیال یہی کیا گیا کہ ضرور اسے کوئی درندہ اٹھا کر لے گیا ہے لیکن مشکل یہ تھی کہ ان اطراف میں درندے نہیں تھے اس لئے لڑکے کے بارے میں چہ میگوئیاں جاری رہیں۔

ایک صبح ایک نوجوان لڑکی غائب ہوگئی۔ گاؤں میں کہرام مچ گیا۔ ہر طرف لڑکی کو ڈھونڈا گیا مگر اسے نہ ملنا تھا نہ ملی۔ اب تو سب کے رنگ اڑ گئے۔ لڑکے کی گمشدگی کا واقعہ پھر سے ہرا ہوگیا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ والد صاحب ان دنوں بھی گاؤں سے باہر گئے ہوئے تھے۔ وہ واپس آئے تو انہیں اس بارے میں بتایا گیا۔ وہ سوچ میں ڈوب گئے۔ لوگوں کو محتاط رہنے کی ہدایت کی اور خود بھی رات کو گاؤں کا چکر لگانے لگے۔ ایک سال گزر گیا۔

آدھی رات کا وقت تھا اور میں گہری نیند سو رہا تھا اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ کوئی دروازے پر آہستہ آہستہ دستک دے رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس وقت کون آ گیا۔ اٹھ کر دروازہ کھولا اور دھک سے رہ گیا۔ زندگی میں اس سے زیادہ حیرت مجھے کبھی نہ ہوئی ہوگی۔

دروازے پر روپا کھڑی تھی۔

”وہ......وہ......اس کا بھینٹ دینے والے ہیں۔“ وہ ہکلائی زندگی میں پہلی بار وہ مجھ سے مخاطب ہوئی تھی۔

”کیا مطلب......؟“ میں بری طرح چونکا۔

”وقت نہیں ہے......میرے ساتھ آؤ۔“

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا، تاہم مقناطیسی انداز میں اس کے ساتھ ہولیا۔ چاند کی آخری تاریخیں تھیں۔ ہر طرف گھنگھور تاریکی مسلط تھی۔ روپا مجھ سے دو قدم آگے تھی اور تیز تیز چل رہی تھی۔ مجھے بھی اس کا ساتھ دینے کے لئے تیز چلنا پڑ رہا تھا۔ اندھیرے میں وہ مجھے ایک سایہ سا نظر آ رہی تھی۔ گرتا پڑتا میں اس کے پیچھے چلتا ہندوؤں کی آبادی میں داخل ہوگیا۔

آبادی میں داخل ہوتے ہی وہ مڑی اور اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اب اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میرے بدن میں کرنٹ سا دوڑنے لگا، مگر شاید وہ میرے احساسات سے بالکل بے خبر تھی یا پھر وہ وقت ہی ایسا تھا، اسے یہ احساس بھی نہیں رہ گیا تھا کہ اس نے ایک غیر مذہب جوان آدمی کا ہاتھ تھام لیا ہے۔ میں یہ دیکھ کر دھک سے رہ گیا کہ اس کا رخ اب کالی مائی کے مندر کی طرف تھا۔ اب اس کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ قدم اٹھاتے وقت ہلکی سی چاپ بھی پیدا نہیں ہونے دے رہی تھی۔

مندر کا دروازہ کھلا تھا اور اندر سے عجیب و غریب سی آوازیں ابھر رہی تھیں جیسے بہت سے لوگ مل کر بھجن گا رہے ہوں۔ یہ بھجن خالص ہندی زبان میں تھا اور میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ تاہم میں اتنا ضرور سمجھ گیا کہ گیت کالی مائی کی تعریف میں تھا۔ روپا یہاں تک پہنچ کر رک گئی اور اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ”آج اسے کالی مائی پر قربان کر دیا جائے گا۔ بچا سکتے ہو تو بچا لو۔“

میں سناٹے میں آ گیا۔ نہ جانے روپا کس کے بارے میں کہہ رہی تھی وہ کون بدنصیب تھا جسے قربان کیا جانے والا تھا، اور پھر انسانوں کی قربانی میں تھرا کر رہ گیا۔ ایسا تو میں نے کیا کسی بھی مسلمان نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ جن ہندوؤں کو ہم نے گاؤں میں رہنے کی اجازت دی پھر ان کے سادھو مہاراج کو بھی آنے سے نہ روکا، اب وہی لوگ اپنی کالی ماتا پر انسانوں کو قربان کر رہے تھے۔ اور مجھے یقین ہوگیا کہ ضرور کوئی مسلمان ہوگا۔

بس اس لمحے، میرا خون کچھ طرح کھولا کہ میں خود پر قابو نہ پا سکا۔ پوری قوت سے دروازے کو دھکیلا اور اندر داخل ہوگیا۔ دروازہ کھلنے کی آواز بھجن کی لے پر حاوی ہوگئی، گیت کے سر دب سے گئے جیسے نیکی بدی پر غالب آنے لگی ہو۔ اس آواز نے بم کا کام کیا۔ مندر

میں موجود تمام لوگ اس طرح چونکے جیسے کسی گہرے خواب میں محو تھے۔ انہوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری طرف دیکھا۔ میرے سامنے کالی مائی کا ہیبتناک بت تھا۔ اس کا رنگ بالکل سیاہ تھا۔ کتنے ہی بازو مختلف سمتوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ کئی انچ لمبی زبان باہر کو نکلی ہوئی تھی، البتہ اس کالے رنگ کے بت میں صرف آنکھیں سرخ رنگ کی تھیں اور یہ سرخ رنگ کی آنکھیں اس کی خوفناکی میں اور بھی اضافہ کررہی تھیں۔

بت کے آگے ایک قبر نما چبوترا بنا تھا۔ اس چبوترے پر ایک نوجوان بندھا پڑا تھا۔ اس کی گردن چبوترے کی ابھار پر رکھی تھی۔ نوجوان کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میں نے اسے پہچان لیا۔

وہ ہمارے گاؤں کی مائی جمن کا نوجوان بیٹا سلیم تھا۔ مائی جمن کا اس کے سوا اس دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔ وہ محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنی ماں کا پیٹ پالتا تھا اور ابھی پچھلے ہی سال اس نے اپنی والدہ کو حج بھی کرایا تھا۔ سب لوگ سلیم سے بہت خوش تھے۔ وہ سبھی کے کام آتا تھا۔ لیکن آج وہی سلیم میری آنکھوں کے سامنے کالی مائی کی قربان گاہ کے چبوترے پر رسیوں سے جکڑا پڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کا ایک سمندر موجزن تھا۔ آنکھوں کے سوا وہ جسم کے کسی بھی حصے کو حرکت دینے کے قابل نہیں تھا کیونکہ اسے بہت سختی سے باندھا گیا تھا۔ چبوترے کے پاس ہی دیوار میں ایک چوڑے پھل والی تلوار لٹک رہی تھی۔ اس کا پھل دستے کی طرف سے اوپر کی طرف چوڑا ہوتا چلا گیا تھا۔ یہاں تک کہ آخری سرے پر اس کی چوڑائی کم از کم چھ انچ کے برابر تھی۔ یہ تلوار خون میں لتھڑی ہوئی تھی لیکن اس خون کا رنگ سیاہ پڑ چکا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اس سے پہلے جس بدقسمت انسان کی قربانی دی گئی تھی، یہ اس کا خون تھا۔ گویا قربانی کے بعد تلوار کو جوں کا توں لٹکا دیا گیا تھا، اسے صاف کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔

میں سلیم اور کالی مائی کے بت کو دیکھنے میں محو تھا اور ہندو مجھے دیکھ رہے تھے۔ یہاں نہ صرف مرد موجود تھے بلکہ عورتیں بھی موجود تھیں، البتہ نوجوان لڑکیاں نہیں تھیں، بچے بھی نہیں تھے۔ شاید اس لئے کہ کہیں وہ خوفزدہ نہ ہوجائیں یا ان کے منہ سے بات نہ نکل جائے اور مسلمانوں تک نہ پہنچ جائے لیکن بات تو مسلمانوں تک پہنچ چکی تھی اور میں ان کے سامنے موجود تھا۔ مگر بالکل نہتا جبکہ مقابلے میں سوڈیڑھ سو کے قریب مرد تھے، عورتیں الگ رہیں۔

چند لمحوں تک نگاہوں کا تبادلہ ہوتا رہا اور پھر وہ سب مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے خوب ہاتھ پیر چلائے۔ ان کے نرغے میں نہ آنے کی لاکھ کوشش کی اور اس کوشش میں ان میں سے کئی کو زخمی بھی کرڈالا مگر ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ رفتہ رفتہ میرے ہاتھ سست پڑتے چلے گئے۔ آخر میرے پیروں میں کھڑے رہنے کی سکت نہ رہی۔ میں دھڑام سے گرا اور پھر وہ چاروں طرف سے مجھ پر لاتیں اور مکے برسانے لگے۔ تھوڑی دیر بعد مجھے ایک ستون سے باندھ دیا گیا۔ میرے سر منہ اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ بند ہوتی ہوئی آنکھوں سے میں نے پورے ہال پر ایک نظر ڈالی۔ روپا وہاں نہیں تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اندر نہیں آئی تھی۔ وہ کم عمر تھی اور اسے مندر کی تقریب میں شامل ہونے کی اجازت نہیں تھی لیکن اس نے چھپ کر اندر ہونے والی کاروائی کا معائنہ ضرور کیا تھا ورنہ وہ مجھے کیوں بلا کر لاتی۔ وہ کم عمر بھی تھی اور ناسمجھ بھی۔ اس نے یہ نہ سوچا کہ میں تنہا اتنے بہت سے لوگوں کا مقابلہ کس طرح کرسکوں گا۔ گاؤں سے چلتے وقت تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ کن حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اگر پہلے ہی معلوم ہوجاتا تو میں پوری مسلمان آبادی کو ساتھ لے کر مندر پر حملہ آور ہوسکتا تھا اور قبلہ والد محترم بھی ساتھ ہوتے۔ پھر ان کی مجال نہیں تھی کہ مجھے باندھ سکتے۔ لیکن اب میں ایک بے بس پرندے کی مانند تھا۔

بھجن ایک بار پھر شروع ہوگیا تھا۔ بھجن کی لے پر تمام مرد اور عورتیں تھرک رہے تھے۔ ان کے انگ انگ پھڑک رہے تھے۔ آنکھوں میں وحشیانہ چمک لہرا

رہی گی۔ اچانک ہال کی دیوار میں ایک دروازہ کھلا اور سادھو اندر داخل ہوا۔ سادھو کا خیال تو میرے ذہن سے نکل ہی گیا تھا۔ اسے بغلی دروازے سے نکلتے دیکھ کر میں ہکا بکا رہ گیا۔ تو یہ سب کچھ اسی کا کیا دھرا تھا۔ اس کی ترغیب پر ہی انسانی جانوں کی قربانی شروع کی گئی تھی۔ ورنہ اس کے گاؤں میں آنے سے پہلے تو یہاں مندر تک نہیں تھا اور نہ کوئی مسلمان غائب ہوا تھا۔ اب مجھے یاد آیا کہ اس سے پہلے دو مرتبہ ایک نوجوان لڑکا اور ایک لڑکی بھی غائب ہو چکے تھے۔ ضرور انہیں کالی مائی کی بھینٹ ہی چڑھایا گیا تھا۔ میں خوف اور دہشت کے مارے کپکپا اٹھا۔ گویا تیسرے نوجوان کی قربانی میری آنکھوں کے سامنے دی جائے گی اور میں کچھ بھی نہ کر سکوں گا۔ دفعتہً ہال میں موت کا سا سناٹا طاری ہو گیا۔ سادھو کو دیکھ کر وہ سب خاموش ہو گئے تھے۔ سادھو چبوترے کے عین سرے پر آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے ایک قہر آلود نظر مجھ پر ڈالی اور پھر بولا۔

"یہ کہاں سے آ ٹپکا؟"

"پتہ نہیں مہاراج، یہ یہاں کیسے پہنچ گئے۔" ایک پجاری نے جواب دیا۔ "خیر کوئی بات نہیں، آج ایک کی بجائے دو مسلوں کی قربانی دی جائے گی۔ کالی مائی اس مرتبہ ہم سے بہت زیادہ خوش ہو گی۔ سارا سال ہم نعمتوں سے مالا مال رہیں گے۔ اسے بھی چبوترے پر ڈال دو اور اس کے بعد پروگرام شروع کر دوں۔"

اس کے الفاظ ہال میں گونج کر رہ گئے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مجھے ستون سے کھول کر دوبارہ رسیوں سے جکڑا گیا اور سلیم کے برابر چبوترے پر لٹا دیا گیا۔ اب میری گردن بھی چبوترے کے ابھار پر رکھی تھی اور مندر کی چھت کی طرف تھا۔ مندر کی چھت بھی کالے رنگ کی تھی، دیواریں بھی کالی تھیں اور ان سب مردوں اور عورتوں نے بھی سیاہ لباس پہنے ہوئے تھے۔ بس سلیم اور میرے کپڑے سفید تھے۔ مجھے چبوترے پر لٹانے کے بعد سادھو نے ایک عجیب قسم کا اشارہ کیا۔ اس اشارے کے ساتھ ہی سب لوگ چبوترے کے گرد جمع ہو گئے اور زور زور سے اچھلنے کودنے لگے۔ ایک وحشیانہ اور بے ہنگم رقص تھا۔ رفتہ رفتہ رقص میں تیزی آتی گئی۔ اب ان کے جسموں کا ایک ایک انگ تھرک رہا تھا۔ وہ دائرے کی شکل میں چکر بھی کاٹ رہے تھے اور بے معنی اچھل کود بھی جاری تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد کیا مرد کیا عورتیں سب بری طرح ہانپنے لگے۔ ایک کونے میں بیٹھے ہوئے سازندے یہ دیکھ کر اور بھی جوش میں آ گئے۔ سازوں میں بلا کی تیزی آ گئی۔ مرد اور عورتیں بھی ان سازوں کا ساتھ دینے کی کوشش کر رہے تھے لیکن چونکہ سازوں میں بھی کوئی ترتیب نہیں تھی، اس لئے رقص بھی سوائے اچھل کود کے اور کچھ نہیں تھا۔

پھر وہ بے دم ہو ہو کر گرنے لگے۔ یہ رقص اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ آخری مرد بھی بے دم ہو کر نہیں گر گیا۔ آخری مرد کے گرتے ہی ساز یک لخت تھم گیا۔ مندر میں یوں خاموشی مسلط ہو گئی جیسے کبھی کوئی آواز گونجی ہی نہیں۔ مجھے اپنے دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

"اپنے اپنے پیالے تھام لو۔" سادھو نے بلند آواز میں کہا۔ "آج تمہیں دو چند خوراک ملے گی۔"

سب نے خوش ہو کر ایک نعرہ لگایا، کالی ماتا کی جے اور ہال کے ایک کونے کی طرف بڑھ گئے۔ میں اس کونے کا جائزہ نہیں لے سکا تھا شاید اس لئے کہ تاریکی میں تھا۔ میں نے گردن گھما کر انہیں دیکھنا چاہا لیکن ممکن نہ ہوا۔ پیالوں کا مطلب البتہ میں سمجھ گیا تھا۔ یہ سب انسانی خون پینے کی تیاریاں تھیں۔ چبوترے کے ایک طرف بنے ٹب نما گڑھے کا مقصد بھی اب میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ شہ رگ سے نکلنے کے بعد خون سیدھا اس ٹب کا رخ کرتا اور اس ٹب میں سے یہ پیالے بھر بھر کر پیتے۔ میں لرز کر رہ گیا۔

اوہ خدا ان لوگوں کو گاؤں میں بسنے کی اجازت دے کر بہت بڑی غلطی سرزد ہوئی تھی۔ یہ سب تو اس قابل تھے کہ انہیں فوراً تہ تیغ کر دیا جاتا۔ ان کے گھروں کو آگ لگا دی جاتی۔ سادھو نے دیوار کے ساتھ ٹنگی

ہوئی تلوار اتار کر اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لی۔ موت کا لمحہ آ پہنچا تھا۔ سادھو تلوار کے ایک ہی وار سے ہم دونوں کی گردنیں اڑانے والا تھا۔ اس وقت میرے دل سے دعا نکلی۔ ''اللہ ہماری مدد کر۔''

دعا میں تاثیر تھی یا کیا بات تھی بجلی کا ایک کڑاکا ہوا، پورے کا پورا مندر اس طرح ہلا جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ وہ سب کے سب لڑکھڑائے سادھو نے بڑی مشکل سے دیوار کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے بچایا۔ اور پھر ان پر گویا سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ مندر کا دروازہ ایک زوردار دھماکے سے کھلا تھا اور میں نے دیکھا۔ قبلہ والد چلے آ رہے تھے، کوئی ان کے راستے میں نہ آ سکا، ان پر وار نہ کر سکا۔ وہ سب بتوں کی طرح کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔

والد منہ میں کچھ پڑھتے ہوئے ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے نہایت اطمینان سے ہماری رسیاں کھولیں۔ حالانکہ ان سے صرف دو فٹ کے فاصلے پر سادھو ہاتھ میں وہ خوفناک تلوار لئے کھڑا تھا مگر شاید اس کے ہاتھوں میں سکت نہیں رہ گئی تھی۔ رسیاں آناً فاناً کھل گئیں۔ ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ والد صاحب مندر کے دروازے کی طرف چل پڑے اور ہم دونوں ان کے پیچھے چلتے ہوئے مندر سے باہر آ گئے۔ مندر سے باہر آ کر ہم نے دیکھا والد صاحب وہاں کہیں بھی نہیں تھے۔ ہم سر پر پیر رکھ کر بھاگے۔ اپنے پیچھے ہم نے چیخوں کی آوازیں سنی۔ شاید وہ لوگ ہمارا تعاقب کر رہے تھے لیکن اب ہم ان کی پہنچ سے باہر تھے۔ آخر گرتے پڑتے ہم اپنی حدود میں داخل ہو گئے۔ یہاں ہر طرف سناٹا تھا۔ سب لوگ سوئے پڑے تھے۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ کالی مائی کے مندر میں کیا واقعہ پیش آ چکا ہے۔ میں سلیم کو ساتھ لئے اپنے گھر میں چلا آیا۔ ہمیں حیرت اس پر تھی کہ والد صاحب یکا یک کہاں غائب ہو گئے تھے۔

ہم گھر میں داخل ہوئے تو والد بے چینی کے عالم میں ٹہل رہے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی ان کے منہ سے نکلا ۔''خدا کا شکر ہے تم آ گئے۔ مجھے روپا نے آ کر اطلاع دی تھی کہ تم مندر میں پھنس گئے ہو۔''

ہم دونوں یہ سن کر بہت حیران ہوئے۔ ہمارے چہروں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ''حیران ہونے کی ضرورت نہیں میں گھر سے نہیں نکلا البتہ میں نے اپنی روحانی طاقت سے کام ضرور لیا تھا۔''

ہم دھک سے رہ گئے۔ دوسرے دن صبح سویرے والد صاحب نے سادھو کو پیغام بھجوا دیا کہ وہ اور اس کے ساتھی گاؤں خالی کر دیں مگر سادھو نے نہایت ڈھٹائی سے کہلا بھیجا کہ وہ گاؤں خالی نہیں کریں گے اور یہ کہ رات وہ مقابلے کے لئے تیار نہیں تھا ورنہ انہیں کامیاب نہ ہونے دیتا۔ اب وہ ہر طرح تیار رہے یہ سن کر والد بڑبڑائے گویا مقابلہ ہوگا۔

سادھو کے پاس کالی قوتیں تھیں اور میرے والد کے قبضے میں نوری قوتیں۔ کالی قوتیں برائی کی اور نوری قوتیں نیکی کی مظہر ہیں، لہٰذا یہ جنگ نیکی اور بدی کی جنگ تھی۔ کالی قوتوں کو عام طور پر حصول شہرت اور دولت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس راستے میں بہت کشش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے پیروکاروں میں دولت مندوں کی بڑی تعداد ہوتی ہے۔ یہ لوگ مزید دولت حاصل کرنے کی خاطر کالی قوتوں کو اپنے قبضے میں کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں۔

سادھو کالی قوتوں کا بہت بڑا ماہر تھا۔ اس نے ان سے سب سے پہلا کام یہ لیا کہ دریائے میکھنا کا کنارہ توڑ دیا۔ دریائے میکھنا گاؤں سے صرف چار پانچ میل دور ہی تو بہتا تھا بس پھر کیا تھا۔ پورا گاؤں سیلاب کی لپیٹ میں آ گیا، لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ ہندوؤں کے مکانات اور کالی مائی کا مندر سیلاب سے بالکل محفوظ تھے۔ چند گھنٹوں میں ہی ساری مسلم آبادی اور والد صاحب کی اپنے ہاتھوں تعمیر کی ہوئی مسجد منہدم ہو جاتی۔ میرے والد بھی جلال میں آ گئے۔ فوراً گھر سے باہر نکلے ایک ڈھیلے پر کچھ پڑھ کر پھونکا اور اسے سیلاب کے ریلے میں پھینک دیا۔

ردعمل حیران کن تھا، پانی فوراً سمٹنے لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی بہت بڑی غیر مرئی قوت پانی کو واپس

دریا میں دھکیلے دے رہی ہے۔ گاؤں کے سب لوگوں نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ صرف چند گھنٹوں میں سارا پانی سمٹ کر دریا میں سما گیا۔ دریا کا پانی معمول کے مطابق بہنے لگا اور کنارہ آپ ہی آپ اپنی اصلی حالت میں آ گیا۔ سادھو کا یہ حملہ پوری طرح ناکام ہو گیا تھا۔

اس پر وہ اور بھی سیخ پا ہو گیا۔ ایک ہی دن میں اسے دو ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑ گیا تھا لیکن اس سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ ہوئی کہ تھوڑی دیر بعد جب لوگوں نے دریا کو دیکھا تو اس کا سارے کا سارا پانی زمین میں جذب ہو گیا تھا اور اب پانی کے دریا کی جگہ ایک ریت کا دریا نظروں کے سامنے تھا، گویا سادھو دوبارہ سیلاب لانے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔ اگر میرے والد صاحب پانی کو دریا میں رہنے دیتے تو سادھو دوبارہ دریائے میگھنا کے کنارے کو توڑنے کی کوشش کر سکتا تھا۔

یہ اس کی شکست فاش تھی۔ طبقات الارض کے ماہرین اس موقعے پر یہ توضیح پیش کر سکتے ہیں کہ بعض زمینیں ایسی ہوتی ہیں جن میں پانی جذب کر لینے کی استعداد ہوتی ہے۔ یہ درست سہی لیکن اس معاملے میں حقیقت یہ نہیں تھی کیونکہ حالات معمول پر آنے کے بعد انہوں نے پھر سے دریائے میگھنا کو جاری کر دیا تھا۔

سادھو اب باقاعدہ مقابلے پر اتر آیا۔ اس نے اپنی تمام تر کالی قوتوں کو بروئے کار لانے کا فیصلہ کر لیا۔ ابھی مسلمان سیلاب سے بال بال بچے تھے کہ ایک ہولناک قسم کا زلزلہ شروع ہو گیا۔ زمین ہچکولے کھانے لگی مکان ڈولنے لگے، کتنے ہی لوگ کھڑے کھڑے زمین پر گر گئے۔ کئی مکانوں میں دڑاڑیں پڑ گئیں، مٹی نیچے گرنے لگی اور یوں محسوس ہونے لگا کہ چشم زدن میں تمام مکانات منہدم ہو جائیں گے اور لوگ ان کے نیچے دب جائیں گے۔ ایک کہرام سا مچ گیا۔ کوئی ادھر بھاگا جا رہا تھا تو کوئی ادھر ہر کوئی خوفزدہ تھا۔ والد باہر نکلے انہوں نے ایک مکان کی دیوار تھام کر قرآن شریف کی کوئی آیت پڑھی اور زلزلہ ایک دم رک گیا۔ یہاں تک کہ جن مکانات میں دراڑیں پڑ گئی تھیں، وہ دڑاڑیں بھی غائب ہو گئیں۔

سادھو دور کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا، جان گیا کہ اس کا یہ حربہ بھی ناکام رہا ہے۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے بدشکل اور ٹیڑھے میڑھے عصا کو ہوا میں لہرایا۔ فوراً ہی اس میں سے ہزاروں سانپ جھڑے، اس نے عصا کا رخ مسلمانوں کے گھروں کی طرف کر دیا۔ تمام سانپ پھن اٹھائے تیزی سے اس طرف بڑھے۔ والد زلزلہ رکنے کے بعد اپنے حجرے میں چلے گئے تھے۔ لوگوں نے فوراً انہیں اطلاع دی کہ ہزاروں سانپ ہمارے گھروں کا رخ کر رہے ہیں۔ انہوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے ایک رسی کا ٹکڑا لوگوں کو دیا اور اسے سانپوں کی طرف اچھالنے کا حکم دیا۔ لوگ فوراً باہر آئے اور رسی کا ٹکڑا ہوا میں اچھال دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ حیرت زدہ رہ گئے۔

رسی فضا میں ایک مہیب اژدہے کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ اژدہا ہوا میں تیرتا ہوا ان سانپوں پر گرا اور پھر ان میں ایک زبردست جنگ شروع ہو گئی۔ تمام سانپوں نے اژدہے کو گھیر لیا تھا اور اپنے پھنوں سے اس پر وار کر رہے تھے لیکن اژدہے پر ان کے زہر کا اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اژدہا انہیں اس تیزی سے نگل رہا تھا جیسے کوئی وہیل مچھلی چھوٹی بڑی مچھلیوں کو سانس کے زور سے کھینچ لیتی ہے۔ لوگوں کے دیکھتے ہی دیکھتے تمام سانپ اژدہے کے پیٹ میں اتر گئے۔ اژدہا واپس ہوا اور سیدھا والد محترم کے حجرے میں گھس گیا۔ لوگ اس کے پیچھے اندر داخل ہوئے تو انہوں نے دیکھا، وہاں رسی کا وہی ٹکڑا پڑا تھا۔

اس پر بھی سادھو باز نہ آیا۔ آخر میرے والد صاحب تنگ آ گئے انہوں نے اس جھگڑے کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ چالیس دن تک چلہ کھینچتے رہے اور چلے کے زور سے کالی مائی کے مندر کے گرد ایک حصار کھینچ دیا۔ اس سلسلے میں انہوں

نے اپنے پیرو مرشد سے بھی مدد لی۔ وہ بنفس نفیس تشریف لائے۔ انہوں نے بھی مندر کے گرد سات چکر لگائے۔ لوگوں نے رات کے وقت انہیں چکر لگاتے ہوئے پائے گئے وہ سلہٹ میں موجود تھے۔ بہر حال انہوں نے حصار کی مضبوطی کے لئے اپنے شاگرد کی مدد ضرور فرمائی تھی۔ چکر لگانے کے بعد وہ غائب ہو گئے تھے۔ دوسرے دن ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ گاؤں اور مندر کا فاصلہ غیر محسوس طور پر بڑھنے لگا۔ مندر پہلے گاؤں کے آخری سرے پر تھا، اب یہ ایک میل دور چلا گیا۔ نالہ پہلے بالکل سیدھا تھا اب یہ مندر کے چاروں طرف گھوم گیا۔ یہیں سے اس کی ابتداء ہوتی ہے۔ حصار کھنچ جانے کے بعد کوئی ہندو مندر تک نہ پہنچ سکا۔ ہندو اپنے سادھو کو لے کر سارا سارا دن مندر کی طرف چلتے رہے لیکن کہیں نہ کہیں انہیں ٹھوکر ضرور لگتی۔ وہ گر پڑتے اور واپس نالے کے دوسری طرف پہنچ جاتے۔

سادھو نے اس حصار کو توڑنے کے لئے اپنی تمام کالی قوتیں آزما ڈالیں لیکن اس حصار کو توڑ کر مندر تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ پھر ایک روز ایسا ہوا کہ انہوں نے پل کر نالے کو پار کیا اور حصار میں پھنس کر رہ گئے۔ اب ان کے لئے باہر نکلنے کا راستہ بھی نہ رہا تھا۔ یہ کام بھی والد صاحب نے کیا تھا کیونکہ وہ سب خونی تھے۔ انہوں نے بے گناہ انسانوں کو کالی مائی کی بھینٹ چڑھایا تھا اس لئے انہیں سزا ملنا ضروری تھا۔ وہ کئی دن تک حصار کے گرد چلتے رہے بھوکے پیاسے گرتے پڑتے مندر تک پہنچنے یا نالے سے اس طرف آنے کی کوشش کرتے رہے پھر بھوک اور پیاس کی حالت میں تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ والد صاحب نے مٹی کی ایک مٹھی بھر کر حصار کے دوسری طرف پھینک دی۔ دوسری طرف بگولے سے اٹھنے لگے۔ بالکل ایسے جیسے صحرا میں چلتے ہیں اور پھر آناً فاناً ان بگولوں نے سادھو اور اس کے [illegible] کاروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دوسرے لفظوں [illegible] ہو گئے۔

صرف چند گھر ہندوؤں کے باقی بچ گئے تھے جن میں ہندو موجود تھے، وہ سادھو کے ساتھ نہیں گئے تھے۔ ان میں روپا اور اس کے ماں باپ بھی تھے۔ دوسرے دن روپا اپنے ماں باپ اور چند دوسرے لوگوں کے ساتھ والد صاحب کے پاس آئی اور اسلام لانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ مجھے یہ جان کر بے پناہ مسرت ہوئی کہ روپا اور اس کا خاندان مشرف بہ اسلام ہو گئے ہیں۔

میرے دل میں روپا کی محبت چٹکیاں لینے لگیں۔ اب اس کا اور میرا ملاپ ممکن ہو گیا تھا۔ روپا کا اسلامی نام صائمہ رکھا گیا تھا۔

ایک دن والد نے مجھے اپنے حجرے میں بلایا اور کہنے لگے۔ "مجھے معلوم ہے تم صائمہ سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ جاؤ یہ شادی ضرور ہوگی۔" کرنا خدا کا کیا ہوا کہ خود روپا کے والدین نے دو ایک آدمیوں کے ذریعے اس خواہش کا اظہار کیا اور پھر ہماری شادی ہوگئی۔

آج اس واقعے کو چالیس سال گزر چکے ہیں۔ مندر کا حصار جوں کا توں موجود ہے، حالانکہ والد صاحب آج اس دنیا کے رنگ و بو میں موجود نہیں، وہ عالم بالا میں پہنچ چکے ہیں لیکن مندر تک پہنچنا اب بھی ممکن نہیں۔ نہ جانے اس وقت تک کتنے لوگ اس واقعے کو سن سن کر مندر تک پہنچنے کی کوشش کر چکے ہیں اور تھک ہار چکے ہیں یہاں تک کہ ایک انگریز ڈپٹی کلکٹر بھی اس گاؤں میں آیا۔ اس نے مندر کو اندر سے دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو لوگوں نے اسے بتایا کہ وہ مندر تک نہیں جا سکتا۔ وہ نہ مانا اور اپنی سی کر کے دیکھ لی۔ اس نے اپنی ناکامی کی داستان نہایت دلچسپ پیرائے میں "کلکتہ گزٹ" میں چھپوائی تھی۔ کلکتہ گزٹ کا وہ شمارہ میں نے بھی خریدا تھا۔ وہ آج تک ہماری لائبریری میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں نے کوشش کی۔ آج تک سب حیرت زدہ ہیں اور کوئی اس راز کو حل نہیں کر سکا کہ وہ کونسی طاقت ہے جو لوگوں کو مندر تک نہیں پہنچنے دیتی اور انہیں اٹھا کر واپس پٹخ دیتی ہے۔ اس سلسلے میں مختلف تاویلیں ضرور پیش کی گئیں لیکن کوئی بھی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ شاید آئندہ آنے والی

لوں میں سے کوئی اس راز کو جان سکے۔
ان الفاظ کے ساتھ ہی یہ کہانی ختم ہوگئی تھی۔ ڈائری کی باقی صفحات خالی تھے۔ کہانی ختم ہوئی تو میں ہوش وحواس کی دنیا میں لوٹ آیا۔ ڈائری پڑھتے وقت مجھ پر یہی احساس چھایا رہا تھا جیسے کہانی خود مجھ پر گزر رہی ہے جیسے میں خود ہی قربان گاہ کے چبوترے پر لیٹا تھا۔ اب ہوش میں آیا تو شاہد کا خیال آیا۔ وہ مجھے چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ لیٹے لیٹے میری آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو شاہد کرسی پر بیٹھا نظر آیا، اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولا۔
''کیوں دوست...... کہانی پڑھ لی، اب کیا خیال ہے۔ کیا اب بھی تم مندر تک جانے پر بضد ہو؟''
میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں، اس وقت تو نہیں البتہ میں چند روز بعد پھر گاؤں آؤں گا اور یہ کوشش کم از کم ایک بار اور کروں گا۔''
''کیا مطلب؟'' شاہد بری طرح چونکا۔ شاید اسے ایسے الفاظ سننے کی خواب میں بھی توقع نہیں تھی۔ اس نے سوچا ہوگا کہ اب میں اپنے ارادے سے باز آجاؤں گا۔ حقیقت بھی یہی تھی۔ میں ارادے سے باز ضرور آ گیا تھا لیکن اس کے باوجود ایک تجربہ کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا۔ ''سنو دوست شہر میں میرا ایک دوست ہے اس کے والد ملک کے سب سے بڑے سائنس دان ہیں میں انہیں جا کر یہ ساری کہانی سناؤں گا۔ اگر انہوں نے زحمت گوارا کی اور یہاں تک آنا منظور کیا تو میں ان کے ساتھ ایک بار پھر نالے کو پار کروں گا۔ پھر ہم دیکھیں گے کہ وہ کیا نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔''
شاہد ہنس پڑا اور اس نے مجھے ایسا کرنے کی بڑی خوشی سے اجازت دے دی۔ پھر بولا۔ ''تم یہ بھی کر کے دیکھ لو۔ اس کہانی کے سلسلے میں صرف ایک بات اور رہ گئی ہے۔ مگر میں وہ بات تمہیں اس کوشش کے بعد ہی بتاؤں گا۔''
گاؤں کی سیر کو ملتوی کر کے میں شہر پہنچا۔ پہلے اپنے دوست سے ملا اور پھر اسے ساتھ لے کر اس کے والد کے سامنے پیش ہوا۔ وہ بہت بوڑھے تھے۔ ان کا نام پروفیسر جمال تھا۔ میں نے انہیں ساری کہانی تفصیل سے سنائی۔ تو وہ سوچ میں ڈوب گئے پھر بولے۔
''یہ سب ناممکن نہیں، ہپناٹزم ہمارے سامنے کی چیز ہے، اس قسم کی کچھ اور پراسرار قوتیں بھی ہیں جو انسان مسلسل کوشش کے بعد خود میں پیدا کر لیتے ہیں۔ معراج شریف کا واقعہ ہم سب کو معلوم ہے۔ آنحضورؐ کے زمانے میں بھی جادوگر تھے، وہ بھی غالباً ہپناٹزم سے کام لیتے تھے۔ حضرت موسیٰؑ کے دور میں بھی جادوگروں نے رسیوں کو سانپوں میں تبدیل کر دیا تھا اور حضرت موسیٰؑ کے عصا نے اژدہے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ یہ بھی یقیناً ہپناٹزم کی کسی ترقی یافتہ شکل کا ہی مظاہرہ تھا۔ جہاں تک اس حصار کا تعلق ہے میں حتمی طور پر کچھ کہنے سے قاصر ہوں۔ اولیاء کرام کی کرامات سے کتابیں بھری پڑی ہیں، ان کا منکر نہیں۔ اگر تم ضرور ہی چاہتے ہو تو میں تمہارے ساتھ گاؤں تک چلوں گا اور اپنے ساتھ چند آلات بھی لے چلوں گا تاکہ ہم یہ اندازہ لگا سکیں کہ وہ کیا چیز ہے جو لوگوں کو اٹھا کر نالے کے دوسری طرف پھینک دیتی ہے۔'' میں بہت خوش ہوا کہ وہ تیار ہو گئے۔
دوسرے دن ہم گاؤں پہنچ گئے۔ شاہد کو اطلاع نہیں دے سکا تھا، اس لئے وہ اسٹیشن پر موجود نہیں تھا۔ ہم تانگے پر بیٹھ کر اس کے گھر پہنچ گئے۔ کچھ دیر ستانے کے بعد آخر تینوں نالے کے پاس پہنچے، چھلانگ لگا کر ہم نے نالہ پار کیا۔ پروفیسر جمال نے اپنے آلات کندھے لٹکا رکھے تھے اور دو ایک چیزیں ان کے ہاتھوں میں بھی تھیں۔ ہم نہایت احتیاط سے قدم اٹھانے لگے دل دھک دھک کر رہے تھے۔ پروفیسر کی نظریں بدستور آلات پر تھیں۔ ان کے چہرے پر اچانک حیرت کی لکیریں ابھریں ساتھ ہی تینوں نے ٹھوکر کھائی اور ہم نالے کے دوسری طرف پڑے تھے۔
''اوہ خدا ......اس مندر کے چاروں طرف مقناطیسی قسم کی لہریں موجود ہیں، یہ لہریں ہی ہمیں اٹھا کر پھینکتی ہیں۔'' ان کے منہ سے نکلا۔

"لیکن اس سے پہلے ہم گرتے کیوں ہیں؟"

"ہم یہی محسوس کرتے ہیں، جیسے ٹھوکر لگی ہے لیکن دراصل ہوتا یہ ہے کہ مقناطیس ہمیں ایک زبردست جھٹکے سے اٹھا کر پھینک دیتا ہے۔" انہوں نے کہا تو میں نے سمجھ جانے والے انداز میں سر ہلایا اور شاہد کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ دوسرے ہی لمحے ہم نے ایک ایسا حیران کن منظر دیکھا کہ ہمارے اوپر کے سانس اوپر اور نیچے کے نیچے رہ گئے۔ میرا اور پروفیسر جمال کا وہ حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

مندر کی طرف سے ایک عورت چلی آرہی تھی، اس نے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ نالے تک پہنچ گئی۔ پھر ایک چھلانگ اسے نالے کے اس طرف لے آئی۔ ہم نے دیکھا وہ گاؤں کی طرف چلی جارہی تھی۔

"یہ ......یہ کون ہے؟" میرے منہ سے بوکھلاہٹ کے عالم میں نکلا۔ "یہ واحد ہستی ہے جو اس حصار کے دوسری طرف مندر تک جاسکتی ہے۔"

"آؤ، اس کے پیچھے چلتے ہیں۔" شاہد نے مسکرا کر کہا۔

ہم اس کے پیچھے چل پڑے۔ اور پھر میں دھک سے رہ گیا۔ وہ شاہد کے گھر میں داخل ہورہی تھی۔ اسی وقت میں نے اپنے دوست کو کہتے سنا۔

"یہ میری بہن شمائلہ ہے۔ جب آپ لوگ ستا رہے تھے تو میں نے اسے مندر کی طرف بھیج دیا تھا۔ دراصل ہوا یہ تھا کہ یہ ابھی چھوٹی ہی تھی اور اسے حصار کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ ایک دن کھیلتے کھیلتے نالے تک پہنچ گئی۔ مجھے آج بھی حیرت ہے کہ تین چار فٹ چوڑے نالے کو اس نے کیسے پار کرلیا تھا۔ میں اسے تلاش کرتا ہوا نالے کے پاس پہنچا تو یہ مندر کی طرف سے واپس آرہی تھی۔ اور اس دن مجھے یہ بات معلوم ہوئی کہ دنیا میں ایک ہستی ایسی بھی موجود ہے جو مندر تک جاسکتی ہے۔"

"تو ......تو کیا وہ مندر کے اندر بھی جاسکتی ہے؟"

"نہیں ......اس کا کہنا ہے کہ مندر کا دروازہ بالکل بند ہے اور اس کے کھولنے پر بھی نہیں کھلا۔"

میں نے پروفیسر جمال کی طرف دیکھا، ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ انہوں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ مقناطیسی لہروں والا خیال بھی غلط ہے ورنہ لہروں نے آپ کی بہن کو کیسے گزر جانے دیا۔ میری عقل اس بات کا کوئی جواب دینے سے عاجز ہے۔ ویسے کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس لڑکی کا مندر سے کیا تعلق ہے؟"

"جی ہاں۔ ہم اس ماں کی اولاد میں سے ہیں جس نے قربانی کی رات دو بے گناہ انسانوں کو بھینٹ چڑھنے سے بچالیا تھا۔"

اور میں سکتے کے عالم میں رہ گیا۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ اس اسرار سے قیامت تک کوئی پردہ نہیں اٹھا سکتا تھا کہ وہ کونسی طاقت ہے جو لوگوں کو مندر تک نہیں پہنچنے دیتی، اور جو شمائلہ کا راستہ نہیں روکتی۔

دوسرے دن ہم نے واپسی کی ٹھانی دروازے میں سے نکلتے وقت میں نے شاہد سے کہا۔

"میں نے اس مندر کو فتح کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

"کیا مطلب؟" وہ بری طرح چونکا۔

"مطلب تم بہت جلد سمجھ جاؤ گے۔ چند دنوں تک میں اپنی والدہ کو تمہارے پاس بھیجوں گا۔"

یہ کہہ کر میں پروفیسر صاحب کے ساتھ تانگے میں بیٹھ گیا...... شاہد علی شاید میری بات کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر میں نے ایک خوشگوار تاثر ابھرتے دیکھا۔

اور پھر اس وقت تانگہ چل پڑا۔





موت کا تعاقب

ایس امتیاز احمد-کراچی

ایک اَن دیکھی حیرتناک اور خوفناک قوت جو کہ اس کا تعاقب کررہی تھی پتھریلی زمین پر کسی کی پراسرار سرسراہٹ اسے صاف سنائی دے رہی تھی لیکن پھر......

قدم قدم پر لرزاں براندام کرتی رگوں میں خون منجمد کرتی...... حیرت ناک...... کہانی

عظیم سائنسدان کنارڈ کو لوگ اس لئے خبطی سمجھتے تھے کہ اس نے شہر کے خوب صورت علاقے کو چھوڑ کر بھیانک جنگل میں رہنا پسند کیا تھا۔ عوام کے لئے یہ امر تعجب خیز تھا مگر کنارڈ اور اس کے نائب ڈاکٹر اس کی نزیہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کے تجربات کے لئے تنہائی اور سکون کتنا اہم ہے۔ ڈاکٹر کنارڈ دراصل کیمیا بنانے کا خواب دیکھ رہا تھا اور اس کا یہ خواب اب شرمندہ تعبیر ہوا ہی چاہتا تھا اپنی زندگی کے تیس سال اس نے نت نئے فارمولے بنانے اور تجربہ کرنے میں ضائع کردیئے تھے اس کی محنت کا پھل اب ملنے والا تھا اور اس کا یہ تجربہ آخری مراحل میں تھا۔

اپنے محنتی رفیق کار ڈاکٹر اس کی نزکو اس نے ایک کاغذ دکھاتے ہوئے کہا۔ ''اس کی نزیہ ہے میری محنتوں کا پھل۔ اب دنیا کی کوئی بھی شے ٹھوس سونے میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ اب ہمارا ملک دنیا کا امیر ترین ملک بن سکتا ہے۔''

ایک وسیع و عریض میز پر سائنسی آلات بڑی خوب صورتی کے ساتھ سجے ہوئے تھے۔ اسپرٹ لیمپ کے اوپر ایک بہت بڑا شیشے کا برتن رکھا ہوا تھا اور اس برتن میں گہرے سرخ رنگ کی کوئی رقیق شے ابل رہی تھی مختلف گیسوں کے مرتبانوں میں سے لاتعداد شیشے کی نلکیاں نکل کر اس برتن میں پہنچ رہی تھیں۔ ڈاکٹر کنارڈ نے تمام اشیاء کو بہ نظر تحسین دیکھا اور پھر بولا۔

''مجھے ایک ضروری کام یاد آگیا ہے۔ میں چاہتا

ہوں کہ تم اتنے میں اس تجربہ کی دیکھ بھال کرو میں ایک گھنٹہ بعد واپس آ کر اسے پایہ تکمیل تک پہنچاؤں گا۔“

”ہاں..... اس کاغذ میں وہی آخری مراحل درج ہیں۔ بہتر ہے آپ جا سکتے ہیں،“ اس کی نر نے نہایت ادب سے کہا۔

ڈاکٹر کنارڈ کو گئے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا مگر وہ واپس نہیں آیا۔ خدا جانے کے کیا بات ہوئی؟ تجربہ چونکہ آخری مراحل میں تھا اس لئے اس کی نر نے مجبور ہو کر خود ہی اسے تکمیل تک پہنچانا شروع کر دیا۔ اس کی خوش قسمتی سے ڈاکٹر کنارڈ آخری فارمولے والا کاغذ وہیں بھول گیا تھا اس لئے اس کی نر نے اس فارمولے کی مدد سے اپنا کام شروع کر دیا۔

ڈاکٹر کنارڈ کا یہ تجربہ اس کی روانگی سے تقریباً پانچ گھنٹے بعد شروع ہوا۔ اس کی نر نے اپنی بھرپور کوشش کر لی۔ وہ چاہتا تھا جو کچھ بھی ہونا ہے جلدی ہو جائے مگر تجربہ مکمل ہونے میں ابھی کئی دن درکار تھے۔ فطرتاً وہ جلدی پسند تھا اس لئے یہ طویل مدت اسے کھل رہی تھی۔ لیکن یہ کوئی معمولی تجربہ تو تھا نہیں کیمیا بنانے کا معاملہ تھا اس لئے اسے صبر کرنا ہی پڑا۔

ڈاکٹر کنارڈ کا اس نے دو دن تک انتظار کیا مگر جب وہ واپس ہی نہ آیا تو اس کی نر نے سوچ لیا کہ وہ جان بوجھ کر کہیں لاپتہ ہو گیا ہے اور شاید اس کی وجہ محض یہ ہو کہ وہ اس کی نر کے ذریعے ہی اس تجربہ کی تکمیل کا خواہشمند ہو!

بڑی بھیانک اور خوفناک رات تھی سفیدے کے لمبے لمبے درخت ڈاکٹر کنارڈ کے مکان کے باہر کفن پوش لاشوں کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ ہوائیں درختوں کے سوکھے پتوں پر چیختی چلاتی پھر رہی تھیں۔ زمین پر پتوں کی پراسرار سرسراہٹ سے روحوں کے چلنے کا گمان ہوتا تھا۔ ڈاکٹر اس کی نر مکان کے اندر کھڑا ہوا، کھڑکی سے باہر نظر آنے والے اس بھیانک منظر کو دیکھ رہا تھا۔ کھڑکی کے شیشوں پر ایک چمگادڑ اپنے پر پھیلائے بار بار اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور ارواح خبیثہ کا اس کی نر قائل نہیں تھا لیکن اندھیرے سے اسے ضرور دہشت ہوتی تھی کھڑکی سے باہر دور تک سیاہ دھند چھائی ہوئی تھی اور اس دھند میں لپٹی ہوئی اشیاء بڑی ہیبت ناک اور بھیانک نظر آ رہی تھیں۔

اس کی نر اپنی توجہ ان خیالات اور دہشت ناک ماحول سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے پھر سے کام میں مصروف ہو گیا! کسی شیشی میں سے ایک ارغوانی محلول اس نے ٹیسٹ ٹیوب میں نکالا اور پھر شیشے کے بڑے برتن کی طرف بڑھا۔

اچانک اسے یوں لگا جیسے کوئی کمرے میں ہے۔ ایک ہیبت ناک سرسراہٹ، پراسرار سرگوشی اسے صاف سنائی دے رہی تھی۔ گھبرا کر وہ پلٹا اور پھر چلایا۔

”کون ہے..... کون ہے کمرے کے اندر؟“

لیکن کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ اس کی نر دل ہی دل میں ہنسا کہ ناحق ڈرا جا رہا ہے۔ چونکہ وہ دن رات کام میں مصروف رہا ہے اس لئے تھکاوٹ کے باعث الٹے سیدھے خیالات اس کے دماغ میں آ رہے ہیں۔ یہ سوچ کر وہ دوبارہ کام میں مصروف ہو گیا۔ ٹیسٹ ٹیوب کا محلول برتن میں ڈالتے وقت اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ اپنے پراگندہ خیالات کو اس نے ایک مرکز پر پھر سے جمع کیا اور محلول کو شیشے کی نلکی سے ہلانے لگا۔

یکا یک وہی سرسراہٹ اسے پھر سنائی دی۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ قوت سامعہ تیز ہو گئی اور پھر جو کچھ اس نے دیکھا وہ اسے حواس باختہ کر دینے کے لئے کافی تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک سفید رنگ کا لمبا سا سانپ تجربے کی میز پر رینگتا ہوا آیا اور اپنا پھن اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی لمبی اور پتلی زبان بار بار شعلے کی طرح باہر لپک رہی تھی اس کی مسحور کن آنکھوں سے اس کی نر سحر زدہ ہو گیا۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔

سانپ آہستہ آہستہ اس کی طرف آیا تھا۔ جب وہ بہت قریب آ گیا تو اس کی نر چونکا اور پھر اس نے ایک زوردار ہاتھ مار کر اسے نیچے پھینک دیا۔ اسی پر بس نہ کر کے اس نے سانپ کو اپنے لمبے بوٹ سے کچلنے کی کوشش بھی کی مگر

اچانک وہ سانپ غائب ہوگیا۔ پھر اس کی نر نے میزوں، کرسیوں اور چھوٹے بڑے سوراخوں میں ہر جگہ تلاش کر لیا۔ مگر سانپ کو نہ ملنا تھا نہ ملا۔

کچھ دیر تک وہ خاموش بیٹھ کر ان باتوں پر غور کرتا رہا۔ اس کے خیال میں یہ ایک اتفاقی بات تھی کہ سانپ اندر آ گیا تھا۔ اور اس طرح پھن اٹھا کر اس کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ سانپ عموماً دولت یا خزانوں کی رکھوالی کیا کرتے ہیں۔ کیا ایسا تو نہیں کہ رقیق مادہ ٹھوس سونے میں تبدیل ہونے والا ہو۔ اور سانپ کو پہلے ہی اس کی خبر لگ گئی ہو۔ اس لئے وہ دولت کی نگہبانی کرنے آ گیا ہو!

بہر حال کچھ بھی ہو۔ اب اسے کام کی رفتار تیز کر دینی چاہیے۔ یہ سوچ کر اس نے جلدی سے فارمولے کے مطابق دی ہوئی ادویات کے شیلف میں سے ایک خاص محلول نکالنا چاہا۔ لیکن جیسے ہی اس نے مناسب مقدار میں وہ محلول برتن میں ڈالنا چاہا، اچانک ایک زبردست آواز ہوئی اور برتن میں جھاگ ہی جھاگ اٹھنے لگے۔ یہ جھاگ برتن سے کئی فٹ بلند ہو گئے۔ ان جھاگوں کے باعث مادہ نیچے گرنے لگا۔

اس کی نر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس کے خیال کے مطابق تو ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ پھر یقیناً کہیں غلطی ہوئی تھی۔ وہ دوبارہ شیلف کے پاس جا کر ادویات کی شیشیوں کو پرکھنے لگا۔ مگر یہ کیا؟ جو محلول اسے درحقیقت برتن میں ڈالنا چاہیے تھا وہ تو شیلف میں ہی رکھا ہوا تھا اور اس نے غلطی سے دوسری شیشی اٹھائی تھی! لیکن ایسا کیوں ہوا، کیا اس کے ہاتھ غلط شیشی اٹھا سکتے تھے؟

اس نے پھر یہی سوچا کہ یقیناً یہ سب کام کی زیادتی کے باعث ہوا ہے، وہ اتنی محنت کر رہا ہے کہ اس کے حواس قابو میں نہیں رہے اور وہ غلط سلط باتیں سوچنے لگا ہے بہتر یہی ہے کہ رات کو خوب اچھی نیند لی جائے اور پھر صبح تازہ دم ہو کر کام میں جت جائے اپنا یہ خیال جب اسے بالکل درست معلوم ہوا تو وہ فوراً ہی بستر پر دراز ہو گیا احتیاطاً اس نے سب کھڑکیاں بند کر لیں اور بستر کو اچھی طرح جھاڑ جھٹک کر دیکھ لیا کہ وہ سفید سانپ تو وہاں پہلے سے نہیں آ گیا اور پھر یہ دیکھ کر اس نے اطمینان کا لمبا سانس لیا کہ ایسا نہیں ہے۔

سانپ تو کیا وہاں ایک معمولی سا کیڑا بھی نہیں آ سکتا۔ راستے بند ہیں۔ کھڑکیاں بند ہیں اور فرش بھی پکا ہے، پھر بھلا سانپ کا وہاں کیا کام؟

رات کا آخری وقت تھا جبکہ ایک پراسرار اور بھیانک سرسراہٹ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ شاید یہ اس کا وہم تھا یا پھر حقیقت تھی کہ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا کوئی غیر مرئی قوت اس کمرے میں موجود ہے۔ وہ اسے دیکھ تو نہیں سکتا البتہ محسوس کر سکتا ہے۔ مگر یہ کون ہے جو اس کے تجربے اور آرام میں خلل انداز ہو رہا ہے؟ تکیے کے نیچے رکھا ہوا اپنا پستول نکال کر وہ آہستہ سے کھڑا ہوا اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی بے سود کوشش کرنے کے بعد وہ دبے دبے پاؤں رکھتا ہوا فرش پر چلنے لگا۔

کمرے میں دہشت ناک خاموشی کا تسلط تھا۔ اندھیرا ویسے بھی اسے ناپسند تھا اور پھر اس دن کا اندھیرا خدا کی پناہ...... یوں لگتا تھا جیسے تاریکی نے ہر شے کو نگل لیا ہے، اندھیرے میں اسے کچھ ہیولے چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ اس نے اپنی آنکھیں ملیں اور غور سے ان ہیولوں کو دیکھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا، اسے یقین ہو گیا کہ یہ سب اس کا وہم ہے۔ اندھیرے کا خوف چونکہ شروع ہی سے اس پر حاوی تھا۔ اس لئے اوٹ پٹانگ خیالات نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔ پستول واپس اس نے بستر پر پھینک دیا اور پھر دوبارہ لیٹنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ وہی پراسرار سرسراہٹ پھر سنائی دی۔ اس آواز کے ساتھ ہی اچانک نارنجی رنگ کی روشنی بھی دوسرے کمرے میں پیدا ہوتی ہوئی دکھائی دی۔

اسے بڑا تعجب ہوا...... یہ روشنی کیسی ہے؟ اس نے تو کمرے کی ساری بتیاں بجھا دی تھیں...... پھر یہ روشنی وہ تیزی کے ساتھ دوڑتا ہوا اس کمرے میں پہنچا اور جو کچھ اس نے وہاں دیکھا وہ اسے حیران کر دینے کے لئے کافی تھا۔

اس نے دیکھا کہ تجربے کی بڑی میز پر بڑے

برتن کے عین نیچے سپرٹ لیمپ روشن ہے اور برتن میں پڑا ہوا رقیق مادہ گرم ہونے کے بعد ابلنے لگا ہے چونکہ اسے ایک خاص مقدار میں ہی گرمی پہنچائی جاتی تھی اس لئے اب اتنی زیادہ گرمی پاکر ایک طرح سے اس کے عظیم تجربے کا ستیاناس ہوگیا تھا جلدی سے آگے بڑھ کر اس نے اسپرٹ لیمپ کو بجھادیا اور پھر یاد کرنے لگا کہ یہ غلطی اس کی ہے جہاں تک اسے یاد ہے سونے سے پہلے اس نے اسپرٹ لیمپ بجھادیا تھا۔

کرسی پر وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور کافی دیر کے غور و خوض کے بعد اس نے جھنجلا کر کرسی کے دستے پر مکہ مارا اور پھر فوراً کھڑا ہوگیا اب اسے پکا یقین تھا کہ رات کے آغاز میں اس نے برنر بند کردیا تھا پھر آخر وہ کون ہے جس نے برنر دوبارہ کھول کر اس کی شب و روز کی محنت کو نقصان پہنچایا ہے! میز کے قریب جا کر اس نے غور سے دیکھا تو اس کی آنکھیں خوف کے باعث پھٹی کی پھٹی رہ گئیں میز پر جمی ہوئی خاک پر ایک سانپ کے رینگنے کے نشان صاف نظر آرہے تھے!

دہشت کی ایک تھرتھری اس کے جسم میں پیدا ہوئی اور اس نے دانت پر دانت جما کر جیسے خود سے کہا۔

''میں اب سمجھ گیا کہ یہ سب کیا ہے۔ مگر میں بالکل نہیں ڈرتا خواہ کچھ بھی ہو جائے میں اپنا تجربہ ضرور مکمل کروں گا۔''

صبح ہوتے ہی اس نے پرانے کپڑوں اور ردی کاغذوں کی مدد سے دیواروں، فرش اور چھت کا ایک ایک سوراخ بند کردیا۔ چھوٹی بڑی نالیاں۔ ہوا کے آنے جانے کے راستے اور تمام کھڑکیاں اس نے اس طرح بند کیں کہ سوئی کے برابر بھی کہیں سوراخ نہیں رہا۔ اب اسے مکمل اطمینان ہوگیا تھا اسے یقین تھا کہ وہ منحوس سانپ پھر وہاں ہرگز نہ آسکے گا۔

اس نے پرانا مادہ پھینک دیا اور تجربے کا نئے سرے سے آغاز کیا۔ رات دن اس نے خوب محنت کی فارمولے کے مطابق تجربہ کو اس مقام تک لے آیا جب کہ اس میں ایک دو دن کے کام کی کسر رہ گئی تھی۔ مسرت اور جوش کے باعث اس کا چہرہ ہر وقت تمتماتا رہتا تھا سانپ کے بارے میں اب اسے پختہ یقین ہو چکا تھا کہ دراصل وہ اس کے وہم کی ہی پیداوار ہے سانپ آیا بے شک تھا مگر اسپرٹ لیمپ وغیرہ کو اس نے ہرگز نہیں چھوا چونکہ یہ بالکل ناممکن ہے کہ سانپ برنر کی چابی کھول دے جبکہ انسانی ہاتھوں سے وہ مشکل سے کھلتی ہے تو وہ تو پھر سانپ ہے۔ غلطی درحقیقت اس سے ہوئی تھی اور کوئی خاص بات نہیں۔

تجربہ مکمل ہونے والا تھا صرف ایک دن کی کسر رہ گئی تھی اس کی نر جب رات کو بستر پر آرام کرنے کے لئے لیٹا تو وہ بڑے عجیب منصوبے بنا رہا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ ٹھوس سونے کو بازار میں فروخت کرنے کے بعد وہ اتنی دولت پیدا کرلے گا کہ حکومت کے خزانے میں بھی نہیں ہو گی وہ دنیا کا امیر ترین انسان تھا! امیر ترین انسان کا مطلب ہے طاقتور آدمی۔ اور جب اس کے پاس طاقت ہوگی تو وہ پوری دنیا کو اپنے قدموں پر جھکا لے گا پھر وہ وقت کتنا عجیب ہوگا جبکہ دنیا اس کے تلوے چاٹے گی اور وہ اسے حقارت سے ٹھکرادے گا۔

''مگر یہ کیا...... یہ آواز کیسی ہے؟''

گھبرا کر وہ بستر سے اٹھ بیٹھا اور پھر آنکھیں پھاڑ کر ہر سمت دیکھنے لگا اچانک ہی بھیانک قسم کی سرسراہٹ پھر سنائی دی۔ چونکہ وہ اس سرسراہٹ کا معمہ حل کر چکا تھا اس لئے تیر کی طرح اس کمرے میں پہنچا جس میں وہ برتن تھا اور جس میں پڑا ہوا رقیق مادہ کیمیا گری کے باعث سونے میں تبدیل ہونے والا تھا کمرے میں پہنچتے ہی وہ بوکھلا کر دو قدم پیچھے ہٹا۔ کوئی اور ہوتا تو دہشت کے باعث فوراً بے ہوش ہو جاتا مگر اس کی نر بڑے دل گردے والا آدمی تھا۔

وہ حیرت سے ایک جگہ ہی جم کر رہ گیا اور پھر اس سفید سانپ کو دیکھنے لگا جو اپنے منہ میں ایک چھوٹی سی زرد رنگ کی شیشی دبائے ہوئے رقیق مادے والے برتن کے قریب اس انداز میں جھوم رہا تھا کہ اس کا پھن برتن کے بالکل اوپر تھا۔ اور نیچے اس نے کنڈلی مار رکھی تھی۔

اس کی نر جیسے سحر زدہ ہوگیا اس نے آگے بڑھنے کا ارادہ کیا بھی مگر اس کے قدم وہیں جم کر رہ گئے۔ چونکہ وہ اس وقت جبکہ سانپ نے زرد رنگ کا سفوف برتن میں الٹ دیا

تھا اور اس کے الٹتے ہی ایک زوردار دھماکا ہوا تھا...... اتنا زبردست دھماکا کہ برتن ٹکڑے ٹکڑے ہوکر فرش پر بکھر گیا اور کمرے کی دیواروں میں شگاف پڑ گئے۔

ارے ظالم یہ کیا کیا تو نے؟ اس کی نر بری طرح دھاڑا۔ اور پھر بیتابی کے عالم میں سانپ کو مارنے کے لئے آگے بڑھا۔ اس کا خیال تھا کہ سانپ بھی دھماکے کے ساتھ ہی ختم ہوگیا ہوگا اور یقیناً اس کے چیتھڑے اڑ گئے ہوں گے مگر یہ دیکھ کر اس کے تعجب کی انتہا نہ رہی کہ

سانپ اسی طرح کنڈلی مارے بیٹھا ہے اور اس کی نر کو لگاتار گھورے جارہا ہے۔ اس کی نر دراصل اسے مارنے کے لئے آگے بڑھا تھا مگر جب اس نے محسوس کیا کہ سانپ اس پر حملہ کرنا چاہ رہا ہے تو وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے جھکتے ہی سانپ اس کی طرف لپکا۔ اور اس کی نر کے حواس باختہ ہوگئے۔ اس نے چلا کر کہا۔

"میں جان گیا...... اچھی طرح جان گیا مردود...... مگر میں تیرے ہاتھ ہرگز نہ آؤں گا۔"

اتنا کہہ کر اس کی نر تیزی سے دروازہ کھولا اور پھر بری طرح باہر کی طرف بھاگا۔ بھاگتے ہوئے وہ دہشت زدہ آواز میں مدد کے لئے چلا رہا تھا۔ مگر اس ویرانے میں بھلا کون اس کی مدد کو آتا! وہ ہانپتا ہوا دوڑتا رہا! بھاگتے ہوئے وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا بھی جاتا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ کوئی ان دیکھی قوت اس کا تعاقب کررہی ہے۔

پتھریلی زمین پر کسی کی پراسرار سرسراہٹ اسے سنائی دے رہی تھی۔ یہ سرسراہٹ جلدی ہی قدموں کی چاپ میں تبدیل ہوگئی۔ ایک کھوکھلی آواز اسے اپنے ذہن سے ٹکراتی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔ کوئی غمناک لہجے میں اس سے مخاطب تھا۔ "اس کی نر...... اس کی نر بھاگ کیوں رہے ہو، رک جاؤ۔ رک جاؤ، میرا انتقام ابھی پورا نہیں ہوا......"

اس کی نر اس آواز کو سنتے ہی خوف زدہ انداز میں اپنی رفتار بڑھا رہا تھا، جلدی ہی وہ کھلی سڑک پر آ گیا۔

دور سے کسی کار کی ہیڈ لائٹس اسے اپنی طرف آتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ اپنے پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر چیخا۔ "بچاؤ...... مجھے بچاؤ۔"

کار نزدیک آ چکی تھی اور اس کی نر اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کی طرف بڑھا کار کے جھٹکے سے وہ نیچے گر پڑا لیکن پھر فوراً ہی اٹھ گیا۔ آنے والے لوگ پولیس کے علاوہ اور کوئی نہ تھے۔ "کیا بات ہے مسٹر، آپ بوکھلائے ہوئے ہیں؟" انسپکٹر نے دریافت کیا۔

"مجھے بچایئے انسپکٹر صاحب، خدا کے لئے مجھے بچایئے۔" اس کی نر بے تابی سے بولا۔

"کس سے بچائیں...... کون آپ کا تعاقب کررہا ہے؟" "وہ...... وہی ظالم سانپ......"

"سانپ! کیا کہہ رہے ہیں آپ...... کہیں آپ نشہ میں تو نہیں ہیں؟"

"میں نشہ میں نہیں ہوں انسپکٹر صاحب...... میں سچ کہہ رہا ہوں وہ میرا پیچھا کررہا ہے۔" اس کی نر نے بے تابی سے کہا۔ "کون پیچھا کررہا ہے؟" انسپکٹر نے پھر پوچھا۔

"کنارڈ...... ڈاکٹر کنارڈ انسپکٹر صاحب...... وہ سانپ کے روپ میں میرا تعاقب کررہا ہے خدا کے لئے مجھے بچالیجئے۔" اس کی نر نے بھیانک لہجے میں پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر نے جب مزید تحقیقات کی تو اس راز کا انکشاف ہوا کہ اس کی نر نے ڈاکٹر کنارڈ کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرکے جنگل کے اندر دفن کردیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ فارمولے کی بدولت کیمیا گری میں ماہر ہوجائے گا اور اسی لئے اس نے اس بھیانک جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ اس نے اپنے منہ سے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا تھا اس اعتراف کے ساتھ ہی انسپکٹر نے اس کی نر کی مدد کرنے کی بجائے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔

اس کی نر پولیس کار میں دبکا ہوا سڑک کو دیکھ رہا تھا، جس کے کنارے سفید سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا اور مستی کے عالم میں جھوم رہا تھا۔ اس کی تیز اور چمکیلی آنکھیں اس آستین کے سانپ پر مرکوز تھیں جو اب پولیس کار میں بیٹھا ہوا آہستہ آہستہ اس سے دور ہوتا جارہا تھا۔





موت کی آواز

ایس امتیاز احمد۔کراچی

کمرے کی دیوار پر ایک چیتے کی تصویر موجود تھی کہ اچانک چیتے کی آنکھیں چمکنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے تصویر میں موجود چیتے نے حقیقت کا روپ دھار لیا اور چشم زدن میں کمرے میں موجود نوجوان پر چھلانگ لگادی۔

وعدہ خلافی اور چشم پوشی اکثر انسان کو زندہ درگور کردیتی ہے۔ثبوت کہانی میں موجود ہے

سلیم میرا بچپن کا دوست تھا۔ہم دونوں ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ہم دونوں نے ایک ہی اسکول میں تعلیم پائی تھی۔اسکول چھوڑنے کے بعد اس نے کٹھل کی تجارت شروع کردی۔اور اس تجارت کی وجہ سے اس کی بیشتر زندگی کا فرستان میں گزری۔اب وہ ایک دولت مند شخص کی حیثیت سے آرام وآسائش کی زندگی بسر کررہا تھا۔مگر باوجود اس آسودہ حالی کے اس کی زندگی غیر مطمئن معلوم ہوتی تھی۔وہ ہر وقت کھویا کھویا سا رہتا اسے کسی کام میں دلچسپی نہ تھی۔وہ لوگوں سے متنفر تھا۔سوائے میرے کسی سے زیادہ میل جول نہ رکھتا تھا۔میں نے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ اس کی افسردگی کا راز معلوم کروں۔مگر موقع نہ ملا۔

ایک دفعہ فصل کے موقع پر میرا اپنے حصہ داروں سے کچھ جھگڑا ہوگیا۔اور مجھے اپنے گاؤں جانا پڑا۔وہاں

جا کر میں زمینداری کی بندھنوں میں ایسا گرفتار ہوا کہ دوسال تک چھٹکارا نہ ملا۔ اس عرصہ میں سلیم سے میری خط وکتابت جاری رہی۔ اس کے خطوں سے اکثر وحشت اور مایوسی کا جذبہ ٹپکتا تھا۔

دوسال بعد جب میں واپس آیا تو میں نے سنا کہ سلیم بالکل گوشہ نشین ہوگیا ہے۔ دو تین دن تو گھر کے کام کاج میں صرف ہوگئے۔ تیسرے دن شام کے قریب میں اس کے گھر گیا۔ میرا بیٹا جمال میرے ہمراہ تھا۔ سلیم کی حالت دیکھ کر مجھے دلی صدمہ ہوا۔ وہ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آرہا تھا۔ اس کا رنگ مٹیالا تھا اور جلد بدنما طور پر خشک ہورہی تھی۔ اس کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں سے خوف وہراس کی علامات ظاہر تھیں۔

مجھے دیکھ کر ایک مردہ سی مسکراہٹ اس کے پژمردہ ہونٹوں پر پھیل گئی میں حیرت سے اسے دیر تک دیکھتا رہا۔ میری اندرونی حالت کو بھانپ کر وہ مری ہوئی آواز سے بولا۔

''کیا دیکھ رہے ہو۔''

میں خاموش رہا۔ وہ دوبارہ بولا۔

''اندر آؤ! تم نہیں جانتے میری زندگی کس عذاب میں ہے۔ میں نے آج تک اپنا راز تم سے پوشیدہ رکھا۔ مگر اب زیادہ دیر یہ میرے دل میں نہیں رہ سکتا۔ میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔''

جمال کمرے سے ملحقہ لائبریری میں رنگین پنسلوں سے تصویریں بنانے میں مصروف تھا۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔

سلیم کہنے لگا۔ ''اسکول چھوڑنے کے بعد میری دوستی ایک ایسے شخص سے ہوئی جو کافرستان میں کشمل کی تجارت کرتا تھا۔ وہ شخص انتہائی نیک نفس اور دوست راز تھا۔ وہ دنیا میں بالکل اکیلا تھا۔ اور تجارت کا کام انجام دینے میں اسے بہت دقت ہوتی تھی۔ اس لئے اسے ایک ایسے آدمی کی تلاش تھی جو اس کے ماتحت کافرستان کے علاقہ میں رہ کر کشمل فراہم کرنے میں اس کی مدد کرے۔

ان دنوں میری عمر صرف اٹھارہ برس تھی، میں بالکل ناتجربہ کار تھا۔ تاہم اس نے مجھے دیانتدار اور محنتی پاکر تجارت میں حصہ دار بنالیا۔ اور میں نے اپنا کام اس قدر شوق اور محنت سے کیا کہ سال کے اندر اندر ہماری تجارت چمک اٹھی۔

انہی ایام میں ایک دفعہ میں اپنے ایک کوہستانی ملازم کے ہمراہ دورہ کرتا ہوا ایک غیر آباد علاقہ میں جا پہنچا۔ وہ علاقہ نہایت سرسبز تھا۔ میوے سے لدے ہوئے درخت ہماری خوراک کے لئے کثرت سے موجود تھے اور پیاس بجھانے کو چپہ چپہ پر حیات بخش چشمے جاری تھے۔ لیکن رات کو سر چھپانے کے لئے جگہ دشوار تھی۔

تمام دن ہم جنگلوں میں بھٹکتے رہے۔ حتیٰ کہ شام قریب ہوگئی۔ شکست خوردہ آفتاب دن بھر کی خجالت سے تھک کر لیلائے شب کی سیاہ فام زلفوں میں سر چھپانے لگا۔ جنگلی پرندے شوروغل مچاتے ہوئے اپنے گھونسلوں کے اردگرد طواف کرنے لگے اور گھنے درختوں کی وجہ سے جنگل بے حد تاریک ہونے لگا۔

ہم اندھادھند آگے بڑھتے گئے۔ یکا یک جنگل ختم ہوگیا۔ ہم تاریک فضا سے باہر نکلے تو افق کے دلکش مناظر سے ہماری آنکھیں روشن ہوگئیں۔ ہم ایک شاداب وزرخیز میدان کے کنارے کھڑے تھے۔ دور سے روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ ہم اس طرف بڑھے اور تھوڑی دیر میں ایک جھونپڑی کے دروازے پر جا کر کھڑے ہوئے۔

جھونپڑی میں ہلکی ہلکی روشنی ہورہی تھی۔ کھڑکی سے دھوئیں نکل رہے تھے اور بھنے ہوئے گوشت کی خوشگوار مہک اٹھ رہی تھی۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے دستک دی۔ چند لمحے بعد ایک خشک صورت شخص نے دروازہ کھولا۔ میں نے رات بسر کرنے کی درخواست کی۔ اس نے ہم دونوں کو سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا۔ پھر ایک نے ہنستے ہوئے انداز سے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

اس کی ہنسی سے میرا دل دہل گیا۔ طرح طرح کے وسوسے اٹھنے لگے۔ مگر تھکان سے مجبور ہو کر چپ چاپ اس کے پیچھے ہولیا۔ جھونپڑی کی اندرونی حالت بہت ابتر تھی۔ دیواریں دھوئیں سے سیاہ ہو رہی تھیں۔ ہر چیز پر سیاہی مائل گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اس نے ہمیں ایک شکستہ تخت پر بیٹھایا اور خود ہمارے کھانے کے بندوبست میں مصروف ہو گیا۔

تھوڑی دیر میں اس نے بھنا ہوا گوشت اور مکئی کی روٹیاں لا کر ہمارے سامنے رکھ دیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر میرے ملازم نے میرا بستر ایک طرف لگا دیا۔ مگر میرا دل سونے کو نہ چاہتا تھا۔ مجھے اس خشک صورت شخص کی آنکھوں میں واضح سفاکی جھلکتی دکھائی دیتی تھی۔ اس بدگمانی کے زیر اثر میرے دل میں ایک نامعلوم خطرہ پیدا ہو چکا تھا۔ میں اسی سوچ میں تھا کہ وہ قہوہ لے آیا۔ نیند کو دور کرنے کے لئے میں نے خوب قہوہ پیا۔

تھوڑی دیر کے بعد مجھے سخت نیند کے جھونکے آنے لگے۔ میں نے چاہا کہ ملازم کو خبردار رہنے کی تاکید کر کے خود سو جاؤں۔ مگر دیکھا تو وہ پہلے ہی گہری نیند کے مزے لے رہا تھا۔ میں نے اسے آوازیں دیں، جھنجھوڑا، مگر بے سود۔ مجھ پر نیند کا غلبہ زیادہ ہو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اردگرد کی چیزیں دھندلی نظر آنے لگیں مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

رات کو مجھے نہایت خوفناک خواب دکھائی دیا۔ میں نے دیکھا کہ چند دیوزاد آدمی مجھے کندھے پر اٹھائے ہوئے کہیں لے جا رہے ہیں۔ یکایک میرے سر میں سخت ٹیس اٹھی۔ ایک تشنجی کیفیت سے میرے پٹھے اینٹھنے لگے۔ دوران خون سر کی طرف زیادہ ہونے سے دماغ پھٹنے لگا۔ سخت تکلیف سے میری آنکھ کھل گئی۔

اوہ میرے خدا! میں نے ایک ایسا بھیانک منظر دیکھا کہ میرا خون خشک ہو گیا۔ بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور دل ایک بڑے کلاک کی مانند ٹک ٹک کرنے لگا۔

آہ! میں ایک تیرہ و تار ڈراؤنی غار میں ایک لمبی

ہی چوبی میز پر چت پڑا ہوا تھا۔ میری مشکیں کسی ہوئی تھیں۔ اور سرہانے کی طرف ایک زبردست الاؤ جل رہا تھا۔ دہکتے ہوئے انگاروں کی سرخ تھرکتی ہوئی روشنی میں دیواروں پر مہیب سائے ناچ رہے تھے۔ غار دوزخ کی بھٹی کی طرح لال اور گرم تھا۔ سخت گرمی سے میرا سر چکرا رہا تھا۔

میز کے قریب ایک دیوزاد آدمی کھڑا تھا۔ جس کا بالوں سے بے نیاز سر ایک پشاوری تربوز کی طرح بڑا تھا۔ اس کا سرخ چہرہ جس پر جلادوں کی طرح سفاکی تھی، انگاروں کی لال روشنی میں خون سے رنگا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ ہاتھ میں ایک لمبا شکار چاقو پکڑے کسی کو کچھ احکام دے رہا تھا۔ انتہائی دہشت سے میری زبان حلق میں دھنس گئی۔ اور سانس رک رک کر آنے لگی۔ اتنے میں ایک نسوانی آواز سنائی دی جسے سنتے ہی سرخ جلاد نے اپنا مضبوط ہاتھ اٹھایا اور چاقو سے میرے سر میں زخم کرنے لگا۔ میں شدت خوف سے پہلے ہی نیم جاں ہو رہا تھا، زخموں کی تکلیف سے بے ہوش ہو گیا!

مجھے ہوش آیا تو میں ایک صاف ستھرے کشادہ کمرے میں آرام دہ بستر پر پڑا تھا۔ کمرے میں بالکل سکوت تھا۔ پیتل کے بڑے سے چراغ میں تیل جل رہا تھا۔ جس کی کیف آور روشنی کمرے میں پھیل رہی تھی۔ چاند کی حسین کرنیں کھڑکی سے داخل ہو کر فرش پر لوٹ رہی تھیں۔ میرے سر اور گردن کے پٹھے اکڑے ہوئے تھے۔ رفتہ رفتہ مجھے سب واقعات یاد آنے لگے۔ اور غار والا منظر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ میں نے گھبرا کر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ سرہانے کی طرف ایک سایہ سا دیکھ کر میری چیخیں نکل گئیں۔ فوراً کسی نے شفقت بھرا ہاتھ میرے سینے پر رکھ کر بولا۔

''نوجوان! تمہیں اپنی زندگی اور جوانی مبارک ہو۔ تمہاری اس طویل اور مسلسل غشی نے مجھے تمہاری زندگی سے مایوس کر دیا تھا۔ مگر آج آٹھ دن کے بعد تمہیں ہوش میں دیکھ کر بہت خوش ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔ اب کچھ فکر نہیں۔ تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے!''

دل جوئی کے الفاظ سن کر میں نے مطمئن نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک چالیس سالہ وجیہہ آدمی تھا۔ اس نیک دل انسان کی بڑھتی ہوئی ہمدردی اور ان تھک خدمت گزاری سے میری صحت بہت جلد ٹھیک ہونے لگی۔ اور میں بتدریج صحت یاب ہوتا گیا۔

دوران علالت مجھے معلوم ہوا کہ میرے محسن کا نام جبران ہے۔ اور وہ ایک قبیلے کا سردار ہے۔ میرے استفسار پر جبران نے مجھے ایک عجیب و غریب داستان سنائی۔ اس نے کہا۔

''اس علاقہ میں کئی ایسی وادیاں ہیں جو ہنوز دنیا کی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ ہر ایک وادی کا راستہ اتنا خفیہ اور پراسرار ہے کہ کوئی اجنبی ان میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اور ہر وادی میں جدا جدا قبیلے آباد ہیں۔ چنانچہ یہ وادی بھی جس میں میرا قبیلہ آباد ہے۔ اسی طرح کی ایک پوشیدہ وادی ہے۔ جس میں ایک رہزنوں کا قبیلہ آباد ہے۔ ان کی سردار ایک عورت ہے جس نے جوانی کا جوہر ایجاد کیا ہے۔ 18 سے 25 سال تک کی عمر کے نوجوانوں کے سر سے وہ اس جوہر کو کیمیاوی طریقے سے حاصل کرتی ہے۔ اور اس جوہر کے اثر سے باوجود سن رسیدہ ہونے کے ابھی تک جوان اور نوخیز نظر آتی ہے۔ اس جوہر کو حاصل کرنے کے لئے اس نے اپنے ملازم مختلف علاقوں میں اس غرض سے چھوڑ رکھے ہیں کہ وہ کسی طرح نوجوانوں کو اس کے لئے فراہم کریں۔

ان اسیر نوجوانوں کو اس کے ملازم منشیات سے بے ہوش کر کے خفیہ غاروں میں لے جاتے ہیں۔ جہاں وہ عورت ان کے سروں سے جوہر کشید کرتی ہے۔''

میں نے پوچھا۔''آپ کو یہ باتیں کیسے معلوم ہوئیں۔''

اس نے کہا۔''جوانی میں مجھے بھی ایک دفعہ اس کے آدمی پکڑ کر لے گئے تھے۔ لیکن میرے قبیلے کو اس غار کا کسی طرح کھوج مل گیا اور انہوں نے حملہ کر کے مجھے عین اس وقت چھڑایا جب ایک سرخ جلاد میرے

سر کو زخمی کر رہا تھا!" جبران نے اپنی پگڑی اتار کر مجھے اپنا سر دکھایا جس پر جا بجا بڑے سفید داغ تھے۔ پھر کہنے لگا۔

"میں نے اب اس علاقہ میں اپنے جاسوس چھوڑ رکھے ہیں۔ جب کوئی نووارد ان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے تو مجھے اطلاع مل جاتی ہے اور میں چھاپہ مار کر ان نوجوانوں کو بچالیتا ہوں۔ مگر وہ عورت احتیاطاً غار بدلتی رہتی ہے۔ مگر میں ہمیشہ کھوج لگانے میں کامیاب ہو جاتا ہوں۔ چنانچہ رہزن جس دن تمہیں اس ڈائن کے پاس لے جا رہے تھے، مجھے جاسوسوں نے مطلع کیا۔ جس پر میں نے کئی ایک غاروں میں تمہیں تلاش کیا۔ اور آخرکار ایک غار پر حملہ کر کے میں نے تمہیں نجات دلوائی۔ میں کئی دفعہ اس عورت پر حملہ کر چکا ہوں مگر ہر دفعہ وہ میرے ہاتھ سے صاف بچ کر نکل جاتی ہے۔ کاش! مجھے اس کی وادی کا راستہ معلوم ہو جائے اور میں ہمیشہ کے لئے دنیا کو اس ڈائن کے وجود سے پاک کر دوں۔"

میں تقریباً چھ ماہ جبران کی وادی میں مقیم رہا۔ کئی دفعہ واپسی کا ارادہ کیا مگر اس کی بے لوث محبت میرے لئے زنجیر پا ہو گئی۔ چھ ماہ بعد میں نے دل کڑا کر کے اس سے اجازت طلب کی۔ وہ کچھ سوچ کر بے دلی سے کہنے لگا۔

"تم شوق سے جا سکتے ہو۔ مگر تمہیں یہاں سے پٹی باندھ کر جانا ہوگا۔"

میں نے گھبرا کر کہا۔ "یہ کیوں؟"

وہ لجاجت سے بولا۔ عزیز من! میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ یہ ایک پوشیدہ وادی ہے اس لئے سوائے اپنے قبیلے کے کسی اور کو ان خفیہ راستوں کا راز بتانا ہمارے اصول کے خلاف ہے۔ اور اس اصول میں بے قاعدگی کی وجہ سے نقصان کا سخت خطرہ ہے کیوں کہ اگر ایک قبیلے کو دوسرے قبیلے کی وادی کا راستہ معلوم ہو جائے تو وہ شب خون مار کر وادی میں گھس آتے ہیں اور قبیلے کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ گو مجھے تم پر کوئی بدگمانی نہیں مگر اپنے قبیلے کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ ان کے قائم کردہ اصول کی خلاف ورزی میری طاقت سے باہر ہے۔"

میں نے افسردگی سے کہا۔ "تو کیا میں یہاں کبھی نہ آسکوں گا۔"

"میرے خیال میں کبھی نہیں۔" اس نے کہا۔

میں نے کہا۔ "لیکن آپ کی ملاقات......!"

وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ "یہ بھی تقریباً ناممکن ہے؟"

جبران کی ناگوار گفتگو نے مجھے مایوس کر دیا۔ مجھے اس سے دلی الفت تھی۔ اس لئے اس کے فیصلے سے میرے دل پر گہری چوٹ لگی۔ اور میرے آنسو جاری ہو گئے۔ وہ رویا تو نہیں مگر اس کے چہرے کا اڑتا ہوا رنگ اس کے اضطراب کا شاہد تھا۔ وہ گاؤ تکیئے پر کہنیاں ٹیکے کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کے شگفتہ چہرے پر سادی تجلیاں نمایاں تھیں۔ کافی وقفہ کے بعد اس نے سر اٹھایا اور اپنی نکھری ہوئی منور پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نہایت ملامت سے کہنے لگا۔

"ہاں! ایک صورت ہو سکتی ہے۔ اگر تم میرے مذہبی طریقے پر قسم اٹھا کر میری برادری میں شامل ہو جاؤ تو میرے قبیلے کو اطمینان ہو جائے گا۔"

میں نے اس شرط کو قبول کر لیا۔

دوسرے دن جبران نے اپنے تمام قبیلے کی دعوت کی اور سب کے سامنے ایک نیم عریاں کاہن نے جبران کی چھنگیا سے چند قطرے خون نکال کر ایک طشتری میں ٹپکائے۔ پھر اپنی خاص زبان میں اس خون پر مجھ سے قسم لی گئی۔ جس کا مفہوم یہ تھا کہ اگر میری وجہ سے جبران کو کسی قسم کی تکلیف پہنچے تو روحیں مجھے بھی وہی سزا دیں۔ اس کے بعد کاہن کی ہدایت کے بموجب میں نے اس مقدس خون کو چکھا اور اس رسم کے اختتام پر جبران نے مجھے اپنے گلے سے لگا لیا۔ اس کے بعد قبیلے کے سب لوگ یکے بعد دیگرے میرے گلے ملے اور خوشیاں مناتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

اگلے دن مجھے وادی کا راز بتا دیا گیا۔ اور جاتے وقت جبران نے تاکید کی۔ "جب تک میری عمر پچیس برس سے تجاوز نہ کر جائے اس علاقہ میں اکیلا یا کسی کسی

اجنبی کے ہمراہ سفر نہ کروں۔" جبران کے خاص آدمی مجھے اس جگہ پہنچا گئے جہاں میرے دوست کا ہیڈ کوارٹر تھا۔

یہ خطہ جبران کی وادی سے دوسو میل کے فاصلے پر تھا۔ میرا دوست جو میری زندگی سے مایوس ہو چکا تھا، مجھے زندہ وسلامت پا کر بہت خوش ہوا۔

جبران کی دوستی سے میرے کاروبار کو بہت فائدہ پہنچا۔ کیوں کہ جبران کی وادی میں کستھل بہت کثرت سے پائے جاتے تھے۔ اس کے آدمی ہمیشہ کستھل پہنچاتے رہتے۔ انہی آدمیوں کے ساتھ میں بھی ہر دوسرے تیسرے ماہ جبران سے ملنے جایا کرتا۔ اسی طرح کئی سال گزر گئے۔ میری عمر پچیس برس سے تجاوز کر گئی۔ اب میں بغیر محافظوں کے بے کھٹکے اس علاقہ میں سفر کرنے لگا۔

ایک دفعہ میں جبران کو ملنے جارہا تھا کہ راستے میں ایک چھوٹی سی کوہستانی سرائے میں میری ایک خوش پوش مسافر سے ملاقات ہوئی۔ وہ شخص بڑا باتونی تھا۔ باتوں ہی باتوں میں اس نے ذکر کیا کہ فلاں راستے سے آتے ہوئے کئی دفعہ اس ندی کے کنارے جو نشیبی گھاٹی میں ہے، اس نے پریوں کو گاتے دیکھا ہے۔ اس وقت تو میں نے اسے جھٹلا دیا۔ مگر دوسرے دن سفر کرتے ہوئے راستے میں مجھے اس ندی کا خیال آیا جو وہاں سے زیادہ دور نہ تھی۔ میں نے گھوڑا اس راستے پر ڈال دیا۔

ندی کے کنارے گیا تو کہیں دور سے ہلکی ہلکی دلکش آواز جو نیم بہار کی نرم رولہروں میں مستی بکھیر رہی تھی، بن کر میرے دل میں گدگدی پیدا ہونے لگی۔ میں نے گھوڑا آگے بڑھا دیا۔ برساتی ندی میں پانی بہت کم تھا۔ میں با آسانی اسے عبور کر کے پار کے گھنے جنگل میں داخل ہو گیا۔ اب گیت کہیں قریب ہی سنائی دیتے تھے۔

یہ نشاط انگیز راگنی مجھے اپنی طرف اس طرح کھینچ رہی تھی جس طرح مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے آگے بڑھ کر معلوم ہوا کہ جنگل کو وسط سے کاٹ کر چھوٹا سا میدان بنایا گیا ہے۔ اور اس میدان میں ایک خوش نما جھونپڑی ہے۔ جس کے ارد گرد خوش رنگ پھلواریوں کی بساط بچھی ہوئی ہے۔

قریب گیا تو فرط حیرت سے میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ سوسن کی پھلواری میں ایک پری جمال حسینہ ایک پہاڑی ساز پر دلکش لے میں گیت گا رہی تھی اور چند کوہستانی لڑکیاں پاؤں میں گھنگرو باندھے اس کے سامنے ناچ رہی تھیں۔ اس حسینہ کو دیکھ کر میں پھڑک گیا۔ اس کی بڑی بڑی خوشنما صدفی آنکھوں سے ایسا کیف کا سیلاب اُمڈ رہا تھا جس کی تیز رو میں میرے ہوش وحواس تک بہہ گئے۔

مجھے دیکھ کر انہوں نے راگ ختم دیا۔ حسینہ نے مجھے بلا کر بڑے اخلاق سے اپنے قریب بیٹھایا اور مترنم آواز میں باتیں کرنے لگی۔ جب میرے حواس قدرے درست ہوئے تو میں نے اس حسینہ سے نام وغیرہ دریافت کیا۔ وہ کہنے لگی۔

"میرا نام امتا ہے۔ میں ایک کوہستانی رئیس کی لڑکی ہوں۔ والدین کے انتقال پر میرا دل ٹوٹ چکا ہے۔ یہ جگہ کبھی میرے باپ کی شکارگاہ تھی یہاں اپنی کنیزوں کے ساتھ اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں۔"

میں نے تمام دن اس حسینہ کی صحبت میں گزارا۔ خوشی کے چند لمحے چٹکیوں میں گزر گئے۔ حتیٰ کہ دن کی ڈھلتی چھاؤں وقت کی رفتار کا پتہ دینے لگی۔

میں امتا سے رخصت ہو کر جبران کی وادی کی طرف ہولیا۔ میں ابھی تک محبت کی چاشنی سے ناآشنا تھا۔ آج پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ میں اپنا دل اس لڑکی کو دے چکا ہوں۔

جبران کی ملاقات کے بعد میں اپنے ڈیرے پر آیا۔ تو امتا کی جدائی دن بدن مجھے شاق گزرنے لگی۔ بہت کوشش کی کہ اس کو بھول جاؤں مگر دل نہ مانا۔ اور آخر کار اپنے کاروبار سے بددل ہو کر زیادہ تر جوان خالد کے پاس رہنے لگا۔ خالد میری اس تبدیلی

پر متعجب تھا۔ لیکن میں نے بڑی خوش اسلوبی سے اپنے عشق کا راز اس سے چھپائے رکھا۔

امتا کی جھونپڑی جبران کی وادی سے کچھ زیادہ دور نہ تھی۔ اس لئے اکثر اس سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ وہ اکثر میری جائے رہائش دریافت کرتی مگر میں نے کبھی اس سے جبران کا ذکر نہ کیا۔ اسے ہمیشہ اپنے ڈیرے کا پتہ دیتا جو میرے کاروبار کا مرکز تھا۔ یہ سن کر وہ بدگمانی سے منہ پھیر لیا کرتی۔ کیونکہ وہ ڈیرہ یہاں سے تقریباً دو سو میل کے فاصلے پر تھا۔

ایک دن جب میں اسے اپنی محبت کا یقین دلا رہا تھا۔ وہ بے اختیاری سے کہنے لگی۔

''تمہاری محبت کا میں کیسے یقین کرسکتی ہوں۔ جب کہ تم اپنی جائے رہائش تک مجھ سے چھپارہے ہو!''

ندامت سے جھٹ بے سمجھے بوجھے میرے منہ سے نکل گیا۔

''دوسرے کا راز میں نہیں بتا سکتا۔''

میرے اس جواب پر وہ اپنی حسین آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

''اوہ آپ مجھے اس قدر ذلیل سمجھتے ہیں۔ کیا میری ذات سے کسی کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے؟''

درحقیقت آنسو عورت کا زبردست ہتھیار ہے۔ جسے دیکھ کر مضبوط سے مضبوط ارادے کا مرد بھی زیر ہوجاتا ہے۔ آہ! میں ان صدقان گوہر کو دیکھ کر بے تاب ہوگیا۔ اوران خوشنما آنسوؤں نے مجھے مغلوب کرلیا۔ افسوس! میں نے اپنا مقدس عہد توڑ کر اسے اس وادی کا راز بتادیا۔

رات کسی بدعہد گنہگار کے دل کی طرح تاریک تھی۔ جس کی نحوست سے کائنات دھواں دھواں تھی۔ تیسری تاریخ کا نیا چاند افق کی گہرائیوں میں کھوچکا تھا۔ تارے سیاہ بادلوں میں گم ہوچکے تھے۔ تمام دنیا ایک کالے دیو کی مانند مٹھی میں بند معلوم ہوتی ہے۔ خالد اپنے کمرے میں گہری نیند سورہا تھا۔ مگر میری آنکھوں میں نیند مفقود تھی۔ ایک نامعلوم خطرہ مجھے قریب تر معلوم ہو رہا تھا۔ کسی مبہم خوف سے میرا دل دھڑک رہا تھا۔ میں ذہنی اذیت محسوس کرتے ہوئے اپنے کمرے میں بے چینی سے چکر لگا تا رہا۔

آدھی رات کے قریب ایک گرجدار آواز سے تمام وادی گونج اٹھی۔ اس پر ہول آواز سے میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

آہ! یہ اس مہیب نقارے کی آواز تھی جس پر خطرے کے وقت چوٹ پڑتی تھی۔ خطرے کے الارم پر تمام قبیلہ بیدار ہوگیا۔ جبران کے گھر میں کھلبلی مچ گئی۔ اس نے نہایت عجلت سے ہتھیار اٹھائے۔ اور مقابلے کیلئے تیار ہوگیا۔

یکدم رہزنوں کا ایک گروہ جبران کے محل پر ٹوٹ پڑا۔ وہ کمال بہادری اور جواں مردی سے لڑا۔ مگر رہزنوں کے ٹڈی دل کے سامنے اس کی پیش نہ گئی۔ وہ مجروح ہوکر گر پڑا۔ رہزنوں نے اس کے ساتھ ہم سب کی مشکیں کس لیں۔ اور ہمیں برق رفتار گھوڑوں پر لاد کر وادی سے نکال لائے۔

ابھی وہ وادی سے نکلے ہی تھے کہ جبران کا باقی قبیلہ تعاقب کرتے ہوئے آن پہنچا۔ چند میل کے فاصلے پر دونوں لشکر آپس میں گتھم گتھا ہوگئے۔ ادھر ہم قیدیوں کو ایک غار میں پہنچادیا گیا۔ غار میں الاؤ جل رہا تھا اور ایک بپھرے ہوئے شیر کے پنجرے کے قریب ایک عورت کھڑی تھی۔ اس عورت کو دیکھ کر میں حیرت واستعجاب سے اچھل پڑا۔

اوہ! اوہ امتا تھی۔ وہ غصے میں دانت پیس رہی تھی، ایک کونے میں وہی خوش خوش مسافر کھڑا تھا جو کبھی مجھے سرائے میں مل چکا تھا۔ جس نے جبران کی مشکیں امتا کے اشارے پر کھول دیں۔ اوراسے خوفناک شیر کے پنجرے میں ڈال دیا۔ مہیب شیر نے آناً فاناً جبران کو اپنے مضبوط پنجوں میں دبوچ کر ہلاک کردیا۔

عین اسی وقت رہزنوں کے لشکر میں بھگدڑ مچ گئی۔ اور حملہ آور مار دھاڑ کرتے ہوئے غار کے قریب پہنچ گئے۔ خطرے کو بھانپ کر امتا فوراً دوسرے راستے

سے فرار ہوگئی...... جبران کا قبیلہ جب وہاں پہنچا تو انہیں خالد کا حسرت ناک انجام دیکھ کر ازحد صدمہ ہوا۔ اس کی لاش واپس وادی میں لائی گئی جہاں نہایت۔ احترام سے اسے سپرد خاک کیا گیا۔ چالیس دن تک اس کا قبیلہ سوگوار رہا۔ آخر چالیسویں کی رسوم پر جبکہ تمام قبیلہ جمع تھا، نعیم عریاں کا ہن نے کہا۔

''بھائیو! میں نہیں جاننا چاہتا کہ تم میں سے غدار کون ہے؟ لیکن تمہیں یہ بتادینا چاہتا ہوں کہ غدار سزا سے کبھی نہیں بچ سکتا۔ تم لوگ مقدس خون پر جبران سے وفاداری کی قسم اٹھاچکے ہو۔ اور یہ کوئی معمولی چیز نہیں۔ جبران کی عمر اس وقت پچاس کے قریب تھی، اس لئے پچاس کی عمر میں غدار پر اس مقدس قسم کی لعنت پڑے گی۔ اور وہ شیر کے ہاتھوں ہلاک ہوگا۔'' نعیم عریاں کاہن کے ان الفاظ کا مجھ پر خاص اثر ہوا۔ مگر حوصلہ کرکے دل کو برقرار رکھا۔ اور دوسرے دن اپنے ڈیرے کی طرف واپس ہوا۔

میں مجرم تھا، میرا سکون قلب رخصت ہو چکا تھا۔ اب تجارت میں بھی میرا دل نہ لگا۔ میں تجارت کو چھوڑ کر اپنے شہر چلا آیا۔ چوں کہ خالد کی بدولت میں نے بے شمار دولت کمائی تھی، میں امیرانہ زندگی بسر کرتا رہا۔ لیکن میرا دل کبھی مطمئن نہ ہوسکا۔ اس نیم عریاں کا ہن کے الفاظ ہمیشہ میرے کانوں میں گونجتے رہے۔ اب جس دن سے میرا پچاس واں سال شروع ہوا ہے، خوف سے میری زندگی وبال ہوگئی ہے۔ رات کو شیروں کے دہاڑنے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ شیروں کے خوف ناک سائے دیواروں پر متحرک دکھائی دیتے ہیں۔ اکثر ملک الموت کے سرد پاؤں کی چاپ محسوس کرتا ہوں۔ روحیں میرے اردگرد منڈلاتی رہتی ہیں۔ جبران خالد کی کفن پوش لاش مجھے اشاروں سے بلاتی ہے۔ اور میں اسی خوف سے گوشہ نشین ہوگیا ہوں۔''

سلیم کی داستان سن کر میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں وہم ہوگیا ہے۔ ورنہ ایسی قسمیں کچھ حقیقت نہیں رکھتیں۔ اور نہ ہی تم نے جان بوجھ کر غداری کی۔ ایسی فضول قسموں کا خیال نہ کرو۔ یہاں شہر میں شیر کہاں سے آئے گا۔ میں اسے بہت دیر تک سمجھاتا رہا۔ بارہ بجے کے قریب میں اٹھا۔ میرا خیال تھا کہ جمال لائبریری میں سو رہا ہوگا۔

میں لائبریری کی طرف گیا تو وہ کرسی پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگا۔

''ابو! میں نے انکل کی تمام باتیں سنی ہیں، وہ بہت ڈرپوک ہیں۔''

میں نے اسے آہستہ سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''جمال ایسا نہیں کہتے۔'' وہ شوخی سے بولا۔

''وہ درحقیقت بڑے ڈرپوک ہیں۔ دیکھیں میں نے انہیں ڈرانے کے لئے دیوار پر کیا بنایا ہے!''

میں نے دیوار کی طرف دیکھا۔ جمال نے اس پر اپنی رنگین پینسل سے ایک بہت بڑے شیر کی تصویر بنائی تھی۔ تصویر کو دیکھ کر میں بے اختیار ہنس دیا اور اسے لے کر باہر نکل آیا۔

چونکہ رات کو میں دیر سے سویا تھا اس لئے صبح دیر سے آنکھ کھلی۔ ابھی میں بستر میں ہی تھا کہ سلیم کی موت کی خبر پہنچی۔ اسے رات کو کسی درندے نے ہلاک کردیا تھا۔ میں اسی وقت سلیم کے مکان پر پہنچا وہاں پولیس جمع تھی۔

سلیم کی لاش بستر پر نہایت ابتر حالت میں پڑی تھی۔ اس کی شہ رگ کے قریب ایک بہت بڑا گہرا زخم تھا کسی درندے کے خون آلود پنجے بستر کی سفید چادر پر نمایاں تھے۔

میں سراسیمگی سے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا لائبریری میں جانکلا۔ اچانک مجھے جمال کی بنائی ہوئی تصویر کا خیال آیا مگر دیوار کی طرف دیکھ کر میرے اوسان خطا ہوگئے۔ کیونکہ جمال کی بنائی ہوئی شیر کی تصویر دیوار سے غائب تھی۔





موت کا گھر

ایس امتیاز احمد۔کراچی

نوجوان کا جسم اچانک برف کی طرح سرد ہوگیا۔ سامنے کھڑی عجیب الخلقت مخلوق اپنے لمبے اور نوکیلے دانت کچکچاتے ہوئے نوجوان کی طرف بڑھی کہ پھر چشم زدن میں نوجوان کو جیسے ہوش آگیا اور اس نے اوپر سے چھلانگ لگادی۔

رات کے اندھیرے میں جنم لینے والی دل ودماغ کو مبہوت کرتی ایک ناقابل فراموش کہانی

ڈاکٹر پال اس رات کو کافی دیر سے سوئے تھے۔ دن بھران کے کلینک میں مریضوں کا تانتا بندھا رہتا اورانہیں دم لینے کی مہلت بھی نہیں ملتی تھی۔ لیکن اب ساڑھے چار بجے اچانک ان کی آنکھ کھل گئی تھی۔ انہوں نے سنا کہ صدر دروازے کی گھنٹی مسلسل بج رہی ہے سورج کے طلوع ہونے میں ابھی کافی دیر تھی اور چاروں طرف گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس وقت نرم گرم بستر سے نکلنا ڈاکٹر پال کے لئے بہت تکلیف دہ تھا۔ وہ اپنے ملازم کو کوسنے لگے جوایک دن قبل کوئی بہانہ کر کے اپنے گاؤں چلا گیا تھا۔

''پتا نہیں کون کم بخت میری نیند حرام کرنے پر تلا ہوا ہے جہنم میں جائے۔'' انہوں نے بڑبڑا کر کہا اور لحاف اپنے اوپر لپیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگے مگراب گھنٹی بجانے والا دروازہ پیٹنے لگا تھا۔ کئی منٹ

گزر گئے مگر وہ بدستور دروازے کو پیٹتا رہا۔ اور جب ڈاکٹر پال کو یقین ہوگیا کہ دستک دینے والا آسانی سے ٹلنے والی آسامی نہیں تو غصے میں وہ بستر سے نکلے اور ڈریسنگ گاؤن پہن کر لڑکھڑاتے ہوئے صدر دروازے تک گئے۔

دروازہ کھول کر انہوں نے جونہی باہر تاریکی میں جھانکا تو ایک شخص جھٹ سے اندر آ گیا اور جلدی سے دروازہ بند کر کے چٹخنی لگادی پھر اس نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے ڈاکٹر کا بازو پکڑلیا۔ ڈاکٹر نے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا مگر اس کی گرفت اور سخت ہوگئی۔ چندلمحوں بعد اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"مجھے بتایا گیا ہے کہ اس مکان میں ایک ڈاکٹر رہتا ہے جس کا نام پال ہے۔ کیا تمہارا یہی نام ہے؟ اگر تم ڈاکٹر نہیں تو خدارا مجھے ڈاکٹر پال کے پاس لے چلو۔"

ڈاکٹر پال نے جواب دینے سے پہلے اس پراسرار اجنبی کا بغور جائزہ لیا۔ پھر مطمئن ہو کر انہوں نے اجنبی کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے کتب خانے میں لے آئے جہاں آتش دان میں اب بھی لکڑیاں چیخ رہی تھیں اور کمرہ خاصا گرم تھا۔ انہوں نے ایک موٹی سی لکڑی آتش دان میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہاں مجھے ڈاکٹر پال کہتے ہیں۔"

"اوہ ڈاکٹر صاحب مجھے بتایئے کیا میں پاگل ہوں۔"

ڈاکٹر پال نے بھی اپنے اس بے وقت ملاقاتی کی طرف بغور دیکھا۔ اس کا حلیہ عجیب وغریب تھا ۔سر کے بال گردآلود اور الجھے ہوئے تھے۔ کپڑے پھٹ کر تار تار ہو چکے تھے اور چہرہ خون سے تر تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف وہراس آواز میں کپکپاہٹ اور خوف کا عنصر نمایاں تھا۔ ڈاکٹر نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کر کے اس سے بیٹھنے کے لئے کہا جس پر اجنبی دھپ سے بیٹھ گیا۔" تم زخمی بھی ہو اور حواس باختہ بھی ٹھہرو۔ ابھی کچھ دیر بعد تمہاری داستان سنتا ہوں۔"

ڈاکٹر نے الماری کھولی اور برانڈی کا ایک گ بھر کر اجنبی کو دیتے ہوئے کہا۔"لو پہلے اسے لو۔" اس نے ایک ہی سانس میں گلاس ختم کر اور پھر آہستہ آہستہ اس کے اوسان بحال ہونے ، چندلمحوں تک خاموشی چھائی رہی آخر اجنبی نے داستان اس طرح شروع کی۔

"میرا نام فرنیک میتھون ہے اور میں لندن رہنے والا ہوں، میرا پیشہ فوٹوگرافری ہے اور میں برا اینڈ بلیک کمپنی میں ملازم ہوں کمپنی کے کام سے مجھے علاقے میں چند تصویریں لینے کے لئے آنا پڑا علاقے میں قطعی ناواقف ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ گز پندرہ روز سے مختلف دیہاتوں میں بھٹکتا پھر رہا ہو لیکن مجھے اپنی مطلوبہ تصاویر لینے میں کامیابی نہ ہوئی۔ آخر میں نے رور کنگٹن اور وائٹ ہیون اضلاع کا دورہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ میرا ارادہ وائ ہیون کے بہترین رائل ہوٹل میں قیام کرنے تھا۔ چنانچہ گزشتہ رات میں اپنی موٹر سائیکل پر کر روانہ ہوا۔ یہ تمام راستہ ویران اور دلدلی میدانوں مشتمل تھا۔ رات بھی بہت تاریک اور سرد تھی مگر میں ا دھن میں برق رفتاری سے موٹر سائیکل اڑائے وائ ہیون کی طرف چلا جارہا تھا کہ اچانک موٹر سائیکل رفتار خود بخود دھیمی پڑنے لگی۔

اور تھوڑی دور آگے جا کر موٹر سائیکل بالکل ٹھپ ہوگئی۔ میں نے موٹر سائیکل سے اتر کر اس چیک کیا اور یہ معلوم کر کے میرا دل دھک سے رہ گیا پٹرول کی ٹنکی تقریباً خالی ہو چکی ہے تلاش کرنے پر نے ٹنکی کے پیندے میں ایک ننھا سا سوراخ پایا ج میں سے پٹرول ٹپک ٹپک کر تمام راستے گرتا آیا ت میں نے جلدی سے ایک چیونگم چبا کر سورا پر لگا دیا تاکہ جو تھوڑا سا پٹرول بچ رہا ہے وہ ضائع ہو۔ میری بدقسمتی دیکھئے کہ فالتو پٹرول کا ڈبا جو میں ا سفر میں ہمیشہ ساتھ رکھتا ہوں بالکل خالی تھا حالانکہ

نے گیراج والوں کو ہدایت کردی تھی کہ وہ یہ ڈبا پیٹرول سے پُر کردیں۔ مگر غالباً وہ بھول گئے تھے۔ خیر میں نے دوبارہ موٹرسائیکل اسٹارٹ کی میں جلدازجلد اس وحشت ناک علاقے سے نکل جانا چاہتا تھا مگر کیا معلوم قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ابھی بمشکل دو فرلانگ ہی گیا تھا کہ موٹرسائیکل نے جواب دے دیا۔ مجھے جو پریشانی اور وحشت ہوئی اس کا آپ صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔ میرے اندازے کے مطابق نزدیکی گاؤں کم ازکم چھ میل دور تھا۔ میں نے جیبی گھڑی نکال کر دیکھی، ریڈیم ڈائل کی چمکتی ہوئی سوئیوں نے مجھے بتایا کہ رات کے دس بجے ہیں چاروں طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا اور ہوا میں خنکی لحہ بہ لحہ بڑھتی جارہی تھی۔ میں نے اپنے چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پناہ لینے کیلئے کوئی مکان یا کسی دہقان کی جھونپڑی کو تلاش کرنے کی کوشش کی مگر اس قدر ہولناک سناٹے کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے صدیوں سے یہاں کسی انسان نے قدم نہیں رکھا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ دھند کا ایک گہرا بادل مجھے اپنے حلقے میں لینے کے لئے آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا ہے۔

یہاں تک پہنچ کر فرنیک میتھون نے چند لمحے توقف کیا اور پھر بولا۔

مجھے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس دھند کو دیکھ کر میری وحشت اور اضطراب میں اضافہ ہوگیا۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا۔ چاروں طرف دہشت زدہ کردینے والی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ جیسے میں صدیوں پرانے قبرستان میں کھڑا ہوں اور پھر دھند نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

میری طاقت جیسے کسی نادیدہ قوت نے سلب کرلی۔ یقین کیجیے ڈاکٹر صاحب میں اتنا بزدل نہیں ہوں اور نہ ہی میرے اعصاب اتنے کمزور ہیں لیکن اس دھند میں پھنس کر مجھے یہ یقین ہورہا تھا کہ اس میں کسی نادیدہ قوت کا دخل ہے پھر میں نے اپنے شانوں پر ایک زبردست دباؤ محسوس کیا اور مجھے یوں لگا جیسے یہ قوت مجھے آگے بڑھنے کے لئے مجبور کررہی ہے، میں نے جدوجہد کی کہ آگے نہ جاؤں مگر میری ایک نہ چلی۔

کسی سحرزدہ انسان کی طرح میں آگے بڑھتا چلا جارہا تھا۔ آگے خاردار جھاڑیوں کے درمیان مجھے ایک وسیع شگاف دکھائی دیا۔ اور جونہی میں شگاف میں داخل ہوکر دوسری جانب نکلا میرے شانوں پر رکھا ہوا ناقابل برداشت بوجھ اتر گیا میں نے دیکھا کہ وہ گہری دھند جسے دیکھ کر مجھ پر دہشت طاری ہوگئی تھی آہستہ آہستہ فضا میں تحلیل ہورہی ہے اور پھر اچانک مجھے اس ویرانے میں ایک مکان دکھائی دیا۔ یہ ایک سرائے کی طرز کا قدیم مکان تھا جس کے چاروں طرف خودرو جھاڑیاں اور لمبی گھاس بکثرت اگی ہوئی تھی۔ سرائے چونکہ بہت قدیم تھی اس لئے اس کی دیواروں کا رنگ سیاہ پڑ گیا تھا یا ممکن ہے تاریکی میں مجھے سیاہ نظر آیا ہو بہرطور بے بسی اور مجبوری کے عالم میں یہ مکان مجھے بہت بڑا اسہارا نظر آیا۔

مجھے یقین تھا کہ یہ مکان ضرور آباد ہوگا۔ بلاشبہ رات کافی بیت چکی تھی مگر پھر بھی مکان کا مالک یا جو کوئی بھی اس میں رہتا ہے، انسانی ہمدردی کے جذبے کے تحت میرے لئے دروازہ کھولنے میں کوئی ناراضگی محسوس نہیں کرے گا اور عین ممکن ہے مجھے گرما گرم کھانا بھی کھلا دے، کھانے کا خیال آتے ہی میری بھوک چمک اٹھی اور چندمنٹ پہلے مجھ پر خوف ودہشت کی جو کیفیت طاری ہوئی تھی رفتہ رفتہ دور ہوگئی انسان کی فطرت بھی عجیب ہوتی ہے۔

قریب پہنچ کر اس عمارت کے دھندلے نقوش مجھے واضح طور پر دکھائی دینے لگے، عمارت کے بڑے سے دروازے پر کچھ لکھا ہوا تھا جو میں کوشش کے باوجود نہ پڑھ سکا۔ عمارت کے چاروں طرف وہی پراسرار دھند پھیلی ہوئی تھی لیکن یہ دھند اپنی جگہ بالکل ساکت تھی۔

جی کڑا کرکے میں نے دروازے پر زور سے دستک دی اور انتظار کرنے لگا مگر اندر سے کوئی جواب نہ

آیا تب میں نے دروازے کو کئی مرتبہ کھٹکھٹایا۔ اب میں اپنے گردو پیش کی چیزیں بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ مجھے حیرت اس بات پر ہورہی تھی کہ شاندار عمارت کا مالک یا تو نہایت لاپرواہ شخص ہے یا اسے اپنے مکان سے باہر نکلنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا کہ اس کی حالت درست کرنے پر توجہ دے اور دفعتہً میری نگاہ عمارت کے اوپر لگے ہوئے ایک سفید پتھر پر گئی جس پر چند الفاظ کندہ تھے، پہلے میرا خیال تھا کہ شاید اس پر سرائے کا نام لکھا ہوا ہے لیکن اب بغور دیکھنے پر پتا چلا کہ اس پر عجب مضحکہ خیز الفاظ لکھے ہیں۔

''آپ کا سفر یہاں ختم ہوتا ہے۔''

ان احمقانہ الفاظ کا مطلب میری سمجھ میں نہ آسکا میں کافی دیر تک ان الفاظ پر غور کرتا رہا اور پھر اچانک میرے کانوں میں ایسی آواز آئی جیسے کوئی مکان کے اندر چل رہا ہو۔ پھر دائیں ہاتھ کی اونچی کھڑکی کی درازوں میں روشنی کی ہلکی ہلکی کرنیں مجھے دکھائی دیں اور فوراً ہی یہ روشنی غائب ہوگئی غالباً کوئی شخص دروازہ کھولنے آرہا تھا لیکن یہ سوچ کر کہ دستک دینے والا لوٹ گیا وہ روشنی بجھا کر اپنے بستر پر لیٹ گیا ہوگا۔ لیکن پھر میرے کانوں میں مکان کے اندر کسی کے آہستہ آہستہ چلنے پھرنے کی آواز آئی۔ آہستہ آہستہ یہ آہٹ مکان کے اندرونی حصے سے دروازے کی طرف آئی۔ پھر میں نے دروازے کی آہنی زنجیر کی کھڑکھڑاہٹ سنی اور پھر لکڑی کا بنا ہوا بلند و بالا دروازہ آہستہ آہستہ کھلنے لگا۔

سامنے ہی مجھے ایک آدمی کھڑا دکھائی دیا۔ اسے دیکھ کر میری ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی ایک سرد سی لہر سرایت کرگئی۔ میں بری طرح خوف زدہ ہوگیا۔ وہ پستہ قد اور چوڑے چکلے شانوں والا مضبوط جسم کا آدمی تھا۔ اس کا گول مٹول چہرہ دودھ کی مانند سفید اور چمکدار تھا۔ گنجی کھوپڑی اندھیرے میں سفید انڈے کی طرح چمک رہی تھی۔ اس نے سیاہ رنگ کا لمبا سا چغہ زیب تن کررکھا تھا۔ مگر ان تمام عجیب باتوں کے علاوہ جس چیز نے میرے جسم پر لرزہ طاری کردیا تھا وہ یہ تھی کہ اس شخص کے چہرے پر نہ بھنویں تھیں اور نہ آنکھیں۔ اس عجیب وغریب آدمی کے پیچھے ایک بے حد خوبصورت اور جاذب نظر عورت قدیم طرز کا شمع دان ہاتھ میں لئے کھڑی تھی۔ مرد جتنا بھدا اور بدصورت تھا عورت اتنی ہی حسین اور دلکش تھی، اس کا مرمریں جسم سڈول اور کافی اشتعال انگیز تھا اور سفید و سیاہ آنکھیں جن میں جھیل کی سی گہرائی تھی بے پناہ چمکیلی تھیں۔ سیاہ لباس میں وہ غضب ڈھا رہی تھی۔

مگر ان سب چیزوں کے باوجود اسکے چہرے پر ایک ایسی چیز بھی تھی جسے دیکھ کر میرے دل میں اس کے لئے شدید ترین نفرت اور کراہت کے جذبات پیدا ہوگئے نہ جانے کیوں؟ اس کے ہونٹ پتلے پتلے تراشیدہ ہونٹ، کبوتر کے خون کی مانند سرخ تھے جیسے وہ ابھی کسی کا خون پی کر آئی ہو۔ مجھے دیکھتے ہی اس عورت کی آنکھیں تارے کی مانند چمکنے لگی تھیں۔ میں نے ان سے اپنا حال بیان کیا اور ایک رات کے لئے پناہ لینے کی درخواست کی جب میں چپ ہوا تو ایک لمحہ انتظار کے بعد بغیر آنکھوں اور بھنوؤں والے پراسرار شخص نے اپنی لمبی لمبی سفید انگلیاں آگے بڑھائیں اور میرے چہرے کو ٹٹولنے لگا۔ شاید وہ میرے چہرے کے خدوخال سے یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ آیا میں کوئی بدمعاش تو نہیں اور پھر اس عورت نے جھک کر مرد کے کان میں آہستگی سے کہا۔ ''کافی ہے اسے اندر آنے دو۔''

میں نے اس کا یہ فقرہ سن لیا مگر اس کا مطلب میری سمجھ میں نہ آسکا فوراً ہی مرد نے ایک طرف ہٹ کر مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا اگرچہ میں اس مکان کی ہیبت اس میں رہنے والے ان دو افراد کی شکل وصورت لباس اور انداز گفتگو سے کسی قدر سراسیمہ ہوگیا تھا لیکن اب میرے لئے مکان میں داخل ہونے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ بصورت دیگر میں اپنے آپ کو اس ویران دلدلی علاقے کے رحم وکرم پر چھوڑ دیتا اور راہ گیر صبح میری اکڑی ہوئی لاش پاتے۔

بہرحال اپنے آپ کو ہمت دلاتا ہوا میں مکان

میں داخل ہوگیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ سفید چہرے والا شخص کدھر کو چلا گیا البتہ عورت نے مجھے اپنے پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور پہلی منزل کے ایک کمرے میں لے گئی۔ میں نے دیکھا کہ چلتے ہوئے اس کے پیروں سے ہلکی سی آہٹ بھی پیدا نہ ہوئی تھی۔

یہ مکان دو منزلہ تھا اور اس میں کئی بڑے بڑے کمرے تھے مجھے وہ جس کمرے میں لے گئی غالباً وہ سونے کا کمرہ تھا۔ کیونکہ کمرے کے ایک کونے میں ایک آرام دہ بستر موجود تھا۔ عورت کمرے میں داخل نہیں ہوئی بلکہ دروازے پر ہی رک گئی۔ اس کے لبوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ کھیل رہی تھی اس نے سر کے اشارے سے رخصتی سلام کیا اور واپس مڑنے ہی والی تھی کہ میں نے اسے روک لیا اور پوچھا کہ کیا کھانے کے لئے کچھ مل سکتا ہے؟ مگر اس عورت نے نفی میں گردن کو جنبش دی اور بجائے افسوس ظاہر کرنے کے اس کے سرخ سرخ لبوں پر مسکراہٹ کچھ اور زیادہ ہوگئی یہاں تک کہ مجھے اس کے سفید سفید چمکیلے دانت دکھائی دیئے جو غیر معمولی طور پر لمبے اور نوکیلے تھے پھر اس نے دروازہ بند کیا اور چلی گئی۔

اب میں کمرے میں تنہا تھا میں نے چاروں طرف بغور دیکھا یہ ایک بڑا سا کمرہ تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں ہاتھ منہ دھونے کے لئے ایک سنک بنا ہوا تھا۔ جس کے قریب ہی چند تولیے لٹک رہے تھے جنوبی دیوار کے ساتھ پرانی طرز کی کئی کرسیاں بھی ایک قطار میں رکھی ہوئی تھیں اور اس کے مقابل کی دیوار کے ساتھ ہی لکڑی کی بنی ہوئی ایک بے حد مضبوط اور بھاری الماری کھڑی تھی۔ کمرے کی مغربی دیوار کے کونے میں ایک ہی کھڑکی تھی جو مجھے بند دکھائی دی۔ اور اسی طرف وہ دروازہ تھا جس سے میں اندر داخل ہوا تھا۔

بستر کے قریب ہی ایک نہایت وزنی اور کئی فٹ اونچا لیمپ بھی رکھا ہوا تھا جس پر گرد کی موٹی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ اس کی زرد رنگ کی روشنی میں کمرے کی یہ تمام چیزیں مجھے دھندلی سی نظر آ رہی تھیں۔ مشرقی دیوار میں ایک چھوٹا سا دروازہ مجھے دکھائی دیا جس میں قفل لگا

انمول باتیں

☆ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ہر انسان کو رزق دینے کا وعدہ فرمایا ہے لیکن یہ وعدہ نہیں کیا کہ وہ ہر ایک کو بخش دے گا۔ پھر ہم کیوں رزق کے لئے فکر مند ہیں اور مغفرت سے بے پرواہ......؟

☆ قسمت آپ کے ہاتھوں میں نہیں لیکن کام آپ کے ہاتھ میں ہے۔ قسمت آپ کا کام نہیں سنوار سکتی لیکن کام قسمت سنوار سکتا ہے۔

☆ جب آپ روشنی میں ہوں گے تو ہر چیز آپ کے پیچھے چلے گی لیکن جب آپ اندھیرے میں داخل ہوں گے تو ہر چیز حتیٰ کہ آپ کا سایہ بھی آپ کا ساتھ چھوڑ دے گا۔ یہی زندگی ہے۔

☆ انسان کے اعمال ہی اس کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہیں۔ نیک نیتی سے کی جانے والی کوششیں کبھی ضائع نہیں ہوتیں۔ جو شکوہ کرتا ہے وہ اللہ کی تقسیم پر راضی نہیں۔

☆ غیبت کرنے سے صرف اس بندے کو فائدہ ہوگا جس کی غیبت کی جائے۔ کیونکہ اس سے اس کی نیکیاں بڑھیں گی اور غیبت کرنے والی کی کم ہوں گی۔

☆ حاسد اپنے سوائے کسی کا نقصان نہیں کرتا۔ ناکامی کی وجہ تقدیر نہیں۔ ہڈ حرامی بد نیتی اور بے عملی ہوتی ہے۔

(نوشین خان۔ کوٹ مظفر میلسی)

ہوا تھا میں نے ایک سوراخ سے اندر دیکھنے کی کوشش کی مگر کچھ دکھائی نہ دیا کہ اس کمرے میں کیا ہے کیونکہ اندر گھپ اندھیرا تھا۔

میں تھک کر چور ہو چکا تھا اور کپڑے دھول میں اٹ گئے تھے میں نے سوچا اگر اس وقت گرم گرم پانی سے ایک غسل ہو جائے تو کیا ہی اچھا ہو۔ مگر افسوس کے یہاں غسل کا کوئی انتظام نہ تھا میں نے سونے کی تیاریاں شروع کر دیں اور اپنا کوٹ اتارا تب مجھے اس عورت کا خیال آیا جو مجھے اس کمرے میں پہنچا کر غائب ہو گئی تھی۔ آخر اتنی حسین و جمیل عورت اس پراسرار اندھے شخص کے ساتھ اس ویران مکان میں کیونکر رہتی ہے؟ اور وہ شخص تو مجھے کسی اور ہی دنیا کی مخلوق معلوم ہوتا تھا یا پھر وہ کوئی بدروح ہے مگر اس بدروح کے ساتھ اس عورت کا کیا تعلق؟ چونکہ میں بری طرح تھک چکا تھا لہٰذا اس سوال کا جواب میرا ذہن بھی دینے سے قاصر رہا۔ ہاں میں نے یہ طے کر لیا کہ صبح ہوتے ہی اس عورت کا معاملہ حل کرنے کی کوشش کروں گا۔

بستر پر لیٹتے ہی ایک مرتبہ پھر میرے دل میں غسل کرنے کی خواہش نے جنم لیا اور پھر مجھے یاد آیا کہ ممکن ہے کہ وہ چھوٹا سا دروازہ جس میں تالا لگا ہے کسی غسل خانے کا دروازہ ہو۔ میں بستر سے اٹھ کر اس دروازے کے قریب گیا۔ دروازے کا جائزہ لیا اور پھر پوری قوت سے اسے کھولنے کی کوشش کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

میں ہمیشہ کئی قسم کی چابیوں کا گچھا اپنے ساتھ ضرور رکھتا ہوں چنانچہ میں نے وہ گچھا کوٹ کی جیب سے نکالا اور باری باری ہر چابی تالے کے سوراخ میں آزمانے لگا اور آخر طویل جدوجہد کے بعد ایک چابی سے تالا کھل ہی گیا۔ واقعی یہ غسل خانہ تھا مگر بے حد غلیظ تھا۔ خدا معلوم کتنے عرصے سے اس میں صفائی نہیں ہوئی تھی چونکہ لیمپ کی مدھم روشنی غسل خانے تک نہیں پہنچ سکتی تھی اس لئے میں نے موم بتی تلاش کرنے کی کوشش کی مگر جہد مسلسل کے باوجود مجھے موم بتی نہ ملی میں نے موم بتی کی تلاش بلاتاخیر ترک کر دی اور اندھیرے میں ہی غسل کرنے کا فیصلہ کر لیا اور پھر میں نے ٹنکی میں لگے ہوئے نل کا والو کھول دیا۔

بہت ہی مدھم روشنی میں، میں نے دیکھا کہ پانی کی ٹنکی سے دھار نکل کر غسل کے بڑے ٹب میں گری مگر کیسا پانی، گدلا اور سیاہ رنگ کا جس میں سے عجیب قسم کا تعفن پھوٹ رہا تھا اور پھر پانی کی ٹنکی سے خرخر کی عجیب آوازیں نکلنے لگیں۔ اب میں نے نہانے کے ٹب پر ایک نظر ڈالی یہ بھی قدیم طرز کا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے صدیوں سے اسے کسی نے استعمال نہیں کیا۔

پہلے تو میں نے سوچا کہ نہانے کا ارادہ ترک کر دینا چاہئے لہٰذا سوچا کہ کم از کم ہاتھ پیر ہی دھولوں جو بے حد گرد آلود تھے، یہ سوچ کر میں نہ پتلون اور موزے بھی اتار ڈالے اور انہیں بستر پر رکھ کر دوبارہ غسل خانے میں آ گیا میرے دل سے اب سارا ڈر اور خوف رخصت ہو چکا تھا میں سیٹی بجاتے ہوئے پانی کے ٹب میں بیٹھ گیا۔ میرے سر پر پانی کی ٹنکی سے دھار پڑنے لگی۔ مگر دفعتہً میں بری طرح دہشت زدہ ہو گیا۔ خدا کی پناہ یہ کیا لجلجی سی چیز تھی جو میرے بدن پر چپک رہی تھی۔ میں نے غور سے ٹب کی طرف دیکھا اور پھر میرے رونگٹے کھڑے ہوئے۔ ٹب کے نیچے اور چاروں کناروں لجلجا سا خون جما تھا۔ جسے دیکھ کر میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور میں اچھل کر دوسری طرف جا پڑا۔

اور جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو اسی مکروہ اور غلیظ ٹب کے پاس پڑے ہوئے پایا، میرے ہاتھوں اور پیروں میں خون جم کر سخت ہو گیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ یہ خون حیوانی نہیں انسانی ہے۔ اس اچانک اور لرزہ خیز دریافت نے میرا ذہن قطعی ماؤف کر دیا۔ چند لمحوں تک میں سر پکڑے اس طرح بیٹھا رہا۔ ایک ویران مکان کے اندر آدھی رات کو انسانی خون سے بھرے ٹب میں غسل کرنے کا حادثہ اتنا بھیانک اور دہشت انگیز تھا کہ اس نے میری تمام ذہنی اور جسمانی قوتیں سلب کر لی تھیں، میں یقیناً اسے ایک وہم یا خواب

سے زیادہ اہمیت نہ دیتا اگر خون سے جمے ہوئے لوتھڑے میرے بدن سے چپٹے نہ ہوتے۔

چند منٹ بعد میرے اعصاب کچھ پرسکون ہوئے تو میں اٹھا اور کمرے میں جا کر اپنے تولیے سے ہاتھ پیروں میں جما ہوا خون بمشکل صاف کیا۔ بلاشبہ یہ انسانی خون تھا اور بالکل تازہ، آخر یہ خون کہاں سے آیا؟ اور وہ بدنصیب جو مارا گیا اس کی لاش کہاں چھپائی گئی۔

نہ جانے میں کتنی دیر تک سوچتا رہا۔ دہشت سے میرے جسم کا ہر رونگٹا کھڑا ہو گیا تھا اور دل دھک دھک کر رہا تھا۔ میں نے اپنے کپڑے دوبارہ پہنے کیونکہ اب آنکھوں سے نیند غائب ہو چکی تھی اور ایک ایسی بھیانک جگہ جہاں انسانی خون بکھرا ہوا ہو بھلا کسی شخص کو کس طرح نیند آ سکتی ہے، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کون بدنصیب تھا جس کا خون بہایا گیا اور کس نے بہایا؟ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی موٹی تازی جونک نے اس کا خون چوسا ہو اور پھر اسے ٹب میں خارج کر دیا ہو۔

جونک؟ بجلی کی مانند میرے ذہن میں یہ خیال آیا اور پھر اس سفید چہرے والے اندھے کی خوفناک شکل میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگی۔ اف خدایا، کیا اس کی شکل جونک سے مشابہت نہیں رکھتی؟ خون میری رگوں میں جمنے لگا۔ اس عفریت کا اگلا شکار کون ہوگا؟ میرا جسم بری طرح کپکپانے لگا۔ میں اٹھ کر فوراً کھڑکی کی طرف بڑھا اور پوری قوت کے ساتھ میں نے کھڑکی کے دونوں پٹ کھولے۔ مگر باہر جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کھڑکی میں موٹی موٹی آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں میں فوراً وہاں سے دروازے کی طرف لپکا مگر بے سود کیونکہ دروازہ تو باہر سے مقفل کر دیا گیا تھا اور پھر میں دروازے کے قریب کھڑے ہو کر فرار ہونے کی ترکیب سوچنے لگا دفعتاً مکان میں پھر کسی کی نقل و حرکت کی ہلکی سی آواز میرے کانوں میں آئی جیسے کوئی دبے پاؤں چل رہا ہو۔ یہ آواز آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی یہاں تک کہ میرے کمرے کے دروازے کے برابر پہنچ کر اچانک تھم گئی۔ دہشت سے آنکھیں پھاڑے میں

دروازے کی طرف دیکھتا رہا اور پھر میں نے سنا کہ قفل میں چابی گھمائی جا رہی ہے۔ دروازے میں لگا ہوا گول دستہ آہستہ آہستہ گھومنے لگا اور دروازہ بغیر کسی آہٹ کے دو تین انچ کے قریب کھل گیا۔

فرنیک میتھون کی حالت غیر ہو گئی اور اس کا سانس زور زور سے چلنے لگا۔ ڈاکٹر پال نے فوراً برانڈی کا گلاس بھر کر اس کے منہ سے لگا دیا۔ برانڈی پینے کے بعد اس کی حالت درست ہوئی اور اس نے سلسلہ کلام دوبارہ شروع کیا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کمرے کے فرش نے میرے پیر جکڑ لئے ہیں اور میں کوشش بھی کروں تو اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا میرا مفلوج جسم پسینے سے تر ہو رہا تھا۔ آہ وہ ہیبت ناک اور بھیانک خاموشی مجھے ساری عمر یاد رہے گی، یہاں تک کہ خوف سے میرے دانت بجنے لگے۔ غسل خانے کی ٹنکی سے قطرہ قطرہ پانی ٹب میں گر رہا تھا اور اس کی آواز بڑی ہی ڈراؤنی تھی۔

دروازہ تھوڑا سا اور کھلا اور پھر میں اپنی قوت سے چلانے لگا۔ ”جاؤ...... یہاں جو کوئی بھی ہے فوراً چلا جائے ورنہ......“ اور پھر پاگلوں کی طرح کھلے ہوئے دروازے پر اپنا بوجھ ڈال کر اسے زور سے بند کر دیا، دروازے کے باہر قدموں کی چاپ ایک مرتبہ پھر سنائی دی جو آہستہ آہستہ دور ہوتی گئی اور پھر غائب ہو گئی میں دروازے کے ساتھ چمٹا ہوا بری طرح ہانپ رہا تھا اور جب مجھے پورا اطمینان ہو گیا کہ باہر کوئی بھی نہیں تو میں نے دروازہ کھولنا چاہا مگر وہ باہر سے بند تھا۔ اب مجھے ہر قیمت پر یہاں سے نکلنا تھا۔

مگر سوال یہ تھا کہ کیسے؟ عین ممکن تھا کہ وہ خون آشام جونک جو انسانی شکل میں تھی دوبارہ اس طرف کا رخ کرتی۔ اور پھر میری نظر کمرے میں رکھی ہوئی بھاری بھرکم لکڑی کی الماری پر پڑی میں نے بمشکل وہ بھاری الماری گھسیٹ کر دروازے کے ساتھ لگا دی۔ اس کام سے فارغ ہو کر مجھے اطمینان ہوا کہ اس دروازے سے اب کوئی آسانی سے نہ آ سکے گا۔ کمرے کا لیمپ

بدستور جل رہا تھا۔ میں نے جیب سے گھڑی نکال کر دیکھی پورے بارہ بجے تھے اور صبح ہونے میں ابھی کئی گھنٹے باقی تھے میں بستر پر لیٹ گیا اور صبح ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

مسہری کے اوپر چھت پر ایک بہت بڑا سا سائبان لگا ہوا تھا جیسا کہ پرانے زمانے میں بستر کی خوبصورتی کے لئے استعمال ہوتا تھا میں بستر پر لیٹا اس خوبصورت سائبان کو دیکھنے میں محو تھا کہ اچانک میری نگاہ ایک ایسی شے پر پڑی جسے دیکھ کر مجھے ہمیشہ کراہت ہوتی ہے۔ یہ ایک بہت بڑی مکڑی تھی جس نے میرے سر کے عین اوپر سائبان کے درمیان لگی ہوئی ایک لمبی اور نوکیلی آہنی سلاخ سے لیکر مسہری کے ایک کونے تک اپنا وسیع جالا تان رکھا تھا، میرا خیال تھا کہ سائبان کے درمیان لوہے کی یہ نوکیلی سلاخ شاید لالٹین یا لیمپ وغیرہ کے لٹکانے کے کام آتی ہوگی۔ مکڑی اب جالے کے عین درمیان میں بیٹھی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں بھی اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا یہاں تک کہ میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں اور پھر چند لمحوں بعد نیند نے مجھے آگھیرا۔

دفعتاً میری آنکھ کھل گئی اور مجھے یاد ہے کہ وہ بڑی مکڑی اپنے جالے سے گر کر میرے دائیں گال پر آن پڑی اور پھر رینگتی ہوئی گردن کی طرف بڑھی، دہشت زدہ ہو کر میں ایک طرف اچھلا عین اس لمحے لوہے کی بھاری نوکیلی سلاخ سنناتی ہوئی نکلی اور بستر میں کھب گئی اور ایک سیکنڈ کی بھی دیر ہو جاتی تو وہ سلاخ میرے سینے میں پیوست ہو چکی ہوتی مگر اس مکڑی نے میری جان بچالی اور تب میں نے محسوس کیا کہ سائبان کے درمیان اس آہنی سلاخ کو لگانے کا اصل مقصد کیا ہے۔؟

واقعی کسی کو سوتے میں قتل کرنے کی اس سے بہتر ترکیب کوئی نہیں ہوسکتی تھی۔ میں نے اس سلاخ کا معائنہ کیا جو بستر میں گڑی ہوئی تھی۔ سلاخ کی بناوٹ تیز دھار نیزے کی انی سے مشابہت رکھتی تھی انی جب گری تو مکڑی کا جالا ٹوٹ گیا اور یقیناً مکڑی کو پہلے سے پتا چل گیا ہوگا کہ سائبان کی سلاخ میں جنبش ہو رہی ہے اور پھر مکڑی خوف زدہ ہو کر میری گردن پر آن گری اور میں نیزے کی انی سے ہلاک ہوتے ہوتے بچا۔

اب میں کمرے کے وسط میں کھڑا اس مصیبت سے نجات پانے کے لئے کوئی تدبیر سوچ رہا تھا کہ دفعتہً میں نے دروازے کے باہر قدموں کی وہی چاپ سنی جو اس سے قبل میں دو مرتبہ پہلے بھی سن چکا تھا جلد ہی یہ ہلکی آواز غائب ہوگئی مگر کچھ دیر بعد ہی وہی آواز سنائی دی۔ اس مرتبہ یہ آواز دیوار کے قریب سے آئی تھی جس کے ساتھ مسہری لگی ہوئی تھی۔ اور پھر ایسی آواز سنائی دی جیسے دیوار کھرچی جارہی ہو اور اس میں سے کوئی چیز نکالی جارہی ہو اور پھر کوئی بٹن دبائے جانے کا کھٹکا بھی سنائی دیا۔

میں نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا دیوار میں ایک چھوٹا سا شگاف ظاہر ہو رہا تھا۔ جس میں سے موم بتی کی مدھم اور لرزتی ہوئی روشنی کمرے میں داخل ہو رہی تھی میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر لیمپ کو گل کر دیا میں نے کوشش کی کہ دہشت سے اپنے اعصاب کو بچائے رکھوں پھر میں لپک کر اس غسل خانے میں گھس گیا جہاں جاتے ہوئے میری روح فنا ہوتی تھی میں دروازے کی اوٹ سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

دیوار والا شگاف آہستہ آہستہ بڑا ہو رہا تھا اور پھر وہ اتنا چوڑا ہوگیا کہ ایک آدمی اس میں سے بخوبی نکل سکتا تھا اور پھر مجھے دو ہاتھ دکھائی دیئے۔ بھدے بدنما اور پنجے جیسے ہاتھ جو شگاف کو ٹٹول رہے تھے اور دوسرے ہی لمحے وہ بغیر آنکھوں والی مکروہ اور غلیظ جو انسانی شکل میں تھی اندر داخل ہوگئی۔ چند سیکنڈ توقف کے بعد وہ آہستگی سے بستر کی طرف بڑھا اور پھر میں نے دیکھا کہ دیوار کے شگاف کے پیچھے وہی خوبصورت چڑیل ہاتھوں میں شمع دان لئے کھڑی ہے اس کی شیطانی آنکھیں دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح سرخ تھیں جنہیں دیکھ کر میں کانپ اٹھا۔

آدمی اب بستر کے قریب پہنچ چکا تھا چند لمحے بستر ٹٹولنے کے بعد وہ اندھا شیطان بلی کی مانند غرایا اور پیچھے ہٹا اس کی آواز سن کر چڑیل بھی

اندر آ گئی اور اس اندھے شیطان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ''جلدی کرو...... غسل خانے میں......'' یہ سنتے ہی وہ مڑا اور دبے پاؤں غسل خانے کی طرف بڑھا اس مختصر سے عرصہ میں مجھے ہر قیمت پر اپنی بچانی تھی۔ میں نے چھت پر ٹنکی کی طرف دیکھا جہاں ایک بڑا سا شگاف تھا۔ برق رفتاری سے میں اوپر چڑھ گیا۔ شگاف اتنا بڑا تھا کہ میں تڑ مڑ کر اوپر چھت پر پہنچ سکتا تھا۔ اس شگاف تک پہنچتے پہنچتے میرا سانس پھول گیا اور میں ایک لمحہ دم لینے کے لئے رکا۔ تعفن اور سڑاند کا ایک سلسلہ مجھے اپنے نتھنوں میں گھستا ہوا محسوس ہوا، اور پھر وہ مرد اور عورت غسل خانے میں داخل ہوگئے پہلے عورت نے ٹب میں جھانکا اور کمر سیدھی کر کے کھڑی ہوئی اور اب میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں ایک کلہاڑی تھی۔

اس عورت نے مجھے دیکھا اور بھیانک انداز میں قہقہے لگانے لگی۔ ''نیچے اترو چڑیل نے چلا کر کہا اس کمرے میں رہنے کا معاوضہ تمہیں ادا کرنا پڑے گا ،اور جب میں نے کوئی حرکت نہ کی تو اس کا وحشیانہ پن عود کر آیا۔ اس نے شمع دان مرد کو تھمایا اور پھرتی سے پائپ پر چڑھنے لگی۔ میں نے جلدی سے اپنا جسم سوراخ کے اندر داخل کر لیا اور پھر میں نے بغیر سوچے سمجھے چھلانگ لگا دی۔

اف خدایا! میں گوشت اور ہڈیوں کے ایک عظیم ڈھیر پر گرا تھا۔ دس پندرہ لاشیں جن کے عضو عضو جدا تھے جانے کب سے پڑی سڑ رہی تھیں۔

میرے سامنے ایک تاریک راہداری تھی جس کے اندر میں اندھا دھند دوڑتا چلا گیا۔ عورت چیختی چلاتی ہوئی اب بھی میرے تعاقب میں تھی۔ میں لکڑی کے ایک زینے کے ذریعے دوسری منزل کی چھت پر پہنچ گیا تھا۔ اب میرے لئے فرار کی تمام راہیں مسدود ہوگئیں۔

خوبصورت چڑیل میری بے بسی سے فائدہ اٹھا کر مجھ سے دس فٹ کے فاصلے پر رک کر وحشیانہ انداز میں قہقہے لگانے اور کلہاڑی گھمانے لگی۔ میرا سارا جسم برف کی مانند سرد ہوگیا۔ وہ اپنے لمبے، نوکیلے سفید دانت پیستی ہوئی میری طرف بڑھ رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ ایک بلند بالا درخت کی چند شاخیں چھت سے دو تین فٹ کے فاصلے پر پہنچ کر رک گئی تھیں۔ میں نے دیوار پر ایک ہاتھ رکھ کر دوسرے ہاتھ سے ایک شاخ پکڑ لی اور دوسرے ہی لمحے وہ مجھ پر جھپٹ پڑی۔ اس نے کلہاڑی گھمائی اور دیوار پر رکھا ہوا میرا ہاتھ سن ہوگیا۔ درخت کی شاخ میرا بوجھ نہ سنبھال سکی اور تڑاخ سے ٹوٹ گئی۔ اور میں دھڑام سے جھاڑیوں پر گرا اور اٹھ کر پاگلوں کی طرح بھاگا اور ایک میل تک بھاگتا رہا آخر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو جس مقام پر سرائے تھی وہاں آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے پوری عمارت ان شعلوں کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔''

فرینک میتھون خاموش ہوگیا اس کی پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی۔

''اچھا تو سرائے میں آگ لگ گئی؟'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''مگر یہ آگ کس طرح لگی ہوگی؟''

''میرا خیال یہ ہے کہ عورت نے وہ شمع اندھے کے ہاتھ میں پکڑا دی تھی اور پھر کسی طرح اس کے سیاہ چغے نے شمع کی لو کو چھو لیا ہوگا۔ اندھے نے اپنے بچاؤ کی تدبیر کی ہوگی لیکن کمرے کے دوسرے سامان نے بھی آگ پکڑ لی ہوگی۔''

''بہرحال کہانی بہت دلچسپ ہے...... بشرطیکہ یہ سچی ہو......''

یہ سنتے ہی فرینک میتھون کا چہرہ فق ہوگیا اور اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ڈاکٹر کیا تم بھی مجھے پاگل سمجھتے ہو۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا دایاں ہاتھ کوٹ کی جیب سے نکال کر ڈاکٹر کی آنکھوں کے سامنے کر دیا۔

اس کی چاروں انگلیاں کٹی ہوئی تھیں اور ہاتھ پر بے ترتیبی سے بندھی ہوئی ڈھیلی پٹیوں پر تازہ خون کے قتلے جمے ہوئے تھے۔





موت کی جیت

ایس امتیاز احمد - کراچی

ہال کے چبوترے پر لیٹا ہوا مردہ اچانک اٹھ بیٹھا، اس کی گردن سے اس کا سرا جدا تھا، اس نے فرش پر اپنے قدم رکھے اور پھر چشم زدن میں اس نے پاس کھڑی خوبرو لڑکی کو دبوچ لیا کہ اتنے میں پھر......

صدیوں پرانی چاہت وخلوص کی عکاسی کرتی ایک عجیب ودلگداز دلفریب حقیقت

وہ جس وقت سے میوزیم سے ہو کر آئی تھی۔ اس کا ذہن عجیب بے چینی میں مبتلا تھا۔ میوزیم میں اس نے ایک ایسی انہونی بات محسوس کی تھی کہ وہ خود پر قابو نہ پاسکی۔ اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا اور پیشانی پسینے سے تر ہوگئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا ایسا بھی ممکن ہوسکتا ہے! ایک ایسی شخصیت جس کی موت کو تقریباً چار ہزار سال گزر چکے تھے۔ اسے کیسے جانی پہچانی محسوس ہوئی؟ ممکن ہے اس نے کسی ایسے شخص کو دیکھا ہو جس کی شکل وصورت میوزیم میں رکھی ہوئی ممی سے ہو بہو ملتی جلتی ہو؟ لیکن کب اور کہاں اس نے ایسے شخص کو دیکھا تھا۔

وہ بے چینی کے ساتھ اپنے کمرے میں ٹہلنے لگی اور پھر صوفے پر بیٹھ کر اس نے ان تمام لوگوں کی شکلوں کو اپنے ذہن میں لانا شروع کیا جو جو اس کے واقف کار تھے یا جنہیں وہ اکثر وبیشتر دیکھتی رہتی تھی۔ اس کے گھر

کے لوگ اس کے دوست، یونیورسٹی میں اس کے کلاس فیلو، اور اس کے علاوہ اسے پڑھانے والے استاد؟ لیکن کوئی بھی شکل ایسی نہ تھی جو میوزیم والی ممی سے تھوڑی بہت بھی مشابہت رکھتی ہو۔ پھر وہ کون تھا؟ اس کے چہرے کو دیکھ کر وہ یک دم ٹھٹک کیوں گئی تھی؟

صبح کے وقت جب وہ اپنے مقالہ کی تکمیل کے سلسلے میں مصری عجائب گھر میں داخل ہوئی تو سب سے پہلے اس کی نظر ایک ایسی ممی پر پڑی جو وہاں رکھی ہوئی سب چیزوں سے نمایاں اور الگ نظر آرہی تھی۔ وہ فراعنہ مصر کے زمانے کے ایک کاہن کی ممی تھی۔ جس کا سر اور تن الگ الگ ایک اونچی جگہ پر رکھے ہوئے تھے۔ کاہن کا گرانڈیل جسم ایک سرخ رنگ کے جبے میں لپٹا ہوا تھا۔ گردن کے گرد سبز رنگ کی ایک ریشمی شال تھی۔ چند فٹ کے فاصلے پر اس کا سر ایک بڑے طشت کے درمیان قرینے سے رکھا تھا۔ چہرے پر ہلکی ہلکی خوب صورت داڑھی بڑی بڑی کنول کی سی آنکھیں اور گورا چٹا رنگ۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کاہن کی ممی کے قریب پہنچی۔ اسے محسوس ہوا کہ ایک نامعلوم سی کشش اسے اس ممی کی طرف کھینچ رہی ہے۔

وہ جونہی اس کے قریب پہنچی تو اسے محسوس ہوا کہ کاہن کی بڑی بڑی آنکھوں میں زندگی ہے اور وہ اسے بڑے غور سے تک رہی ہیں۔ اسے یقین تھا کہ اس نے ان آنکھوں میں ہلکی سی حرکت بھی دیکھی تھی۔ جیسے وہ آنکھیں پلک جھپکی بھی ہوں۔ اور پھر۔ اس نے کٹے ہوئے سر کے لبوں پر ایک ایسی مسکراہٹ بھی دیکھی جس میں نہ جانے کتنے ہی بھید چھپے ہوں۔ وہ یک دم ٹھٹک کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے شدت سے یہ محسوس کیا کہ وہ چہرہ اس نے پہلے بھی کبھی دیکھا ہے۔ وہ اسے جانتی ہے اور شاید اسے پسند بھی کرتی ہے۔ لیکن وہ ہے کون؟ اسے اپنے قریب قدموں کی ہلکی سی چاپ سنائی دی۔ اس نے یک دم پلٹ کر دیکھا۔ اس کے قریب ہی میوزیم کا گائیڈ کھڑا تھا۔

''مس...... اس ممی میں آپ کی گہری دلچسپی کو دیکھتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ آپ اس کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا ضرور چاہتی ہوں گی۔'' اس نے بڑے ادب سے کہا۔

وہ قدرے چونک گئی اور بولی۔ ''ہاں۔ میں جاننا چاہتی ہوں...... کہ...... یہ کس کی ممی ہے؟''

''یہ کاہن طاس ہے جو شہنشاہ اخناطون کے زمانے میں بڑی شہرت کا مالک تھا۔ یہ بڑی پراسرار قوتوں کا مالک تھا۔ لیکن ایک روز شہنشاہ اخناطون اس سے خفا ہو گیا اور اسے اپنے سامنے قتل کروا کر اس کی لاش اور سر کو چورستے میں لٹکا دیا تاکہ دوسرے لوگوں کو عبرت حاصل ہو۔ اور آج بھی کاہن طاس کی لاش اپنے کٹے ہوئے سر کے ساتھ اس میوزیم میں اس دور کی یاد ہے۔''

''لیکن۔ کس جرم کی بنا پر اتنے بڑے کاہن کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا؟'' اس نے سوال کیا۔

''اس معاملہ میں یونانی تاریخ خاموش ہے۔ ممکن ہے وہ کوئی ایسا راز ہو جسے صرف کاہن طاس اور شہنشاہ اخناطون کے علاوہ کوئی تیسرا شخص نہ جانتا ہو اور طاس کی موت کے ساتھ ہی وہ راز بھی ہمیشہ کے لئے دفن ہو گیا ہو۔''

اس کی نظر ایک مرتبہ پھر ممی کے سر کی طرف گئی تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی اب اس ممی کے ہونٹ غصے سے بھینچے ہوئے تھے اور پیشانی پر کئی سلوٹیں نمودار ہو چکی تھیں۔ آنکھوں کی چمک غصے کی لالی میں تبدیلی ہو چکی تھی۔ وہ یک دم وہاں سے پلٹی اور تیز تیز قدم اٹھاتی میوزیم سے باہر نکل گئی۔

تمام دن وہ اس سرکٹی ممی کے بارے میں سوچتی رہی۔ آخر وہ کیا راز تھا جو کاہن طاس کی موت کا سبب بنا؟ پھر شہنشاہ اخناطون اس کی لاش اور کٹے ہوئے سر کو چورستے میں لٹکا کر اپنے لوگوں کو کون سی عبرت دلانا چاہتا تھا۔ لوگوں کو تو یہ علم ہی نہیں ہوگا کہ طاس کو کس جرم کی اتنی بڑی سزا دی گئی تھی، پھر وہ عبرت کس بات سے حاصل کرتے! وہ یک دم چونکی۔

اگر اسے وہ راز معلوم ہو جائے تو اس کا مقالہ ایک تاریخی حیثیت کا حامل ہوگا، وہ تاریخ کے ایسے سربستہ راز سے پردہ اٹھادے گی جس پر چار ہزار سال پرانی گرد کی تہیں جمی ہوئی ہیں۔

کاہن کے کٹے ہوئے سر میں چند ہی لمحوں میں جو اس نے تبدیلیاں دیکھی تھیں ان سے یہ بات ظاہر تھی کہ چار ہزار سال بعد بھی اس میں کوئی غیر مرئی قوت موجود ہے۔ اپنے دور کا وہ یقیناً ایک بہت بڑا انسان ہوگا۔ شہنشاہ اخناطون نے اس کی شہرت اور قابلیت سے جل کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا ہو۔

اس کا جی چاہا کہ وہ ایک مرتبہ پھر جا کر اس ممی کو غور سے دیکھے۔ لیکن خوف اور دہشت نے اس کے پاؤں پکڑ لئے۔ وہ کانپ گئی اور اسے پسینہ آ گیا۔

اپنے کمرے میں اسے شدید گھٹن کا احساس ہوا۔ اس نے اٹھ کر کھڑکیوں کو کھولنا چاہا تو اس نے دیکھا کہ وہ سب پہلے ہی سے کھلی ہوئی تھیں۔ وہ گھبرا کر یک دم کمرے سے باہر نکل آئی اور کوٹھی کے باہر لان میں گھومنے لگی۔ شام ہو چکی تھی۔ ہر طرف بجلی کے قمقمے روشن ہو چکے تھے۔ اپنے کمرے کی طرف اس نے دیکھا۔ وہ ابھی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ بہت سے خیالات اس کے دماغ میں گھوم رہے تھے۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ وہ یک دم نرم گھاس پر بیٹھ گئی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس پر اسے بڑی فرحت محسوس ہوئی اور وہ بے اختیار ہو کر گھاس پر ہی لیٹ گئی۔

نہ جانے وہ کب تک وہاں لیٹی رہی۔ اس کے نزدیک جھینگروں کی مسلسل آوازیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں لیکن ان سب سے بے نیاز اس کا دھیان کاہن طاس کی ممی کی طرف تھا۔ اس نے یک دم اپنے سر کو ایک جھٹکا دیا گویا وہ ان خیالات کو اپنے ذہن سے جھٹک کر پھینک دینا چاہتی تھی۔ جھینگروں کی تیز تیز آوازیں اب اسے بڑی ناگوار محسوس ہوئیں اور وہ تیزی سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

اس کے کمرے کا دروازہ بدستور کھلا ہوا تھا اور اندر گھپ اندھیرا تھا۔ اپنے کمرے کے اندر قدم رکھتے ہوئے نہ جانے کیوں اسے کچھ خوف محسوس ہوا۔ دروازے کے قریب قدرے رکی اور پھر اپنی بزدلی پر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اندر داخل ہو گئی۔ آخر یہ اسی کا کمرہ تو تھا جہاں وہ آ کر مکمل سکون محسوس کرتی تھی۔ اپنے ہی کمرے سے خوف کس بات کا؟

وہ چلتی ہوئی سوئچ بورڈ کے قریب پہنچی۔ اندھیرا ہونے کے باوجود اسے صحیح طور پر اندازہ تھا کہ سوئچ بورڈ کس جگہ پر ہے۔ سوئچ بورڈ کے قریب پہنچ کر جب اس نے بجلی آن کرنے کے لئے سوئچ بورڈ کی طرف ہاتھ بڑھایا تو نہ جانے کیوں اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اسے اندھیرے میں دو آنکھیں چمکتی ہوئی نظر آئیں۔ اسے پہچاننے میں ہرگز دقت محسوس نہیں ہوئی۔ یہ اسی کاہن طاس کی آنکھیں تھیں۔ اس نے گھبرا کر فوراً سوئچ دبا دیا۔ لیکن وہ یہ دیکھ کر انتہائی پریشان ہوئی کہ کمرے میں روشنی نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس اسے اپنے کانوں میں شائیں شائیں کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور پھر جیسے تاریکی میں کوئی اس کی طرف بڑھنے لگا۔ تیز ہوا کا ایک جھونکا آیا اور وہ خوفزدہ ہو کر دیوار سے جا لگی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے کمرے میں جیسے طوفان آ گیا ہو۔ میز پر رکھے ہوئے تمام کاغذات اڑ اڑ کر کمرے میں بکھر گئے۔ کسی نے اس کے چہرے پر دھپ کے ساتھ اپنا ہاتھ رکھ دیا تو اس کی چیخ حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ اور وہ بے ہوش ہو کر فرش پر گر پڑی۔

اسے ہوش آیا تو وہ اپنے بستر پر لیٹی تھی۔ اس کے چچا اس کے قریب ہی کرسی پر بیٹھے تھے۔ ماں باپ کے انتقال کے بعد اس کی پرورش اس کے چچا نے ہی کی تھی۔ چچی کے فوت ہونے کے بعد اس کے چچا نے اسے باپ بن کر ہی نہیں بلکہ ماں بن کر پالا تھا۔ اسے پڑھا لکھا کر اعلیٰ تعلیم بھی دلائی تھی۔ وہ اب ایم اے کے بعد ہسٹری میں پی ایچ ڈی کر رہی تھی۔ تمام قوموں کی تاریخ میں اسے سب سے زیادہ دلچسپی مصری تاریخ سے

تھی فراعنہ مصر کے عجیب و غریب اور دلچسپ واقعات پڑھ کر وہ بڑی خوش ہوتی تھی۔ ان واقعات کو پڑھتے وقت وہ بالکل اس طرح محسوس کرتی تھی جیسے وہ ایک ننھی منی بچی ہے اور اس کی دادی اماں اسے جنوں اور پریوں کی کوئی دلچسپ اور حیرت انگیز کہانی سنا رہی ہیں۔

مصری تاریخ کی ریسرچ کے سلسلے میں ہی اسے مصر آنا پڑا۔ اس کے دادا مرحوم اسے بتایا کرتے تھے کہ ان کے آباؤ اجداد بھی مصر سے ہی ہندوستان آئے تھے۔

مصر میں اس کے چچا کے ایک گہرے دوست اب بھی موجود تھے۔ اس لئے انہیں یہاں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی۔ اس کے چچا کے دوست نے ان دونوں کو اپنی کوٹھی کا ایک الگ حصہ رہائش کے لئے دے دیا تھا۔ وہ دن بھر مصر کے اہرام میں گھومتی اور پھر اپنے کمرے میں آ کر اپنا مقالہ مکمل کرتی رہتی۔ اسے یہاں آئے ہوئے تقریباً ایک ماہ ہوگیا تھا۔ اور اسے اپنے کمرے سے ایک گوناں گوں محبت ہوگئی تھی۔ وہ دن بھر گھومنے پھرنے کے بعد جب اپنے کمرے میں پہنچتی تو اسے بے حد اطمینان محسوس ہوتا۔

اس نے یک دم آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھا تو صبح ہو چکی تھی اور ہر چیز قرینے سے اپنی اپنی جگہ موجود تھی۔ یقیناً اس نے رات کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے۔ اس نے سوچا۔

''اب کیسی طبیعت ہے بیٹی؟'' اس کے چچا نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''کیا ہوا میری طبیعت کو؟'' اس نے اچانک سوال کیا۔

اس کے چچا نے متفکرانہ انداز سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور بولے۔ ''کل رات تمہاری چیخ کی آواز سن کر میں جب بھاگم بھاگ تمہارے کمرے میں پہنچا تو اندر مکمل تاریکی تھی اور کمرے کا پنکھا پوری رفتار سے چل رہا تھا۔ میں نے بتی جلائی تو عجیب منظر دیکھا۔ پنکھے کی تیز ہوا کی وجہ سے میز پر رکھے ہوئے تمہارے مقالے کے تمام کاغذات اڑ کر ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے اور تم دیوار سے پشت لگائے بے ہوش پڑی تھیں۔ تمہارے چہرے کے اوپر بھی ایک بڑا کاغذ چپکا ہوا تھا۔ جس نے تمہارا پورا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔''

☆......☆......☆

وہ دن بھر اپنا مقالہ لکھنے میں مصروف رہی۔ لیکن شام کو جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوئی تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ ہوگئی کہ اس نے پورے پندرہ صفحات میں کاہن طامس کی مردانہ حسن اور جوانی کی تعریف کے علاوہ اور کچھ نہ لکھا تھا۔ اپنے ذہن میں کاہن طامس کی وجاہت و عظمت کی چھپی ہوئی تصویر غیر ارادی طور پر وہ کاغذ پر منتقل کر چکی تھی۔ اس نے جھلا کر تمام کاغذات کو ریزہ ریزہ کر ڈالا اور پھر انہیں آتش دان میں پھینک دیا۔ ''آخر یہ کاہن طامس جسے قتل ہوئے چار ہزار سال گزر چکے تھے۔ اس کے ذہن پر اس بری طرح کیوں سوار ہوگیا تھا۔ اس میں آخر ایسی کون سی کشش تھی جو اسے بار بار اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔''

وہ اب اکثر اوقات پریشان رہنے لگی۔ چہرے کی سرخی زردی میں تبدیل ہونے لگی اور صحت مند جسم لاغر ہونے لگا تھا۔ اس کے سر میں ہر وقت ہلکا ہلکا سا درد رہنے لگا اور وہ بہت کم اپنے کمرے سے باہر نکلتی۔ رات کے وقت اکثر نامعلوم سے الفاظ بڑبڑاتی رہتی اس وجہ سے اس کے چچا کو بڑی فکر لاحق ہوئی۔ کئی ایک ڈاکٹروں کو دکھایا گیا۔ لیکن کوئی بھی اس کے مرض کی صحیح تشخیص نہ کر سکا۔ آخر ایک روز اس کے چچا نے بڑے پیار سے اس سے اس کی اداسی کی وجہ پوچھی۔

''بیٹی۔ تم جانتی ہو کہ میں نے تمہاری کن مصیبتوں سے پرورش کی ہے۔ تم میری زندگی کی واحد امید ہو۔ ڈاکٹروں کی تشخیص کے مطابق تمہیں کوئی مرض نہیں ہے۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تم روز بروز گھلتی جارہی ہو۔ بیٹی میں تمہارا چچا ہی نہیں تمہارا ہمدرد دوست بھی ہوں۔ مجھے بتاؤ۔ تمہیں آخر ایسا کون سا دکھ ہے جو

تمہیں اندر ہی اندر کھائے جارہا ہے، مجھے بتاؤ تمہارے اس دکھ کا آخر علاج کیا ہے؟'' اور اس کے چچا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

چچا کی حالت دیکھ کر اسے بڑا دکھ ہوا اور وہ بولی۔ ''چچا جان مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ میں تو خود حیران ہوں کہ مجھے یہ کیا ہوتا جارہا ہے؟''

''تم رات کو اکثر کچھ الفاظ بڑبڑاتی ہو۔ کیا تمہیں ڈراؤنے خواب نظر آتے ہیں؟'' اس کے چچا نے اسے کریدا۔

''ڈراؤنے خواب؟'' اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ ''وہ خواب نہیں ہوتے چچا جان۔''

''تو پھر کیا ہے؟'' چچا نے سوال کیا۔

''کوئی شخص ہر روز مجھے آکر کہتا ہے کہ تمہیں تمہارا محبوب بلا رہا ہے۔ وہ اپنے خوب صورت محل میں تمہارا منتظر ہے تم میرے ساتھ چلو۔ لیکن میں اس کے ساتھ جانے سے انکار کردیتی ہوں۔ وہ ضد کرتا ہے تو میں اسے شدت سے جھڑک دیتی ہوں، وہ منت سماجت کرتا ہے لیکن میں کوئی پروا نہیں کرتی۔ آخر وہ مایوس ہو کر کہتا ہے۔ ایک روز تمہیں آنا پڑے گا۔ تم اس کے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ وہ تمہیں ایک روز ضرور اپنے ساتھ لے جائے گا۔ کیونکہ اس نے تمہیں حاصل کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔''

میں چیخ اٹھتی ہوں۔ ''نکل جاؤ یہاں سے میں کسی کو نہیں جانتی۔''

اس کا چچا بغور اس کے چہرے کو تکتا رہا اور اچانک پوچھا۔ ''کون ہے وہ جو اپنے خوب صورت محل میں تمہارا انتظار کررہا ہے؟''

''میں نہیں جانتی۔'' وہ بولی اور پھر چچا سے سوال کیا۔ ''چچا جان۔ یہ کاہن طامس کون ہے؟''

''کاہن طامس؟'' اس کے چچا کا چہرہ یک دم زرد ہوگیا اور خوف کی پرچھائیاں لہرانے لگیں۔ ''بیٹی یہ ایک بدروح کا نام ہے۔ اپنے بزرگوں سے میں نے سنا

ہے کہ وہ شہنشاہ اخناطون کے زمانے میں ایک عبادت گاہ میں کاہن تھا۔ بہت سی بدروحیں اس کے قبضے میں تھیں۔ وہ ان بدروحوں کے ذریعے مصر کی ہر اس خوب صورت اور جوان لڑکی کو اپنی عبادت گاہ میں بلالیتا تھا۔ جسے وہ پسند کرلیتا تھا، شہنشاہ اخناطون نے اسے قتل کرواکر اس کی لاش چوراستے پر لٹکوادی تھی۔ لیکن تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہی ہو؟؟"

"میں نے اس کی ممی یہاں میوزیم میں دیکھی ہے، اس کی شکل وصورت دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ وہ کوئی برا آدمی نہیں تھا۔ شہنشاہ اخناطون نے اسے کسی اور وجہ سے قتل کروایا ہوگا۔" وہ نہایت سنجیدگی سے بولی۔ گفتگو کرتے وقت اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

"لیکن بیٹی" اس کا چچا پریشان ہوگیا۔ "مصر کی تاریخ اور ہمارے آباؤاجداد نے ہمیں اس کے بارے میں وہی انکشاف کیا ہے۔ جو میں تم سے کہہ رہا ہوں۔"

"نہیں چچا جان۔ اس کا کٹا ہوا سر دیکھ کر مجھے خوف ضرور محسوس ہوتا ہے لیکن اس کے چہرے پر جو معصومیت ہے اور اس کی آنکھوں میں جو محبت کی چمک ہے وہ مجھے بار بار اپنی طرف کھینچتی ہے۔"

"بیٹی!!!" اس کا چچا جیسے چیخ اٹھا۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ ایک شیطان کے چہرے پر معصومیت کا کیا سوال! اور ایک بدروح کی آنکھوں میں محبت کی چمک کے کیا معنی؟ ضرور تم پر اس بدروح کا اثر ہوگیا ہے۔" وہ زاروقطار روتے ہوئے چیخے۔ "وہ تمہیں ہم سے چھین لینا چاہتا ہے۔ میری بچی۔ خدا کے لئے تم اس شیطان کا خیال اپنے دل سے نکال پھینکو۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں۔ تمہارا باپ اور تمہارے آباؤاجداد کی روحیں تم سے خفا ہوجائیں گی۔" وہ بغور اپنے چچا کی حالت کو دیکھتی رہی وہ اس کے سامنے رو رو کر بری طرح گڑگڑا رہے تھے۔

"میں تو اپنے مقالے کے لئے صرف وہ راز جاننا چاہتی ہوں جو کاہن طامس کے قتل کا باعث بنا۔ ورنہ مجھے اس کی ذات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" وہ بولی۔ "اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں اپنا مقالہ ادھورا چھوڑ دوں تو میں۔"

"کاہن طامس کے قتل کا باعث وہی ہے جو تاریخ میں لکھا ہے۔ تم اپنے مقالے میں بھی وہی کچھ لکھو۔ اور اب میں اس جگہ ایک پل بھی ٹھہرنا نہیں چاہتا۔ میں آج اور اسی وقت یہاں سے واپس چلا جانا چاہتا ہوں۔ تم فوراً تیاری مکمل کرلو۔" اس کے چچا جلدی جلدی بولے۔

"یہاں سے جانا چاہتے ہیں آپ؟" وہ بڑبڑائی۔ پھر جیسے کسی نے اس کے پاؤں پکڑ لئے۔

"ٹھیک ہے چچا جان' ہمیں یہ جگہ چھوڑ ہی دینی چاہئے۔" اس نے محسوس کیا کہ کوئی اس کے پاؤں اپنے ہاتھوں سے سہلا رہا ہے پھر اس نے محسوس کیا کہ آنسو کے دو قطرے ٹپک کر اس کے پاؤں پر گرے اور کوئی اپنے گال اس کے پاؤں کے ساتھ رگڑ رہا ہے۔ کوئی اس سے رک جانے کی التجا کررہا تھا۔ لیکن کون؟ اس انوکھے لمس نے اس کے پاؤں میں گویا زنجیر ڈال دی۔ وہ یہاں سے کیسے جاسکتی ہے؟

"میں صرف آج کی رات اور رکنا چاہتی ہوں۔ کل صبح ہم یہاں سے ضرور چلے جائیں گے۔" وہ اپنے چچا سے بولی۔

"جیسے تمہاری مرضی۔ لیکن کل صبح کا سورج طلوع ہوتے ہی ہم اس منحوس جگہ سے دور ہوں گے۔ تم آرام کرو، میں کل صبح کے جہاز سے واپسی کے لئے ٹکٹوں کا انتظام کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس کے چچا کمرے سے باہر چلے گئے۔

دو قطرے اس کے پاؤں پر اور ٹپکے۔ اور کسی نے اس کے پاؤں چھوڑ دیئے، یہ اس کی شکرگزاری کی علامت تھی۔

رات ہوتے ہی وہ ایک عجیب سی ذہنی کشمکش کا شکار ہوگئی۔ وہ یہاں سے جانا ضرور چاہتی تھی۔ لیکن اس کا دل نہ جانے کیوں مٹھی میں آیا جارہا تھا۔

آج کاہن طامس کا کٹا ہوا سر بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے آکر غائب ہوجاتا تھا۔ وہ یہ سوچ سوچ کر پاگل ہوئی جارہی تھی کہ آخر اس کی اپنی ذات کا اس سر کٹے کاہن سے کیا تعلق ہوسکتا ہے جسے مرے ہوئے بھی چار ہزار سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ وہ اپنے چچا سے یہ کہہ چکی تھی کہ وہ کل صبح اس جگہ کو چھوڑنے کے لئے تیار ہے۔ لیکن۔ کیا کل صبح وہ یہاں سے جاسکے گی؟ اور اگر وہ یہاں سے چلی گئی تو پھر کبھی کاہن طامس کا خوب صورت وجود جو صدیوں سے بے جان پڑا تھا نہ دیکھ سکے گی۔

آخر اس صدیوں پرانی ممی میں ایسی کون سی بات ہے کہ وہ اس کے لئے دیوانی ہوئی جارہی ہے۔ اس کے چچا کا کہنا تھا کہ ''کاہن طامس بری روحوں پر قابض تھا اور ان کے ذریعہ حسین وجمیل لڑکیوں کو اپنے معبد میں بلاکر اپنی ہوس کا نشانہ بناڈالتا تھا۔''

لیکن اس کا دل یہ گواہی دیتا تھا کہ کاہن ایسا نہیں تھا یہ سراسر اس پر بہتان تھا۔ اور پھر اچانک اس کے ذہن میں ایک عجیب سوال ابھرا۔ ''اگر کاہن اتنی ہی پراسرار قوتوں کا مالک تھا تو اسے شہنشاہ اخناطون قتل کروانے میں کیسے کامیاب ہوسکتا تھا؟ وہ اپنی قوتوں سے ہمیشہ زندہ رہ سکتا تھا۔ اور اگر وہ اپنی روحانی قوت کی بنا پر آج بھی زندہ ہوتا تو انہی بدروحوں کے ذریعہ وہ کبھی کا اسے بھی اٹھوا کر اپنے پاس بلالیتا۔'' اس نے یہ فیصلہ کرلیا کہ یہ جگہ چھوڑنے سے قبل وہ ایک مرتبہ کاہن طامس کی ممی کو ایک نظر دیکھنے میوزیم میں ضرور جائے گی۔

رات کے دو بج چکے تھے۔ پورا شہر محو خواب تھا۔ باہر مکمل سکوت تھا جیسے وہ کوئی شہر نہ ہو بلکہ قبرستان ہو۔ لیکن وہ جاگ رہی تھی۔ وہ اپنے بستر پر لیٹی مسلسل چھت کی طرف تک رہی تھی۔

اچانک فضا میں پراسرار سی سرگوشیاں ہونے لگیں۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے کھڑکیوں کے پردوں کو سرسرا رہے تھے۔ آہستہ آہستہ ہوا میں شدت پیدا ہونے لگی اور چند ہی لمحوں بعد اچھی خاصی تیز ہوا چلنے لگی۔ وہ آہستگی کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بڑے سکون کے ساتھ اس نے فرش پر اپنے نرم و نازک سفید سفید پاؤں رکھ دیئے اور اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ پھر وہ ننگے ہی پاؤں دروازے کی طرف اس طرح بڑھنے لگی۔ جیسے وہ چل نہ رہی ہو بلکہ ہوا میں اڑ رہی ہو۔ ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ اور آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں۔ وہ اسی حالت میں دروازے سے باہر نکل گئی۔ اس کے لمبے سیاہ بال اس کی پیٹھ پر لہرا رہے تھے۔

ہوا نے اب ایک چھوٹے سے طوفان کی صورت اختیار کرلی تھی اور فضاؤں میں سسکیوں کی آوازیں گھل مل جاتیں، ماحول بے حد پراسرار ہورہا تھا۔ طوفان بڑھ رہا تھا اور اس کے قدم بھی تیزی کے ساتھ میوزیم کی طرف بڑھ رہے تھے۔

وہ تاریکیوں کو چیرتی ہوئی جوں جوں میوزیم کے قریب ہورہی تھی طوفان میں شدت آرہی تھی۔ وہ جب میوزیم سے چند گز کے فاصلے پر تھی تو طوفان اتنا شدید ہوچکا تھا کہ آگے بڑھتے وقت وہ لڑکھڑا کر ایک پتھر پر گر پڑی جس سے اس کا ایک پاؤں زخمی ہوگیا۔ لیکن وہ اس سے بے پرواہ ہوکر پھر آگے بڑھنے لگی۔ اس کے قریب ہی ایک درخت طوفان کی زد میں آکر جڑ سے

چوہا

ست جھگڑالو بیوی اپنے شوہر پر برس رہی تھی۔ وہ بے چارہ مسکین صورت بنائے ہوئے چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا۔ بیوی بولے جارہی تھی۔

''بزدل کہیں کے، تم انسان ہو کہ چوہے؟''

شوہر عاجزی سے گڑگڑایا۔ ''بیگم میں انسان ہوں، چوہا ہوتا تو تم اس وقت تھر تھر کانپ رہی ہوتیں۔''

(رانا اشفاق۔ کراچی)

اکھڑ کر ایک مہیب شور کے ساتھ چند قدم کے فاصلے پر گر پڑا۔ ایک لمحے کی تاخیر ہو جاتی تو وہ اس کے نیچے آ کر یقیناً پس جاتی۔

میوزیم کی عمارت تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی اس کے قدم بڑے دروازے کی طرف بڑھنے لگے اور وہ ایک راہداری میں سے گزر کر بڑے دروازے تک جا پہنچی۔ خلاف توقع بڑے دروازے پر کوئی دربان موجود نہ تھا۔ وہ جونہی دروازے کے قریب پہنچی تو دروازہ خود بخود کھلتا چلا گیا۔ وہ اندر داخل ہوئی۔ اور تیز تیز چلتی ہوئی اس جگہ جا پہنچی جہاں کاہن طامس کی ممی کو اس نے دیکھا تھا لیکن یہ دیکھ کر اس کی ہلکی سی چیخ نکل گئی کہ ممی اپنی جگہ پر موجود نہ تھی۔ اس کا سر جس طشت میں پڑا تھا وہ طشت بھی خالی تھا۔ وہ پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ وہ دوسرے کمروں کی طرف بڑھی، وہ جس کمرے کے دروازے کے قریب بھی پہنچتی کوئی غیر مرئی قوت خود بخود دروازہ کھول دیتی۔ اس نے محسوس کیا جیسے کوئی برابر اس کے آگے آگے چل رہا تھا اور دروازے کے قریب پہنچتے ہی اسے کھول دیتا تھا۔ اس نے تمام کمروں میں گھوم پھر کر دیکھا لیکن اسے ممی کہیں نظر نہ آئی۔ وہ پلٹ کر پھر اس جگہ آ کھڑی ہوئی جہاں اس نے پہلے روز ممی کو دیکھا تھا۔ اسے وہاں کھڑے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ اس نے اپنے قریب قدموں کی چاپ سنی، اس نے یکدم پلٹ کر دیکھا۔

اس کے قریب سر سے پاؤں تک سیاہ لبادہ اوڑھے کوئی شخصیت موجود تھی۔ وہ اسے دیکھ کر چیخنا ہی چاہتی تھی کہ اسے آواز آئی۔ ''گھبراؤ نہیں! میری ذات سے تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے، میں تمہارا دوست ہوں۔'' یہ آواز اسی سیاہ پوش ہستی کی تھی۔ اسے پھر آواز آئی۔

''میں جانتا ہوں تم اس وقت یہاں کیوں آئی ہو؟

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کی زبان گنگ ہو چکی تھی۔ آواز پھر آئی۔ ''تم غالباً یہ دیکھ کر پریشان ہو کہ یہاں پر رکھی ہوئی کاہن طامس کی ممی کہاں غائب ہو گئی؟'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''کاہن طامس کی ممی کو فی الحال یہاں سے کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا ہے۔''

''لیکن کہاں؟'' وہ یکدم پوچھ بیٹھی۔

''کہیں بھی، لیکن تمہیں چار ہزار سال پرانی اس ممی سے کیا دلچسپی ہے؟'' سیاہ پوش نے اچانک اس سے سوال کیا۔ وہ اس کا کوئی جواب نہ دے سکی۔ ایک قہقہہ میوزیم ہال میں گونجا۔ ''میں جانتا ہوں تم اس ممی میں کیوں اتنی دلچسپی لے رہی ہو۔''

''کیوں؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے پوچھا۔

''اس لئے...... کہ...... تم...... وہ راز جاننا چاہتی ہو جو کاہن طامس کے قتل کا باعث بنا۔''

''ہاں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

دوبارہ ایک قہقہہ گونجا۔ ''وہ راز تمہیں میں بتا سکتا ہوں۔''

''تم؟؟؟'' وہ سوالیہ نشان بن گئی۔

''ہاں! کیونکہ میں اس راز سے اچھی طرح واقف ہوں۔''

وہ اب اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔ یہ سیاہ پوش ہستی وہی گائیڈ تھا جو پہلے روز اسے میوزیم میں ملا تھا۔ لیکن اسے یہ سیاہ لبادہ اوڑھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ شاید وہ اسے خوفزدہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ جان کر کہ اس سے ایک گائیڈ مخاطب تھا۔ اس کا خوف دور ہو چکا تھا۔ وہ بولی۔ ''میں تمہاری مشکور رہوں گی گائیڈ اگر تم مجھے ان واقعات سے آگاہ کر دو، جن کے تحت کاہن طامس کو شہنشاہ اخناطون نے قتل کروا کر اس کی لاش چوراہے پر لٹکوادی تھی اور پھر کئی روز تک وہ عبرت کا نشان بنی لٹکتی رہی۔''

''یقیناً میں تمہیں ان سب باتوں سے آگاہ کر دوں گا۔ کیوں کہ میرے علاوہ انہیں اور کوئی نہیں جانتا۔'' وہ کہنے لگا۔

''آج سے چار ہزار سال پہلے شہنشاہ اخناطون جو فراعنہ مصر میں سب سے جلیل القدر اور بارعب حاکم تھا مصر کے سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ اس کے دور میں بے

شمار معبد تھے جن پر کاہنوں کا قبضہ تھا۔ اکثر کاہن اپنے معبدوں میں کنواری لڑکیوں کی عصمت لوٹ لیا کرتے۔ طامس بھی اس دور میں ایک بڑے معبد کا کاہن تھا۔ کاہن طامس ڈیل ڈول اور شکل و شباہت کے لحاظ سے اس دور کا حسین ترین شخص تھا۔ مصر کی زیادہ تر دوشیزائیں اس پر فریفتہ تھیں۔ وہ اس کے پاس معبد میں پہنچ کر طرح طرح کے عشووں سے اسے لبھانے کی کوشش کرتیں، لیکن وہ ایک ایسا پتھر ثابت ہوا تھا جس پر حسن کا کوئی حربہ کامیاب نہ ہوسکا تھا۔ اسی وجہ سے اس کی شہرت مصر کے ہر گلی کوچے میں پھیل گئی۔ شہنشاہ اخناطون نے اس کی شہرت سے متاثر ہوکر اسے ایک روز اپنے دربار میں بلایا تو وہ بھی مردانہ وجاہت کے اس حسین و جمیل مجسمے کو دیکھ کر عش عش کر اٹھا۔"

یہ کہہ کر گائیڈ کچھ دیر کے لئے رکا اور پھر بولا۔ "شہنشاہ اخناطون نے اسی روز اسے کاہن اعظم کا لقب دے دیا اور اسے مصر کے سب سے بڑے معبد کا انچارج بنادیا۔ کاہن طامس نے ستاروں کے علم پر عبور حاصل کیا اور دن رات عبادت میں مصروف رہنے لگا۔ مصر کی حسین دوشیزائیں اب بھی اس کے گرد بھنوروں کی طرح منڈلاتی تھیں۔

آخر کاہن طامس نے حسن کی دیوی افرودیتی کی عبادت شروع کی۔ شب و روز کی اس عبادت سے افرودیتی بہت خوش ہوئی اور اس سے پوچھا۔ "اس کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟"

"کاہن طامس نے اس کے سامنے اپنا سر جھکا دیا اور بولا۔ "اے حسن کی دیوی افرودیتی۔ میرا اپنا وجود ہی میرا دشمن ہوگیا ہے۔ میرے جسم کی خوب صورتی کو دیکھ کر بے شمار کنواری لڑکیاں مجھے اپنی عصمتوں کے گوہر نذر دینا چاہتی ہیں لیکن میں کسی برائی کی دلدل میں دھنسنا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں تم میرے پاس اس دوشیزہ کو بھیج دو جسے تم نے صرف میرے لئے بنایا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میں وہ چیز ہمیشہ کے لئے حاصل کرلوں جو میرے ہی وجود کا نصف حصہ ہے۔"

یہ سن کر افرودیتی مسکرائی اور بولی۔ "تمہارے لئے جس دوشیزہ کا انتخاب میں نے کیا ہے وہ مصر کی حسین ترین لڑکی ہے۔ تم اسے دیکھو گے تو اپنے وجود کے حسن کو بھول جاؤ گے..... لیکن....."

"لیکن.....؟ لیکن کیا.....!" کاہن طامس چلایا۔

"لیکن وہ دوشیزہ تمہیں اس زندگی میں حاصل نہ ہوسکے گی۔"

"کیوں؟" وہ چیخ اٹھا۔

"یہ تمہیں صرف وقت بتائے گا۔" جواب ملا۔

اور اسی شام اپنی چند خادماؤں کے ہمراہ ایک دوشیزہ اس سے ملنے اس کے معبد میں آ پہنچی۔ وہ اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ حسن اور خوب صورتی کی اس سے زیادہ دلکش تصویر اس نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔ اس کے کان میں سرگوشیاں سی ہونے لگیں۔ یہی وہ دوشیزہ ہے جسے افرودیتی نے تمہارے لئے پیدا کیا ہے۔ یہی تمہاری منزل ہے۔"

وہ بے اختیار اس کی طرف بڑھنے لگا۔ اور بالکل اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ انتہا کی بے خودی کے عالم میں وہ اسے تکتا رہا۔ چند لمحوں بعد اس کے کانوں میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ "ہم چاہتے ہیں تم اپنے ستاروں سے ہماری قسمت کا حال پوچھ کر بتاؤ۔" دوشیزہ اس سے مخاطب تھی۔

وہ یک دم چونک پڑا۔ "آپ کی قسمت کا حال؟"

ایک خادمہ آگے بڑھی اور بولی۔ "کاہن طامس آپ شہزادی زولہ سے مخاطب ہیں۔"

"شہزادی زولہ؟" وہ یک دم سٹپٹا گیا۔ "شہنشاہ اخناطون کی اکلوتی بیٹی؟"

اس نے ادب سے جھک کر شہزادی کو تعظیم دی اور بولا۔ "میں آج ہی ستاروں سے آپ کے مستقبل کے بارے میں پوچھ کر آپ سے کل عرض کردوں گا۔"

اس نے دیکھا کہ شہزادی زولہ بھی اسے یک ٹک دیکھنے میں محو تھی۔ سر سے پاؤں تک ایک ٹھنڈی لہر

اس کے جسم میں سرایت کرگئی۔ اور ان چند لمحوں میں ہی ان دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کرلیا۔"

یہ کہہ کر گائیڈ خاموش ہوگیا اور بے چینی کی سی کیفیت میں ادھر سے ادھر پھرنے لگا۔ خاموشی کافی طویل ہوگئی تھی۔ اس کا ذہن کلبلانے لگا۔ "پھر کیا ہوا۔ پھر کیا ہوا۔" آخر وہ پوچھ بیٹھی۔ "پھر کیا ہوا گائیڈ؟"

"پھر؟" وہ یک دم رک گیا۔ "پھر شہزادی زولہ اور کاہن طامس ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے۔

شہزادی بلا ناغہ رات کو اس سے ملنے اس کے معبد میں آتی اور تمام رات اس کے پہلو میں گزار دیتی۔ ان دونوں کی محبت اس قدر عروج پر پہنچ چکی تھی کہ وہ ایک لمحے کی جدائی بھی برداشت نہ کرسکتے تھے۔ اور پھر......"

گائیڈ بے چین ہوگیا اور تیزی سے میوزیم ہال میں گھومنے لگا۔ آخر وہ آ کر اس جگہ رک گیا جہاں وہ لمبی میز پڑی تھی جس پر کاہن طامس کی لاش پڑی تھی اور اب خالی تھی۔ وہ شدت جذبات سے مغلوب ہوکر بولا۔ "پھر ایک روز شہنشاہ اخناطون کو ان کی لافانی محبت کا علم ہوگیا۔ وہ غصہ سے تھر تھر کانپنے لگ گیا۔ وہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ ایک کاہن اس کی بیٹی کو اپنی محبت کے جال میں پھنسالے گا۔

وہ رات ایک انتہائی بھیانک تھی جب حسب معمول شہزادی زولہ کاہن طامس سے ملنے اس کے معبد میں آئی اور اس کے پہلو میں بیٹھ کر اپنی محبت کا نذرانہ پیش کرنے لگی۔

اچانک دھڑام کی آواز کے ساتھ معبد کا دروازہ کھلا اور ان کے سامنے شہنشاہ اخناطون کھڑا تھا۔ دونوں خوف سے تھر تھر کانپنے لگے۔

شہزادی زولہ کو شہنشاہ نے بالوں سے کھینچ کر کاہن طامس سے الگ کیا اور دوسری صبح طامس کو بھرے دربار میں قتل کردینے کا حکم صادر کردیا۔

کاہن طامس کو جب قتل گاہ میں لایا گیا تو شہنشاہ بھی وہاں موجود تھا، شہزادی زولہ ایک کھڑکی میں سے اپنے محبوب کو قتل ہوتے دیکھ رہی تھی۔ جب جلاد نے اس کی گردن مارنے کے لئے اس کا سر جھکایا تو وہ ایک دم کھڑا ہوکر شہنشاہ اخناطون سے مخاطب ہوا۔

"شہنشاہ۔ تم شاید یہ سمجھتے ہو کہ مجھے قتل کروا کر تم میری زندگی اور میری لافانی محبت کو ختم کردو گے۔ لیکن یہ تمہارا وہم ہے۔ میں نے افرودیتی کی اتنی عبادت کی ہے کہ میرے جسم سے میری روح الگ ہوجانے کے بعد بھی میں زندہ رہوں گا۔ میرے جسم کا حسن اور جوانی اسی طرح برقرار رہے گی۔ اور میں اس وقت کا انتظار کروں گا۔ جب میں اپنی کھوئی ہوئی محبت کو دوبارہ حاصل کرلوں گا۔"

پھر کاہن طامس چیخ کر بولا۔ "شہزادی زولہ کو مجھ سے الگ کرکے آج تم جیتے ہو لیکن وہ وقت بھی ضرور آئے گا جب آخر کار جیت میری ہوگی۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا سر جھکا دیا۔ جلاد نے تیز دھار کلہاڑے کا ایک بھرپور وار کیا اور کاہن طامس کا سر لڑھکتا ہوا دور جا گرا۔ اس کی گردن سے خون کا فوارہ نکلا جس سے قتل گاہ کا تمام فرش سرخ ہوگیا۔ کھڑکی کے پیچھے شہزادی زولہ کی چیخ گونجی اور وہ بے ہوش ہوکر گر پڑی۔"

گائیڈ یہاں تک کہہ کر پھر خاموش ہوگیا۔ وہ نہایت محویت سے اس کی گفتگو سن رہی تھی۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "اس کے بعد شہنشاہ نے کاہن طامس کی لاش اور کٹا ہوا سر مصر کے سب سے معروف بازار کے چوراہے پر لٹکا دیا جہاں کئی روز تک وہ لٹکا رہا۔"

وہ راز جو اب تک تاریخ کے اوراق سے پوشیدہ تھا وہ جان چکی تھی۔ اسے خوشی تھی کہ گائیڈ نے اسے ایسا انمول راز بتا دیا تھا جو اس کے مقالے کے لئے بڑا درجہ رکھتا تھا۔ وہ اب یہاں سے واپس جانا چاہتی تھی۔ لیکن اس کا دل چاہتا تھا کہ کسی طرح طامس کے کٹے ہوئے سر کو ایک نظر دیکھ لے۔ وہ بھی قدم اٹھانا ہی چاہتی تھی کہ گائیڈ کی آواز آئی۔ "اور پھر وہ دن بھی آن پہنچا جب کاہن طامس نے اپنی کھوئی ہوئی محبت کو دوبارہ حاصل کرلیا۔"

"وہ کیسے؟" اس نے پلکیں اٹھا کر سوال کیا۔

"شہزادی زولہ۔" وہ بولا۔ "چار ہزار سال بعد اسے پھر مل گئی۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے سر سے سیاہ نقاب اٹھا دیا، اس کے سامنے کاہن طاس زندہ کھڑا تھا۔

وہ چیخنا چاہتی تھی۔ لیکن نہ چیخ سکی۔ وہ بھاگنا چاہتی تھی لیکن اس کے پاؤں میں کسی انجانی طاقت نے زنجیریں ڈال دیں۔ کاہن طاس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ جسے وہ اب تک گائیڈ سمجھ رہی تھی وہ حقیقتاً کاہن طاس ہی تھا۔

وہ خوفزدہ سی ہو کر پیچھے ہٹنے لگی۔

وہ بولا۔ "شہزادی زولہ کیا تم نے اپنی اس محبت کو قطعی فراموش کر دیا ہے جو تم کبھی مجھ سے کرتی تھیں؟"

"شہزادی زولہ؟" وہ بڑبڑائی۔ "لیکن میں تو......"

"تم وہی شہزادی زولہ ہو۔ آج سے چار ہزار سال پہلے میں نے تم سے ہی محبت کی تھی۔ شہزادی ہم ایک ہی جسم کے دو حصے ہیں۔ یہ دو حصے اب الگ نہیں رہ سکتے۔ میں نے شہنشاہ اخناطون کے سامنے یہ عہد کیا تھا کہ ایک نہ ایک روز اپنی محبت، اپنی شہزادی کو ضرور حاصل کرلوں گا۔ اور آج...... آج میں نے تمہیں پالیا ہے۔"

وہ اب بالکل اس کے قریب آچکا تھا۔ وہ پیچھے ہٹتی ہوئی دیوار سے جا لگی۔ کاہن طاس کی آنکھوں میں ایک عجیب سحر تھا جو اسے مدہوش کئے جا رہا تھا۔ وہ ان آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ کاہن طاس نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑ لیا اور اپنے ہونٹ اس کے خوب صورت اور گلابی ہونٹوں پر ثبت کر دیئے۔ بوسہ اس قدر طویل تھا کہ وہ جھلا اٹھی۔ خود کو چھڑانے کے لئے اس نے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کئے لیکن ان بازوؤں کی گرفت سے خود کو آزاد نہ کرا سکی۔

اس نے اس کے سر کے لمبے بالوں کو پکڑ کر ایک زوردار جھٹکا دیا تا کہ اس کے چہرے کو اپنے چہرے سے دور ہٹا سکے۔ کھٹاک کی ایک آواز پیدا ہوئی اور کوئی وزنی چیز اس کے ہاتھوں میں لہرانے لگی۔

وہ ایک بہت ہی دہشت ناک منظر تھا۔ کاہن طاس کے سر کے بالوں کا ایک گچھا اس کی انگلیوں میں بھنچا ہوا تھا اور اس کا کٹا ہوا سر اس کے ہاتھ کے نیچے لہرا رہا تھا۔ گردن سے خون کا فوارہ جاری تھا۔ اور سر سے بھی خون کی سرخ سرخ بوندیں ٹپک رہی تھیں...

ایک زوردار چیخ میوزیم کے ہال میں گونجی اور وہ بے ہوش ہو کر کاہن طاس کے بازوؤں میں جھول گئی۔

دھڑام کی آواز کے ساتھ میوزیم کا دروازہ کھلا اور چند لوگ بھاگتے ہوئے اندر آگئے۔ ان آدمیوں میں کاہن طاس کے بازوؤں میں جھولتی ہوئی دوشیزہ کا چچا بھی تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ کاہن طاس کے بے سر کے دھڑ نے دوشیزہ کو اپنے بازوؤں پر اٹھایا۔ اس کا سر دوشیزہ کے ہاتھ میں لہرا رہا تھا۔ وہ اسے اٹھائے آگے بڑھا، اس کے قدم ایک تہہ خانے کی طرف اٹھنے لگے۔

دوشیزہ کا چچا چیخ اٹھا۔

"ٹھہرو کاہن طاس! ٹھہرو۔"

ایک پل کے لئے کاہن طاس رکا۔ "مجھے معاف کر دو طاس۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھ سے میری بیٹی نہ چھینو۔" اس نے التجا کی۔

"اب تم وہ شہنشاہ اخناطون نہیں ہو کہ مجھ سے میری محبوبہ کو چھین سکو۔" آواز پھر گونجی۔ "دیکھو میں نے چار ہزار سال بعد تمہاری بیٹی کو پھر حاصل کرلیا ہے۔ میں جیت گیا ہوں اخناطون، میں جیت گیا ہوں۔" خوفناک قہقہہ پھر گونجا اور بے سر کا دھڑ تہہ خانے میں اتر گیا۔

سب لوگ بھاگ کر تہہ خانے کے قریب پہنچے۔ لیکن اچانک ایک وزنی پتھر کہیں سے لڑھکتا ہوا آیا اور آکر تہہ خانہ کے منہ پر جم گیا۔

وہ پتھر آج بھی اس میوزیم میں تہہ خانے کے اوپر جما ہوا ہے جسے انتہائی کوشش کے باوجود بھی کوئی طاقت وہاں سے نہیں ہلا سکی۔





موت کے پنجے

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

رات کا اندھیرا ہر سو پھیلا تھا کہ اچانک ایک عورت نے مکڑی کا روپ دھار کر چشم زدن میں ایک شخص کے چہرے کو اپنی ٹانگوں سے احاطہ کرلیا پھر دیکھتے ہی دیکھتے اپنی ٹانگیں اس شخص کی گردن میں ہوگئیں اور پھر……

پل پل اور لمحہ لمحہ خوف وہراس کے سمندر میں غوطہ زن دل دہلاتی تحیر انگیز شاہکار کہانی

ہنری جارج کا ذہن آج کل عجیب وغریب خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اسے ہر وقت یہ احساس ہونے لگا تھا کہ وہ کچھ بھولتا جارہا ہے۔ اس کی یادداشت ختم ہوتی جارہی ہے…… وہ سڑک پر جارہا ہوتا کہ اچانک اسے خیال آتا کہ اس نے ٹائی غلط جگہ باندھی ہے، وہ رک جاتا اور ٹائی کی ناٹ کھول کر…… اپنی کمر کے گرد لپیٹنے لگتا…… اس دوران اسے اس چیز کا احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ ایک عجیب وغریب حرکت کررہا ہے…… لوگ اس کی اس حماقت پر دل کھول کر قہقہے لگاتے تو پھر وہ چونکتا تھا…… کہ وہ کیا کرچکا ہے۔

رات کو جب وہ بستر پر لیٹتا تو ایک دم اٹھ بیٹھتا اور باہر ٹہلنا شروع کردیتا۔

ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ اس نے باہر نکل کر دوڑنا شروع کردیا۔ وہ پاگلوں کی طرح دوڑتا جارہا تھا کہ ایک کانسٹیبل نے اسے روک کر اس طرح بھاگنے کی وجہ پوچھی تو وہ بہت حیران ہوا۔ اس نے اپنے اردگرد نظر ڈالی تو خود کو سڑک پر کھڑے پایا۔

اس ''مصیبت'' سے وہ اس قدر تنگ آچکا تھا کہ اس نے باہر نکلنا چھوڑ دیا کہ نہ جانے کس وقت دماغ سوچنا چھوڑ دے اور وہ کوئی الٹی سیدھی حرکت کر بیٹھے۔

آج چھٹی کا دن تھا وہ کمرے میں بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیوں نہ آؤٹنگ کی جائے۔ مگر پھر اپنی عجیب وغریب عادات کا خیال کرکے اس نے اپنے ارادے کو ختم کردیا۔

پھر دس بجے کے قریب مسز والٹن اس سے ملنے آئیں۔ یہ ایک بھدے سے نقش ونگار رکھنے والی بھاری بھرکم عورت تھی۔ جس کی آنکھیں گول گول سی تھیں اور گال اتنے پھولے ہوئے تھے کہ ان میں آنکھیں دھنسی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

ہنری کی ملاقات مسز والٹن سے چند دن پیشتر بڑے عجیب طریقہ سے ہوئی تھی۔

وہ چڑیا گھر میں جانوروں کے پنجرہ کے قریب کھڑا تھا کہ اچانک اسے اپنے ساتھ ہی کسی کے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی، ہنری نے پلٹ کر دیکھا تو ایک عورت کو اپنی جانب متوجہ پایا تھا۔

وہ کہہ رہی تھی۔ ''کتنی عجیب بات ہے کہ نام تو چڑیا گھر رکھا ہے...... مگر......'' وہ فقرہ چھوڑ کر خاموش ہوگئی۔

''مگر کیا؟'' ہنری نے پوچھا۔

''منتظمین کہتے ہیں کہ یہاں پر ہر قسم کا جانور ہے...... لیکن ایک عام سی چیز موجود نہیں ہے۔'' عورت نے بیزاری سے کہا۔

''وہ کون سی؟'' ہنری کی دلچسپی عورت میں بڑھتی جارہی تھی۔ ''میرے خیال میں تو یہاں پر دنیا کا ہر جانور موجود ہے۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہاں کوئی مکڑی نہیں ہے۔'' عورت نے تیزی سے کہا۔ اس کی گول گول آنکھیں ہنری پر مرکوز تھیں۔ ''مکڑی......''

ہنری کے لہجے میں حیرت تھی۔

''جی ہاں مکڑی......'' عورت نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''دیکھئے نا...... مکڑی بھی جانور ہے لیکن انتظامیہ نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔ اگر میں یہاں ملازم ہوتی تو مکڑیوں کے لئے ایک بہترین شیشے کا جار مہیا کرتی...... اس میں مکڑیاں ہوتیں...... ہر قسم کی۔''

ہنری عجیب کیفیت سے دوچار تھا...... کیا کہے اور کیا نہ کہے...... ویسے وہ سوچ رہا تھا کہ عورت کو مکڑی سے زیادہ لگاؤ ہے۔

بہرحال وہ ٹالتا ہوا بولا۔ ''جی ہاں یقیناً یہ انتظامیہ والوں کی غلطی ہے انہیں یہاں مکڑی کا اضافہ کرنا چاہئے۔''

''اوہ...... معاف کیجئے گا۔'' وہ عورت چونکتے ہوئے بولی۔ ''ہم دونوں اتنی دیر سے باتیں کئے جارہے ہیں لیکن تعارف ابھی تک ہوا ہی نہیں...... مجھے مسز والٹن کہتے ہیں۔''

''اور مجھے ہنری جارج۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ پھر کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ گھر آگیا۔ اس کے بعد وہ تقریباً مسز والٹن کو بھول گیا تھا۔

مگر آج اچانک جب وہ اس کے گھر کے دروازے پر آپہنچی تو وہ چونک پڑا۔ چونکنا لازمی بات تھی کیونکہ اسے یاد تھا کہ اس نے ملاقات کے وقت مسز والٹن کو اپنا ایڈریس نہیں دیا تھا...... لیکن اب وہ یہاں کس طرح پہنچ گئی؟ بہرحال اس نے سر کو جھٹک دیا۔

ہنری نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود چائے بنانے کے لئے کچن کی طرف چلا۔ تقریباً دس منٹ بعد جب وہ ڈرائنگ روم میں چائے کی ٹرے لئے داخل ہوا۔ تو مسز والٹن کارنس کے ساتھ والی الماری کے پاس کھڑی ہوئی تھی اور الماری کے پیچھے کچھ تلاش کررہی تھی۔

''کیا بات ہے مسز والٹن۔'' ہنری نے چائے کی ٹرے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

وہ کوئی جواب دیئے بغیر الماری کے پیچھے کچھ تلاش کرتی رہی...... چند لمحوں بعد وہ مایوسی سے سر کو جھٹکتی ہوئی کرسی کی جانب بڑھی۔

ہنری سوالیہ نگاہوں سے مسز والٹن کو دیکھ رہا تھا۔ ''ایک مکڑی تھی جسے پکڑنے کی کوشش کررہی تھی۔'' مسز والٹن نے ہنری کی نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔

''آپ مکڑی پکڑنے کی کوشش کررہی تھیں۔'' وہ مذاقاً ہنسا۔

''جی ہاں...... مگر افسوس کہ وہ ہاتھ نہ آسکی۔'' مسز والٹن کے لہجے میں مایوسی تھی۔ چہرہ پر بھی اداسی کے سائے پھیل چکے تھے۔

''آپ کو مکڑی سے بہت زیادہ دلچسپی ہے...... کیوں......؟'' وہ مسکراتا ہوا بولا۔ ''اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ

ہماری ملاقات کا موجب بھی شاید ایک مکڑی ہی بنی تھی۔"

"جی ہاں مسٹر ہنری..... آپ اسے میرا مشغلہ کہہ سکتے ہیں۔" مسز والٹن نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"بڑا عجیب مشغلہ ہے۔" ہنری کے لہجے میں تعجب تھا۔

"آپ کو اس بات پر حیرت ہوگی کہ جو لمحے میں مکڑیوں کی رفاقت میں گزارتی ہوں وہ بہت..... خوشگوار ہوتے ہیں۔"

مسز والٹن کے لہجے میں مسرت عیاں تھی۔ "حیرت ہے..... ویسے میرے خیال میں آپ اس شہر میں واحد شخصیت ہوں گی جو اس قسم کا یعنی مکڑیوں کی رفاقت کا مشغلہ رکھتی ہیں۔" ہنری جارج کی آنکھوں میں حیرت کے سائے لرز رہے تھے۔

جواباً مسز والٹن صرف مسکرا کر رہ گئی۔

ہنری جارج چائے بنانے میں مشغول ہوگیا۔ اس بات سے وہ اب بھی ڈر رہا تھا کہ کہیں اس کی ذہنی رو بہک نہ جائے۔ اور کوئی اوٹ پٹانگ بات مسز والٹن کے لئے حیرت بن جائے۔

اس نے چائے کی پیالی مسز والٹن کے سامنے رکھ دی وہ دونوں خاموشی سے چائے پیتے رہے۔ چند وقفوں کی خاموشی کے بعد وہ بولی۔ "یقیناً آج آپ کی چھٹی کا دن ہے۔"

"جی ہاں۔" ہنری نے مثبت انداز میں سر ہلایا۔

"تو پھر کیوں نہ کہیں آؤٹنگ کی جائے..... دن اچھا گزر جائے گا۔"

"جیسا آپ مناسب سمجھیں۔"

وہ جلد ہی راضی ہوگیا۔ اس بات کے متعلق تو اس کا دل پہلے ہی راضی تھا۔ گیارہ بجے کے قریب وہ دونوں باہر نکل آئے۔ موسم کچھ خاص خوشگوار نہ تھا۔ کسی بھی لمحے بارش کے ہونے کے امکانات تھے۔ اسی خطرے کے پیش نظر وہ "رین کوٹ" بھی ساتھ لے چکا تھا۔ وہ پیدل ہی ایک جانب بڑھے چلے جا رہے تھے۔

چلتے چلتے وہ چھوٹی نہر کے خوبصورت پل پر آ گئے۔ نہر کا پانی تیزی سے بہہ رہا تھا۔ یہ ایک خوبصورت نظارہ تھا۔ نہر کے ساتھ ہی گھاس کا ایک میدان تھا وہ دونوں ایک جگہ گھاس پر بیٹھ گئے اور بہتے ہوئے پانی کو دیکھنے لگے۔

"مسز والٹن....." ہنری ہلکے سے بولا۔

"یس مسٹر ہنری۔"

"کیا آپ مجھے اپنے عجیب و غریب شوق کے متعلق کچھ بتانا پسند کریں گی۔"

"مثلاً..... یہی کہ آپ نے مکڑی کو کیوں پسند کیا۔ آپ کو اس سے کیونکر لگاؤ ہے۔ اس بات کی کوئی وجہ ہوگی۔"

"ظاہر ہے....." مسز والٹن سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "بات دراصل یہ ہے مسٹر ہنری جارج کہ مجھے مکڑی پسند ہے۔ اس کی ٹانگوں کا پھیلا ہوا جال۔ گول، گول آنکھیں..... یہ سب کچھ میرے لئے بہت کشش انگیز ہیں۔" مسز والٹن کی آنکھوں میں خوشی کی چمک تھی جیسے مکڑی کا ذکر اس کے لئے باعث خوشی ہے۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"مسٹر ہنری..... شاید آپ یقین نہ کریں کہ میرے پاس دو ہزار کے قریب مکڑیاں ہیں۔"

"دو ہزار۔" ہنری نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔ پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ "مگر..... مگر مسز والٹن..... کیا آپ کو کبھی کراہیت کا احساس نہیں ہوتا۔"

"نہیں..... کبھی نہیں۔" وہ نفی میں سر کو جنبش دیتے ہوئے بولی۔ ہنری خاموش رہا۔ پھر چند لمحوں بعد مسز والٹن ہی ہنری سے مخاطب ہوئی۔

"کیوں نہ آپ میرے ساتھ چل کر ان مکڑیوں کو دیکھیں..... میں نے ہر نسل اور ہر جگہ کی مکڑی جمع کی ہوئی ہے۔"

"ضرور..... ضرور..... اب تو میرا اشتیاق بڑھ رہا ہے۔"

"تو پھر واپسی پر پروگرام رہا۔" مسز والٹن بولی۔

"بالکل....." ہنری نے تائیدانہ انداز میں کہا۔

"مسز والٹن آپ کو ہر نسل اور ہر جگہ کی مکڑیاں منگوانے کے سلسلہ میں کافی دشواریاں پیش آئی ہوں گی۔"

"ہاں ہنری..... ایسا ہوا تھا..... میں نے اپنا کافی

سرمایہ مکڑیوں پر خرچ کیا ہے۔" مسز والٹن کے لہجہ میں فخر تھا۔

ان میں اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ آدھا گھنٹہ گزر گیا لیکن وہ اپنی باتوں میں مگن رہے۔ پھر بارش شروع ہونے پر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"کیوں نا ایک ایک کپ کافی ہو جائے۔ اس طرح سردی کا احساس کچھ کم ہو جائے گا۔" ہنری نے تجویز پیش کی۔

"کوئی حرج نہیں۔" مسز والٹن اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے بولی۔ پھر وہ دونوں قریب ہی بنے ہوئے ایک کافی ہاؤس کی جانب چل دیئے۔

بارش جو کہ پہلے آہستہ ہو رہی تھی، اب آہستہ آہستہ وہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ جلد ہی وہ کافی ہاؤس پہنچ گئے۔ انہوں نے کافی ہاؤس میں تقریباً ایک گھنٹہ گزارا۔ اور اس ایک گھنٹہ میں بارش بھی ختم ہو چکی تھی۔

"اب کیا پروگرام ہے؟" ہنری بولا۔

"پروگرام....." مسز والٹن اپنے گول گول دیدے گھماتی ہوئی بولی۔ "ٹائم پکچر کا ہے اس لئے بہتر یہی ہے کہ پکچر دیکھ لی جائے۔" پھر ہنری نے بھی رضا مندی ظاہر کر دی۔

وہ دونوں کافی ہاؤس سے باہر نکل آئے۔ ایک ٹیکسی کو رکوا کر وہ اندر بیٹھ گئے..... ہنری نے ٹیکسی ڈرائیور کو پکچر ہاؤس چلنے کو کہا۔ جہاں آج کل ایک جاسوسی قسم کی پکچر لگی ہوئی تھی۔

پکچر ہاؤس پہنچ کر ہنری نے دو ٹکٹ حاصل کئے اور اندر ہال میں جا بیٹھے۔ جلد ہی پکچر شروع ہو گئی اور وہ بھی ایک عجیب اتفاق تھا کہ فلم میں بھی ایک مکڑی کا چکر چل نکلا۔ ٹائٹل میں خوف ناک طرز کا میوزک تھا اور اسکرین پر ایک مکڑی دکھائی جا رہی تھی جو اپنے وسیع جال میں ادھر ادھر پھر رہی تھی۔

پکچر ختم ہونے پر جب وہ باہر نکلے تو مسز والٹن بولی۔" ان پکچر بنانے والوں کو مکڑی کے متعلق زیادہ معلومات نہیں۔ ایک جگہ ولیم (فلم کے ایک کردار کا نام) کہتا ہے کہ مکڑی ایک گھناؤنی فطرت کی حامل ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔" مسز والٹن نے بڑے جوش وخروش سے کہا۔

"تو کیا تمہارے خیال میں مکڑی ایک پاکیزہ شے ہے۔" ہنری جارج ہونٹوں پر طنزیہ تبسم پھیلاتے ہوئے بولا۔

"تم نے شاید کبھی مکڑی کو قریب سے نہیں دیکھا ورنہ ایسا نہ کہتے۔" مسز والٹن نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"اچھا چھوڑو ان باتوں کو....." ہنری ٹالتا ہوا بولا۔ کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ مسز والٹن کا موڈ بگڑنے لگا ہے۔ وہ ایک بس میں سوار ہو گئے۔

اب تاریکی پھیلنے لگی تھی سورج غروب ہو رہا تھا۔ دن کی روشنی تیزی سے پھیلتی ہوئی تاریکی میں مدغم ہو رہی تھی پرندے اپنے اپنے آشیانوں کی جانب پرواز کر رہے تھے۔ سڑک پر موٹروں، کاروں اور بسوں کی ہیڈ لائٹ آڑی ترچھی لکیریں بنا رہی تھیں۔

مسز والٹن کا گھر فاریسٹ کالونی کی طرف تھا۔ جو شہری مضافات سے کافی ہٹ کر تھا۔

بس فاریسٹ کالونی کے اسٹاپ پر رکی۔ وہ دونوں اترے..... اور ایک جانب بڑھنے لگے۔

"وہ رہا میرا مکان۔" مسز والٹن ایک جانب ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ہنری نے ہاتھ کی سمت دیکھا..... کچھ دور ایک کافی بڑے مکان کا ہیولہ سا نظر آ رہا تھا۔

جلد ہی وہ دونوں اس مکان تک پہنچ چکے تھے۔ مسز والٹن دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ پھر جونہی ہنری نے مسز والٹن کے پیچھے اندر داخل ہونے کے لئے قدم رکھا۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس کا دماغ اس کا ساتھ چھوڑے جا رہا ہے وہ گھبرا گیا اور رک گیا۔

"کیا بات ہے ہنری..... تم رک کیوں گئے۔" مسز والٹن نے اسے رکتے دیکھ کر کہا۔

"شاید میں اپنی کار کو لاک کرنا بھول گیا ہوں۔" وہ ذہن پر زور دیتا ہوا بولا۔

"کار..... مگر ہم تو یہاں بس پر آئے ہیں۔"

"نہیں..... میں کار لایا ہوں۔" وہ یقین دلانے والے لہجے میں بولا۔

مسز والٹن حیرت سے اس کے چہرے کو تک رہی تھی۔ ہنری پلٹا..... اور اپنی کار کو تلاش کرنے کے لئے ادھر ادھر نگاہیں دوڑانے لگا..... لیکن..... وہاں کوئی کار ہوتی تو نظر آتی..... وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ بس دور دور تک تاریکی اور سناٹے کا راج تھا۔

ہنری مکان میں داخل ہوا اور بولا۔

"واقعی میں اپنی کار نہیں لایا تھا۔"

مسز والٹن کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ رینگ گئی۔ ایسی مسکراہٹ جس میں پراسراریت تھی..... کسی مکڑی کے وسیع جال کی طرح۔

"آیئے۔" وہ ہنری کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتی ہوئی بولی۔ ہنری اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ ڈیوڑھی میں سیم کی وجہ سے بو سی پھیلی ہوئی تھی۔

ایک بند دروازے کے سامنے وہ رکتے ہوئے بولی۔ "پہلے میں آپ کو اپنا "اسٹاک" دکھادوں۔ پھر دوسری باتیں بعد میں ہوں گی۔"

ہنری اب خود کو ٹھیک محسوس کر رہا تھا۔ اسے اپنی پچھلی بات بالکل یاد نہ تھی کہ کچھ دیر پیشتر اس نے کار کے سلسلہ میں کچھ کہا تھا۔ مسز والٹن دروازہ کھول چکی تھی وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔

ایک بڑا سا کمرہ تھا جس میں لمبی لمبی میزیں قطاروں کی صورت میں پڑی تھیں اور میزوں پر بہت سے شیشے کے جار پڑے تھے جن میں مکڑیاں تھیں۔

مسز والٹن کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ ایک مرتبان کی جانب بڑھی اور بولی۔ "یہ سیاہ مکڑا۔ اسے میں نے جس قدر محنت سے حاصل کیا ہے اس کے متعلق نہ ہی پوچھیں تو بہتر ہے۔"

ہنری نے صرف سر ہلادیا۔ مسز والٹن ایک اور مرتبان کی طرف بڑھی۔ "یہ سفید مکڑی ہے۔ جنوبی امریکہ میں کثرت سے ہوتی ہے۔"

اسی طرح مسز والٹن مختلف جاروں میں بند مکڑیوں کے متعلق بتاتی جارہی تھی۔ ہنری بھی بڑی دلچسپی کے ساتھ ان کے متعلق سن رہا تھا۔

اچانک وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت کے شدید تاثرات ابھر آئے۔ دوسرے ہی لمحے وہ ایک جار کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"ارے..... یہ..... اتنی بڑی مکڑی۔" اس کے لہجے میں لڑکھڑاہٹ پیدا ہوگئی تھی۔

"یہ۔" مسز والٹن مسکراتے ہوئے بولی۔ "یہ بڑی عجیب مکڑی ہے میں اسے آج تک خود بھی نہیں سمجھ سکی ہوں۔" مسز والٹن جار میں پڑی ہوئی ایک زرد رنگ کی بڑی مکڑی پر اپنی نگاہیں مرکوز کرتی ہوئی بولی۔

"مگر یہ آپ نے پکڑی کہاں سے؟" وہ مکڑی کو گھورتے ہوئے بولا۔ پھر اچانک وہ چونک پڑا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے مکڑی بے جان ہے۔ اس میں کوئی حرکت نہیں کوئی جنبش نہیں۔

"اوہ..... شاید یہ تو مری ہوئی ہے۔"

"نہیں مسٹر ہنری..... یہ زندہ ہے۔" مسز والٹن نے جلدی سے کہا۔ "عام حالات میں یہ مردہ دکھائی دیتی ہے مگر..... یہ زندہ بھی ہوجاتی ہے..... میرے اسٹاک میں یہ سب سے زیادہ عجیب وغریب مکڑی ہے۔"

"پھر تو بڑی حیرت انگیز چیز ہوئی۔" وہ حیرت ظاہر کرتا ہوا بولا "اور میری معلومات میں ایک اضافہ بھی۔"

اس کے بعد وہ آگے بڑھ گئے تمام کمرے میں پھرنے کے بعد جب وہ واپس ہونے لگے تو بے اختیار ہنری کی نگاہیں اس بڑی مکڑی کے جار پر پڑیں اس مرتبہ اس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا کیونکہ جار بالکل خالی تھا۔

"ایں..... یہ کیا..... یعنی وہ غائب ہوگئی۔" ہنری مسز والٹن کو متوجہ کرتے ہوئے بولا۔ "چھوڑیئے مسٹر ہنری..... کن باتوں میں پڑ گئے، میں نے کہا تھا کہ یہ مکڑی عجیب وغریب ہے۔ یہ خود بخود غائب ہوجاتی ہے اور پھر واپس بھی آجاتی ہے۔"

اب ہنری کچھ کچھ خوف زدہ سا ہونے لگا تھا۔ وہ

جلد سے جلد اس مکان سے نکل جانے کے متعلق سوچ رہا تھا کمرے سے باہر نکلتے ہی وہ بولا۔

''اچھا مسز واٹسن ...... اب مجھے اجازت دیں پھر کبھی ملاقات ہوگی۔''

''میرا خیال تھا کہ تم ڈنر کھا کر جاؤ گے۔''

لیکن مسز واٹسن مجھے اب کافی دیر ہوچکی ہے پھر کبھی سہی۔'' وہ فوراً اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''جیسی تمہاری مرضی۔'' مسز واٹسن نے شانے اچکائے۔

''گڈ نائٹ۔'' ہنری نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

''گڈ نائٹ......'' جواباً مسز واٹسن نے کہا۔

اور پھر ہنری کے جاتے ہی اس کے ہونٹوں پر مکڑی کے جال کی طرح ایک گہری اور پراسرار مسکراہٹ پھیل گئی۔

دوسرے ہی لمحے اس کے حلق سے ایک قہقہہ ابلا۔ ایک شیطانی قہقہہ۔

ہنری بڑی تیزی سے چلا جارہا تھا۔ کالونی سے باہر نکل کر ایک وسیع میدان میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ اور اس وقت وہ اسی میدان میں سے گزر رہا تھا۔

رات اس وقت بہت تاریک ہوچکی تھی اتنی تاریک کہ چند گز کے فاصلے پر پڑی ہوئی کوئی چیز نظر نہیں آرہی تھی۔ بارش ہونے کی وجہ سے زمین پر کیچڑ سا پھیل چکا تھا۔

ہنری دوڑنے کی حد تک تیز چل رہا تھا۔ اس کا ذہن مسز واٹسن کی مکڑی میں الجھا ہوا تھا۔ اچانک ہنری چونکا۔ اسے اپنے رین کوٹ کی جیب میں کسی چیز کے چلنے کا احساس ہوا۔ وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔

پھر بڑی پھرتی کے ساتھ اس نے اپنا رین کوٹ اتار کر پھینک دیا، کچھ خوف اور سردی کی وجہ سے اب وہ کانپ رہا تھا پھر وہ آگے بڑھ گیا۔

لیکن ابھی چند گز ہی چلا تھا کہ اسے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں کسی چیز کے رینگنے کا احساس ہوا وہ بری طرح بوکھلا گیا پھر کوٹ بھی اس نے بڑی جلدی سے اتار کر پھینکا۔

اب وہ ایک پینٹ اور قمیض میں ملبوس تھا۔ سرد ہوا اس کے جسم سے ٹکراتی اور وہ کانپ کر رہ جاتا، کوٹ پھینکنے کے بعد وہ دوبارہ دوڑا۔ لیکن پھر وہ اچھل پڑا اور زمین پر گر پڑا چونکہ اب کی بار اسے پینٹ کی جیب میں اسی قسم کا احساس ہوا تھا۔

دوسرے ہی لمحے اس نے پیٹی کھولی بٹن ایک جھٹکے سے کھولے اور پینٹ کو اتارنے لگا۔ دہشت سے اس کا چہرہ دھواں ہورہا تھا۔ اور پھر ابھی وہ پینٹ اتار ہی رہا تھا کہ اسے اپنے چہرے پر ایک جال سا پھیلتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کے ہاتھ تیزی سے اپنے چہرے کی جانب بڑھے۔

وہ ایک مکڑی تھی۔ زرد سی مکڑی جس کی لمبی لمبی ٹانگیں اس کے پورے چہرے کو ڈھانپنے کی کوشش کررہی تھیں اس کی گول گول آنکھیں تاریکی میں چمک رہی تھیں۔

ہنری نے مکڑی کو اپنے چہرے سے ہٹانے کی بہت کوشش کی مگر ...... وہ اپنے مقصد میں ناکام رہا ...... پھر وہ زمین پر گر پڑا۔

اس کے دل کی دھڑکن حد درجہ تیز ہوچکی تھی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے چند منٹوں میں اس کا دل سینہ توڑ کر باہر آگرے گا۔

اس کی قوت مدافعت کمزور پڑتی جارہی تھی۔ مکڑی جو کہ چہرے پر پوری طرح چھا چکی تھی۔ اب وہ رینگتی ہوئی چہرے سے گردن کی طرف بڑھ رہی تھی پھر اس کی ٹانگیں ہنری کی گردن میں پیوست ہونے لگیں۔

ہنری کا اپنا سانس سینے میں گھٹتا محسوس ہونے لگا۔ پھر اس کے حلق سے ایک دردناک چیخ بلند ہوئی۔ کیونکہ مکڑی کی ٹانگیں اس کی گردن میں اترتی جارہی تھیں جیسے اس کی گردن موم کی ہو۔

درد کی شدت سے اس کی آنکھیں بھیانک انداز میں پھیل چکی تھیں جانکنی کا عالم تھا، چہرے پر کرب کے تاثرات تھے، پھر ہنری کی گردن اس کے تن سے جدا ہوکر علیحدہ ہوگئی اس کا جسم کچھ دیر کے لئے موت کے بے رحم پنجوں میں تڑپا اور پھر ساکت ہوگیا۔ بے جان مجسمے کی مانند!

اسی لمحے مکڑی کے اردگرد دھواں پھیلنے لگا پھر اسی دھوئیں میں ایک شبیہ ابھری اور وہ شبیہ مسز واٹسن کی تھی۔

کھڑی نجانے کہاں غائب ہو چکی تھی شاید دھوئیں......

دھواں چھٹا اور مسز والٹن جس کی گول گول آنکھوں میں بلا کی چمک تھی اپنے ہونٹوں پر فاتحانہ تبسم بکھیر چکی تھی پھر وہ قہقہہ لگانے لگی۔ اپنی کامیابی پر...... شیطانی اور بھیانک قسم کے قہقہے جنہوں نے ماحول پر پھیلے ہوئے سکوت کو تار تار کر دیا۔

مسز والٹن فضا میں...... عین ہنری کے مردہ جسم کے قریب کھڑی قہقہہ لگانے میں مصروف تھی کہ اسی لمحے ایک بڑا سا عقاب جس کی آنکھیں تاریکی میں یوں چمک رہی تھیں جیسے دو روشن قندیلیں ہوا میں ہوں پھر اس نے غوطہ لگایا۔

دوسرے ہی لمحے اس کا پنجہ ہنری جارج کی کھوپڑی کو بالوں سے اپنی آہنی گرفت میں لے چکا تھا۔ مسز والٹن کی نظر عقاب پر پڑی...... اور اس کے قہقہے یک دم رک گئے اس کے گرد آہستہ آہستہ دھواں پھیلنے لگا لیکن یہ دھواں بہت معمولی تھا۔

اسی لمحے فضا ایک بھاری بھرکم قہقہے سے گونج اٹھی، مسز والٹن سے چند گز کے فاصلے پر ایک سفید لباس میں ملبوس وجود کھڑا تھا اور یہ سو فیصدی مردانہ وجود تھا۔ اس کی دو روشن آنکھیں انگاروں کی مانند دہک رہی تھیں اور دہکتی ہوئی آنکھیں مسز والٹن پر مرکوز تھیں۔

”مسز والٹن...... تم ہار چکی ہو۔“ اس وجود نے بھاری آواز میں کہا۔ ”تم نے میری ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔“ مسز والٹن بولی لیکن اس کے لہجے میں کمزوری عیاں تھی۔

”کیا کرتا...... مجھے بھی اسی چیز کی ضرورت تھی۔“

اس وجود نے شانے اچکائے۔

”لیکن تم کسی اور کو بھی اپنا شکار بنا سکتے تھے۔ آخر تم نے میرے ساتھ ہی زیادتی کیوں کی۔“

اس وجود کے ہونٹوں پر مکارانہ مسکراہٹ ابھری۔ ”اس کی دو وجوہات تھیں مسز والٹن۔ ایک تو یہ کہ مجھے زیادہ محنت کرنی پڑی...... دوسری بات یہ کہ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ ایک ہی شہر میں ہم دونوں رہیں اور آج کے بعد......“ ہاہا۔ اس نے بھیانک سا قہقہہ لگایا۔ ”آج کے بعد ہم دونوں میں سے یقیناً ایک ختم ہو جائے گا۔ مجھے اعتراف ہے کہ تم نے ہنری پر بہت محنت کی تھی اس کی ذہنی صلاحیتوں کو ختم کر دیا تھا۔ لیکن......“ وہ فقرہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ عقاب ان کے سروں پر چکرا رہا تھا اور اپنی خونخوار آنکھوں سے ان کی جانب دیکھ رہا تھا۔ ”اب تم چند منٹ بعد ختم ہو جاؤ گی مسز والٹن۔“

”اور میں...... ہاہاہا...... ہا......“

وہ بھیانک ہنسی کے ساتھ بولا۔ ”اور میں اپنے وجود کو مزید ایک سال تک قائم رکھنے میں کامیاب ہو جاؤں گا کیونکہ وہ کھوپڑی اب میرے عقاب کے قبضے میں ہے۔“

”اگر آج رات تمہیں یہ کھوپڑی نہ ملتی تو تم بھی فنا ہو جاتے۔“ مسز والٹن نے بے بسی سے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ ”اور مجھے یہ علم ہوتا کہ تم میری تاک میں ہو تو آج تم یہاں میری جگہ بے بسی سے ہاتھ ملتے ہوتے۔“

”ہاں مسز والٹن...... یقیناً ایسا ہو سکتا تھا لیکن اب میں جا رہا ہوں...... اور تم......“ وہ فقرہ چھوڑ کر معنی خیز مسکراہٹ ہونٹوں پر پھیلا گیا۔ پھر وہ فاتحانہ انداز میں قہقہہ لگانے لگا۔

انہی قہقہوں کے درمیان اس کا وجود اوپر اٹھنے لگا اس کے اردگرد دھند سی پھیلنے لگی اور وہ اسی میں غائب ہو گیا۔

عقاب نے ایک چکر اور لگایا۔ پھر وہ بھی رات کی تاریکی میں روپوش ہو گیا۔ مسز والٹن کے چہرہ پر خوف کے تاثرات نقش ہو رہے تھے۔ وہ ختم ہو جائے گی کیونکہ اسے کھوپڑی نہیں ملی۔ اپنے وجود کو مزید ایک سال قائم رکھنے کے لئے وہ کھوپڑی بہت ضروری تھی۔ یہ وہ بخوبی جانتی تھی اچانک ایک چیخ فضا میں ابھری...... اور پھر مسز والٹن کے چہرہ پر کرب کے تاثرات پھیل گئے۔

دفعتاً اس کی آنکھوں سے خون نکلنے لگا...... بالکل فواروں کی مانند...... وہ زمین پر گر پڑی...... اس کے اردگرد خون تیزی سے جمع ہو رہا تھا۔ پھر مسز والٹن کا وجود اسی خون میں تحلیل ہوتا چلا گیا۔

ہیبت پنہاں تھی۔ خوف سے مجھے اپنی رگوں میں لہو منجمد ہوتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ مجھے اندر داخل ہوتا دیکھ کر وہ میری طرف متوجہ ہوگئی۔ اس نے اپنا اگلا ایک پاؤں اٹھایا اور یوں ہلایا جیسے مجھے اپنے پاس بلا رہی ہو۔ پہلے تو مجھے یقین نہ آیا لیکن بغور دیکھنے پر مصمم یقین ہوگیا کہ وہ مجھے ہی بلا رہی ہے۔

میرا دل دھک سے حلق کو آن لگا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں اس کی طرف چل پڑا۔ میرے قریب پہنچنے پر اس نے ایک بار پھر صفدر کا گوشت نوچا اور چپک چپک کی آواز نکالتے ہوئے ہضم کرگئی۔ ایک بار اس نے مجھے ایک ایسا اشارہ کیا کہ میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے مجھے یوں لگا جیسے میں اس کا غلام بن کر اس کے اشاروں پر چلنے لگا ہوں۔ اب کی بار وہ اکیلی صفدر کا گوشت نوچ کر نہیں کھا رہی تھی۔ میں بھی شامل تھا۔

☆......☆......☆

انسانی خون اور گوشت اب میری مجبوری بن چکا تھا۔ اب میں اپنے گھر میں اکیلا نہیں رہتا تھا بلکہ وہ خونی مکڑی بھی میرے ساتھ رہتی تھی۔ میں نے پیار سے اس کا نام ”مانو“ رکھا ہوا تھا۔ ہمارے ہاں بلیوں کو اکثر مانو کے نام سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ وہ مکڑی اب کسی بڑے بلے کی جسامت سے کم نہیں تھی۔ یہی نہیں بلکہ اب وہ مکڑی اور میں دونوں اکٹھے ایک ہی بیڈ پر سوتے تھے۔ وہ میری اچھی دوست بن چکی تھی اس کی عدم موجودگی میں میرا دل نہیں لگتا۔

اب میں روزانہ اس کے لئے اور اپنے لئے شکار تلاش کرکے لاتا تھا۔ قسمت کی بات ہے کہ کوئی نہ کوئی ہتھے چڑھ ہی جاتا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ چور کی چوری ایک نہ ایک دن پکڑی جاتی ہے۔ میں کبھی بھی خوفزدہ نہیں ہوا۔ مرنا تو ہے ہی پھر کیوں نہ خوب عیاشی کرکے مرا جائے۔

اس روز میری دکان پر ایک نہایت ہی حسین و جمیل دوشیزہ شاپنگ کرنے آئی تھی۔ اس نے اپنا نام گل رخ بتایا تھا۔ گلاب کے پھول کی طرح اس کا چہرہ تروتازہ تھا۔ پہلی ہی نگاہ میں ہم دونوں ایک دوسرے کے گرویدہ ہوگئے تھے۔ اب وہ میرے ساتھ میرا گھر دیکھنے کے لئے جا رہی تھی۔ اس کا بھی اس دنیا میں سوائے ایک بھائی کے کوئی نہیں تھا۔ نجانے کیوں میں اتنا سنگدل ہوگیا تھا کہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس کے گرم خون کا پیاسا ہوئے جا رہا تھا۔

جیسے ہی ہم گھر میں داخل ہوئے میں نے مانو کو چھت پر گھومتے دیکھا۔ وہ خوشی سے جھومتے ہوئے اگلے دو پیر اٹھا کر میرا شکریہ ادا کررہی تھی۔ گل رخ کو کمرے میں بیٹھانے کے بعد میں پانی کا بہانہ کرکے جیسے ہی باہر نکلا مانو نے دھاوا بولنے کے لئے اندر قدم رکھا۔

گل رخ نے شاید اسے نہیں دیکھا تھا۔ میرے دل کے نہاں خانوں میں گل رخ کی محبت کے جلتے دیئے نے پھڑکنا شروع کردیا۔ تبھی میرا ہاتھ پاس رکھی کلہاڑی کی طرف گھوما۔ کلہاڑی اٹھا کر میں فوراً کمرے میں داخل ہوا۔ گل رخ کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ مانو اس کے پیچھے پہنچ چکی تھی۔ شاید گل رخ کو میری موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ وہ گھومی۔ دوسری طرف مانو فضا میں اوپر اٹھی اور عین اسی وقت میرا ہاتھ حرکت میں آیا اور مانو کا جسم دو حصوں میں منقسم ہوگیا، مانو کے تڑپتے شریر کی آنکھوں میں حیرت اور یقین کے تاثرات عیاں تھے۔ دوسری طرف گل رخ اس عفریت کو دیکھ کر اور پھر دو ٹکڑوں میں تقسیم ہوتا دیکھ کر سہم گئی اور دوڑ کر میرے گلے لگ گئی۔ معصوم بچوں کی طرح وہ میرے سینے سے چپکی کھڑی تھی اور میں اسے تسلی دے رہا تھا۔ پھر مانو کا وجود دھواں بن کر ہوا میں تحلیل ہوگیا۔

مانو کے مرتے ہی میری حالت بھی اعتدال پر آگئی۔ میرے اندر جیسے انسانی خون کی طلب ختم ہوگئی اور میں پرسکون زندگی گزارنے لگا۔ اور پھر چوتھے ماہ گل رخ میری بیوی بن کر میرے گھر آگئی۔ اب ہم دونوں میاں بیوی ایک جان دو قالب بن کر پرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔



میں جن ہوں

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

مکان کے عقب میں برسوں پرانی چٹان موجود تھی لیکن پھر ایک اشارے میں وہ چٹان ریزہ ریزہ ہوکر بکھر گئی اور یہی نہیں بلکہ پوری چٹان آنکھوں سے اوجھل بھی ہوگئی، ایک اچنبھا تھا مگر پھر......

پرمزاح کہانیوں کے شوقین لوگوں کے لئے عجیب وغریب حقیقت پرمبنی کہانی

روز افزوں مہنگائی کے باعث ہماری بیگم کا مسلسل اصرار تھا کہ سبزیاں اگاؤ کہ دو پیسے بچیں اور وقت ضرورت کام آئیں۔ گھر کی کیاریوں میں لگے ہوئے پھولوں کو دیکھ کر اب وہ خوش ہونے کے بجائے ناک بھوں چڑھانے لگی تھیں اور اکثر یہاں تک کہہ اٹھتی تھیں کہ "پھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔"
ہم یہ تو نہیں کہتے کہ زن مرید واقع ہوئے ہیں البتہ یہ درست ہے کہ ہم بہت ہی سعادت مند اور فرمانبردار قسم کے شوہر ہیں اور اس ضمن میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے ہوئے عموماً یہ کہا کرتے ہیں کہ "کامیاب ترین ازدواجی زندگی گزارنے کا راز ہمارے زریں اصول میں پوشیدہ ہے۔"
چنانچہ جب بیگم کا اصرار بہت ہی شدت اختیار کرگیا اور ہم نے یہ سمجھ لیا کہ اب فرار کی کوئی صورت نہیں

ہے تو لنگوٹ کس کر اور کھرپی ہاتھ میں سنبھال کر ہم نے پھولوں کے پودوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر کیاریوں کی مٹی درست کی۔ نرسری سے حاصل کی ہوئی وہ کھاد جس میں گوبر کے علاوہ کچھ نہیں تھا ڈالی اور مختلف سبزیوں کے بیج بونا شروع کر دیئے۔ ایک مقام پر ہمیں زمین کچھ سخت علوم ہوئی۔ کھرپی ماری تو پتہ چلا کہ پتھر ہے۔ زمین میں پتھر ہو تو سبزیوں کی نازک مزاج جڑیں پھیل نہیں پاتیں۔ ہم نے مناسب سمجھا کہ زمین کے اس حصے کو پتھر سے نجات دلا دیں تا کہ ہماری سبزیوں کو پھولنے پھلنے میں کسی قسم کی دقت اور پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

لیکن عجیب قسم کا پتھر تھا، ہم جتنا زمین کو کھودتے، وہ اتنا ہی زیادہ نیچے دھنستا اور اس طرح مجھے پسینے آ گئے، صبح سے دوپہر ہو گئی۔ اتنی محنت اگر ہم کنواں کھودنے پر صرف کرتے تو اب تک کامیاب ہو گئے ہوتے۔ بیگم نے بگڑ کر کہا۔ ”موئی کیاری نہ ہوئی، وادی کشمیر ہو گئی کہ فتح ہونے میں نہیں آتی۔“

ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے ہم نے بے بسی سے کہا۔ ”یہ بات نہیں ہے بیگم ایک کمبخت پتھر بیچ آ گیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ سبزیوں کو اس کی دسترس سے دور رکھنے کے لئے اس کو باہر نکال دیں۔“

بیگم ہمارے پاس آ گئیں۔ ”توبہ ہے شاہد۔“ انہوں نے منہ سکیڑ کر کہا۔ ”تم تو عورت ہوتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔ اتنا سا پتھر زمین سے نہیں نکال سکتے۔ ذرا دینا تو کھرپی۔“

ہم نے فوراً کھرپی ان کے ہاتھ میں تھما دی۔ دیکھیں جو کام مرد ہونے کے باوجود انجام نہ دے سکے۔ وہ اسے کس طرح پایہ تکمیل تک پہنچاتی ہیں۔ لیکن ہوا یہ کہ ادھر انہوں نے کھرپی سنبھالی۔ ایک ہاتھ پتھر پر مارا اور دوسرے ہی لمحہ وہ پتھر اچھل کر اس طرح اوپر آ گیا جیسے وہ پتھر نہیں بلکہ آٹے کا پیڑا ہو۔

اور حقیقت میں وہ پتھر نہیں تھا۔ آٹے کا پیڑا بھی نہیں تھا بلکہ پیتل کی چراغ نما کوئی چیز تھی جس میں ایک جانب ہینڈل تھا اور دوسری جانب وہ قدرے مڑا ہوا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ مستقبل قریب ترین میں بیگم ہماری مردانگی کو آڑے ہاتھوں لے کر ہمیں یہ پرانی اطلاع بہم پہنچائیں گی کہ تم جیسے مرد سے تو ہم عورت ہی بہتر ہیں لیکن ہوا یہ کہ پیتل کی اس چراغ نما چیز نے ان کی ساری توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ وہ اسے لیتے ہوئے سیدھی باورچی خانے میں چلی گئیں۔ اپنے کام سے فارغ ہونے کے بعد ہم ان کے پاس پہنچے تو چولہے پر رکھی ہوئی ہانڈی جل رہی تھی اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اس بے ہنگم سی شے کا مشاہدہ کر رہی تھیں۔

ہم نے ہانڈی کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی تو انہوں نے جلدی سے ایک لوٹا پانی اس میں ڈال دیا۔ پھر ہم سے مخاطب ہو کر بولیں۔ ”آخر یہ ہے کیا چیز؟“

”ہمیں تو یہ مچھلی کی کوئی قسم معلوم ہوتی ہے۔“

”ارے۔ گھاس تو نہیں چر گئے۔ بالکل صاف پیتل کی چیز ہے، جس میں ہینڈل تک موجود ہے اور تمہیں یہ مچھلی نظر آ رہی ہے۔“

ہم نے کہا۔ ”آج کل جس جگہ ہم رہتے ہیں کسی زمانے میں یہاں سمندر ہوا کرتا تھا اور ماہرین نباتات کا کہنا ہے کہ ایک مچھلی ایسی بھی پائی جاتی ہے جو دیکھنے میں بالکل پیتل جیسی معلوم ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ......“

”اور اس میں ہینڈل بھی ہوتا ہے۔“ انہوں نے ہماری بات کاٹ کر کہا۔

”نہیں ماہرین نباتات نے یہ تو نہیں لکھا لیکن کیا عجب ہے کہ پیتل جیسی مچھلی میں ہینڈل لگا ہوتا ہو اور آج جو ہینڈل اس جگہ لگا نظر آتا ہے اس کا آئیڈیا اس مچھلی کو دیکھ کر لیا گیا ہو۔“

”بھاڑ میں جائیں تمہارے ماہرین نباتات“ منہ بگاڑ کر کہا اور دوپٹے کے پلو سے اس چیز کو رگڑ کر چمکایا۔ ”بالکل صاف پیتل۔“

مگر ان کا جملہ منہ کے اندر ہی رہ گیا۔ ایک عجیب سی زناٹے کی آواز ہوئی اور بیک وقت ہم دونوں نے

دیکھا کہ ایک بہت بڑا آدمی جس کا قد کم سے کم آٹھ اور زیادہ سے زیادہ دس فٹ ہوگا، لنگوٹ باندھے دست بستہ باورچی خانے کے باہر کھڑا ہوا ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ ہم اسے دیکھ کر ڈر گئے۔ پہلی نظر میں وہ ہمیں ڈاکو نظر آیا دوسری نظر میں خوفناک قاتل اور تیسری نظر میں ایم اے راحت والا صدیوں کا اصلی بیٹا۔

شاید ہماری گھگھی بندھ جاتی اور ہم مع اپنی بیگم کے جلتے ہوئے چولہے میں گر کر بھسم ہو جاتے مگر ہم نے دیکھا کہ ہماری بیگم پر کسی قسم کا کوئی خوف طاری نہیں ہوا۔ وہ خشمگیں نظروں سے اس نووارد کو گھور رہی تھیں۔ پھر اچانک بگڑ کر بولیں۔ ''تمہیں اس حالت میں یہاں آتے ہوئے شرم نہیں آئی۔ جاؤ یہاں سے اور کپڑے پہن کر آؤ۔''

''آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔'' اس نے سر جھکا کر کہا پھر وہ گھوما اور زناٹے کی آواز کے ساتھ ہماری نظروں سے دور ہو گیا ہم بیگم سے وضاحت طلب کرنا چاہ رہے تھے کہ تمہاری اس شخص سے کب اور کہاں ملاقات ہوئی تھی اب تک تم نے اس کے بارے میں ہمیں کیوں نہیں بتایا کہ اگلے ہی لمحے دوبارہ آواز ہوئی اور وہ شخص شاہی لباس پہنے اور کمر سے خمدار شمشیر لٹکائے ہوئے ایک بار پھر ہماری نظروں کے سامنے موجود تھا۔ اس کے جانے اور آنے میں مشکل سے دس پندرہ سیکنڈ صرف ہوئے ہوں گے۔

اس کی سج دھج دیکھ کر ہم نے ادب سے پوچھا۔

''جناب والا۔ آپ کون ہیں؟''

''ہم چراغ کے غلام ہیں۔''

''کون سا چراغ؟''

''وہ چراغ جو آج تمہاری بیگم نے کیاری سے نکالا ہے۔''

ہم نے کہا۔ ''وہ تو مچھلی کی ایک قسم ہے ماہرین نباتیات۔''

بیگم نے ہماری بات کاٹ کر کہا۔ ''نہیں وہ مچھلی

سالگرہ نمبر

قارئین کرام

السلام علیکم!

ہر سال کی طرح اس سال یعنی اکتوبر 2016ء ''**ڈر ڈائجسٹ**'' کا سالگرہ نمبر ہوگا۔

جس میں کہنہ مشق رائٹروں کی کہانیاں جلوہ گر ہوں گی۔ جو کہ اپنی مثال آپ ہوں گی۔

قارئین کرام! اس لئے گزارش ہے کہ آپ سب اپنی دلکش، دل فریب اور دل کو چھو لینے والی خوفناک، وہشت ناک، وحشت ناک، اور خونچکاں بھونچکاں کہانیاں جلد از جلد ارسال کریں۔ تاکہ وہ سالگرہ نمبر میں جلوہ گر ہو سکیں۔

خود نویست کہانیوں کو نمایاں جگہ ملے گی۔

نقل شدہ کہانیوں سے پرہیز کیجئے۔

قارئین کرام! سالگرہ نمبر ضخیم صفحات میں جلوہ گر ہو رہا ہے۔ لہٰذا سالگرہ نمبر کی قیمت 70 روپے ہوگی۔

شکریہ

ادارہ

ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ

نہیں، بچوں کے کھیلنے کی صراحی ہے۔“

”صراحی؟“ ہم نے حیرت سے کہا۔ ”اگر ہمیں تمہاری خفگی کا احساس نہیں ہوتا تو یہ کہے بغیر نہیں مانتے کہ اسے کوئی آنکھوں کا اندھا اور عقل سے کورا شخص ہی صراحی کہہ سکتا ہے۔“

”ترزمت کرو۔“ بیگم کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔ ”ہوسکتا ہے یہ چراغ ہی ہو۔ پرانے زمانے میں اس قسم کے چراغ استعمال کئے جاتے تھے۔ میں نے ایسے چراغوں کی تصویریں دیکھی ہیں۔“

پھر وہ اس شخص سے مخاطب ہوکر بولیں۔ ”کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ چراغ کیسے جلتا ہے؟“

اجنبی نے اپنے بڑے سے ہاتھ میں اس چیز کو لے کر اس کے اوپر اپنا دوسرا بڑا سا ہاتھ پھیرا۔ ہم دونوں کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اچانک اس میں تیل بھر گیا۔ ایک جانب تقریباً آدھ انچ بتی باہر نکل آئی اور پھر بتی نے جلنا شروع کردیا۔

”کمال ہے بھئی؟“ ہم نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”بیگم بولیں۔ ”جب تمہیں ایسا کرتب آتا ہے تو ادھر ادھر بھیک کیوں مانگتے پھر رہے ہو؟“

اس شخص نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے چراغ کو ہماری بیگم کے سامنے رکھ دیا۔ اور ایک بار پھر اپنے دونوں ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا۔

ہم نے چراغ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کسی نے چیز اچھی ایجاد کی ہے۔“ بیگم نے حسب عادت ہماری بات کاٹی۔ ”لیکن اس کی روشنی بالکل بیکار ہے۔ اتنی روشنی میں تو ایک کمرہ بھی روشن نہیں ہوسکتا۔“ پھر وہ اجنبی سے مخاطب ہوکر بولیں۔

”میرے خیال میں تم جادوگر ہو۔ کیا تمہارا کسی سرکس سے کچھ تعلق ہے؟“

”پانچ سال سے یہاں کوئی سرکس نہیں آیا۔“ ہم نے بیگم کی معلومات میں اضافہ کیا۔ ”اور نہ آج کل کا موسم سرکس کے لئے موزوں ہے اور بھائی اجنبی انسان چراغ کا کرتب تو تم نے خوب دکھایا۔ کیا تم ایسے دوسرے شعبدے بھی جانتے ہو؟“

آپ کے ارشاد پر ہزار شعبدے دکھائے جاسکتے ہیں آقا۔“

بیگم بولیں۔ ”ہم نے سنا ہے کہ بھارت میں ایسے شعبدے باز ہیں جو رسی کو ہوا میں کھڑی کرکے اس پہ چڑھ جاتے ہیں اور نظروں سے غائب ہوجاتے ہیں۔ کیا تم یہ شعبدہ ہمیں دکھا سکتے ہو؟“

”آپ کے حکم کی دیر ہے سرکار۔“

”اگر زیادہ پریشانی نہ ہو تو دکھا دو۔“ بیگم نے کہا۔ ہم تمہیں کچھ زیادہ انعام تو نہیں دے سکتے البتہ رات کا کھانا کھلا دیں گے۔“

اس نے میان سے تلوار نکال کر کپڑے ٹانگنے والی رسی کاٹی اور اسے ہوا میں اچھال دیا۔ بیگم احتجاج ہی کرتی رہ گئیں۔ رسی کا ایک سرا زمین پر ٹک گیا اور دوسرا خط مستقیم کی صورت میں فضا میں بلند ہوگیا۔ دونوں ہاتھوں کی مدد سے اس نے اوپر چڑھنا شروع کردیا۔ پہلے اس کی پگڑی غائب ہوئی پھر شاہانہ لباس، تلوار اور آخر میں سلیم شاہی جوتے بھی نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

بیگم کو تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے ہم نے کہا۔ ”بھئی مانتے ہیں تمہیں، اس شخص سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تم نے کیسی عجیب ترکیب نکالی۔“

”مجھے تو آج تک یقین نہیں آیا کہ کوئی شخص رسی پر اس طرح چڑھ سکتا ہے۔“ بیگم ابھی تک اس کے شعبدے سے متاثر تھیں۔ ”چلو آج اپنی آنکھوں سے یہ شعبدہ بھی دیکھ ہی لیا۔“

انہوں نے پھونک مار کر چراغ بجھایا اور پلو سے اسے رگڑتے ہوئے بولیں۔ ”شام ہورہی ہے۔ میرے خیال میں رات کا کھانا۔“

زناٹے کی آواز ہوئی۔ سامنے وہی اجنبی آ کھڑا ہوا۔

”تم پھر آگئے؟“

”تابعدار ہوں حضور۔“

ہم نے کہا۔ ”تم نے اسے کھانا کھلانے کا وعدہ

کیا تھا۔"

بیگم نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا۔ "اتنا بڑا شخص ہمارے کمرے میں نہیں سما سکتا۔ تم اسے باہر لے کر گھاس پر بیٹھو میں ابھی کھانا لے کر آتی ہوں۔"

ہم اسے باہر لے گئے اور اس سے کہا۔ "بیگم تمہارے لئے کھانا لا رہی ہیں۔" وہ فوراً آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

"کہو یار۔ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟" ہم نے پوچھا۔

"ہم چین میں رہتے ہیں۔"

"یہاں کیسے آنا ہوا؟"

"آپ نے بلایا اور خادم حاضر ہو گیا۔"

ہم نے کہا۔ "لکھنوی تکلف چھوڑ دو۔ ذرا قاعدے سے انسانوں کی طرح بات کرو۔ سنا ہے چین میں افیم کا قحط پڑ گیا ہے؟"

بولا۔ "آپ حکم دیں تو منوں کے حساب سے پیش کی جا سکتی ہے۔" اسی وقت بیگم ٹرے کو لبالب بھر کر اس کے لئے کھانا لے آئیں۔ "لو کھاؤ۔"

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ٹرے کا سارا کھانا کھا گیا۔ اس کے بعد چاہتا تھا کہ ٹرے کو بھی کھا جائے مگر بیگم نے منع کر دیا۔ "نہیں نہیں یہ کھانے کی چیز نہیں ہے۔ ٹھہرو میں تمہارے لئے کچھ اور لاتی ہوں۔"

بیگم نے بھی کچھ اسے کھلا دیا۔ یہاں تک کہ دوپہر کا جلا ہوا سالن اور بچا کر رکھے ہوئے بھوسی ٹکڑے تک وہ بغیر ڈکار لئے ہوئے کھاتا چلا گیا۔ آخر میں بیگم نے اس سے معذرت چاہی اور کہا۔ "تم یہیں سو جاؤ۔ اس وقت رات میں کہاں جاؤ گے۔ کمرے میں تمہارے لئے گنجائش نہیں ہے ورنہ تمہیں باہر سونے کی تکلیف نہ ہوتی۔"

بیگم کی بات سنتے ہی وہ وہیں لمبا لمبا لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر کے خراٹے لینے لگا۔

ہم دونوں اندر چلے گئے۔ بیگم نے ہمیں یہ مژدہ سنایا کہ آج ہمیں بھوکا ہی سونا پڑے گا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا کہ آدمی ہے کام کا۔ اگر اس کا پیٹ اتنا بڑا نہ ہوتا تو وہ اسے اپنے ہاں ملازم کے طور رکھ لیتیں۔

"تمہیں اس سے ڈر نہیں لگتا؟" ہم نے پوچھا۔

"نہیں معصوم سا بے ضرر شخص ہے۔ ہر بات ماننے کے لئے تیار اس سے بھلا کسی کو کیا ڈر لگ سکتا ہے۔"

ہماری بیگم بھی خوب ہیں۔ ڈرنے والی بات سے ڈرتی نہیں اور نہ ڈرنے والی چیز سے خوب ڈرتی ہیں پچھلے ہی دنوں کی بات ہے گاندھی گارڈن میں چھپکلی سے ڈر کر شیر کی کچھار میں جا چھپی تھیں۔

رات گزر گئی۔ صبح کو ہم نے باہر نکل کر دیکھا تو وہ شخص جا چکا تھا۔ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اندر آئے۔ بیگم ہاتھ میں چراغ لئے ہوئے کھڑی تھیں۔ ہم سے کہنے لگیں۔ "اسے رگڑ کر صاف کر لو۔ دوپہر کو کھوپرے والا آئے گا تو اس کے بدلے میں کھوپرا لے لیں گے۔"

ہم نے قمیض کی آستین سے اسے رگڑا۔ اسی وقت آواز ہوئی دیکھا کہ سامنے وہی شخص کھڑا ہوا ہے۔

"کہو بھئی۔ اب کیسے آنا ہوا؟"

"آپ کا حکم بجالانے کے لئے۔"

بیگم باورچی خانے سے چلائیں۔ "اس سے کہہ دو ہمارے پاس اسے پلانے کے لئے چائے نہیں ہے۔"

ہم نے یہی بات اسے بتائی تو بولا۔ "کتنی چائے لا دوں؟"

یونہی کہہ دیا۔ "ایک ایک پونڈ والے دس پیکٹ۔"

پندرہ سیکنڈ کے اندر ہمارے قدموں میں چائے کے دس پیکٹ پڑے ہوئے تھے۔ حیرت کو دباتے ہوئے ہم نے پوچھا۔ "کچھ محنت کا کام کر سکتے ہو؟"

بولا۔ "حکم دیجئے آقا۔"

"ہمارے گھر کے عقبی حصہ میں ابھری ہوئی چٹان تھی۔ بیگم کہا کرتی تھیں کہ چٹان نہ ہوتی تو وہاں گوبھی کی کاشت کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ ہم نے کہا۔ "تم اس چٹان کو کاٹ سکتے ہو؟"

"سوال جواب نہ کیجئے سرکار۔ صرف حکم دیجئے۔"

ہم نے فوراً حکم دیا۔ جاؤ تین ہفتے کے اندر اندر چٹان کو کاٹ کر وہاں پر زرخیز علاقہ کی مٹی بھر دو۔"

وہ فوراً ہی چلا گیا۔

دفتر سے دوپہر ہی کو چھٹی مل گئی۔ گھر آئے تو بیگم منہ میں انگلی دبائے کھڑی تھیں۔

ہم نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

بولیں۔ "ایسا جن آدمی تو ہم نے آج تک نہیں دیکھا ذرا چل کر دیکھو۔ ساری چٹان غائب ہے اور وہاں پر بہترین قسم کی مٹی پھیلی ہوئی ہے۔"

پہلی بار ہمیں چراغ کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ ہم نے کہا۔ "وہ چراغ کہاں ہے؟ ذرا بتاؤ تو۔"

بیگم نے پوچھا۔ "کیا کرو گے؟"

"تمہیں اس کے بدلے میں کھرا لا کر دیں گے۔"

وہ ہنسیں پھر کچھ سنجیدہ ہو کر بولیں۔ "صبح سے سوچ رہی ہوں کہ چراغ میں کوئی معمہ پوشیدہ ہے۔ ادھر ہم اسے رگڑتے ہیں اور ادھر وہ ہمارے سر پر آن سوار ہوتا ہے۔"

ہم نے کہا۔ "لاؤ آزمائش کئے لیتے ہیں۔"

چراغ ہمیں دینے کے بجائے انہوں نے خود اسے رگڑا جب حسب معمول وہ شخص اگلے ہی لمحہ وہاں موجود تھا۔

"ہم تم سے جو کچھ منگائیں بغیر کسی معاوضے یا لالچ کے بالکل مفت لا کر دو گے؟" بیگم نے اس سے پوچھا۔

"حکم دیجئے سرکار والا۔"

"اچھا تو ہمیں ایک بوری آٹا اور سیر بھر ارہر کی دال اور آدھے درجن انڈے اور آج کا اخبار اور ایک پاؤ دہی اور آدھا سیر ٹماٹر اور ایک سنسنی خیز ناول اور تھوڑا سا ہرا دھنیا اور سیر بھر پیاز لا دو۔"

ساری چیزیں آ گئیں تو بیگم نے پوچھا۔ "دوپٹے بھی لا سکتے ہو؟"

"حکم دیجئے غلام پرور۔"

"آدھے درجن دوپٹے نئے فیشن والے اور چھ زنانے سوٹ، چھ عدد جاپان سے اسمگل کئے ہوئے نئے پرنٹ اور چھ عدد ریشمی ازار بند اور تین عدد بنارسی ساڑھیاں خاص بنارس کی بنی ہوئی اور حیدر آباد کے امرود اور شیشیاں اسنو کی اور ایک شیشی کریم کی اور ایک ڈبہ پاؤڈر کا اور پڑوسن کی بچی کے لئے ایک جھنجھنا اور شمیم میاں کے لئے شیو کی مشین بجلی والی لا دو۔ باقی چیزیں بعد میں منگاؤں گی۔"

دو زناٹوں میں جن سے ایک زناٹا جانے کا اور ایک آنے کا تھا، بیگم کی ساری مطلوبہ اشیاء کا ڈھیر لگ گیا۔ انہوں نے جلدی جلدی ان چیزوں کو دیکھا اور سمیٹ کر کمرے میں رکھ دیا، پھر ہم سے بولیں۔ "اب کیا منگائیں؟"

ہم نے کہا۔ "کچھ نہیں، فی الحال بیٹھ کر فہرست بناؤ۔"

بولیں۔ "اچھا دس روپے کی ہلدی تو منگا ہی دو۔ سالن کے لئے ضرورت ہے۔"

لیجئے جناب ہلدی بھی آ گئی۔ ہم نے سوچا بیگم اتنا کام کرا رہی ہیں تو کیوں نہ تھوڑا سا کام ہم بھی کرا لیں۔

چنانچہ ہم نے کہا۔ "یار ہمارا کمرہ بہت خستہ ہو رہا ہے۔ پچھلی بارش میں اس کی چھت بھی ٹپکی تھی۔ دیواریں بھی دو ایک جگہ سے چٹخ گئی ہیں۔ اگر ناگوار نہ گزرے تو اس کی بھی لگے ہاتھوں مرمت کر دو۔"

ہماری بات سنتے ہی وہ چلا گیا ہم بیگم کی چیزیں رکھنے میں لگ گئے۔ دبی زبان سے ہم نے یہ شکایت بھی کی کہ تم نے سب ہی کچھ منگوا لیا یہ نہیں ہوا کہ ہمارے لئے ایک شیروانی اور آدھے سوٹ کا کپڑا منگوا دیتیں سبھی کچھ کے نام پر وہ چونکیں بولیں۔

"ابھی منگوایا ہی کیا ہے اب کی مرتبہ اسے بازار بھیجوں گی تو تمہاری چیزیں بھی منگوا دوں گی۔ تم نے خواہ مخواہ اسے ایک ایسے کام میں لگا دیا ہے جو مزدوروں کے کرنے کا ہوتا ہے۔ آدمی شریف ہے منہ سے کچھ نہیں

بولا لیکن اس کے چہرے سے صاف معلوم ہورہا تھا کہ اسے تمہاری بات ناگوار گزری ہے۔"

آدمی ہم بھی شریف ہیں اس لئے ہم نے بھی بیگم کے منہ لگنا پسند نہ کیا، ورنہ کہنے کو بہت کچھ ہم بھی کہہ سکتے تھے مثلاً دس روپے کی ہلدی والی بات خیر صاحب بیگم کا سامان منگوا کر جب باہر نکلے تو ہم دونوں ایک دوسرے کا چہرہ حیرت سے تکتے رہ گئے۔ ہمارا کمرہ اپنی جگہ سے بالکل غائب ہو چکا تھا اور اب اس کی جگہ پر انتہائی شاندار قسم کا ماڈرن کمرہ موجود تھا جس سے غسل خانہ بھی اٹیچ تھا اور جس کا فرش موزائیک کا تھا اور جس کی دیواروں پر روپہلی سے رنگ و روغن کیا گیا تھا اور جس میں بہترین قسم کا غیر ملکی بجلی کا سامان استعمال کیا گیا تھا اور اگرچہ ہم نے فرنیچر کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا تاہم کمرے کی مناسبت سے اعلیٰ قسم کا فرنیچر قالین اور صوفوں اور شوکیس الماریوں کے ساتھ موجود تھا۔ دیوار پر قائداعظم اور قائد ملت کی تصاویر لگی ہوئی تھیں۔

بیگم نے ہم جیسے پھٹیچر قسم کے آدمی کا اتنا عالیشان کمرہ دیکھا تو تھوڑی دیر تک وہ اس طرح گم صم کھڑی رہیں جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو پھر وہ بھاگیں باورچی خانے کی طرف، واپس آئیں تو ان کے ہاتھ میں چراغ تھا جسے وہ پوری قوت سے رگڑ رہی تھیں۔

"فرمایئے۔ فرمایئے۔" وہ شخص آ گیا، لیکن بیگم نے پھر بھی چراغ کو رگڑنا ختم نہیں کیا۔

"خیر۔" بیگم نے بالآخر اسے حکم دیا۔ "تم نے جیسا کمرہ بنایا ہے بالکل ویسا ہی بلکہ اس سے بڑھ کر ہمارے اس گھر کو دو منزلہ نہیں سہ منزلہ بنا دو۔ گھر میں ریڈیو، ٹی وی، ریفریجریٹر، کار اور ضروریات زندگی کی دیگر چیزیں بھی ہوں۔"

وہ غائب ہو گیا۔

ہم دونوں رات گئے تک انتظار کرتے رہے کہ ہمارے گھر کی قسمت کب پلٹتی ہے۔ آخر میں تھک ہار کر سو گئے۔ سو کر اٹھے تو ایسا معلوم ہوا جیسے بکنگھم پیلس میں لیٹے ہوئے ہوں۔

☆......☆......☆

ہمارے ایک دوست ہیں تاج محمد آنسو۔ وہ ہم سے محض اس لئے جلتے ہیں کہ اگرچہ ہم ان سے عمر میں دس سال سے زیادہ بڑے ہیں پھر بھی ہمارے سارے دانت جوں کے توں موجود ہیں جبکہ ان کی پوری بتیسی جھڑ چکی ہے اور اب وہ نقلی دانت لگائے گھومتے ہیں۔ ہم نے ایک دو بار ان سے مصالحت کی بھی کوشش کی۔ یہ کہا کہ بھائی یہ قدرت کے کارخانے کا نظام ہے جس میں ہمارا عمل دخل نہیں۔ اب اگر ہمارے دانت موجود ہیں اور تمہارے دانت ٹوٹ چکے ہیں تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ نہ ہم نے تمہارے دانت اپنے منہ میں لگائے اور نہ ان کے ٹوٹنے پھوٹنے کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔ مگر انہوں نے ہم سے جلنا نہیں چھوڑا۔ ایک بار تو ہمارے خلاف یہاں تک شکایت کر دی کہ ہم موجودہ حکومت کے خلاف بغاوت کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ وہ تو اللہ بھلا کرے انکوائری کرنے والوں کا جنہوں نے ہمارا چہرہ مہرہ دیکھ کر ہی یہ کہہ دیا کہ ان کی سات پشتوں تک کوئی شخص بغاوت کے متعلق نہیں سوچ سکتا۔

اگر ان میں کچھ دم خم ہوتا تو پہلے اپنی بیگم کے خلاف بغاوت کرتے جس نے انہیں اپنے پاؤں کی جوتی بنا کر رکھا ہے۔ دوسری مرتبہ ان ہی حضرت نے سی آئی ڈی والوں کو یہ خط بھیج دیا کہ ہم بھارت کے لئے جاسوسی کرتے ہیں۔ لیکن یہ الزام بھی غلط ثابت ہوا۔ البتہ ہمارے پورے گھر کی تلاشی ضرور لی گئی اور کئی مہینے تک ہماری حرکات و سکنات کو نظروں میں رکھا گیا۔

دانتوں کی وجہ سے وہ ہم پر خار تو پہلے ہی کھائے بیٹھے تھے لیکن اب جو وہ ہماری طرف سے گزرے اور انہوں نے ہمارا تین منزلہ محل دیکھا اور محل میں پوری آواز سے بجتا ہوا ریڈیو سنا اور محل کے گیراج میں ایک لمبی سی شاہانہ کار کھڑی پائی تو ان کی مصنوعی بتیسی فوراً باہر نکل پڑی۔ جیسے تیسے وہ اپنی بتیسی درست کرتے ہوئے بھاگے مختلف دفاتر کی جانب۔

ہم مرنجان مرنج قسم کے آدمی ہیں۔ تاج محمد کو چھوڑ کر ہم میاں بیوی نے اپنی اپنی آنکھیں خود ملیں پھر بیگم نے ہماری اور ہم نے بیگم کی آنکھیں ملیں کہ خواب ہو تو ٹوٹ جائے۔ مگر محل جوں کا توں باقی رہا۔ باہر نکل کر دیکھا تو ہم اپنے ہی محلہ میں تھے۔ ہمارا محل بھی اسی جگہ تھا جہاں کبھی ہمارا غریب خانہ ہوا کرتا تھا۔ جب اس بات کا اچھی طرح یقین ہوگیا تو ہم دونوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں رہا۔ بچوں کی طرح اپنے تین منزلہ مکان میں اچھلتے پھرے کبھی کوئی چیز دیکھتے۔ چنانچہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ہمیں کئی ٹیلی فون موصول ہوئے۔

کے ڈی اے سے شیخ مولا بخش نے کہا۔ ''یار سنا ہے تم نے ناجائز تعمیر کی ہے۔ بڑے صاحب ٹریکٹر سمیت پانچ بجے شام کو تمہارے مکان کا معائنہ کرنے کے لئے تشریف لارہے ہیں۔''

پولیس اسٹیشن سے ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔ ''رات ہی رات میں تمہارے پاس کار کہاں سے آگئی۔ اچھا بچہ گھبراؤ نہیں اے، ایس آئی صاحب اغوا کی تفتیش سے واپس آجائیں تو ہم لوگ تمہارے ہاں دھاوا بول رہے ہیں۔ ہماری آمد سے قبل ذرا عمدہ قسم کے ناشتے کا انتظام کرلینا اور کار کی رسید اور لائسنس وغیرہ تیار رکھنا۔

سی۔ آئی۔ ڈی کے محکمے سے عبدالستار چاچڑ نے کہا۔ ''بیٹا بہت کہتے تھے کہ تم باغی نہیں ہو۔ آج تمہیں پتہ چلے گا جب ہم تمہارے ہاں سے وائرلیس اور روس اور بھارت کا اسلحہ برآمد کریں گے۔''

ایک فون بیگم کے پاس بھی آیا۔ کسی نے صرف دوٹوک بات کی تھی۔ ''ایک ہفتے کے اندر تم دونوں میاں بیوی کو فوجی حکام کے آرڈر پر گولی سے اڑا دیا جائے گا۔''

بیگم کا ایک ہی فون میں پیٹ خراب ہوگیا۔ ایسے خطرناک وقت میں ہم نے اوسان بجا رکھے اور بیگم کو منع کیا کہ وہ چراغ کو سل پر توڑنے سے باز آجائیں۔ اگر اس کے باعث یہ مصائب آئے ہیں تو ان کا تریاق بھی چراغ ہی کے پاس ملے گا۔

اب آپ کو کیا بتائیں کہ کیا ہوا؟ مختصراً اتنا سمجھ لیجئے کہ ایک گھنٹے کے اندر اندر ہم دونوں میاں بیوی دوبارہ اپنے غریب خانے میں موجود تھے۔ گھر کے عقبی حصہ میں چٹان جوں کی توں موجود تھی اور بیگم نے دس روپے کی منگائی ہوئی ہلدی تک واپس کردی تھی کہ کیا پتہ، بھارتی یا روسی ہلدی نہ ہو اور بیٹھے بٹھائے لینے کے دینے پڑجائیں۔ چولہے پر رکھی ہوئی ہانڈی جل رہی تھی اور سامنے وہی چراغ والا آدمی ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

''کچھ اور حکم دیجئے آقا۔''

ہم نے کہا۔ ''تم فوراً یہاں سے دفع ہوجاؤ۔''

بیگم ہونٹ سکوڑ کر بولیں۔ ''کالا منہ نیلے ہاتھ پاؤں۔''

اور تب وہ لمبا تڑنگا شخص جو دیکھنے میں ہر قسم کے احساس سے عاری معلوم ہوتا تھا ہمارا حکم ماننے کے بجائے موٹے موٹے آنسو بہانے لگا۔

پوچھا۔ ''روتے کیوں ہو؟''

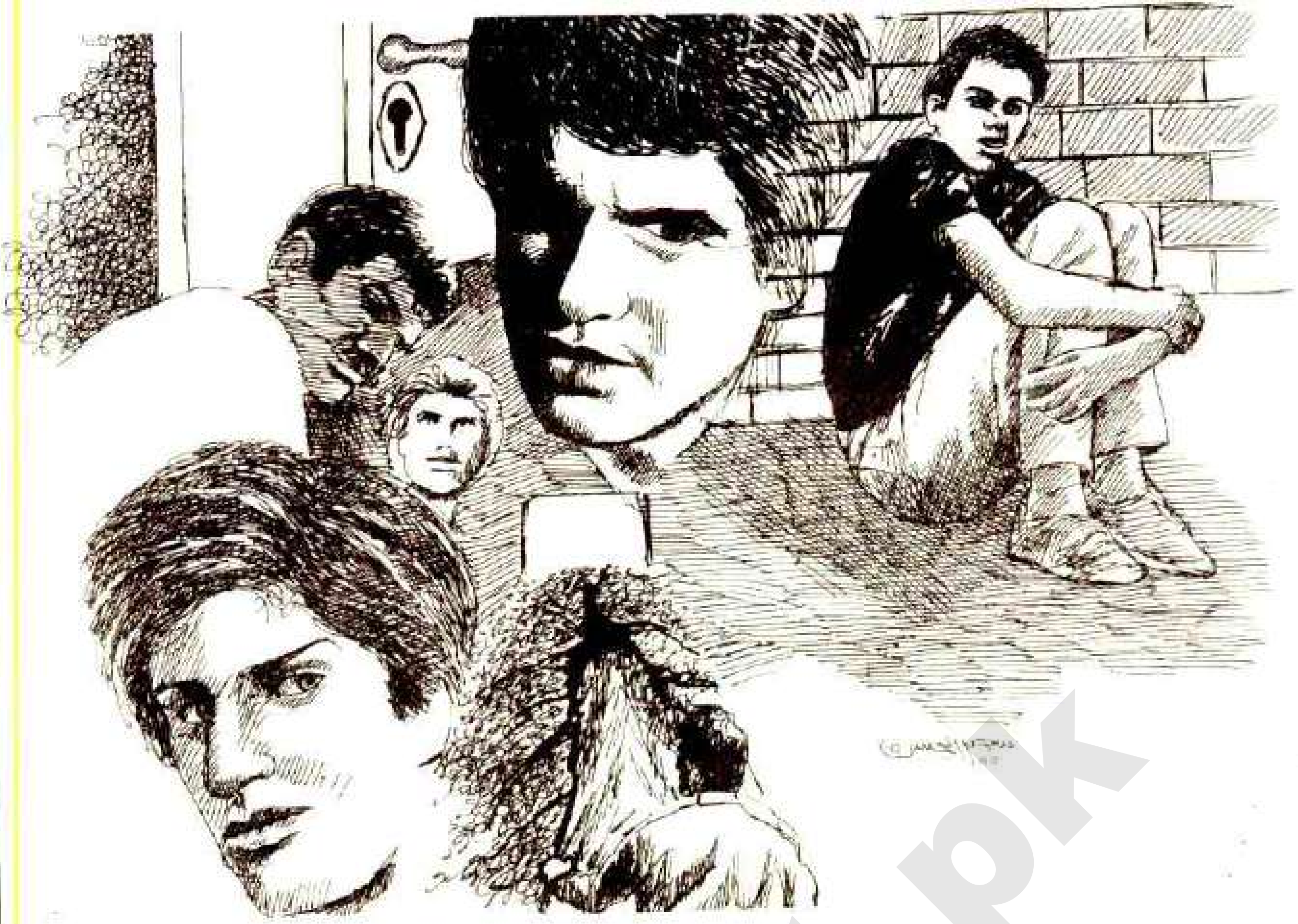
کہنے لگا۔ ''افسوس۔ آج کوئی ہمارا، روادار نہیں۔ جہاں بھی جاتے ہیں دو دن کے اندر ہی لوگ ہم سے اکتا جاتے ہیں۔ ہمارے دیئے ہوئے سارے عطیات واپس کرکے ہمیں فوراً رخصت کردیتے ہیں۔ آہ ہماری قدر کرنے والے لوگ ختم ہوگئے۔ حق مغفرت کرے، عجب آزاد لوگ تھے۔ کاش ہم چراغ کے جن نہ ہوتے۔ دنیا کی خراب مخلوق مثلاً انسان ہی ہوتے۔''

بیگم نے اچھل کر کہا۔ ''تم جن ہو؟''

اس نے آہستہ سے اپنا سر ہلایا۔ ''ہاں میں جن ہوں۔''

بیگم تو فوراً ہی بیہوش ہوگئیں۔ ہم انہیں ہوش میں لانے کے لئے پڑوسیوں سے نخلخہ مانگ کر لائے تو وہ شخص جاچکا تھا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ چراغ بھی غائب تھا۔





نئی قبر

ایس امتیاز احمد۔کراچی

نوجوان جو کہ گورکن تھا اس نے محنت مشاقہ سے ایک قبر تیار کی، قبر کے ارد گرد طرح طرح کے پھول کے پودے لگائے، پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو دل و دماغ کو معطر کرتی تھی اور پھر ایک دن......

ایک نوجوان کا عجیب وغریب سمجھ میں نہ آنے والا دل دہلاتا رونگٹے کھڑے کرتا مشغلہ

مردہ خوب صورت ہونے کی شکل میں اس کا جی کھل اٹھتا تھا۔ نہلاتے وقت وہ مولوی صاحب سے بھی بڑھ چڑھ کر سرگرمی دکھاتا تھا پھر اسے اپنے ہاتھوں پہ اٹھا کر قبر میں اتارتا اور بڑی ہی احتیاط سے اینٹیں چنتا، مٹی ڈالتے وقت لوگوں کو اس سے زیادہ اجازت نہ ہوتی تھی کہ وہ تین مٹھی بھر کر مٹی قبر کی طرف اچھال لیں۔ اس کی بڑی بڑی انگلیاں فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ مٹی سے کھیلتیں اور دیکھتے ہی دیکھتے قبر سانچے میں ڈھالی ہوئی معلوم ہونے لگتی۔

وہ گورکن تھا اور ہوش سنبھالتے ہی اس نے قبر بنانا سیکھ لیا تھا۔ اسے قبر بنانے کا شوق تھا۔ خوب صورت اور دلکش قبریں، ایسی قبریں جنہیں دیکھ کر لوگوں کو مرنے کی آرزو ہو۔

کبھی کبھار وہ نمونے میں تبدیلی بھی کر دیا

کرتا تھا۔ تاہم ایسا بہت کم ہوا تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک صرف دو بار ایسا ہو سکا تھا کہ ایک قبر اس کے باپ کی تھی اور دوسری اس بڑھیا کی جو صائمہ کی ماں کی تھی۔ پوری دنیا میں اس سے دو چیزوں سے عشق تھا۔ قبر اور صائمہ۔

وہ اپنی جھونپڑی میں اکثر چھوٹی چھوٹی قبریں بنایا کرتا تھا۔ جنہیں بار بار بنانے اور مٹانے سے ہر طرف مٹی بکھری رہتی تھی۔ لوگ اسے پاگل کہتے تھے اور اس کا مذاق اڑاتے تھے تاہم اس نے کبھی بھی کسی کی پروا نہیں کی تھی۔ وہ ہر شے سے بے نیاز اپنے کام میں مشغول رہتا تھا۔ اس پوری کائنات میں اگر اسے کسی کی پروا تھی تو وہ صائمہ کی تھی جو کبھی بھی اس پہ نہیں ہنسی تھی۔ اگرچہ آغاز میں اسے یہ قبروں کا سلسلہ بڑا ہولناک لگا تھا اور وہ اس فراخ پیشانی اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والے آدمی کی طرف حیران نظروں سے تکتی رہتی تھی جو قبروں کے بارے میں کمال مسرت اور دلچسپی سے باتیں کرتا تھا۔ آخر کار اس کا خوف بھی آہستہ آہستہ دور ہو گیا تھا اور وہ اس کی باتوں میں دلچسپی لینے لگی تھی۔

انہیں آپس میں ملتے پانچ سال ہو گئے تھے۔ اور اس پانچ سال کے عرصے میں ایک رات بھی ایسی نہیں آئی تھی جب صائمہ اس کی جھونپڑی میں نہ آئی ہو۔

وہ آج بھی ہمیشہ کی طرح اسے جھونپڑی سے باہر ہی آملا تھا اور اس سے لپٹ گیا تھا۔ پل بھر کے توقف کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔ ''جب میں تھکن سے چور ہو جاتا ہوں تو میرے اندر تمہیں دیکھنے کی خواہش کتنی شدید ہو جاتی ہے۔'' اس نے صائمہ کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''کیا تم جانتی ہو؟'' وہ اس کے رخساروں پر جھک گیا۔

صائمہ چادر کی بکل میں ذرا کسمسائی۔ اس نے سلامت کی تیز تیز سانسوں کو چہرے پر محسوس کیا۔ پھر اس نے سرگوشی کی۔ ''میں آتو گئی ہوں، پھر تم ایسا کیوں سوچتے ہو!'' اس کے لہجے میں دکھ کی چاشنی تھی۔

سلامت نے اسے اپنے سینے کے ساتھ چمٹائے رکھا اور اس کے بالوں کی خوشبو اپنے پھیپھڑوں میں بھرتا رہا۔ ذرا دیر کے بعد وہ جھونپڑی میں چلے گئے، زنگ آلود لالٹین کی دھیمی دھیمی روشنی میں ہر شے دھندلائی ہوئی تھی، جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی چمنی کو کاغذ کے ساتھ جوڑا ہوا تھا اور جھونپڑی کے دائیں کونے میں بوسیدہ سا ٹرنک پڑا تھا جس کے رنگ کی جگہ زنگ نے لے لی تھی۔ اس کے ساتھ ہی چارپائی بچھی تھی، دیوار پر دو کیلیں تھیں ایک پر قمیض اور دوسری پر لالٹین لٹکا دی گئی تھی دیوار کا وہ حصہ جہاں لالٹین ٹنگی ہوئی تھی کالا ہو چکا تھا، جھونپڑی کے کچے فرش پر متعدد جگہ چھوٹے چھوٹے گڑھے تھے اور مٹی بکھری ہوئی تھی۔

صائمہ چارپائی پر بیٹھ چکی تھی، اس نے ٹانگیں لٹکائی ہوئی تھیں، جنہیں اب وہ ہولے ہولے ہلا رہی تھی، اس نے ہاتھ کی ہتھیلی پر ٹھوری جمائی تھی اور اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی طویل اور خمیدہ پلکوں کو بار بار جھپک رہی تھی۔ اس کی بکل ڈھیلی ہو گئی تھی اور دوپٹہ سر سے ڈھلک گیا تھا۔

''صائمہ!'' سلامت نے اسے ٹہوکا دیا۔

صائمہ نے جواباً اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اوپر اٹھا دیں۔ اس کی مسکراہٹ کا عکس اس کی آنکھوں سے بھی جھلک رہا تھا۔ ہم نے جو قبروں کے گرد پھول لگائے تھے ناں۔ وہ کھل گئے ہیں کیا تم دیکھو گی؟''

''ہاں۔'' صائمہ نے بکل کو درست کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم کہو گے تو میں ضرور دیکھوں گی۔''

وہ دونوں جھونپڑی سے باہر نکل آئے۔ سلامت اسے قبروں کے اس حصے کی طرف لے آیا تھا جہاں انہوں نے پھول لگائے تھے اور جنہیں وہ ہر روز پانی دیا کرتے تھے۔

بھینی بھینی خوشبو اب ان کے نتھنوں میں محسوس ہونے لگی تھی۔ ذرا دیر کے لئے وہ بے خود ہو گئے تھے۔ کسی نے کسی سے بات نہیں کی۔ آخر کار صائمہ نے سکوت توڑا۔ ''میرا جی خوشی سے پھولوں ایسا ہو رہا ہے۔'' اس کا

چہرہ تمتما رہا تھا اور آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔
''تم دیکھ لینا۔'' سلامت نے کہا۔ اس کی آواز بھاری ہوگئی تھی اور وہ اس وقت بڑا ہی جذباتی ہورہا تھا۔
''میں اسے باغ سے زیادہ خوبصورت بنادوں گا۔ لوگ یہاں دفن ہونا قابل فخر تصور کریں گے۔'' اس کے ہونٹ کپکپانے لگے تھے۔
''کیا میں ایک پھول توڑلوں۔'' صائمہ نے پوچھا وہ جھجکنے لگی تھی۔
''نہیں نہیں۔'' ایکا ایکی وہ گھبرا گیا۔ اس نے عجیب طریقے سے ہاتھ کو جھٹکا اس کی آنکھوں سے نہ معلوم خوف جھانکنے لگا تھا اور اس کا رنگ بھی بدل گیا تھا۔ ''تم ایسا نہ کروگی۔'' وہ ایک لمحے کے لئے رک گیا۔ تاہم اس نے جملہ مکمل کرنے میں دیر نہیں کی۔ ''تم نہیں جانتیں یہ سب......'' اس نے قبرستان کا احاطہ کیا۔
''یہ سب کچھ مجھے کس قدر عزیز ہے۔'' پھر وہ زمین پر بیٹھ گیا اس نے پھولوں پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرا پھول تو دیکھنے کے لئے ہوتے ہیں نا۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔ اس کا لہجہ بالکل کسی خوف زدہ بچے کی طرح تھا تاہم اس کا رنگ جو ذرا دیر پہلے زرد ہوگیا تھا۔ اب معمول پر آچکا تھا وہ ذرا دیر تک بیٹھا رہا۔ اس کی طبیعت آہستہ آہستہ اعتدال پر آرہی تھی۔ آخر کار وہ کھڑا ہوگیا۔ اس نے صائمہ کو بازو سے پکڑلیا۔ وہ جھونپڑی کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ چپ چاپ چل رہے تھے اور ان کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ ایکا ایکی وہ رک گیا اس کی نظریں داہنی جانب والی قبر پر رک گئی تھیں۔
صائمہ نے چونک کر اسے دیکھا۔
''کیا ہوا؟''
اس نے فوراً جواب نہیں دیا۔ ذرا دیر کے لئے وہ ہونٹ کاٹتا رہا۔ ''یہ قبر بیٹھ گئی ہے۔'' اس نے ایک پرانی قبر کی طرف اشارہ کیا۔
''تو اس قدر گھبرانے کی کیا بات ہے؟''
اس کا چہرہ ایکا ایکی سرخ ہوگیا اور آنکھیں ابلنے لگیں...... گھبرانے کی بات اس نے دہرایا۔ ''تمہارے لئے اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔'' وہ بیٹھ گیا۔
''ایک بنائی ہوئی قبر کا بیٹھ جانا کیا معنی رکھتا ہے اسے صرف میں ہی سمجھ سکتا ہوں۔'' اس نے ہونٹ دانتوں میں دبالیا اس کے چہرے پر کرب کی بہت ہی تیز لہر دوڑ گئی ''اس کا مطلب ہے ......'' وہ رک گیا اس نے وحشت کے ساتھ ادھر ادھر دیکھا۔ ''میں اناڑی ہوں۔'' اس نے بڑی ہی تکلیف کے ساتھ یہ جملہ ادا کیا۔ اس کی آواز بھرا گئی تھی اور اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپالیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے قبر کو ٹٹولا...... پھر وہ کھڑا ہوگیا اس کے چہرے پر سختی سی آگئی تھی۔ میں اسے ابھی درست کروں گا۔ کل سے پہلے ملاقات کی کوئی صورت نہیں ہوسکے گی۔'' اس نے جواب کا انتظار نہیں کیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا جھونپڑی کی طرف چلا گیا۔
صائمہ جواب تک بت کی طرح ساکت و جامد تھی اسے دیکھتی رہی۔ وہ یکایکی اپنے آپ کو اداس محسوس کرنے لگی تھی۔ اس نے جھونپڑی کی طرف دیکھا اپنی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں سے ان آنکھوں سے جن کی چمک ایک ہی لمحے میں گم ہوگئی تھی اور جن میں اداسی اور ویرانی رات کی سیاہی کی طرح آپ ہی آپ امنڈتی چلی آرہی تھی پھر وہ تھکے تھکے قدموں سے گاؤں جانے والی پگڈنڈی پر چلنے لگی۔
سلامت جلد ہی واپس آگیا اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور چال میں لڑکھڑاہٹ تھی قبر کے سرہانے اس نے کدال اور کھرپا رکھ دیا۔ ''آخر یہ سب کیا ہے؟'' اس نے سوچا ''یہ جو خواہش تھی اپنے کام میں کمال حاصل کرنے کی جس کے لئے میں نے اپنی زندگی وقف کردی، آخر اس سب کا کیا بنا؟ کچھ بھی نہیں۔'' اس نے تاسف کے ساتھ سر ہلایا اور بڑے ہی دکھ کے ساتھ سوچا۔ ''میں نے محض اپنا وقت برباد کیا ہے۔'' اس نے کھرپا اٹھالیا اور ہولے ہولے مٹی ہٹانے لگا۔ ''تو کیا میں اسے خیرآباد کہہ دوں؟'' اس نے سوچا۔
''نہیں نہیں۔'' اس کا دل تڑپنے لگا۔ ''یہ نہ ہوسکے گا۔ اور کبھی ایسا ہوگیا تو اس کے لئے بہت بڑے

طوفان کی ضرورت ہوگی۔" تاہم ناکامی کا کربناک احساس اسے ڈس رہا تھا۔ آخری تاریخوں کا چاند مشرقی افق سے ہولے ہولے جنم لے رہا تھا وہ سرخ تھا اور اس میں روشنی کو بھی نہ تھی۔

سلامت بڑا اداس اور پژمردہ لگ رہا تھا، اس نے شام تک قبر کو صاف کر دیا تھا، قبر کو بند کرنے والی اینٹیں ٹوٹ چکی تھیں وہ ایک دم مسرت سے کھل اٹھا۔ ذرا دیر کے لئے جو اسے خلاف توقع خوشی ملی تھی ہاتھ پیر پھول گئے۔ کافی دیر وہ چپ چاپ بیٹھا تھا۔ آخر جب اس کی طبیعت اعتدال پر آئی تو اس نے فوراً ہی قبر کو مٹی سے برابر کر دیا۔ پھر اس نے کھرپے کی پشت سے تھپکیاں دے کر قبر کے کونے نکالے۔" اب اس کا روپ نکھر آیا ہے۔" وہ بڑبڑایا پھر اس نے انگوٹھے کے ساتھ پسینہ پونچھا اور اوزار اٹھا کر جھونپڑی میں آ گیا مسکراہٹ سے اس کے ہونٹ پھیلے ہوئے تھے۔ اس نے اوزاروں کو دھو کر سرسوں کا تیل لگایا، اس کا مزاج بڑا خوشگوار ہو گیا تھا، اور غم کی گھٹاؤں سے جو تاریکی اس نے اپنی روح پر چھائی ہوئی محسوس کی تھی، مسرت کے نور میں دم توڑ گئی تھی وہ چارپائی پر دراز ہو گیا اس کا جسم دکھ رہا تھا، تاہم وہ خود کو بڑا ہی ہلکا محسوس کرنے لگا تھا۔

اگلے دن وہ کافی دیر تک سوتا رہا، جب وہ اٹھا تو سورج کافی بلندی پر پہنچ چکا تھا اس روز وہ سارا دن قبروں کے درمیان سے گھاس کھودتا رہا۔ شام کے وقت وہ نہا کر جھونپڑی میں آ گیا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ وہ اپنے نئے ڈیزائن کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا۔

ان دنوں وہ ایک نئی قبر بنانے کی فکر میں تھا کافی دنوں سے اس کے ذہن میں ایک ڈھانچہ سا ابھر رہا تھا، بلکہ اب تو کافی حد تک مکمل ہو گیا تھا، اس نے ایک بار صائمہ سے دعویٰ بھی کیا تھا اور وہ اس وقت بڑا جذباتی ہو رہا تھا۔

"تم دیکھ لینا ایسی قبر ساری دنیا میں نہیں ملے گی۔ میں اسے اپنے خون سے سینچوں گا۔" اس نے دونوں ہاتھ کمر پر باندھ لئے تھے اور جھونپڑی میں ٹہلنے لگا تھا، اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آ گئی تھی۔

"تو وقت آ گیا ہے کہ اسے شروع کر دیا جائے۔" اس نے چارپائی پر لیٹے لیٹے سوچا۔ "اور اب اس محبوبہ کو جسے ہر روز میں تصور کی آنکھ سے دیکھتا ہوں میرے ہاتھوں زمین کے اس ٹکڑے پر جنم لینا ہوگا، جو مدت سے اس کا منتظر ہے میں اسے کل ہی شروع کر دوں گا، مجھے اپنا آپ پھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا ہے۔" وہ اٹھ کر جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ اس کے رخسار تمتمانے لگے تھے۔ "اور ہاں میں اسے کل ہی شروع کر دوں گا۔" اس نے بلند آواز سے کہا، پھر وہ چلتا ہوا اس جگہ تک گیا جہاں اس شاہکار کے لئے عرصے سے زمین پڑی ہوئی تھی، یہ جگہ بقول اس کے پورے قبرستان میں جنت کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہاں چھوٹے سے قطعے کو لمبے اور گھنے درختوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا، اور زمین پر گھاس اگ آئی تھی جو بڑی دلکش لگتی تھی اس نے نرم نرم گھاس پر ہاتھ پھیرا جس پر اوس کے موتی پڑے ہوئے تھے، اس پر قبر کے نشانات لگائے اور واپس آ گیا۔

جھونپڑی کے وسط میں کھانا رکھا تھا جو کوئی اس کی غیر موجودگی میں رکھ گیا تھا اس نے کھانا کھا کر برتن کونے میں رکھ دیئے اور دوبارہ لیٹ گیا۔ وہ اپنے اس شاہکار کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا۔ کافی دیر کے بعد جب وہ اس سوچ کے سمندر سے نکلا تو رات بھیگ چکی تھی اور ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ اس نے قبرستان کے درختوں کو سانس لیتے ہوئے محسوس کیا۔ اس نے اٹھ کر پانی پیا، پھر وہ جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ اس نے ستاروں کی مدد سے جان لیا تھا کہ صائمہ کو دیر ہو گئی ہے۔

"وہ کہیں ناراض نہ ہو گئی ہو؟" ایک لمحے کے لئے اس نے سوچا۔ "آخر مجھے اس طرح الوداع کہنے کا کیا حق تھا۔"

وہ قبروں کے درمیان سے ہو کر گزرنے والی پگڈنڈی پر گاؤں کی طرف چلنے لگا تاہم اس نے قبرستان کی حد عبور نہیں کی، اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے سر اٹھانے لگے تھے اور وہ دل جو ابھی ابھی

مسرت کے نغمے گا رہا تھا اب ہلکے ہلکے اضطراب سے دوچار ہونے لگا تھا بے چینی اور انتظار کی شدید کوفت اس نے پہلی بار محسوس کیا، وہ اس پگڈنڈی پر دیر تک چکر لگاتا رہا۔ جب کافی دیر گزر گئی تو ستاروں کی دھیمی دھیمی روشنی میں ایک سایہ ابھرا جو کمبل میں لپٹا لپٹایا جھونپڑی کی طرف بڑھنے لگا۔

آج اس نے صائمہ کو کافی فاصلے پر ہی جالیا تھا، وہ ذرا دیر تک چپ چاپ کھڑے رہے۔ آخر سلامت نے ہاتھ تھام لیا اور وہ دھیرے دھیرے چلنے لگے۔ ابھی تک سلامت نے لالٹین نہیں جلائی تھی۔

''کس قدر اندھیرا ہے۔'' صائمہ نے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

''جب تم نہیں آتی ہو تو یہاں کی ہر شے اجالے کی کرن تک کو ترس جاتی ہے، میرا دل ڈوبنے لگتا ہے اور کوئی بھی شے مجھے اچھی نہیں لگتی۔''

سلامت نے لالٹین جلادی اور کمرے میں دھیمی دھیمی روشنی پھیل گئی، صائمہ ابھی تک کھڑی تھی۔ اس کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔

''یہاں میرے پاس آؤ۔'' سلامت نے چارپائی پر ہاتھ سے جگہ بنائی۔ صائمہ اس کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ کیا تم ناراض ہوگئی ہو؟

صائمہ نے پلکیں اٹھائیں اور سلامت کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''میں تم سے ناراض نہیں ہوسکتی۔'' اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔ وہ مسکرائی اور اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبالیا۔ سلامت نے اپنی طرف کھینچا وہ اس کی چھاتی سے ڈھے سی گئی مگر وہ سہمی ہوئی چڑیا کی طرح چمٹ گئی تھی۔

جب تم دیر سے آتی ہو تو میری روح پھڑپھڑانے لگتی ہے۔ میرا جی کسی کام میں نہیں لگتا۔ ہر شے مجھے تنہائی کا احساس دلاتی ہے۔'' اس نے صائمہ کے بالوں کو چوما۔

''میرا بھی تو جی نہیں لگتا۔'' وہ اداس ہوگئی تھی اور اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا، اس کی آواز دھیمی مگر غمگین

تھی۔ ''سارا دن دل بجھا بجھا سا رہتا ہے،اور ہر چیز کو اس طرح کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھتی ہوں، جیسے کچھ کھو گیا ہے۔''اس کی طویل اور خمیدہ پلکیں بھیگ گئیں۔اس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبالیا۔اس کی ٹھوری پر ننھے ننھے گڑھے پڑ گئے تھے اور اپنی آنکھوں کو اس نے بڑے ہی کرب کے ساتھ بند کرلیا تھا۔

''میں نہیں جانتی میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔وہ اس کی گود میں گر گئی اور سسکنے لگی۔

''تم رویا نہ کرو۔''اس نے صائمہ کا چہرہ جو آگ کی طرح دہک رہا تھا ہاتھوں میں اٹھالیا۔''تمہارے آنسو مجھ سے برداشت نہیں ہوسکتے۔ سلامت نے اس کی آنکھوں رخساروں اور لرزتے ہوئے ہونٹوں کو چوما۔پھر اس نے صائمہ کی آنکھوں میں جھانکا جو سرخ ہوگئی تھیں،اور پپوٹے معمول سے بھاری تھے، شاید وہ رات بھر نہیں سوئی تھی۔

باہر ہوا تیز ہوگئی اور درختوں کے پتے بری طرح کھڑکھڑانے لگتے تھے۔

وہ کافی دیر تک اسی طرح بیٹھے رہے،جب کافی وقت گزر گیا تو وہ پھول دیکھنے قبروں کی طرف چلے گئے۔

آٹھ دن کی مسلسل جدوجہد کے بعد اس نے قبر مکمل کرلی تھی۔ اس کا جسم مشل ہوگیا تھا،اور مضبوط ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے تھے تاہم وہ بے پناہ مسرت سے دوچار ہوا تھا۔

اس نے قبر پر اس طریقے سے پھول لگائے تھے کہ قبر پھولوں سے گندھی ہوئی معلوم ہوتی تھی،اس نے پھولوں کے پودے اوپر سے نیچے کی طرف لگائے تھے اور ان کا درمیانہ فاصلہ ایک انچ سے زیادہ نہیں تھا۔اس طرح پھولوں کے ڈنٹھل نظر نہیں آتے تھے اور پھول پر پھول چڑھ گئے تھے یوں لگتا تھا جیسے پھولوں کی چادر بچھادی گئی ہو۔ یہ سلسلہ ابھی ایک طرف ہی ہوا تھا۔کیونکہ نیچے کی طرف سے قبر کھلی تھی،تاہم اس نے زمین پر پھول لگادیئے تھے تاکہ ضرورت کے وقت پھول تیار ہوچکے ہوں۔ اس کے علاوہ ذرا ذرا سے فاصلے پر انار اور بادام کے درخت لگادیئے گئے تھے، جنہوں نے قبر کا چاروں طرف سے احاطہ کرلیا تھا۔درخت کافی بڑے تھے اور وہ انہیں شہر سے خرید کر لایا تھا۔ان چیزوں کو خریدنے کے لئے اس نے کپڑوں کا اکلوتا اور نیا جوڑا بمعہ ٹرنک کے فروخت کردیا تھا وہ بے حد خوش تھا،ایسی خوشی اور ایسا اطمینان اس نے زندگی میں پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا،اس کے ہونٹوں سے ایک شعر غیر اختیاری طور پر پھوٹ پڑا۔پھر اپنے جسم کو بے معنی انداز میں حرکت دی۔اس کا جی چاہا وہ ناچے لیکن اپنی اس خواہش کو وہ عملی جامہ پہنا نہیں سکا۔اس نے جھونپڑی اور قبر تک کئی چکر لگا ڈالے۔وہ صائمہ کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اسے اپنا شاہکار دکھانا چاہتا تھا جس کے لئے وہ عرصے سے تڑپ رہا تھا۔ آخر جب اسے صائمہ دکھائی دی تو اس نے دور ہی سے پکار کر کہا۔''میں نے وہ قبر مکمل کرلی ہے۔''

اس نے مزید گفتگو کے بغیر ہی اس کا رخ قبر کی جانب پھیر دیا۔صائمہ اس کے پیچھے چلنے لگی تھی۔اس نے خلاف معمول صرف دوپٹہ ہی اوڑھ رکھا تھا،اس کی کمر پتلی اور خمیدہ تھی۔جس سے چلتے وقت اس کے دونوں حصے الگ الگ چلتے ہوئے محسوس ہورہے تھے۔

صائمہ اسے دیکھ کر واقعی مسحور ہوگئی تھی۔ بادام اور انار کے درختوں پر کلیاں کھل رہی تھیں۔پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو فضا میں پھیل رہی تھی۔وہ چپ چاپ کھڑی تھی اور آس پاس کی ہر شے کو ٹکر ٹکر دیکھے جارہی تھی۔

سلامت بڑا جذباتی ہورہا تھا، اس کا سانس تیزی سے چل رہا تھا۔وہ کافی دیر تک قبر کی تعریف میں تقریر کرتا رہا،آخر کار وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''میں رات یہیں گزارنا چاہوں گا تم یہیں ٹھہرو۔''

اس نے جواب کا انتظار نہیں کیا اور جھونپڑی کی طرف بھاگ گیا۔

صائمہ کھڑی تھی اور سدا بہار پھولوں کی خوشبو سے لطف اندوز ہورہی تھی،ذرا ہی دیر کے بعد سلامت

بھی آ گیا۔ اس نے چارپائی اٹھا رکھی تھی۔ اس نے قبر سے ہٹ کر پھولوں کی کیاریوں کے بالکل ساتھ چارپائی بچھادی۔ وہ دونوں چارپائی پر بیٹھ گئے۔

''یہ ابھی مکمل نہیں ہے بہرحال جلد ہو ہی جائے گی۔'' اس کا تنفس ابھی تک غیر متوازن تھا وہ صائمہ کے قریب ہی لیٹ گیا۔ ''میں تھک گیا ہوں۔'' اس نے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور آنکھیں بند کرلیں۔

صائمہ قبر کی تعریف میں بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے اور کیسے کہے اس کی آنکھیں اضطرابی انداز میں گردش کررہی تھیں۔ وہ اپنا ہونٹ کاٹنے لگی تھی۔ اور اس کی انگلیاں بھی ایک دوسرے میں الجھ گئی تھیں۔

ایکا ایکی گاؤں سے چیخنے اور چلانے کی آوازیں بلند ہوئیں رات کے سناٹے کو عورتوں کے بین بھنبھوڑ رہے تھے، اور فضا ہولناک شور سے لرز اٹھی تھی۔

''مجھے جانے دو ہمارا پڑوسی فوت ہوگیا ہے۔'' وہ تڑپ کر اٹھی اور پگڈنڈی پر بگٹٹ بھاگنے لگی۔

''تو کیا یہ مکمل ہوگئی؟'' اس نے اپنے شاہکار کے بارے میں سوچا۔ آج ہی رات اس پر آخری پھول لگادیئے جائیں گے۔ وہ اٹھا اور مٹی کے ڈھیلے باریک کرنے لگے۔ اس کام سے فارغ ہوکر وہ بالٹی میں پانی لایا۔ آخر میں اس نے قبر تک نالی کھینچی جو نلکے سے پانی لاتی تھی کام ختم کرکے سامان اس نے جھونپڑی میں رکھ دیا۔

''تو کیا اس قبر میں جسے میں نے اپنے خون سے سینچا ہے ایک بڈھا آرام فرمائے گا۔'' اسے کچھ کراہیت سی ہوئی۔ ''نہیں نہیں۔'' اس نے فوراً ہی تردید کردی میں اس کی تکمیل میں تاخیر برداشت کرلوں گا۔ لیکن اس میں کوئی اتنا ہی خوبصورت بدن بھی ہوگا۔''

اس نے فیصلہ کرلیا اور نئی قبر کھودنے میں مصروف ہوگیا۔ اس آدمی کو نئی قبر میں دفنا دیا گیا۔ تاہم سلامت کے دل میں کھد بدر ہنے لگی۔ قبر کے مکمل ہونے کا تجسس اضطراب میں بدل گیا تھا۔

''مجھے اس معیار کا مردہ کبھی نہ مل سکے گا۔'' وہ اب اکثر سوچنے لگا تھا، اور بے چینی جس میں دکھ کی آمیزش ہوتی ہے اسے تنکے کی طرح کریدنے لگی تھی، روز بروز ہنسی اس کے چہرے سے رخصت ہوتی جارہی تھی، اس کی آنکھوں کی چمک بجھ گئی تھی اور چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا، کبھی کبھی اچانک ہی ایک ہی مسکراتا ہوا چہرہ فضا میں ابھرتا، خوب صورت اور دلکش چہرہ جو واقعی اس کے معیار پر پورا اترتا تھا اور جس کے ایک بال میں بھی کبھی اس نے کسی خامی کو محسوس نہیں کیا تھا۔ ''نہیں نہیں۔'' وہ اپنا بوجھل سر جھٹکتا اس کے جبڑے بھنچ جاتے اور آنکھیں حلقوں سے باہر ابلنے لگتیں۔ ''میں کس قدر کمینہ ہوتا جارہا ہوں۔'' وہ سوچتا اور اس خیال سے پیچھا چھڑانے کے لئے دیوانوں کی طرح قبروں میں بھاگنے لگتا جو اس کے ذہن میں اپنے دانت گاڑنے لگا تھا۔

کبھی کبھی اسے یہ وہم بھی ستانے لگا تھا کہ وہ اسی طرح سوچتے سوچتے مرجائے گا اور لوگ اس جگہ پر کسی بھی ایسے آدمی کو دبادیں گے جس کی اہمیت اس کے نزدیک ذرا بھی نہ ہوگی۔

کافی دن وہ اسی غم میں گھلتا رہا وقت کے ساتھ ساتھ اس کی صحت بھی گرتی جارہی تھی۔

''زندگی کی ہر خوشی تو پوری نہیں ہوسکتی اور اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ زندگی کا ساتھ ہی چھوڑ دیا جائے۔'' اب وہ زندگی سے مفاہمت پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ ''میں اپنے غم کو اس نے فیصلہ کرلیا۔ صائمہ کی محبت کے سائے میں بھلادوں گا اور اس قبر کو کل ہی ہمیشہ کے لئے بند کردوں گا جو مجھ سے ہر شے چھینے جارہی ہے۔'' وہ پگڈنڈی پر ٹہلنے لگا۔ اس نے چاند کی طرف دیکھا جو کمان کی طرح تنا ہوا تھا۔ اس نے ہوا میں دو تین لمبے لمبے سانس لئے اور سوچا ''رات کتنی حسین'' ہے۔ وہ گنگنانے لگا دھیمی دھیمی مگر غمگین آواز میں جو صاف مرجھائی ہوئی لگ رہی تھی پھر اس نے پل بھر کے لئے سیٹی بجائی اور تال کے لئے سر کو ہلایا۔ ایکا ایکی اس نے محسوس کیا کہ وہ ایکٹنگ کررہا ہے۔ حالانکہ ان چیزوں کے لئے اس کے دل

میں رتی بھر جگہ نہیں۔

اچانک وہ صائمہ سے ٹکرا گیا جو چادر کے بکل میں سمٹی سمٹائی کھڑی تھی، وہ چوروں کی طرح ٹھٹک گیا اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ صائمہ نے اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے سلامت کو دیکھا پھر نظریں جھکا لیں۔ وہ پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے لگی تھی۔

''تم آ گئی۔'' سلامت نے بجھی بجھی آواز میں پوچھا اس کا رنگ اڑا ہوتا تھا اور آج پہلی بار وہ نظریں ملانے سے گریز کر رہا تھا۔ ''ہاں۔''

وہ جھونپڑی میں چلے گئے۔ سلامت نے لالٹین جلانے کے لئے اتاری تو اس کی چمنی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ اس نے بغیر چمنی کے ہی لالٹین جلالی اور کانچ کے ٹکڑے باہر پھینک دیئے۔ پھر وہ اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ وہ اپنا جسم چرا رہا تھا، صائمہ کا چہرہ قدرے دبلا اور زرد ہو گیا تھا۔ سلامت ابھی تک خاموش تھا اور یہ بالکل ہی خلاف معمول تھا۔

''کیا میں اب تم کو اچھی نہیں لگتی؟'' صائمہ نے پوچھا۔ وہ مرجھائی ہوئی اور پژمردہ سی لگ رہی تھی۔

''میں اب صرف تمہارے سہارے سے جی رہا ہوں!'' اس کی آواز بھاری تھی اور اس کے چہرے پر تھکن کے گہرے تاثرات تھے پل بھر کے توقف کے بعد اس نے کہا۔ ''مجھے عجیب عجیب خیال آتے ہیں کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے آنے والے لمحے میں میرے جسم کی دھجیاں اڑ جائیں گی، میں تم سے کہنا چاہتا تھا کہ اب...... اعتماد مجھے خود اپنی ذات پر بھی نہیں رہا۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ دو چیزوں کے درمیان آ کر میں پس جاؤں گا۔'' اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔ ''یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے تم لیٹ جاؤ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔''

وہ لیٹ گیا کوئی سایہ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا وہ تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے جبڑے بھینچ گئے تاہم جلد ہی اس نے خود پر قابو پا لیا اور صائمہ کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے صائمہ کی پتلی کمر پر ہاتھ پھیرا اس کی گوری گوری لمبی انگلیوں کو ہاتھوں میں لے کر دبایا، اس کے گلاب جیسے ہونٹوں کو چوما پھر اس نے صائمہ کو اپنے ساتھ چمٹا لیا۔

ایسا لگتا تھا جیسے وہ صائمہ کو اپنے سینے میں پیوست کر لینا چاہتا ہو، پھر وہ چارپائی پر لیٹ گیا اور اسے کندھے سے پکڑ کر کھینچا۔ صائمہ نے اپنے رخسار اس کے سینے میں پیوست کر دیئے اس نے صائمہ کی سانس کو اپنے سینے پر پھیلتے محسوس کیا۔ اس نے صائمہ کے بھرے بھرے گالوں کو گدگدایا۔ پھر اس کی گردن پر ہونٹ رکھ دیئے اس کی سانس تیز ہو گئی تھی، اس نے اپنے اندر ایک عجیب سی آگ کو پھیلتے محسوس کیا۔

ایکا ایکی وہ تڑپ کر کھڑا ہو گیا، اس کے حلق سے بڑی ہی عجیب و غریب آواز نکلی جو کراہ سے ملتی جلتی تھی، صائمہ اسے پاگلوں کی طرح تکنے لگی تھی۔ ''کیا ہوا؟''

اس نے جواب نہیں دیا، وہ دروازے تک گیا اور اپنے بالوں کو مٹھی سے نوچا۔ پھر ایکا ایکی وہ پلٹ آیا اور صائمہ کے ساتھ دوبارہ لیٹ گیا وہ پاگلوں کی طرح اسے چھومنے لگا تھا، اس کے ہاتھ صائمہ کو جگہ جگہ سے اٹھا کر ہونٹوں کے قریب لا رہے تھے۔

صائمہ پر مدہوشی سی چھا گئی تھی، اس نے اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا تھا، وہ گہرے گہرے سانس لے رہی تھی اور آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس پر مکمل خود سپردگی کی حالت طاری ہو چکی تھی، سلامت نڈھال سا ہو رہا تھا اور اس کا پورا جسم کانپنے لگا تھا، تاہم اس نے اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے صائمہ کے گال ملے اور تھپتھپائے پھر اس کی کانپتی کپکپاتی انگلیاں گردن کی طرف سرک گئیں۔

اگلے دن لوگوں نے دیکھا کہ قبرستان میں نئی قبر مکمل ہو چکی تھی۔ گورکن کا کہیں نشان تک نہیں تھا۔ تاہم اس کے اوزار قبر کے بکھرے ٹوٹے پڑے تھے۔





ناگ کا انتقام

ایس امتیاز احمد-کراچی

ناگ نے اچانک عورت کے پائوں میں لپٹ کر آناً فاناً ڈس لیا، عورت کی چیخ آسمان کو دہلا گئی اس کی درد ناک اور بھیانک چیخ سننے والوں کا رواں رواں کانپ گیا، ناگ نے کئی سال بعد اپنا بدلہ لے لیا تھا۔

لرزہ براندام اور رگوں میں خون کو منجمد کرتی ...... پرتحیر ...... حیرت انگیز اور خونی کہانی

گلی میں کون تھا جو انہیں چھیڑتا اور ستاتا نہ ہو جسے دیکھو چچا کے پیچھے ہاتھ جھاڑ کر پڑ جاتا تھا اور تو اور وہ عثمان دودھ والے بھی اچھا خاصا دودھ ناپتے ناپتے انہیں دیکھتے ہی بچہ بن جاتے اور چلانے لگتے "چچا ٹلی" اور یہ آواز گلی میں اِدھر اُدھر کھیلتے بچوں پر مقناطیس کا کام کرتی اور اُن کی آن میں چچا ٹلی کو گھیر کر نعرے لگانے لگتے۔

"چچا...... ٹلی تمہاری بیوی گئی کدھر؟" یہ سنتے ہی چچا ٹلی گردن ہلاتے رہتے اور چلتے چلتے بڑبڑاتے۔ "ناگ نے کھالیا! جہنم میں گئی جہنم میں! تم کون ہو جو میں تم کو بتاؤں۔"

بچے ان کے چلے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک چچا ٹلی کی آوازیں لگاتے رہتے اور گلی میں آنے جانے والوں کو معلوم ہو جاتا کہ چچا ٹلی ابھی یہاں سے

گزرے ہیں۔

چچا ٹلی کی عجیب و غریب شخصیت محلے کے رہنے والوں کے لئے کوئی خاص اثر نہیں رکھتی تھی، شاید اس لئے کہ گھر کی مرغی دال برابر والی بات تھی ورنہ چچا ٹلی اپنے دیوانے پن کے باوجود پرکشش نظر آتے تھے، ان کی عمر ہوگی کوئی ساٹھ پینسٹھ سال لیکن کمر ایسی سیدھی جیسے قطب صاحب کی لاٹ، چلتے یوں تھے جیسے کھنا یا تھی، دیکھتے تو معلوم ہوتا جیسے شیر دیکھ رہا ہے، اتنی عمر تھی لیکن کیا مجال جو لاٹھی چھڑی یا ڈنڈا ہاتھ میں لیا ہو، میں نے انہیں کبھی کسی سے بات کرتے ہوئے دیکھا نہیں، گلی کے بچے یا محلے کے سرپھرے انہیں چھیڑتے، تنگ کرتے تو وہ کچھ بڑبڑاتے ایک آدھ گالی بھی دے دیتے اور بس۔

ان کی ذات اور شخصیت پر ابھی کچھ دن اور پردے پڑے رہتے اگر دو چار بے فکرے بارش کی وجہ سے کہیں آنے جانے کی بجائے عثمان دودھ والے کی دکان پر وقت گزارنے کے لئے نہ بیٹھ جاتے۔ اچھی خاصی بارش تھی، گلی میں سناٹا چھایا ہوا تھا، لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبکے پڑے تھے، بس رونق تھی تو عثمان کی دکان پر دودھ اُبل رہا تھا باتیں ہو رہی تھیں، عجیب عجیب قصے کہانیاں جن کا سر تھا نہ پیر۔ اتنے میں گلی کے نکڑ کی طرف سے چچا ٹلی آتے دکھائی دیئے۔ وہ بارش میں شرابور ہو رہے تھے۔ انہیں آتے دیکھ کر سب نے بلاوجہ خاموشی اختیار کرلی، وہ قدم بڑھا کر دکان کے سامنے رک گئے۔ صدری کی جیب سے 10 روپے نکالے اور عثمان کے سامنے رکھ دیئے، عثمان نے 10 روپے خاموشی سے اٹھالئے، آب خورے میں دودھ نکال کر دیا۔ وہ آب خورہ اٹھا کر چپ چاپ اپنے کھنڈر کی طرف چلے گئے، ان کے جاتے ہی ساری کہانیاں قصے ان ہی کے متعلق شروع ہوگئے، ایک صاحب بولے۔ ''میاں ایک جن نے ان پر قبضہ کر رکھا ہے۔''

دوسرے نے کہا۔ ''سونا بنانے کا عمل کر رہے تھے عمل بگڑ گیا۔ اور ان کا دماغ بھی اس کے ساتھ ہی بگڑ گیا۔''

عثمان صاحب نے بتایا۔ ''چچی کی بیوی کو ناگ نے ڈس لیا تھا، جب ہی سے ان پر دیوانگی چھائی رہتی ہے، کسی سے بات نہیں کرتے، اپنے کھنڈر میں پڑے رہتے ہیں، نجانے کون اللہ کا بندہ مہینے کے مہینے 500 یا 1000 روپے پہنچادیتا ہے اور یہ ان ہی روپوں میں گزارہ کررہے ہیں۔'' چچا کے متعلق یہ سب باتیں سن کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اصلیت سے کوئی بھی واقف نہیں، جس کا جو جی چاہا کہہ رہا ہے۔

اپنی کرید نے کی عادت کے باعث میں بے چین ہو کر رات بھر نہ سو سکا اور صبح ہوتے ہوتے نیند جب آئی تو فیصلہ کرلیا کہ چچا ٹلی سے ضرور ملا جائے گا اور کسی نہ کسی طرح ان کی زندگی کا راز پانے کی کوشش کروں گا۔

اتوار کا دن آرام کا دن ہوتا ہے لیکن مجھے صبح کے ناشتے کے بعد بس ایک ہی رٹ تھی چچا ٹلی سے ملنا ہے۔ خیر صاحب.... ناشتہ کر کے چچا سے ملنے چلا، ان کا کھنڈر نما گھر گلی کا سب سے آخری مکان تھا جہاں بچے تو بچے بڑے بھی جاتے سے گریز کرتے تھے۔ مکان کیا تھا مٹی اینٹوں اور ملبے کا ڈھیر تھا۔ ایک ایک کر کے ساری دیواریں گر چکی تھیں، دروازوں کو دیمک چاٹ گئی تھی۔ بچی کچی ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کی چھت سے ہر برسات میں دھادھم مٹی چونا گرتا اور تہہ پر تہہ جمتی رہتی، کوئی کواڑ تھا نہ کھڑکی کی ایک ٹاٹ کا جھاڑ جھنکاڑ پردہ البتہ لٹکا ہوا تھا، یہی چچا کے گھر کا کواڑ تھا، یہی کھڑکی اور یہی قفل کنجی۔

میں جب پہنچا تو چچا اینٹوں کے چولہے پر المونیم کی چھوٹی سی پتیلی رکھے دیسی چائے بغیر دودھ کے پکارہے تھے۔ میں نے جاتے ہی سلام کیا تو چونکے اور واقعی چونکنے کی بات تھی، صبح ہی صبح تو محلے کا بھنگی بھی ادھر نہیں آتا۔

تعجب اور حیرانی سے کہا۔ ''کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں۔'' میں ذرا ذرا ڈر رہا تھا۔ ''آپ سے ملنے کے لئے کئی دن سے جی چاہ رہا تھا۔ آج چھٹی تھی

میں نے سوچا آپ سے مل لوں اس لئے ادھر چلا آیا۔“
انہوں نے بڑی بے اعتباری سے مجھے گھورا۔ ان آنکھوں سے جن میں شیر کی سی آنکھوں کی چمک معلوم ہوتی تھی۔ ان کے گھورنے پر جی چاہا کہ ”تلی.....“ کہتا ہوا۔ سرپٹ بھاگ نکلوں لیکن دل ہی دل میں ہمت بندھا کر جما رہا..... انہیں یقین ہوگیا کہ میں انہیں ستانے آیا ہوں نہ مذاق اڑانے۔ مسکرا کر بولے۔ ”اچھا بیٹھو چائے پیو گے؟“ میں چپ رہا تو پوچھنے لگے۔ ”کیا نام ہے تمہارا؟“ میں نے نام بتادیا تو کچھ سوچا مسکرا کر کہنے لگے۔ ”اچھا تو تم جھاؤ بیگ کے لڑکے ہو؟“
میں نے گردن ہلا کر اقرار کیا اور اپنے آنے کا مقصد انہیں بتادیا۔ چچا نے بڑی عجیب نظروں سے مجھے دیکھا اور چائے کی پیالی میری طرف بڑھادی، دوسری پیالی وہاں تھی نہیں اس لئے اپنے آپ چپکی سے منہ لگا کر چائے پینے لگے پھر ذرا کھنکھارا سنبھل کر بیٹھے اور کہنے لگے۔
”جی تو نہیں چاہتا کہ اپنی بپتی دہراؤں لیکن تم سے انکار کرنے کو دل نہیں مانتا اس لئے بتاتا ہوں سنو! کوئی چالیس برس پہلے کی باتیں ہیں جس جگہ جس کھنڈر میں آج تم بیٹھے ہوئے ہو کبھی یہاں ٹاٹ کے پردے کے بجائے زربفت مخمل و بانات کے پردے جھولتے تھے، اندھیرے کے بجائے چوبیس گھنٹے جھاڑ فانوس روشن رہتے تھے، پورے گھر میں قالین ہی قالین بچھے رہتے تھے۔ کہیں بھی زمین قالین کے بغیر نظر نہیں آتی تھی، بے شمار جائیداد لاکھوں کی ساکھ اتنے نوکر چاکر کہ نام یاد رکھنا مشکل، ایک بار جو لباس پہن لیا دوسری بار اس کی باری آتے آتے مدت گزر جاتی۔
اس ٹھاٹ باٹ کے زمانے میں میری عمر ہوگی کوئی بیس بائیس سال کی کوئی کام تھا نہ کاج، بس صبح اکھاڑے جاکر گھنٹے دو گھنٹے داؤ پیچ سیکھ لینا عادت بنا رکھی تھی۔ وہاں سے آکر ناشتہ کرتے۔ ناشتہ یہ جان کا

انمول موتی

☆ بروں کی ہم نشینی سے تنہائی بدرجہا بہتر ہے۔
☆ جو قومیں اپنے محسنوں کو فراموش کردیں، وہ جلد مٹ جاتی ہیں۔
☆ نیک عمل وہ ہے جو لوگوں کی توقع سے بے نیاز ہوکر کیا جائے۔
☆ تلوار کا زخم بدن پر لگتا ہے پر بری بات کا زخم روح پر اثر کرتا ہے۔
☆ حکمت عملی قوت بازو سے زیادہ کام کرتی ہے۔
☆ کامیابی کا زینہ بہت سی ناکامیوں کی سیڑھیوں سے بنا ہوا ہے۔
☆ مسکراہٹ محبت کی زبان ہے۔
(صبا رمضان۔ پنڈدادنخان)

روگ جائے نہیں، گھی خالص گھی جو مٹکوں میں بھرا رہتا تھا، بس یہ سمجھ لو کہ مجھے جاڑوں میں جب بھی پیاس لگتی تو ایک گلاس گھی پی گیا، اس طرح خدا جھوٹ نہ بلوائے روز ہی کوئی دو ڈھائی سیر گھی کچا بدن میں اتر جاتا تھا۔ اتنے کھانے پینے کی طاقت کہاں جاتی طبیعت میں سرکشی اور ضد پیدا ہوگئی ایک دن کا واقعہ سن لو۔
اسی کمپنی باغ میں کمیٹی کے بڑے صاحب کے سامنے وزن اٹھانے کا مقابلہ ہو رہا تھا، پرے کے پرے لوگ جمع تھے، دس من وزن کی دو بوریاں کمیٹی کی توپ سے مولسری والے باغ تک کمر پر رکھ لے جانی اور یوں ہی بغیر رکے لے کر واپس آنی تھیں، بہت سے لوگوں نے بوریاں اٹھائیں، تھوڑی دور گئے اور ہار کر بیٹھ گئے۔ ایک نے ہمت کی تو کمر پر بوریا لاد کر مولسری والے باغ تک پہنچ گیا لیکن واپس آنے لگا تو لڑکھڑا کر گر گیا، میں دیکھتا کا دیکھتا رہا، جب تاب نہ رہی تو بڑے صاحب کے سامنے آگیا، کہاں بوریاں میں

لے کر جاؤں گا، وہاں کسے انکار تھا۔ اللہ کا نام لے کر میں نے بوریاں کمر پر اٹھوائیں اور چلا مولسری والے باغ ایسا دوڑا چلا گیا جیسے وزن نہیں پھول رکھے ہوں کمر پر لیکن واپس آنے لگا تو قدم لڑکھڑا گئے پسینہ مساموں سے پھوٹ پڑا، ایسا لگا اب گرا، ذرا سی ہمت کی، سوچ لیا چاہے مروں یا جیوں جب تک ہوش ہے بوریاں کمر سے نہیں اتاروں گا اور اتاروں گا توپ کے پاس لے جا کر، تیر کی طرح تیز چلا اور منٹوں میں توپ تک پہنچ گیا۔ دو چار منٹ تو واقعی ہوش قابو سے باہر رہے۔ بڑے صاحب نے خوشی سے ہاتھ ملایا، چاندی کا کپ انعام دیا، نام پوچھا تو زبان تک نہ ہلی اور شرما کر بھاگ آیا، بعد میں کمیٹی والے گھر تک آئے لیکن پھر کون ملتا ان سے بس ایسی ہی خوشی سرکشی اور بے خبری کے دن گزر رہے تھے کہ ایک آفت مجھ پر ٹوٹ پڑی۔

زندگی کی ساری بہاریں مرجھا کر رہ گئیں نہ جانے کون سی گھڑی تھی جب بیچ رات کو سوتے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے آنکھیں مل کر دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔

میری مسہری کے نیچے سرسراہٹ ہو رہی ہے جلتے ہوئے فانوس کے عین نیچے کالے ناگ کا ایک جوڑا اٹھکیلیاں کر رہا تھا، ہلکے اندھیرے اور شمع کے اجالے میں ان کے بدن شیشے کی طرح چمک رہے تھے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں سچے موتیوں کی مانند دمک رہی تھیں۔

خوف اور دہشت کی ایک لہر میرے بدن میں آ کر سرایت کر گئی، شاید زندگی میں پہلی بار دل ڈرا اور خوف سے کانپ رہا تھا۔ دل میں آیا کسی کو آواز دوں لیکن حلق خشک ہو گیا تھا۔ ناچتے جھومتے ناگ اور ناگن نے میرے خون کی حرکت کو بہت بڑھا دیا تھا۔ میں نے اپنے آپ پر قابو پانے اور کانپتے لرزتے جسم کو سنبھالنے کی کوشش کی اور آہستہ آہستہ مسہری کے ایک کونے سے کھسک کر دوسری طرف آ گیا۔

ناگ اور ناگن دونوں بے خبری کے عالم میں جھومتے رہے۔ میں نے مسہری کے دوسرے کونے پر ہاتھ ڈال کر کسی چیز کی تلاش شروع کی قسمت کا مارا اور کچھ نہیں ملا تو گھی تولنے کے لئے آیا ہوا پانچ سیر کا بٹہ میرے ہاتھ میں آ گیا — اسے ہاتھوں میں سنبھالا نشانہ باندھا اور اللہ کا نام لے کر ناگ جوڑے کی طرف پوری تیزی اور قوت سے پھینک دیا۔ پانچ سیر کا بٹہ بم کا گولہ بن کر ناگن کے پھن پر اس طرح جا گرا جیسے بندوق کی گولی۔ ناگن پھڑکی اور بے حد سخت جان ہونے کے باوجود پل بھر میں ڈھیر ہو کر رہ گئی۔ پھن اور پھن کے نیچے کا کئی انچ کا ٹکڑا بٹے کی چوٹ اور وزن سے کچل گیا تھا۔

ناگ پہلے تو مردہ ناگن کے گرد چکر لگاتا رہا۔ جب تھک گیا تو چکر لگاتے لگاتے رکا۔ میری طرف دیکھا، کچھ دیر یوں ہی اپنی بند نہ ہونے والی خونناک آنکھوں سے دیکھتے ہوئے زہر بھری زبان کو لپکاتا رہا اور پھر تیر کی طرح اپنے آدھے سے زیادہ جسم کو کھڑا کر کے وہ بدلہ لینے کے لئے تیار ہو گیا، میں بھی اتنی دیر میں اپنے آپ کو بچانے کے لئے تیار کر چکا تھا۔

میں نے مسہری کے ایک کونے میں سے ایک نوکیلا ڈنڈا نکال لیا تھا۔ اس کے نوکیلے سر پر تانبے کی کوئی ایک سیر وزنی لوہے کی کلغی تھی اور اس کی ایک پوری چوٹ ناگ کے لئے کافی تھی اپنے بچاؤ کے لئے میں نے ایک تکیے کو ڈھال بنا لیا تھا۔ دیوانے ہوئے ناگ نے فوں فوں کر کے اپنی جگہ چھوڑ دی، میں اس وقت ڈرا اور خوف سے لرز رہا تھا۔ سارے بدن سے پسینے بہہ رہے تھے، لیکن دل میں یقین تھا کہ ناگ کو ضرور مار گراؤں گا۔

ناگ نے تیزی سے حملہ کیا، جیسے ہی اس کا پھن میری طرف بڑھا میں نے کلغی والا ڈنڈا اس کے پھن پر مارا لیکن ناگ ہوشیار ہو چکا تھا اس نے میرا وار بچا لیا، ڈنڈا پھن کے بجائے اس کی دم پر پڑا اور دو ڈھائی گرہ دم کٹ کر الگ جا گری۔ میں نے جلدی سے دوبارہ وار کرنے کے لئے ڈنڈا اٹھایا۔ اتنے میں ناگ نے پے

در پے کئی بار ڈسنے کے لئے مجھ پر حملہ کیا، لیکن ہر مرتبہ تکئے سے ٹکرا کر رہ گیا۔ شاید دم کٹنے کی وجہ سے وہ مجھے زندہ چھوڑ کر ناگن کے لاشے سے ٹکراتا رینگتا ہوا کمرے کے ایک کونے میں جا کر غائب ہوگیا۔ اس کے غائب ہوتے ہی کمرے میں ایک عجیب خوشبو پھیل گئی، جس کے اثر سے میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔

اس دھما چوکڑی سے گھر والے جاگ اٹھے تھے آ کر دیکھا، سارا ماجرا سنا، ناگن کے لاشے کو کمرے سے ہٹوایا کمرے کے ایک ایک کونے کو ٹٹولا گیا، سارے چھید اور بل مٹی تھوپ کر بند کردیئے گئے۔

صبح ایک سپیرے کو بلایا گیا دن بھر وہ بین بجاتا رہا لیکن دم کٹا ناگ لوٹ کر نہ آیا۔ سپیرا ناکام لوٹ گیا۔ لیکن جاتے جاتے کہہ گیا کہ "سانپ سو برس بیت جائیں تب بھی بدلہ لئے بغیر نہیں رہتا۔ ذرا میاں کو بچا کر رکھنا، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اکیلا پا کر بدن میں زہر اتار دے۔"

کیسی تدبیر اور کیسی کوشش، سانپ اپنی نفرت کیسے بدلتا، وہ مہینوں تک بلوں میں چھپا موقع کی تلاش میں رہا، کئی بار سوتے سوتے میری آنکھ کسی سرسراہٹ سے کھل جاتی۔ وہی نیند لانے والی خوشبو ناک میں محسوس ہوتی رہتی، دیکھتا تو کچھ دکھائی نہ دیتا، کانوں میں کہیں دور سے فوں فوں کی آواز سنائی دیتی، ادھر ادھر سب ہی جگہیں ٹٹولتا، لیکن بے سود بے فائدہ۔ ناگ نے میرا صبر و سکون آرام کی میٹھی نیند اور سب کچھ چھین لیا تھا، میں جتنا نڈر تھا اتنا ہی خوف زدہ رہنے لگا۔ کیونکہ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ ناگ کا ڈر سوتے جاگتے دل و دماغ پر رہنے سے میں جیسے دیوانہ ہوگیا، بس کانوں میں فوں فوں کی آواز آتی اور میں کھانا پینا چھوڑ دیتا۔ باتیں کرتا ہوتا تو دیوانہ وار چاروں طرف نگاہیں دوڑانے لگتا۔

آخر گھر والوں نے اس کا علاج یہ تجویز کیا کہ شادی کردی جائے، یہ ترکیب کارگر ہوئی۔ شادی ہوتے ہی ناگ کا خوف میرے دماغ سے نکل گیا، بہت دنوں بعد پھر گھر میں خوشی لوٹ آئی، گھر والوں نے اطمینان کا سانس لیا دم کٹے ناگ کا ذکر ختم ہونے لگا، میرے کانوں میں فوں فوں کی آوازیں آنی بند ہوگئیں، وہ بے ہوش کرنے والی خوشبو غائب ہوگئی لیکن ...... یہ سکون عارضی تھا خوشیاں مختصر تھیں، وہ وقت آ گیا تھا جس کا دم کٹا ناگ انتظار کررہا تھا۔

ویسی ہی وہ خاموش رات تھی۔ پورا چاند آسمان پر جاگ رہا تھا، برف کی سی ٹھنڈی روشنی ہر چیز پر بسیرا کئے ہوئے تھی، سرسراہٹ کی آواز سے سوتے سوتے میں چونک کر اٹھا۔ دیکھا شمع کی مدھم روشنی کے عین نیچے بالکل اسی جگہ جہاں ٹھیک ایک سال پہلے ناگن مری پڑی تھی۔

وہ دم کٹا ناگ دیوانگی کے عالم میں سرپٹخ پٹخ کر ناچ رہا ہے۔ اس کی دیوانگی میں بڑی شدت اور بڑی وحشت ناک تیزی تھی۔ بس یہ سمجھ لو کہ اس کے چمکتے بدن پر نگاہ ٹھہرانی تقریباً ناممکن سی بات تھی۔

میں روز روز کی اس وحشت ناک ڈر اور خوف سے تنگ آچکا تھا، یہ فیصلہ کرکے اٹھا کہ آج میں نہیں یا یہ نہیں لیکن مجھ سے پہلے تو یہ فیصلہ ناگ اپنے اور میرے لئے کرچکا تھا، وہ میرے ہر وار کے لئے تیار تھا، مجھے حرکت میں آتا دیکھ کر وہ سنبھل کر کھڑا ہوگیا، مجھے اٹھتا دیکھ کر میری بیوی نے مجھے روکا، وہ ڈرپوک تو نہ تھی، لیکن آنکھوں کے سامنے موت کو کون ناچتے دیکھ سکتا ہے۔ اس نے لرزتے کانپتے ہونٹوں سے ناگ کو نہ مارنے کی التجا کی لیکن اب میرے ہوش و حواس میرے بس میں نہیں رہے تھے۔

میں اپنی بیوی کی خواہش کو ...... آخری خواہش کو رد کردیا، قریب رکھی ہوئی کلہاڑی کو اٹھایا اور سنبھلتا ہوا ناگ کی طرف بڑھا، اس کا جسم اس لمحے ساکت تھا، زبان کی چابی گھنٹے کے پنڈولم کی طرح بہت تیز چل رہی تھی، میں نے ہمت کرکے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی کوشش کی اور چاہا کہ کلہاڑی کے ایک ہی وار میں اس کا سر دھڑ سے جدا کردوں کہ اس نے ایک

زبردست جست لگائی، میرا خیال تھا کہ وہ میرے سر کے اوپر سے زقند لگا کر مسہری پر آ گرا اور.....

میرے بے گناہ..... بے قصور معصوم بیوی کے ایک پاؤں میں لپٹ کر دوسرے پاؤں پر اپنے زہریلے دانت سے زہر چھوڑ دیا، اوہ میرے خدا!

میری بیوی کی اس وقت کی چیخ آج تک میرے کانوں میں گونجتی ہے، وہ درد ناک دل دہلا دینے والی بھیانک چیخ جسے سن کر رواں رواں کانپ گیا تھا۔ اب بھی میرے کان سنتے رہتے ہیں۔

زہریلے دم کٹے ناگ نے اپنا بدلہ لے لیا.....

زہر کام کر گیا، ایک انتقام کے پیاسے کالے ناگ کا زہر کام کیوں نہ کرتا، میں نے اس کی ناگن کو ختم کیا تھا، اس نے میری زندگی کی بہار چھین لی، حساب برابر ہو چکا تھا۔

میری بیوی نے زہر کے باعث منٹوں میں جان دے دی۔ ناگ بے فکر اور مطمئن سا پاؤں میں لپٹا رہا، میرے ہوش و حواس قائم نہیں تھے۔ چند گھڑی کی گھڑی میں ہوا وہ ناقابل یقین تھا۔

شاید اسی وقت سے میں دیوانہ ہو گیا تھا میں نے کلہاڑی کو پھر سنبھالا اور سر پھیلائے ہوئے بے فکر بے پرواہ ناگ کا سر تن سے جدا کر دیا۔ میرا خیال ہے وہ بدلہ لینے کے بعد جان دینے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ ورنہ وہ چاہتا تو اس عرصے میں بھاگ سکتا تھا۔

اس وقت مسہری پر دو لاشے پڑے تھے ایک انسان اور ایک انسانی جان کے دشمن کا۔

میں بیوی کے مردہ نیلے بدن کو بڑی حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس وقت میری آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ دہشت تھی اور انجانا خوف۔

اچانک میں نے محسوس کیا وہی مہک وہی نیند لانے والی عجیب سی خوشبو کمرے میں تیزی سے پھیل رہی ہے۔ غیر ارادی طور پر میں نے ناگ کے سر سے محروم جسم کو دیکھا، کلہاڑی سے کٹی ہوئی جگہ پر سے دھواں اٹھ رہا تھا اور اس دھوئیں کی خوشبو ہی بیہوش کئے دے رہی تھی۔ میں نے چاہا لپک کر کمرے سے باہر نکل جاؤں لیکن موذی ناگ مر جانے کے بعد بھی مجھ سے انتقام لے رہا تھا۔ میں بیہوش ہو کر گر پڑا۔ آٹھ دن بعد ہوش آیا جب سب لوگ میری زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔

لیکن ابھی ناگ کا انتقام پورا نہ ہوا تھا۔ بیوی کے مرنے کے بعد بربادی شروع ہوگئی۔

ایک رات مکان کی چھت نیچے آن گری، ماں باپ دونوں دب کر ختم ہو گئے، گھر میں آئے دن آگ لگنے لگی، کبھی چوری ہو جاتی جو کام کیا جاتا اس میں گھاٹا ہوتا، اس طرح ہوتے ہوتے سب کچھ تباہ اور برباد ہو گیا۔ ان صدموں نے میرے دل و دماغ کو بگاڑ کر رکھ دیا۔ میرا سب کچھ چھن گیا تھا۔

ایک ناگن مار کر میں نے بیوی ماں باپ دولت سکھ چین سب کچھ گنوا دیا۔ غلطی میں نے کی تھی لیکن سزا مجھے ہی نہیں دوسروں کو بھی ملی۔ دوسرے تو سزا پا کر آرام کی نیند سو گئے لیکن میں جیتے جی زندگی کی جلتی آگ میں جل رہا ہوں، کوئی میرا ساتھی نہیں کوئی ہمدرد نہیں، سب مذاق اڑاتے ہیں قہقہے لگاتے ہیں، میں برداشت کرتا رہتا ہوں اور جب برداشت نہیں رہتی تو جو منہ میں آتا ہے کہہ اٹھتا ہوں۔ کبھی کبھی تنہائی میں اس ظالم دم کٹے ناگ کی سزا کی یاد آتی ہے تو اس کی ہڈیاں دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا کر لیا کرتا ہوں؟“

یہ کہہ کر چچا تلی اٹھے کونے میں رکھی ہوئی ایک ہنڈیا اٹھا لائے۔ اس کے منہ پر سے کپڑا کھول کر بولے۔ ”لو دیکھو چالیس سال سے اپنی خوشیوں کے اس جنازے کو سینے سے لگا کر رکھے ہوا ہوں۔“

”ہنڈیاں میں کالے ناگ کی بدن کی ہڈیاں جو بالکل گھاس پھوس معلوم ہوتی تھیں بھری ہوئی تھیں چچا تلی ٹکٹکی باندھے ہڈیوں کو دیکھ رہے تھے اور اس وقت بھی ان کی آنکھوں میں شیر کی سی چمک دکھائی دے رہی تھی۔





ہولناک سانحہ

ایس امتیاز احمد - کراچی

چاندنی رات میں ریل کی پٹڑی چمک رہی تھی، غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ جواں سال خوبرو حسینہ کا مردہ جسم تھا جو کہ کئی حصوں میں بکھرا پڑا تھا جو کہ بہت ہی دردناک منظر پیش کررہا تھا

ایک نادیدہ قوت کی دیدہ دلیری جس نے زورزبردستی ......اپنی محبت کا دم بھرنے لگی تھی

میرے والد ریلوے میں گارڈ تھے......

1947ء میں جب میں نے B.A کیا۔ اسی سال وہ انتقال کرگئے۔ ان کا ایک ہندو دوست رام لعل تھا۔ جو ریلوے ہیڈ کوارٹرز میں ایک بڑا افسر تھا۔ ایک دن وہ مجھے اپنے ساتھ انگریز چیف آپریٹنگ سپرنٹنڈنٹ کے دفتر لے گیا۔ اس انگریز افسر نے مجھے ایک مرحوم ریلوے ملازم کا بیٹا ہونے کے ناطے بطور گارڈ بھرتی کرلیا...... 6 ماہ کی ٹریننگ ختم ہوئی تو کچھ دنوں بعد حیدرآباد میں ٹرانسفر کردیا گیا۔

ملازمت گھر سے اس قدر دور تھی مگر تنخواہ اس وقت کے حساب سے 100 روپے معقول تھی...... میں ٹرین میں سوار ہوکر اگلے دن شام کے دھندلکے سے قبل حیدرآباد پہنچ گیا۔ اسٹیشن ماسٹر سے ملا جس نے مجھے ایک قلی کے سپرد کردیا کہ فرسٹ کلاس ویٹنگ روم میں لے جاؤ۔ یہ نئے گارڈ صاحب آئے ہیں۔ قلی نے بستہ اٹھاتے ہوئے میرے کوائف پوچھے تو میں نے اسے بتادیا کہ کراچی کا رہنے والا ہوں تو اس نے بتایا کہ وہ بھی کراچی کا رہنے والا ہے۔

حیدرآباد کا ویٹنگ روم اس زمانے میں ایک پہاڑی پر تھا اور ریٹائرنگ روم بھی وہیں تھا۔ اس نے ویٹنگ روم میں بستر بچھادیا۔ وہیں میرا بکس بھی رکھ دیا۔ میں کھانا کھا کر سوگیا۔ پنکھا چل رہا تھا نہ معلوم کس وقت میری آنکھ کھلی تو کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا...... انجنوں کی شنٹنگ اور گڑگڑاہٹ بدستور سنائی دے رہی تھی۔ گھڑی

دیکھی تو رات کے 2 بج رہے تھے۔ بہ مشکل دوبارہ آنکھ لگی مگر کچھ دیر بعد اسی احساس کے ساتھ آنکھ کھل گئی کہ کمرے میں کوئی موجود ہے۔ اٹھ کر دروازہ کھولا۔ باہر دیکھا اور پھر بند کردیا۔ لیمپ کی بتی اونچی کر کے دیکھا بھالا تو کچھ بھی نہ تھا...... اسی کشمکش میں صبح ہوگئی۔

میں نے دفتر جاکر ڈیوٹی شیڈول لیا۔ اور سب سے سلام دعا کی...... اسی دن پرکاش نے بھی ڈیوٹی جوائن کی وہ لاہور سے آیا تھا...... ہم دونوں ویٹنگ روم میں ساتھ رہتے تھے۔

چند روز بعد ایک رات میں تنہا بیٹھا لیمپ کی روشنی میں کتاب پڑھ رہا تھا کہ دروازے کی جالی کے قریب مجھے آہٹ محسوس ہوئی...... دروازے میں کسی کی موجودگی کے احساس نے کتاب سے دھیان ہٹادیا اور میں کن انکھیوں سے دروازے کی طرف دیکھتا رہا۔

آخر تنگ آ کر لیمپ کی بتی دھیمی کردی اور لیٹ گیا ابھی سو بھی نہ سکا تھا کہ دیکھا وہ میرے پاس کھڑی ہے۔

وہ اس طرح دھیمے پاؤں چل کر آئی کہ مجھے اس وقت پتہ چلا جب وہ بیڈ کے قریب پہنچ چکی تھی۔ میں اس شش و پنج میں گرفتار تھا کہ دروازے کی کنڈی لگی ہوئی ہے یہ اندر کیسے آئی...... میں نے اس کی جانب دیکھا تو وہ دلفریب انداز میں مجھے دیکھے جارہی تھی۔ میرا دل اس طرح دیکھنے سے دھک دھک کرنے لگا ہمت نہ ہوئی کہ بیڈ سے نیچے قدم رکھ سکوں۔

آخر کار وہ مجھے اس کیفیت میں چھوڑ کر دروازے کی جانب بڑھی اور آہستہ سے پٹ کھول کر غائب ہوگئی...... میں نے لیمپ کی بتی اونچی کی اور اپنی قوتوں کو جمع کیا...... دروازہ جاکر دیکھا تو اس کی کنڈی لگی ہوئی تھی، جیسے میں نے سونے سے پہلے لگائی تھی۔ میں نے تسلی کے لئے ہاتھ لگا کر دیکھا تو واقعی دروازہ اندر سے بند تھا۔ ''یا خدا! میں نے خواب دیکھا؟ یہ کیا اسرار تھا؟'' کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ لیمپ کی بتی پھر نیچے کی نیند نہ آئی تو ساری رات کتابیں پڑھ کر گزار دی۔

اگلی صبح جب کمرے کی صفائی کرنے والا آیا تو اسے میں نے سارا واقعہ سنایا...... اس نے قطعاً لاعلمی کا اظہار کیا اور اسے میرا وہم بتایا...... میں نے مذاق کے ڈر سے دفتر میں بھی اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا۔

اب تو روزمرہ کا یہ معمول ہوگیا...... میں نے اپنی منگیتر بانو کے لئے جس قدر شعر یاد کئے تھے وہ اکیلے کمرے میں اکثر گنگناتا رہتا تھا...... وہ عموماً سنتی رہتی...... درحقیقت وہ بہت معصوم اور بے ضرر معلوم ہوتی تھی۔ رات کے وقت ایک مرتبہ ضرور کمرے کا چکر لگاتی...... کہاں سے آتی...... کیسے آتی؟ اب یہ مسئلہ میرے سوچنے کا نہیں تھا...... وہ آتی اور چپکے سے میرے سامنے بیٹھ جاتی...... اور میں اسے شعر اور بعض اوقات اخبار پڑھ کر سناتا رہتا...... وہ سب کچھ بغور سنتی۔ اس کی آنکھوں میں شرارت ہوتی۔ ایسی چمکدار آنکھیں میں نے پہلے کبھی کسی کی نہیں دیکھی تھیں ایک دن بڑے پیار سے اسے ایک شعر سنایا تو وہ مسکرادی۔

پرکاش بے چارہ سیدھا سادہ نوجوان تھا...... اسے شعر و ادب سے دلچسپی تھی نہ دلبرانہ آہو چشم کے رمزو کنایہ سے التفات 8 سے 10 دن میں بھی ایک آدھ بار ہی اس سے ملاقات ہوتی اور وہ دفتر کے بابوؤں کی شکایتوں اور افسروں کے گلے شکوے تک محدود رہتا۔ والدہ صاحبہ کے خط آتے...... جوابی خط نہ لکھنے کی شکایت اور بانو کا سلام بھی لکھا ہوتا مگر اب مجھے فرصت نہ ملتی...... کچھ اس دلفریب کے چکر میں ایسا پھنسا ہوا تھا کہ ڈیوٹی کے بعد جب کمرے میں آتا اور وہ نہ آتی تو دل الجھا الجھا سا رہتا۔ اور جب وہ آتی تو بھی گفتگو ایک طرفہ ہی رہتی۔

ایک سرد رات تھی۔ لاہور کے اسٹیشن سے مال گاڑی حیدرآباد کے لئے آرہی تھی۔ میں گارڈ کے ڈبے میں لیمپ کی دھندلی روشنی میں جلدی جلدی رجسٹروں کی تکمیل میں مصروف تھا۔ بس چند ہی لمحوں میں حیدرآباد اسٹیشن آیا ہی چاہتا تھا انجن کے یکایک بریک لگنے کا احساس ہوا۔ میں نے کیبن سے جھانک کر دیکھا کہ گاڑی گھسٹتی ہوئی آؤٹر سگنل کے باہر رک گئی۔ خاصی دیر سگنل نہ ہوا تو باہر نکل کر جائزہ لیا مگر وجہ معلوم نہ ہوسکی...... پھر گاڑی کھسکی تو میں کیبن میں واپس آگیا۔ دیکھا تو لکڑی کے سرکاری بکس پر وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ دل دھک سے رہ گیا...... کوئی اس وقت مجھے دیکھتا

تو یہی کہتا کہ ایک معمولی سیاہ بلی دیکھ کر ڈر گیا...... بخدا وہ بلی تھی...... سفید سفید لمبے بالوں والی اور گہری نشیلی آنکھوں والی...... میں نے جیسے ہی ''جانور'' کہا تو وہ مسکرادی جیسے کہہ رہی ہو اکیلا کیلئے سیر کرتے پھرتے ہو۔

پٹریوں کی کھٹا کھٹ شروع ہو چکی تھی۔ پلیٹ فارم پر رش ہونے لگا...... جلدی جلدی میں نے رجسٹر بند کئے اور جیسے ہی ان بکس میں رکھنے کے لئے آگے بڑھا وہ ایک انداز دلبرائی سے اٹھی اور کموڈ کے اوپر جا بیٹھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس قربت کے باوجود میں اسے نہ پکڑ سکوں گا۔ لہٰذا باتیں کرنے لگا وہ سنتی رہی...... پلیٹ فارم پر گاڑی رکتے ہی وہ اتر کر باہر نکل گئی۔ میری نگاہیں لائنوں اور لیمپوں کے ملگجے اجالوں میں اس کا تعاقب کرتی رہ گئیں۔

پانچویں دن پھر لاہور سے آتے ہوئے بالکل وہی واقعہ پیش آیا۔ سگنل کے باہر گاڑی رکی۔ وہ دبے پاؤں چلتی ہوئی میرے کیبن میں آ گئی۔ اور بے تکلفی سے میرے صندوق پر بیٹھ گئی۔ حسب معمول میں رجسٹروں پر جھکا ہوا کام کر رہا تھا...... نظریں اٹھا کر جو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

ایک نہایت حسین وجمیل دوشیزہ...... دراز قد سفید ساڑھی کھلے بال تیکھے نقوش...... بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ میں نے اسے دیکھتے ہی ایک شعر پڑھا...... اس پر اس نے ایک نقرئی قہقہہ لگایا...... دلفریب انداز سے اٹھی اور دروازے تک پہنچ گئی۔ میں ے خود کو بہ مشکل سنبھالا اور قریب تھا کہ اس کو پکڑ لوں مگر گاڑی یارڈ میں داخل ہو چکی تھی۔ وہ چلتی گاڑی سے اتر چکی تھی۔

وہ رات قیامت کی تھی...... جسم تو بے شک بیڈ پر تھا...... لیکن دماغ اور دل وہاں نہیں تھے جب میں B.A میں داخلے کے لئے لاہور گیا تو خالہ کے گھر لوہاری گیٹ میں ٹھہرا...... خالو کی وفات کے بعد خالہ کی کل کائنات بانو تھی...... ماں بیٹی دونوں کمر بند بنا بنا کر گھر کا خرچ چلاتی تھیں...... بانو ایک قبول صورت لڑکی تھی...... میرا ناشتہ کھانا کپڑے دھونا اور رکھنا سب اس کے ذمے تھا۔ سارے گھر کا کام کاج اور باقی ماندہ وقت میں کمر بند بنانا اس کی اضافی ڈیوٹی تھی...... اس خاموش گھر میں میری موجودگی سے گہرا سکوت آہستہ آہستہ ٹوٹنے لگا۔ پھر مجھے محسوس ہونے لگا کہ بانو کے لئے میرا دل دھڑکنے لگا۔ میری والدہ جب خالہ سے ملنے لاہور آئیں تو چپکے سے میرا رشتہ بانو سے پکا کر کے چلی گئیں...... اب بانو مجھ سے پردہ کرنے لگی۔

میری سروس کا سلسلہ چل نکلا تو میں حیدر آباد کی نامانوس مٹی سے مانوس ہونے کی کوششوں میں مبتلا ہو کر رہ گیا۔ جس نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا اور یہاں میری پراسرار ملاقاتیں بڑھتی چلی گئیں۔ مگر ایک دن اچانک والدہ کے خط نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا...... یہ خط مجھے اسٹیشن ماسٹر کی توسط سے ملا...... تو معلوم ہوا کہ وہ برابر خط لکھتی رہتی ہیں جو مجھے نہ ملتے تھے۔ لہٰذا تنگ آ کر وہ خط اسٹیشن ماسٹر کی معرفت تحریر کیا گیا۔

اس میں لکھا تھا کہ ''اب بھی خط کا جواب نہ دیا تو میں وہاں آ جاؤں گی۔'' آخر میں یہ بھی تحریر کہ 12 فروری کو تمہاری شادی بانو سے ہو رہی ہے۔ چند روز کی چھٹیاں لے کر آ جاؤ۔''

یہ جنوری کے آخری دن تھے حسب الحکم اگلے دن چھٹی کی درخواست بھجوادی اور ڈیوٹی پر چلا گیا۔

رات کے وقت جب کمرے میں واپس آیا تو ایک مخصوص مہک اس کے آنے کا احساس دلا رہی تھی۔ پھر آہستگی سے دروازہ کھلا اور سرد ہوا کا ایک جھونکا اندر آیا...... دروازے کے قریب کاغذ کا ایک ٹکڑا نظر آیا جو مجھے یقین تھا کہ میرے داخل ہوتے وقت وہاں نہیں تھا۔ جلدی سے اٹھا کر لیمپ کی روشنی میں پڑھا۔ عبارت کچھ اس قسم کی تھی۔ ''مجھے سب معلوم ہے تم شادی نہ کرنا ورنہ پریشان رہو گے تم یہاں سے مت جانا۔''

3 دن اسی چکر میں گزر گئے...... پرکاش کو میں نے سب باتیں بتا کر مشورہ مانگا تو اس نے کہا۔ ''یہ سب وہم ہے تم شادی کر لو...... اور بھابھی کو جب لاؤ تو حیدر آباد میں کوئی مکان لے لینا اور آرام سے رہنا...... یہ کمرہ چھوڑ دینا تا کہ وہ نظر نہ آئے۔''

فروری کے شروع میں، میں لاہور آ گیا اور شادی

ہوگئی۔ 15، 20 دن آرام سے رہا..... اسی دوران پرکاش کا خط آیا کہ اس نے 20 روپے ماہوار پر ایک مکان کرایہ پر لے لیا ہے جو حیدرآباد اسٹیشن کے قریب ہے جب تم آؤ گے میں اسٹیشن پر ملوں گا۔

بانو کو لے کر میں حیدرآباد پہنچا تو پرکاش حسب وعدہ مل گیا۔ یہ ایک کمرہ کا مکان تھا۔ اس نے صفائی کرادی تھی۔ میرا بکس، بستر اور ایک بیڈ اور ضروری سامان اس نے گھر میں سیٹ کرادیا میں اور بانو ہنسی خوشی رہنے لگے......

کچھ دنوں کے بعد ایک عجیب واقعہ پیش آیا میں دوروز کی ڈیوٹی سے واپس آیا تو کافی دیر تک دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد بانو نے دروازہ کھولا۔ وہ بخار سے تپ رہی تھی اور چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس سے بولا بھی نہیں جارہا تھا۔ بہت تسلی دلاسے کے بعد اس نے بتایا کہ گزشتہ صبح وہ جب باتھ روم سے واپس آئی تو اس کے کمبل میں ایک سفید بلی بیٹھی تھی جو اسے گھور گھور کر دیکھ رہی تھی..... بانو طبعاً بہادر تھی اس کو مارنے کے لئے جو آگے بڑھی تو بلی نے اس پر حملہ کردیا۔ تمام قمیض پھاڑ دی بلی نے اس کو بے حال کردیا قسمت سے دودھ والی آگئی..... اس نے بلی کو بھگایا ورنہ معلوم نہیں کیا ہوجاتا۔ میرا ماتھا تو پہلے ہی ٹھنکا تھا مگر میرے پاس سوائے اسے تسلی دینے کے کچھ نہ تھا ڈسپنسری سے مرہم پٹی کرادی اور دوا لادی..... وہ تین دن میں وہ ٹھیک ہوگئی۔ اب جب میں ڈیوٹی پر جاتا تو وہ پڑوسن کی لڑکی کو بلا کر اپنے ساتھ رکھنے لگی۔

ایک رات جب میں گھر آیا تو بانو پر پھر دورہ پڑا ہوا تھا۔ اس کی حالت بہت خراب تھی سر کے بال کھلے تھے پڑوسن کی ماں آئی ہوئی تھی وہ بولی...... "بھائی دوروز سے بانو کا یہی حال ہے کچھ کھایا نہ پیا...... روئے جاتی ہے۔" میں نے ان کو تو رخصت کردیا اور بانو کی دلجوئی کرنے لگا پھر اسے دودھ پلا کر سلادیا۔

صبح میں نے ناشتہ تیار کیا۔ وہ بہت کمزور ہوگئی تھی بہرحال کچھ طبیعت سنبھلی تو اس نے بتایا کہ پرسوں آپ کے جانے کے بعد بلی پھر آئی تھی دیکھتے ہی دیکھتے وہ کتے کے برابر ہوگئی۔

اتفاقاً اسی دن خالہ لاہور سے آگئیں میری جان میں جان آئی۔ میں بانو کو ریلوے اسپتال لے گیا اور دوا وغیرہ دی۔ اس طرح خالہ کی موجودگی میں اسے آرام کا موقع بھی مل گیا۔ لیکن اس کی قوت گویائی ختم ہوچکی تھی اب میں تھا اور ڈاکٹروں ...... حکیموں کے چکر حیدرآباد کے مشہور ڈاکٹر سے علاج کرایا اور حکیموں سے بھی علاج کرایا مگر بے سود بانو سوکھتی چلی گئی اور پھر چلنے پھرنے سے معذور اس قدر ہوئی کہ بمشکل اسے "حوائج ضروری" کے لئے جلایا جاتا...... میں خود کو اس کا مجرم سمجھنے لگا۔ 3 مہینے اس مکان میں اس طرح گزر گئے۔

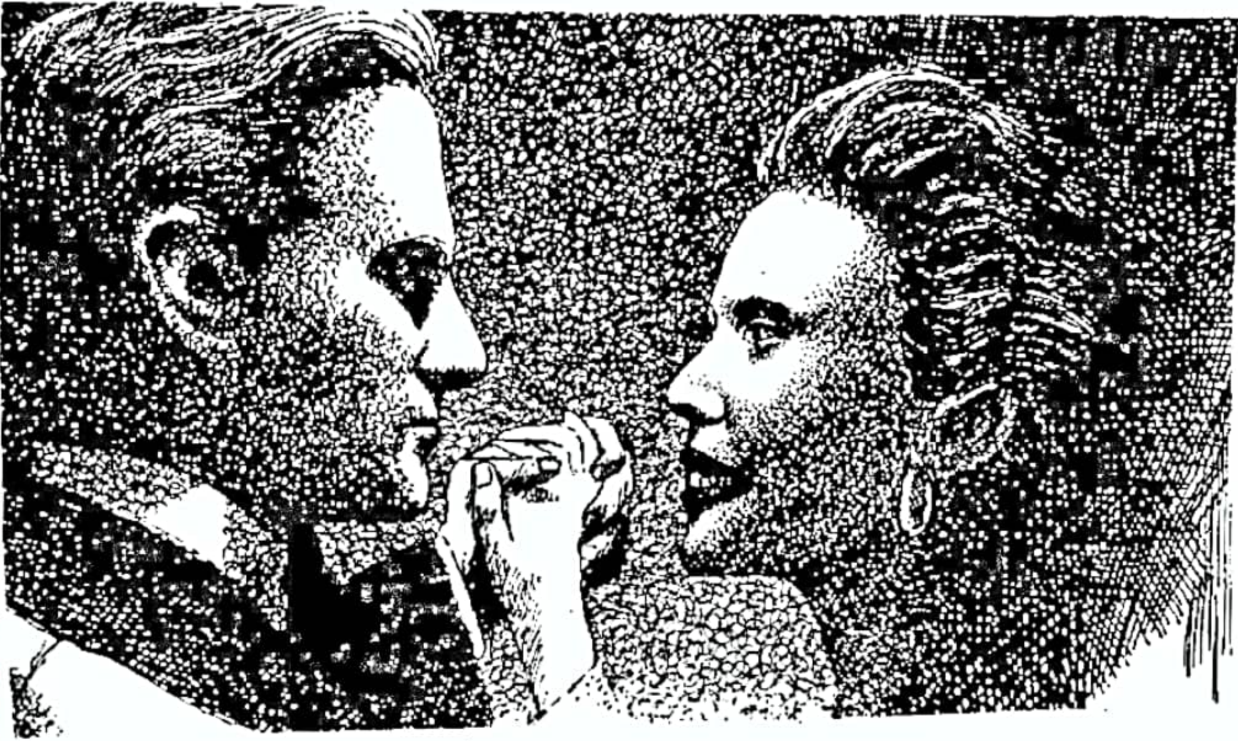
جون کا مہینہ تھا گرم راتوں میں ویسے ہی نیند نہیں آتی...... صحن میں بانو اور خالہ کے بیڈ ڈال دیئے تھے۔

اس دن پرکاش بھی آگیا ہم دونوں نے دروازے کے باہر اپنے پلنگ ڈال لئے معلوم نہیں کہ کس وقت آنکھ کھلی تو خالہ کی آواز نے چونکا دیا۔ اندر گیا تو معلوم ہوا کہ بانو بیڈ سے غائب ہے کمرے میں دیکھا دروازہ کھلا تھا جو خالہ نے اندر سے بند کر رکھا تھا۔ میں دروازے کی طرف بھاگا مکان کے سامنے دور تک کچھ بھی نہ تھا۔ پچھلی جانب ریل کی پٹریاں تھیں میرے ساتھ پرکاش بھی تیز تیز چل رہا تھا۔

چاندنی رات میں صرف پٹری چمک رہی تھی تھوڑے فاصلے پر مجھے کچھ پڑا نظر آیا کیا دیکھتا ہوں کہ بانو کا مردہ جسم پڑا ہے۔ بانو کے بے جان لاشے کو میں گھر اٹھالایا، دیکھا تو بانو کا جسم جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا تھا جیسے کسی خونخوار درندے نے اسے بھنبھوڑ ڈالا ہو۔

پرکاش نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر حوصلہ دیا۔ جیسے وہ سب سمجھ گیا ہو...... خالہ بے حال ہوگئیں قصہ مختصر سب سامان چھوڑ کر میں حیدرآباد سے کراچی چلا آیا۔ بانو کو حیدرآباد سندھ کی مٹی کے حوالے کردیا...... نوکری سے چھٹی پر بیٹھ گیا اور پھر کراچی ٹرانسفر کرالیا۔ ایک عرصہ بعد دوسری شادی کرلی۔ اب پوتے پوتیاں ہیں جب بھی یہ ہولناک سانحہ یاد آتا ہے تو دل بیٹھ سا جاتا ہے...... اور سوچتا ہوں کہ "وہ کون تھی؟"





نیم شب

ایس امتیاز احمد-کراچی

نوجوان کے پاس اب قطعی وقت نہیں تھا اس کا قہقہہ رات کے اندھیرے میں قرب و جوار کو دہلا کر رکھ دیا، وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہوگیا تھا اسے پتا تھاکہ اصل سراغ لگاتے لگاتے پولیس تھک جائے گی۔

دوسروں کو بے وقوف سمجھنے والا......خود بڑا بے وقوف ہوتا ہے......ایک حقیقی کہانی

ٹریکر خون آشام چمگادڑ کی مانند ہوگیا۔اس نے واقعتاً خون نہیں پیا تھا بلکہ اس نے بھیانک منظر کی فلم بند کی تھی۔سورج غروب ہوتے ہی وہ مردہ جسموں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا تھا۔اس کا معمولی ٹرک پولیس سے رابطہ قائم کئے ہوئے تھا۔پولیس نے اسے شہر میں ہر طرح کی مصروفیت برقرار رکھنے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ ایک ماہر کیمرہ مین تھا۔اسے توقع تھی کہ ایک دن اس کی کہانی نہ صرف اسے شہرت کی بلندیوں پر پہنچادے گی بلکہ اس کے ذریعے وہ خوش حال اور دولت مند آدمی بھی بن جائے گا۔

اس کی کہانی کا آغاز نصف شب کے بعد سے صبح چھ بجے تک ہونا ضروری تھا۔ اس وقت تمام ٹی وی اسٹیشنوں کے نیوز روم بند ہوجاتے تھے۔اگر وہ ایسا نہ کرتا تو ٹی وی والوں کو اس کی کیا ضرورت تھی۔ظاہر ہے وہ ایسے ہی مناظر خود بھی فلمبند کرسکتے تھے۔

وہ ہر رات دعا کرتا کہ ٹی وی اسٹیشن سے متعلق ہر آدمی خواب خرگوش میں کھوجائے تاکہ وہ جو کچھ منظر عام پر لانا چاہتا ہے اس کی بھنک بھی کسی کے کان میں نہ پڑسکے۔ وہ اس کام میں مسلسل جدوجہد کررہا تھا اور اب اسے اپنے کام کے تمام نشیب و فراز کا علم ہوگیا تھا۔

ٹریکر اپنی یادداشت پر ہنستا اور خوف ناک مناظر اس کے دماغ میں رقص کرتے رہتے تھے۔ابھی یہ کل ہی کی تو بات تھی کہ وہ اپنی چادر کے نیچے دبکا چیخ رہا تھا۔ ردل

کرو۔ رول کرو۔ کیمرہ سے متعلق افراد اس منظر پر ہر وقت نہیں پہنچتے تھے ایک حادثے کا منظر تھا اور اسے دوبارہ حقیقی انداز میں سامنے لانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

اس قسم کے حادثات کی اس کے ذہن میں کمی نہیں تھی وہ بچپن میں بہت سے مناظر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اس کے ذہن میں ایک مکمل کہانی تھی۔ یہ کہانی ہر لحاظ سے اس کی اپنی تھی اور اس سے وہ منافع کمانے کی فکر میں تھا۔ وہ پوری قوت سے قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ اس کام میں مہارت کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔

وہ بے ثمر رات گزارنے کے بعد گھر جارہا تھا کہ پولیس ریڈیو سے اسے ایک لاش کے متعلق معلوم ہوا لاشوں کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں تھی کیونکہ ان کی فلمبندی میں صرف چند فٹ فلم کا زیاں ہوتا تھا۔ لیکن وہ اس حادثے کے مقام سے ایک میل دور تھا۔ اس لئے وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔ ”کیا مصیبت ہے۔“

وہ پہلی پیٹرول کار سے پہلے اس مقام پر پہنچ گیا تھا۔

اب وہ خوش دلی سے سیٹی بجاتا ہوا ہالی ووڈ کی طرف جارہا تھا۔ جب اس نے چینل کے سامنے گاڑی روکی تو مارے جوش کے اس کی بری حالت تھی۔ اس نے اپنی پک اپ کی کھڑکی سے منہ باہر نکالا اور گارڈ کی طرف دیکھ کر زندہ دلی سے چیخ پڑا لیکن۔ گارڈ کو شاید اس انداز سے کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ اس کی طرف سخت نگاہ سے گھورتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی کی ہلکی سی جھلک بھی نمودار نہیں ہوئی تھی حالانکہ وہ اس سے پہلے بارہا مل چکے تھے اور اس طریقہ کار سے بھی وہ کئی بار گزر چکے تھے۔

”تمہیں کیا کام ہے؟“ گارڈ نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

”نیوز روم کے لئے فلم لایا ہوں۔“ ٹریکر ہمیشہ یہی جواب دیتا تھا۔

”کس سے ملنا چاہتے ہو؟ مجھے اپنے رجسٹر میں نام درج کرنا پڑتا ہے۔“

”وائن گوسٹ۔ انچارج نیوز ایڈیٹر۔“

”وہ چھ بجے سے پہلے کسی سے نہیں ملتا۔“

”بہر حال میں اس سے ابھی اور اسی وقت ملنا چاہتا ہوں۔“ ٹریکر نے کہا۔

زیادہ باز پرس کئے بغیر گارڈ نے بڑی سرد مہری کے ساتھ اسے انگوٹھے سے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ اس نے گاڑی بڑھائی اور سیدھا نیوز بلڈنگ کے اس حصے میں پہنچ گیا جہاں پارکنگ ممنوع تھی۔ اس نے بڑی کاہلی سے اسٹیئرنگ کے نیچے دبا ہوا سیٹ نکالا اور گوسٹ سے ملاقات کے لئے دروازے کی طرف بڑھا۔

انچارج نیوز ایڈیٹر اسے ایک نوعمر دکھائی دیتا تھا۔ اس کی عمر پچیس سے کسی طرح زیادہ نہیں تھی۔ جیسے ہی اس نے ٹریکر کو دیکھا وہ اپنے سامنے رکھے ہوئے ایک ٹیلی فون پر کسی سے گفتگو میں مصروف ہو گیا۔ وہ ٹریکر جیسے آدمی کو انتظار کی زحمت دے کر بہت خوش ہوتا تھا۔ اس لئے یہ بات اس کی عادت میں شامل ہو گئی تھی۔

ٹریکر نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لگایا اور دھوئیں کا بادل سا اڑا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ نیوز ایڈیٹر تقریباً سب ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں جب سے ٹریکر نے فلمبندی کا کام شروع کیا تھا۔ اس نے ان طویل برسوں میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں دیکھی تھی۔ وہ ہر فلم خریدنے کو ایک ایسا مسئلہ بنا دیتے تھے کہ ٹریکر کو کسی خطرناک جنگ کا گمان ہوتا تھا۔

ٹریکر بولا۔ ”میرے پاس ایک اہم فلم ہے۔“

گوسٹ نے اشارہ کیا اور پھر ٹریکر کی طرف پشت کر کے فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ٹریکر تلملا کر رہ گیا۔ پرانے وقتوں میں ایسا نہیں ہوتا تھا اس جیسے آزاد رہ کر کام کرنے والوں کی بہت مانگ تھی۔ ان دنوں رات کے وقت حادثات کی فلمبندی کرنے والوں کی کمی تھی اس لئے ٹریکر کو کبھی نظر انداز نہیں کیا گیا تھا۔ اب اس کے پاس ذاتی عملہ تھا جن میں ساؤنڈ مین سے لے کر باقی ضروری آدمیوں تک سب ہی موجود تھے۔

پہلے تو لوگوں نے کبھی ٹی وی نیوز کے متعلق سنا بھی نہیں تھا۔ سولہ ملی میٹر کیمرے کی کارکردگی کے بارے میں بہت کم لوگوں کو معلوم تھا۔ ان دنوں ٹریکر کی مانگ

تھی۔ رپورٹر اسے نام کے پہلے حصے سے پکارتے تھے اس کے لئے دوپہر کا کھانا خرید کر لانا ان کے معمول میں شامل تھا۔ وہ اس کی ہر بات پر کھل کر ہنستے تھے جیسے صرف اسی طرح اس کی خوشنودگی حاصل ہوسکتی تھی۔ نہ معلوم کب ان کا مستقبل ٹریکر کی فلم سے وابستہ ہوجائے۔

ٹریکر زیرلب بڑبڑایا۔ اور اس یونین کو کوسنے لگا جس کی وجہ سے ٹی وی کے محکمے میں اس قدر انقلاب آ گیا تھا آج کل تو وہ بہ مشکل پیٹ بھرنے کی حد تک کمار ہا تھا۔ بیوی کی ضرورتوں کو پورا کرنا تو محض خیال ہوکر رہ گیا تھا۔ اسی لئے وہ بالکل تنہا تھا کوئی اسے ایک عام آدمی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا جس کا نام ٹریکر تھا۔ نیوز روم میں اسے برداشت کرنے کی صرف ایک وجہ تھی اور وہ یہ کہ ٹریکر رات کے ان لمحات میں حادثات کی فلمبندی کرتا تھا جب ساری کائنات میٹھی نیند سوئی ہوتی تھی۔

وہ اس زندگی سے مطمئن نہیں تھا وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح ماضی واپس آ جائے۔ وہ اپنی کھوئی ہوئی زندگی کو دوبارہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی زندگی روز روشن کے ہنگاموں سے ہمکنار ہوجائے۔

گوسٹ نے فون بند کیا اور ٹریکر کی طرف متوجہ ہوا۔ ”مجھے آج دن بھر کے لئے جن فلموں کی ضرورت تھی انہیں پہلے سے خرید چکا ہوں۔“

ٹریکر نے ایک نگاہ گلاس کی طرف ڈالی جہاں نصف درجن خبروں کے نشانات موجود تھے وہ جانتا تھا کہ اس تعداد سے دوگنا زیادہ خبریں بھی آ جائیں تو صرف ایک گھنٹے کا پروگرام مکمل ہوسکتا ہے۔

”اس وقت میں جو کچھ لے کر آیا ہوں تمہیں اس کی ضرورت محسوس ہوگی۔“ ٹریکر نے کہا۔

”تمام لوگ یہی کہتے ہیں، پھر بھی بتاؤ کیا خاص بات ہے؟“

”یہ ایک قتل کی واردات ہے۔“ ٹریکر نے کہا۔

گوسٹ کی آنکھیں سرک گئیں لیکن اس نے قبولیت کی چمک ظاہر نہیں ہونے دی۔

”گلا ایک کان سے دوسرے کان تک کاٹ دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری خوف ناک باتیں بھی موجود ہیں۔“ ٹریکر نے کہا۔

گوسٹ نے ایک دراز جھٹکے سے کھولی اور فلم خریدنے کا فارم نکالا ٹریکر کا نام پر کرنے کے بعد اس نے دریافت کیا۔

”اس کے علاوہ تم نے کیا کچھ معلوم کیا ہے؟“

”شکار ایک ساٹھ سال کا بوڑھا آدمی تھا۔ مین اسٹریٹ پر واقع ایک کیفے کی عقبی گلی میں اس کی لاش دریافت کی گئی ہے۔“

”مین اسٹریٹ۔“ گوسٹ نے مداخلت کی۔

”آخر وہ کون تھا؟ کیا کوئی بدمعاش؟“

”شرابی.....“ ٹریکر نے کہا۔

ایڈیٹر زیرلب بڑبڑایا۔ ”اس دور میں ایک یا دو پیگ شراب پینا عام بات ہے۔ اس میں انسانی زندگی کی دلچسپی کی کیا بات ہے؟“

”میں وہ واحد آدمی ہوں جس کے پاس لاش کی فلم موجود ہے۔“

گوسٹ نے غیردلچسپی کا اظہار کرنے کے لئے انکار میں گردن ہلائی۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ ایسا ہی ہوا ہے۔“

”حادثے کے بعد میں واحد کیمرہ مین تھا جو اس جگہ موجود تھا۔ میرا کام ختم ہوا تو پولیس نے لاش اٹھوا دی تھی میرا خیال ہے اس وقت کارونر لاش پر کام کررہا ہوگا۔ اس طرح کسی اور فلم کا ہر امکان ازخود ختم ہوجاتا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ ہم تمہاری فلم کو دیکھیں گے۔“

ٹریکر نے اثبات میں سرہلا دیا وہ جانتا تھا کہ آدھی جنگ ختم ہوگئی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ جب فلم کو تکنیکی مراحل سے گزارنے کے لئے منظور کرلیا جاتا ہے تو عموماً وہ فلم خرید لی جاتی ہے ورنہ اس قدر دوسری مول لینے سے کیا فائدہ؟

”ادائیگی کیا ہوگی......؟“ ٹریکر نے سوال کیا۔

”اگر ہم نے اسے قابل استعمال سمجھا تو حسب معمول 75 ڈالر کی ادائیگی ممکن ہے۔“

”یہ ایک اہم فلم ہے۔ اس کی قیمت بھی زیادہ ہونی

چاہئے۔"

"رات بھر کے کام کا معاوضہ اس سے زیادہ کیا ہوسکتا ہے میرا خیال ہے میں نے پہلے ہی زیادہ پیش کش کردی ہے۔" ایڈیٹر نے روکھائی سے کہا۔

"گویا اگر میں ایک ہفتے میں ایسی فلم حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاؤں تو میری ضرورتوں کے لئے کافی ہوگی۔" ٹریکر نے تلخ لہجے میں کہا۔

گوسٹ نے لاپرواہی سے کندھے جھٹک دیئے۔ "قتل کی وارداتوں کا صاف مطلب ہے ڈھیر سارا خون۔ رات کے کھانے پر دکھائے جانے والے پروگرام میں ہمیں بہت محتاط رہنا پڑتا ہے ہم نہیں چاہتے کہ کوئی ایسا منظر دیکھ کر ہمارا پروگرام دیکھنے والے اپنی بھوک ہی کھو بیٹھیں۔"

"میں اپنے کام میں محتاط ہوں۔" ٹریکر نے کہا۔

"میں نے ان زاویوں سے فلم بندی کی ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔"

"ٹھیک ہے ہم ابھی دیکھ لیتے ہیں۔" گوسٹ نے ڈرامائی انداز میں اپنے ڈیسک اسپیکر پر ہاتھ مارتا کہ ٹریکر بھی صورت حال سے آگاہ رہے۔ ایڈیٹر کا یہ دوسرا حربہ تھا۔ جس سے وہ ٹریکر جیسے کیمرہ مینوں پر قابو پالیتا تھا۔ بعض اوقات پولیس والے اس واردات کی کہانی کو انتہائی بے زار کن بنادیتے تھے اس لئے فلم کا تاثر بھی کم ہوجاتا تھا۔

لیکن اس بار جاسوس غیر متوقع طور پر باتونی ثابت ہوا۔ "یہ ٹریکر تو خون آشام ہے۔ اس نے لاش کے معاملے میں ہم سے بھی اولیت حاصل کرلی۔ کیا ہم اس وقت اسپیکر پر ہیں؟"

"ہاں......" ایڈیٹر نے کہا۔

"غالباً ٹریکر بھی تمہارے پاس ہی موجود ہے؟"

ایڈیٹر کے حلق سے بے معنی آواز نکلی جو غراہٹ سے مشابہہ تھی۔

"اس سے کہو کہ فلم کا بغور مشاہدہ کرے۔ اس بار ایک عجیب قاتل ہے سے پالا پڑا ہے۔ اس نے لاش پر کچھ اس قدر کام دکھایا ہے کہ ہم تفصیلات کو زیادہ پھیلانا نہیں چاہتے ورنہ تم جانتے ہی ہو کہ ہم لوگوں پر ان باتوں کا کیا اثر ہوتا ہے۔" جاسوس کی آواز سنائی دی۔

"ہم اسے احتیاط سے پیش کریں گے۔" گوسٹ نے وعدہ کیا۔

"کیا تم اس واردات کے بارے میں کوئی سرکاری بات بتاسکتے ہو۔"

"ابھی وقت نہیں آیا۔ فی الحال شناخت بھی عمل میں نہیں آئی۔ ہمارا خیال ہے کہ آلہ قتل ایک ریزر تھا لیکن تمہیں کارونرز کی رپورٹ کا انتظار کرنا پڑے گا اس سے پہلے کوئی بات نشر نہ کرنا۔"

"چونکہ ہم اس واردات کے بارے میں کوئی خیالی بات نہیں کہہ سکتے اس لئے فلم کی قیمت 75 ڈالر سے زیادہ ہونی چاہئے۔" ٹریکر نے شکایت کی۔

"اب پرانے وقتوں کی جیسی بات نہیں ہے، کیا تمہیں کینڈی کی وہ کہانی یاد ہے جس نے میلی بیو میں جنم لیا تھا؟"

"وہ بات دوبارہ منظر عام پر نہیں آسکتی۔"

ٹریکر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "یہ 2006 کا واقعہ ہے۔ ممکن ہے 2007ء میں پیش آیا ہو۔ ان دنوں کینڈی ساحل کے ساتھ ساتھ گاڑی چلا رہا تھا کہ اچانک اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ چند لمحے سمندر کی جھاگ میں چہل قدمی کرکے محظوظ ہو۔ اس وقت صرف ایک کیمرہ مین وہاں اتفاق سے موجود تھا۔ اس نے فلم بندی کی اور بعد میں اسی فلم کا اسے ایک ہزار ڈالر معاوضہ ملا تھا۔"

"وہ ایک اتفاق تھا۔" گوسٹ نے کہا۔

"اب ایسا اتفاق دوبارہ کبھی پیش نہیں آسکتا۔ اب اسٹیشن بہت بڑے ہوگئے ہیں۔ اور فلم کا عملہ بھی بہت بڑھ چکا ہے۔"

"نہیں۔" ٹریکر نے احتجاج کیا۔

"اب بھی میرے پیشے کے لوگ کوئی اہم کہانی منظر عام پر لاسکتے ہیں۔" گوسٹ قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

ایک ہفتے بعد ایک اور لاش پائی گئی۔ اس لاش کا گلا بھی بری طرح کاٹ دیا گیا تھا اور اس منظر کی فلم بندی میں

بھی ٹریکر سب پر سبقت لے لیا گیا تھا چینل نے اسے اس فلم کی ایک سو ڈالر ادائیگی کی تھی۔

ٹائمنر اخبار، جس نے پہلی واردات کی خبر آخری صفحے پر دی تھی اس نے دوسرے قتل کی خبر سرخی کے ساتھ پہلے صفحے پر شائع کی۔ گلا کاٹنے والے قاتل کی واپسی پر سرخی ٹریکر کے لئے بہت اہم ثابت ہوئی کیونکہ ٹی وی کے لئے بہرحال یہ ایک سرکاری حوالہ تھا۔ قاتل کی خبر اب وقت کی اہم ترین خبر بن گئی تھی۔

جب تیسری لاش دریافت ہوئی تو ٹریکر نے ایک ہم پیشہ کیمرہ مین کو ساتھ ملایا۔ اس بار اگرچہ فلم زیادہ اہم نہیں تھی لیکن ایڈیٹر ڈیڑھ سو ڈالر دینے پر آمادہ ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ دوسرے چینل سودے بازی پر آمادہ ہیں۔

ٹریکر اب ایک اہم کیمرہ مین بن چکا تھا۔ اس نے مقابلے کی کبھی پرواہ نہیں کی تھی۔ وہ اس پیشے کے ساتھ ایک طویل عرصے سے وابستہ تھا اب اسے یقین ہو رہا تھا کہ قتل کی اگلی واردات اس کے لئے جادوئی نمبر کی حامل ہوگی۔ ایک ایسا جادوئی عدد جو اس کے لئے خوش قسمتی کا مظہر ہوگا۔ ایک ایسی واردات جس کے ذریعے وہ بہت زیادہ کمائے گا۔ ممکن ہے اس واردات کی فلم کینڈی کی کہانی سے بھی سبقت لے جائے۔ اس نے یہ بات دل کی گہرائیوں سے محسوس کی تھی۔

خلاف توقع صورت حال بگڑ گئی۔ ٹی وی اسٹیشن نے پولیس سے ساز باز کرلی۔ ان کے درمیان ایک معاہدے نے جنم لیا۔ پولیس اس معاہدے کے مطابق براہ راست ٹی وی کے عملے کو ترجیح دے گی۔

"بہرحال......" گوسٹ نے ٹریکر سے کہا۔

"دیوانے قاتل روزانہ ہی وارداتیں نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ تم آزاد کیمرہ مین ہمیں لوگوں کے تاثرات فراہم نہیں کر سکتے۔ اس حادثے کے دوران بعد میں تماشائیوں کی آوازیں بھی فلم کے ساتھ موجود ہوں تو فلمی مناظر میں حقیقت کا عنصر بڑھ جاتا ہے مجھے افسوس ہے ٹریکر کہ تم نے سودے بازی کا جو بازار گرم کر رکھا تھا وہ اب ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔"

"تمہیں اپنے یہ الفاظ واپس لینے پڑیں گے۔" ٹریکر نے دل میں سوچا اور پیشانی پر سلوٹیں ڈال کر ایڈیٹر کر گھورنے لگا۔ اس بات سے بھی اسے ذہنی سکون حاصل نہ ہو سکا۔ وہ پچپن برس کا ایک پیشہ ور رپورٹر تھا اس عمر میں عموماً دوسرے لوگ ریٹائر ہونے کا منصوبہ بناتے ہیں جبکہ وہ ایک دیوانے قاتل اور اس کے شکار کا متلاشی رہتا تھا۔

"مجھے مددگار رپورٹر بنانے کے بارے میں کیا خیال ہے۔" ٹریکر نے مودبانہ لہجے میں کہا۔

"تم جانتے ہو کہ کبھی نہ کبھی تمہارا عملہ بھی ناکام ہوسکتا ہے۔"

کشادہ آنکھوں سے ایڈیٹر نے اسے گھورا۔

"تم......؟ نہیں ٹریکر...... اگر میرا ایک عملہ ناکام رہتا ہے تو میرے پاس ان کی مدد کے لئے دوسرے آدمیوں کی کمی نہیں ہے اور پھر تم یونین کے ساتھ وابستہ بھی نہیں ہو۔"

جب وہ نیوز روم سے باہر نکلا تو اس کا دماغ غصے سے کھول رہا تھا اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ٹی وی کے عملے کو ہر حال میں نیچا دکھائے گا۔

وہ تھکا تھکا سا اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر سوچ کی گہری سلوٹیں تھیں۔ اور وہ غور کر رہا تھا کہ رات شروع ہونے میں ابھی کتنی دیر باقی ہے۔ کئی بیزار کن گھنٹے گزارنے کے بعد کہیں کام کا وقت شروع ہوگا۔ ایسے میں گھر جانے سے کیا فائدہ؟ صورت حال اس حد تک بگڑ گئی تھی کہ پیشہ ور رپورٹروں کا کام تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ ٹریکر کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے اندر کوئی چیز ریزہ ریزہ ہو گئی ہو۔

"میں بھی ان شرابیوں کی طرح آوارہ گرد ہو گیا ہوں۔" وہ زیر لب بڑبڑایا۔

"بہرحال اب مجھے کسی نئے انداز سے کام شروع کرنا پڑے گا۔" اس نے شہر کی طرف اپنی گاڑی پوری رفتار سے اڑانی شروع کردی۔

اگلے روز صبح چار بج کر تیس منٹ پر اس نے گوسٹ کے گھر فون کیا۔

"تمہیں میرے گھر کا نمبر کہاں سے ملا ہے؟" ایڈیٹر غرایا۔

''اس بات کو چھوڑو۔'' ٹریکر نے کہا۔
''میں ایک فیصلہ چاہتا ہوں ابھی اور اسی وقت۔''
''کیا کوئی نئی واردات ہوگئی ہے؟''
''تم ایک دوہرے قتل کی فلم کا کیا معاوضہ دو گے۔ دو مقتول جن کے گلے کٹے ہوئے ہیں؟''
''تم جانتے ہو کہ میرا عملہ کام کررہا ہے۔''
''دوہرا قتل اور قاتل سے مخصوص انٹرویو؟''
''ہیں...... کیا کہا انٹرویو۔ کیا تمہیں یقین ہے؟''
''میں دو ہزار معاوضہ چاہتا ہوں۔'' ٹریکر نے کہا۔
''کینڈی کی فلم کا دوگنا معاوضہ......''
گوسٹ کی طرف سے جواباً ایک غراہٹ سنائی دی۔ ''میں اتنا بڑا فیصلہ ذاتی طور پر نہیں کرسکتا۔'' گوسٹ نے کہا۔
''مجھے انتظامیہ سے رابطہ قائم کرنا پڑے گا۔''
''میں صرف پانچ منٹ انتظار کرسکتا ہوں۔''
''تمہارا نمبر کیا ہے؟''
ٹریکر نے پے فون کا نمبر دیکھا اور گوسٹ کو بتادیا۔
ٹھیک چار منٹ بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور گوسٹ کی آواز سنائی دی۔
''ایک ہزار بہت بڑی قیمت ہے ہم اس سے زیادہ نہیں دے سکتے۔''
''میں اس سے زیادہ کماسکتا ہوں۔''
ان کے درمیان سودے بازی شروع ہوگئی۔ بالآخر ایڈیٹر نے کہا۔
''بارہ سو سے زیادہ نہیں۔ یہ انتہائی معاوضہ ہے۔''
ٹریکٹر مسکرایا۔ ''بارہ سو کا معاوضہ اسے وقت کا سب سے مہنگار پورٹر بنادے گا۔ وہ جانتا تھا کہ ٹی وی نے اس سے پہلے کبھی اتنی رقم ادا نہیں کی۔'' اس نے گوسٹ کو ایڈریس دیا اور کہا۔
''تمہارا عملہ وہاں کتنی دیر میں پہنچ جائے گا؟''
''پندرہ منٹ۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی۔''
''ٹھیک ہے۔ مجھے منظور ہے۔'' ٹریکٹر نے کہا اور سلسلہ منقطع کردیا، وہ ٹیلی فون بوتھ سے باہر نکلا اور تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ اس نے دروازہ کھولا تا کہ کار کی روشنی میں وقت دیکھ سکے۔ اس دوران وہ سگریٹ کے گہرے کش لگا رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر پراسرار مسکراہٹ تھی۔
نیند کی کمی کے باعث اس کا سر چکرا رہا تھا۔ اس نے سستی سی شراب بھی پی رکھی تھی جس کے اثرات اس کی کھوپڑی میں طوفان اٹھا رہے تھے۔
اس نے گاڑی کا دروازہ مقفل کیا اور ففتھ اسٹریٹ برج کی طرف لڑکھڑاتا ہوا چل دیا۔
دونوں آوارہ گرد شرابی اس جگہ موجود تھے جہاں وہ انہیں چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ اس وقت بے ہوشی کے عالم میں تھے۔
ٹریکر کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا اور ان دونوں پر کیمرہ فوکس کرنے میں دشواری ہورہی تھی۔
''میں چاہتا ہوں کہ مجھے ہمیشہ یاد رکھا جائے۔''
وہ زیرلب بڑبڑایا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے چہرے پر شہرت کی روشنی صاف محسوس کی۔ اس نے آنکھوں سے پسینہ صاف کیا تا کہ وہ کیمرہ ٹھیک سے سیٹ کرسکے۔ اسی لمحے ٹریکر نے محسوس کیا کہ چینل کی تین نیوز ویگن آرہی ہیں۔
اب اس کے پاس قطعاً وقت نہیں تھا۔ اس کا قہقہہ پل کے نیچے محدود جگہ میں گونج اٹھا۔ پولیس کو اصل قاتل کا سراغ لگاتے لگاتے ایک عرصہ گزر جائے گا وہ تمام چالبازیوں سے آگاہ تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اس کے ارادے کیا ہیں؟
چند لمحے وہ کھڑا موزوں ترین زاویے کا انتخاب کرتا رہا پھر اس نے جیب سے ایک تیز دھار ریزر نکالا۔ وہ آگے بڑھا دونوں آوارہ گرد بے ہوشی کی وجہ سے مداخلت کے قابل نہیں تھے۔ اس کے سامنے چند ہی لمحوں کے بعد دو لاشیں تھیں جن کے گلے کٹے ہوئے تھے اور وہ فلم بندی میں مصروف تھا۔



ہساپوکا بلیدان

ایس امتیاز احمد۔کراچی

بلیدان کا وقت قریب تھا کہ اچانک ایک خطرناک موٹا تازہ کالا ناگ پھنکارتا ہوا غار کے کونے سے نکلا اور ناچتی ہوئی دوشیزہ کے سامنے آ کر جھومنے لگا، سانپ کو دیکھ کر دوشیزہ اس سانپ کے سامنے بیٹھ گئی اور اپنی زبان باہر نکال لی تو سانپ نے اس کی زبان پر ڈس لیا۔

اچھوتی انوکھی اور اچنبھے میں ڈالتی ہوئی......لرزیدہ لرزیدہ نا قابل یقین پراسرار کہانی

ان دنوں ہم برما کے حسین پر فضا اور پراسرار فضا سے گزر رہے تھے۔ اس مہم میں میرے علاوہ چار افراد اور بھی تھے۔ روزی، ارمنڈ ڈینس، رائے فلپس (کیمرہ مین) اور حمیک کینی جو نہایت ہوشیار ڈرائیور اور ماہر موٹر مکینک تھا۔ مہم کا سربراہ آرمنڈ ڈینس تھا۔ اس نے بلاشبہ بہترین افراد منتخب کیے تھے۔ ان میں سے ہر فرد اپنے فن کا ماہر تھا۔ پانچ افراد کا یہ مختصر قافلہ ایک ٹرک اور دو کاروں سمیت ایک شام دریائے ایرادتی کے معاون دریا کائی پیڈونگ کے کنارے رکا۔ ہمارے سامنے دو ڈھائی میل کے فاصلے پر پہاڑی پوپا کی خوبصورت چوٹی ڈوبتے سورج کی سنہری کرنوں سے چمک رہی تھی اور ہمیں اب اس پہاڑی کے دامن میں بسے ہوئے ایک چھوٹے سے گاؤں تک پہنچنا تھا لیکن ہم میں سے کسی کو معلوم نہیں تھا کہ دریا عبور کیسے کیا جائے گا۔ ہم نے سوچا کہ شاید دریا کے دوسرے کنارے پر رہنے والے جنگلی باشندے ہماری مدد کریں گے مگر وہاں تو کسی آدمی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ ہم نے ٹرک اور کار وہیں چھوڑ دی ایک شخص کو نگرانی پر مقرر کیا اور دریا کے کنارے کنارے اس امید پر آگے بڑھے کہ شاید کہیں دریا پار کرنے کا راستہ بنا ہوا ہو، ہم چاہتے تھے کہ سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے اس بستی تک پہنچ جائیں، ورنہ جنگل میں رات کاٹنی پڑے گی۔

آخر خدا خدا کر کے دوسرے کنارے پر ہمیں نیم برہنہ سیاہ فام جنگلی باشندے دکھائی دیے۔ ڈینس حلق پھاڑ کر چلایا تو وہ لوگ فوراً رک گئے اور دوڑتے ہوئے کنارے کی طرف آئے۔ ہم نے انہیں اشاروں سے سمجھایا کہ ہم دریا عبور کرنا چاہتے ہیں تو وہ پھر واپس مڑے اور نہ جانے کہاں سے درختوں کی آڑ میں چھپی ہوئی چھوٹی چھوٹی کشتیاں گھسیٹ لائے اور انہیں دریا میں ڈال کر جلدی جلدی چپو چلاتے ہوئے اس کنارے پر آگئے۔ ہم نے انہیں خوش کرنے کے لیے بڑے بڑے سگار دیے کیونکہ ہمیں معلوم تھا کہ یہ لوگ سگار بڑے شوق سے پیتے ہیں۔ پتا چلا کہ ٹرک اور کار دریا پار لے جانے کا کوئی بندوبست نہیں ہے اور ہمیں لازماً انہیں یہیں چھوڑنا پڑے گا۔ قصہ مختصر ہم سب ان آدمیوں کے ساتھ دریا عبور کر کے ان کے قبیلے کے سردار سے ملنے چل پڑے۔

ایک شخص ہماری پیشوائی کے لیے بستی کے تمام زن و مرد سمیت ایک بڑی جھونپڑی کے آگے کھڑا تھا اس کا قد لمبا اور جسم مضبوط تھا اور اس نے سر پر جنگلی پرندوں کے پروں سے بنی ہوئی ایک اونچی ٹوپی رکھی تھی۔ میں حیران تھا کہ امریکہ کا ریڈ انڈین یہاں کیسے آگیا۔ واقعی جب وہ بولا تو ہم سب حیرت سے اچھل پڑے۔

"تم امریکن ہو؟" اس نے صاف انگریزی لہجے میں پوچھا اور پھر ہمارے جواب کا انتظار کیے بغیر کہنے لگا۔ "میرا نام مائیکل جوزف ہے اور میں کیلی فورنیا کے مشن

ج سے تعلق رکھتا ہوں مجھے ان لوگوں میں رہنے کے
ے مجبوراً انہی لوگوں جیسا بھیس بدلنا پڑا ہے۔" پھر وہ
ہہ مار کر ہنسا اور ہمیں اپنی جھونپڑی میں لے گیا جہاں ا
ک گوشے میں پتھر کے بنے ہوئے آتشدان میں آگ
ک رہی تھی اور فرش پر جنگلی بھینسوں اور ریچھ کی کھال
ھی ہوئی تھی۔ ہم سب حیرت سے کبھی اس کی طرف
ے اور کبھی اس جھونپڑی کو، مائیکل جوزف نے ہمیں
ایا کہ وہ دس سال قبل ہندوستان سے برما آیا اور کافی
صیبتیں جھیلنے کے بعد اسی گاؤں میں اپنا اڈہ جمانے کے
بل ہوسکا۔ اب وہ یہاں کا سردار ہے، ہر شخص اسے دیوتا
ی طرح پوجتا ہے اور کسی کو اس کے حکم سے سرتابی کی مجال
ہیں ہے اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کی آٹھ بیویاں ہیں



لیکن ان میں سے ایک اس کی خاص منظور نظر ہے پھر اس نے اپنی اس منظور نظر بیوی کو بلایا اور ہم لوگوں کا تعارف کرایا۔ اس عورت کے صرف جسم کے نچلے حصے پر ایک معمولی سا کپڑا تھا جو اس کی ستر پوشی کرنے سے عاجز تھا اور جسم کا بالائی حصہ برہنہ تھا۔ اس کے جسم کے نشیب و فراز دلکش اور کشش انگیز تھے۔ روزی زیادہ دیر تک اس عورت کو نہ دیکھ سکی اور ہلکے سے اپنا منہ پھیر لیا۔

یکا یک سردار نے ہم سے پوچھا۔ "معلوم ہوتا ہے آپ لوگ کسی خاص مقصد کے تحت یہاں آئے ہیں؟"

"ہاں ہے تو خاص مقصد......" ڈینس نے جواب دیا۔ "ہم ہساپو کی پہاڑی کی تلاش میں آئے ہیں، کیونکہ ہم نے سنا ہے کہ یہاں کالے ناگ کی پوجا کرنے والا ایک قبیلہ ہے جسے ناگ کہا جاتا ہے ہم اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"ان کے متعلق سنا میں نے بھی ہے لیکن کبھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا اور سچ پوچھو تو مجھے اس قصے کی صحت پر کچھ ایسا یقین نہیں ہے۔" سردار نے کہا۔

چند لمحے تک وہ آتش دان میں بھڑکتے ہوئے شعلوں کو گھورتا رہا پھر بولا۔ "یہاں بلاشبہ سینکڑوں سال پہلے سیاہ ناگ کی پوجا ہوتی تھی اور اب بھی پیکن شہر کے کھنڈروں میں دو قدیم مندر موجود ہیں جنہیں "سانپوں کا مندر" کہا جاتا ہے اور ان مندروں میں ایک پجاری اب بھی رہتا ہے۔ میں اسے جانتا ہوں شاید وہ آپ لوگوں کو ناگ پوجا کے بارے میں صحیح معلومات دے سکے۔"

جوزف نے اسی جھونپڑی میں ہمارے آرام کا بندوبست کر دیا۔ اپنے آدمیوں کو بھیج کر ٹرک میں سے اس نے ہمارے بستر اور ضروری سامان منگوا دیئے، ابلے ہوئے گوشت سے ہماری تواضع کی اور صبح ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوگیا۔ اس کے جانے کے بعد ہم دیر تک اسی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ ڈینس کہتا تھا کہ یہ شخص اپنے آپ کو مشن کا آدمی ظاہر کرتا ہے۔ لیکن مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی خونی ہے اور پکڑے جانے کے ڈر سے یہاں آن چھپا ہے۔ میں نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور آہستہ سے کہا۔

"یار تم بھی غضب کرتے ہو، اگر اسے پتا چل گیا کہ ہم اس کے بارے میں ایسی بات کر رہے ہیں تو خدا معلوم کیا نقصان پہنچائے، ہمیں اس کا ماضی کریدنے کی ضرورت ہی کیا ہے ہمیں تو اپنے کام سے غرض رکھنی چاہیے۔"

منہ اندھیرے ہی جوزف ہمارے پاس آیا اور ہم جلد جلد پیکن کی طرف جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ جوزف نے بتایا کہ ہماری کاریں اور ٹرک دریا کے پار آ چکے ہیں، تو ہم سب حیرت سے اس کی طرف تکنے لگے، میں نے اس سے پوچھا کہ "تم نے یہ ناممکن کام کیسے سر انجام دیا۔" وہ معنی خیز ہنسی ہنسا اور بولا۔ "آپ کے نزدیک یہ کام ناممکن ہوگا، لیکن میرے آدمی اسے اتنا مشکل نہیں سمجھتے۔"

جھونپڑی سے باہر نکلے تو تھوڑے فاصلے پر کاریں اور ٹرک صحیح سلامت موجود تھے جوزف کہنے لگا۔ "آپ لوگوں کا ارادہ غالباً پیدل جانے کا تھا لیکن آپ کو معلوم نہیں کہ پیکن کے کھنڈرات ایک سو مربع میل کے علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں اور یہ شہر مسیح کی پیدائش سے پہلے اجڑ چکا تھا۔"

کاریں کھڑی تھیں چنانچہ ہم اس میں بیٹھ کر جوزف کی رہنمائی میں پیکن کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ اتنا دشوار گزار تھا کہ خدا کی پناہ، جنگلوں، دلدلی میدانوں اور پہاڑی ٹیلوں میں سے دقت دشواری گزرتے ہوئے ہم سورج غروب ہوتے ہوتے پیکن پہنچ گئے۔ ایک مناسب سی جگہ ہم نے اپنی کاریں روک دیں کیونکہ انہیں اب اس سے آگے لے جایا نہیں جا سکتا تھا۔

ہمارے چاروں طرف میلوں تک کھنڈر پھیلے ہوئے تھے، مندروں اور عبادت گاہوں کے کھنڈر جن کی تعداد بہت تھی۔ یہ شہر کسی زمانے میں برما کا دارالحکومت تھا مگر آج اس کے صرف کھنڈر باقی ہیں۔ جو زمانے کی ستم ظریفی پر صدیوں سے نوحہ خواں ہیں۔ ایک بھیانک سناٹا پورے ماحول پر مسلط تھا۔ البتہ کبھی کبھی گیدڑوں کے چلانے کی آواز میں اس سناٹے کو چیرتی ہوئی ہمارے کانوں تک آتی تھیں۔ ہم سب چپ چاپ دیر تک ان کھنڈروں میں چلتے رہے۔ ہمارے دلوں پر ایک ہیبت سی طاری تھی۔ یکا یک مشرق کی طرف سے چاند نے درختوں کی اوٹ سے جھانکا اور اس ویرانے میں زرد روشنی پھیل گئی جس نے ماحول کو اور پراسرار بنا دیا۔ آسمان پر بڑی بڑی سیاہ چمگادڑیں پرواز کرتی ہوئی نہ جانے کس طرف جارہی تھیں۔ مندروں کی ٹوٹی پھوٹی دیواروں پر ایک دو جگہ ہمیں چند گدھ بھی دکھائی دیے جو بے حس وحرکت اپنا سر پروں میں چھپائے بیٹھے تھے۔

ایک گھنٹہ تک اسی طرح چلنے کے بعد ہم ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں زمین نہایت دلدلی اور نرم تھی۔ سرد ہوا کے تیز جھونکوں نے ہمارا استقبال کیا۔ ہمارے راہبر نے بتایا کہ دریائے ایراوتی قریب ہی ہے لیکن ہمارا رخ دریا کی طرف نہ تھا یہ دلدلی میدان عبور کرتے ہی ہماری نگاہ کچھ فاصلے پر بنی مندر کی دو شکستہ عمارتوں پر پڑی جن کا رنگ گردش زمانہ کے باعث سیاہ پڑ گیا تھا۔ ان کی ٹوٹی پھوٹی دیواروں پر جا بجا بے شمار گدھ بیٹھے نظر آئے ہمیں دیکھتے ہی وہ ایک ایک کر کے وہاں سے اڑے اور مغرب کی طرف چلے گئے، ان کی بیٹیں جا بجا بکھری ہوئی تھیں اور تعفن کے مارے ہمارے دماغ اڑے جارہے تھے۔ طوعاً وکرہاً ہم ایک مندر کے قریب پہنچے تو جوزف نے آگے بڑھ کر لکڑی کے ایک بلند اور مضبوط دروازے پر آہستہ سے دستک دی، چند ہی منٹ بعد دروازے کے

پیچھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر دروازہ ذرا سا کھلا تو ہم نے اپنے سامنے ایک عمر رسیدہ پجاری کو کھڑے پایا جس کے ہاتھ میں جلتی ہوئی شمع تھی، پجاری کا سر منڈا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں اور گردن سے لے کر ٹخنوں تک موٹے کپڑے کا ایک سرخ لبادہ اوڑھ رکھا تھا اس نے اپنا کمزور ہاتھ ذرا ونچا کیا اور شمع کی مدھم روشنی میں اپنی بے نور آنکھوں سے ہم میں سے ہر ایک کا جائزہ لیا پھر اس نے بالوں سے بے نیاز سر پر بایاں ہاتھ پھیرا اور ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا ہم سب خاموشی سے مندر میں داخل ہو گئے، پجاری نے شمع ایک طاقچے میں رکھی اور اپنی جگہ پر بیٹھ کر جوزف کی طرف متوجہ ہوا اور برمی زبان میں کچھ کہنے لگا۔ جوزف نے ہمیں بتایا کہ وہ ہمارے آنے کا مقصد پوچھ رہا ہے اور جب اسے بتایا گیا کہ کنیسی یا کانسی نام کے ایک گاؤں کی تلاش میں ادھر آئے ہیں جو ایک پہاڑی پر آباد ہے اور جہاں زمانہ قدیم سے ناگ کی پوجا ہوتی ہے تو پجاری دم بخود ہو کر ہمیں تکنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ دیر تک وہ اس کشمکش میں مبتلا رہا کہ کیا بتائے لیکن جب ہمارا اصرار از حد بڑھا تو کہنے لگا۔

"مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ ناگ دیوتا کی پوجا اب بھی ہوتی ہے لیکن کہاں ہوتی ہے، یہ میں نہیں جانتا، آپ اگر رات کی وادی میں جا سکیں جو کایالاپ میں واقع ہے تو وہاں آپ کو کوئی نہ کوئی آدمی ضرور ملے گا جو کانسی گاؤں کا پتا جانتا ہوگا۔ اگر وہ رہنمائی کرنے پر تیار ہو جائے تو آپ وہاں تک پہنچ جائیں گے۔"

"رات کی وادی اور کایالاپ کی تلاش کا مسئلہ اتنا آسان نہ تھا۔ ہفتوں تک ہم ان دو پراسرار مقامات کی کھوج میں گھومتے رہے بعض اوقات ہمارے ساتھی جھنجلا جاتے اور کہتے یا تو ناگ کی پوجا کا قصہ فرضی ہے اس کا کوئی وجود نہیں یا اس پجاری نے ہمیں ٹالنے کے لیے جھوٹ بولا ہے لیکن ایک روز عجیب اتفاق ہوا مجھے ایک برمی باشندے نے ایک قلمی کتاب لا کر دی جو انگریزی میں لکھی ہوئی تھی۔ یہ دراصل ایک انگریز پادری بلسن کا روزنامچہ تھا جو ایک صدی پیشتر برما میں عسائیت کی تبلیغ کے لیے آیا تھا۔ اس روزنامچے میں اس نے اس ملک کے باشندوں ان کے دلچسپ رسم و رواج اور قدیم تہذیب کا تفصیلی ذکر کیا تھا۔ اسی روزنامچے میں اس نے ایک جگہ لکھا تھا۔

"چند روز ہوئے میں ایک دور افتادہ پہاڑی بستی میں گیا۔ یہاں کے باشندوں کی زبان اب کچھ کچھ سمجھنے لگا ہوں۔ اس ملک میں بہت زیادہ بولیاں بولی جاتی ہیں میدانی اور پہاڑی علاقوں میں بسنے والے ہر قبیلے کی زبان الگ ہے اور کوئی ایک دوسرے کی بولی نہیں سمجھتا۔ مان، پیو اور برمی یہاں کی مشہور زبانیں ہیں بعض زبانیں چینی اور کمبوڈین زبانوں سے اور بعض تبتی زبانوں سے میل کھاتی ہیں شام کو گاؤں کا سب سے معمر شخص جو پگوڈا کا پجاری بھی ہے میرے پاس آیا۔ وہ ہمارے مذہب کے بارے میں کچھ اور جاننا چاہتا تھا وہ مجھ سے کافی دیر تک باتیں کرتا رہا۔ اگرچہ اس کی زبان سمجھنے میں مجھے دشواری ہوتی تھی لیکن اتنا مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ ناگ دیوتا کا ذکر کر رہا ہے۔

وہ کہتا تھا کہ کانسی نام کے ایک گاؤں میں ایک ہزار برس سے ناگ کی پرستش ہو رہی ہے یہ گاؤں برما کے شمالی حصہ میں ایک سیاہ پہاڑی کے اوپر واقع ہے جہاں ناگ دیوتا کے کئی مندر ہیں۔ اس گاؤں میں اجنبیوں کو جانے کی اجازت نہیں ہے اور اگر کوئی چوری چھپے وہاں داخل ہونا چاہے تو ناگا باشندے اسے مار ڈالتے ہیں۔ اس بڈھے کی باتیں سن کر مجھے بڑا تعجب ہوا اور میں اب یہ سوچ رہا ہوں کہ اس گاؤں میں جا کر اپنی آنکھوں سے ناگ کی پوجا کا تماشا دیکھوں۔ زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے......"

روزنامچے میں یہ کہیں بھی درج نہ تھا کہ پادری بلسن وہاں پہنچنے میں کامیاب ہوا یا نہیں۔ روزنامچے کے اوراق نہایت بوسیدہ ہو چکے تھے اور جگہ جگہ سے گل چکے تھے بعض جگہ حروف مٹے ہوئے اور بعض جگہ اتنے مدھم تھے کہ انہیں پڑھنا دشوار تھا لیکن ان تمام باتوں کے باوجود پادری بلسن کی تحریر سے یہ ثابت ضرور ہوتا تھا کہ کانسی نام کا کوئی گاؤں شمالی حصے میں موجود ہے اور وہاں سو سال پہلے

تک ناگ کی پوجا ہوتی تھی۔

تنگ آ کر ہم نے نیپال جانے کا فیصلہ کر ہی لیا کیونکہ ہمارے پروگرام کے مطابق برما میں قیام کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ ہمارے کیمرہ مین کو افسوس تھا کہ وہ ناگ دیوتا کی پوجا کرنے والوں کی تصویریں نہیں لے سکا، شام کا وقت تھا ہم برما کی سب سے بڑی جھیل کے کنارے پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے کہ ادھر سے ہاتھی پر سوار ایک پجاری گزرا، ہم نے اسے یوں پہچانا کہ اس نے نیلے پیلے رنگ کا لمبا چغہ پہن رکھا تھا، میں نے یوں ہی ذرا باتیں کرنے کے خیال سے اسے آواز دی۔ اس نے فوراً مہاوت کو ہاتھی روکنے کا حکم دیا اس کے چہرے پر بڑا ہی جلال تھا اور بڑی بڑی آنکھوں میں سرخی جھلک رہی تھی۔ وہ خاموشی سے ہمارے پاس آن کھڑا ہوا، میں جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے آگے جھکا اور نہایت احترام سے اپنے خیمے میں لے آیا۔ اسے خوشبودار تمباکو پیش کیا گیا جسے اس نے مسکرا کر قبول کر لیا۔

برما میں کئی ماہ تک گھومنے کے دوران ہم نے وہاں کی زبانوں کے چند الفاظ رٹ لیے تھے جن سے ہم نے بڑے بڑے کام نکالے۔ جب پجاری اطمینان سے بیٹھ گیا تو ٹوٹے پھوٹے برمی لہجے میں، میں نے اس سے گفتگو کا آغاز کیا۔ میرا پہلا سوال یہ تھا۔ ”کیا تمہیں معلوم ہے کہ کانسی نام کا گاؤں کہاں ہے؟“ یہ سنتے ہی وہ چونکا اور حیرت کے آثار اس کے چہرے پر نمودار ہوئے چند لمحے تک وہ کچھ سوچتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔

”ہاں میں جانتا ہوں کیا تم وہاں جانا چاہتے ہو؟“

اب ہمارے حیران ہونے کی باری تھی۔ روزی کہنے لگی۔ ”کیا وہاں ناگ دیوتا کی پوجا ہوتی ہے۔“ پجاری کی آنکھوں کے سرخ سرخ ڈورے اور گہرے ہو گئے اور ان میں سانپ کی آنکھوں کی سی چمک نمودار ہوئی میں نے گھبرا کر اس کے چہرے سے نظریں ہٹالیں پھر وہ بھاری لہجے میں بولا۔

”میں اسی گاؤں کے پگوڈا کا پجاری ہوں۔ وہاں اجنبی لوگوں کا قدم رکھنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے لیکن میں تمہیں وہاں لے چلوں گا تم مجھے اچھے آدمی معلوم ہوتے ہو...... میں صبح آؤں گا۔ آپ لوگ تیار رہیں اور وہاں......“ اس نے پھر اپنی نگاہیں یکے بعد دیگرے ہم میں سے ہر شخص کے چہرے پر گاڑ دیں اور تنبیہ کرنے کے انداز سے کہا۔

”یہ بات یاد رکھنا کہ اگر تم نے وہاں کسی باشندے یا ہمارے دیوتاؤں (سانپوں) کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو تم میں سے کوئی زندہ نہیں رہے گا۔“

”کہو دوستو...... کیا صلاح ہے؟ نیپال جانا چاہیے ہو یا کانسی؟“ میں نے کہا۔

سبھی گم صم تھے۔ غالباً پجاری کے کہے ہوئے الفاظ ان کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ آخر آرمنڈ کہنے لگا۔ ”ہم وہاں ضرور چلیں گے۔ قدرت خود ہماری مدد کر رہی ہے۔ کانسی کا پجاری ہمیں اپنے ہمراہ لے جانے پر جب رضا مند ہے تو آخر ہمیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ وہ صبح آئے گا ہی نہیں۔“ روزی کہنے لگی۔

”وہ ایسا آدمی نہیں تھا روزی۔“ آرمنڈ بولا۔ ”خیر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔“

ساری رات ہم میں سے کوئی پوری نیند نہ سو سکا بلکہ مجھے تو ایک بار کچی نیند میں پجاری کا چہرہ بھی دکھائی دیا۔ خدا خدا کر کے مشرق کی طرف سورج کی آمد کا اعلان ہوا ہم جلد ناشتے سے فارغ ہوئے اور سامان باندھ کر موٹروں پر رکھ لیا، نہ معلوم کتنی دور جانا پڑے اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ پجاری اپنے ہاتھی اور مہاوت سمیت ہماری جانب تشریف لا رہے ہیں۔ اس نے اشارے سے ہمیں سلام کیا اور ہاتھی کی پشت سے اترا۔

”آپ لوگ میرے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہیں؟“

”ہم تیار ہیں۔“ آرمنڈ نے جواب دیا۔ ”آپ آگے آگے چلیں ہم اپنی موٹروں اور سامان کے ساتھ پیچھے پیچھے آئیں گے۔“

یہ سن کر وہ ہنسا اور موٹروں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"یہ چیزیں وہاں نہیں جاسکتیں، راستے میں گھنے جنگل میں پہاڑ ہیں میلوں...... آپ لوگ میرے ہاتھی پر بیٹھ جائیں، دودن کا راستہ ہے کھانے پینے کا سامان اپنے ساتھ لینا ضروری ہے...... وہاں سے واپسی پر میں خود آپ کو یہیں چھوڑ جاؤں گا۔"

مہاوت اور پجاری سمیت ہاتھی پر سوار ہونے والے ہم سات افراد تھے۔ آمنڈ کہنے لگا کہ "اس طرح ہاتھی پر بیٹھنا سخت مشکل کا باعث ہوگا ہم پیدل چلیں گے۔" یہ سن کر پجاری بولا۔ "ٹھیک ہے، آپ لوگ پیدل چلنا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں، البتہ اس عورت کو ہاتھی پر بیٹھادیجیے۔" اس نے روزی کی طرف اشارہ کیا اور وہ خوف کھا کر پیچھے ہٹ گئی۔

"نہیں...... نہیں...... میں بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ پیدل ہی چلوں گی۔"

پجاری چند لمحے تک کسی گہری سوچ میں گم رہا پھر وہ اپنے مہاوت کے پاس گیا اور اس سے کچھ کہا۔ مہاوت نے مودبانہ انداز میں گردن جھکائی اور ہاتھی کو لے کر ایک جانب روانہ ہوگیا، پھر پجاری ہمارے پاس آیا۔

"میں نے اپنا آدمی اور ہاتھی واپس کردیا ہے اور میں خود آپ کے ساتھ پیدل چلوں گا۔ کیا آپ چلنے کے لیے تیار ہیں؟"

ہمارا رخ شمال کی طرف تھا جہاں سب سے پہلے ساگوان کا ایک وسیع جنگل راہ میں آیا، اس کے بعد ایک بڑا سلسلہ کوہ کا عبور کرنا پڑا۔ دن بھر ہم چلتے اور رات کو کسی مناسب جگہ آرام کرنے کے لیے ٹھہر جاتے۔ دو روز کے اس یادگار سفر میں وہ پر اسرار شخص بالکل خاموش رہا۔ اس نے صرف چند بار زبان کھولی اور وہ بھی اس لیے کہ ہم میں سے دو آدمی راستہ بھول کر کسی اور جانب جانکلے تھے۔

تیسرے روز صبح جب ہم نیند سے بیدار ہوئے تو ہم نے پجاری کو اپنے قریب نہ پایا۔ دو میل کے فاصلے پر سیاہ رنگ کا ایک اونچا سا پہاڑ ہمیں دکھائی دے رہا تھا جس کی چوٹی دھند میں چھپی ہوئی تھی۔ اس پہاڑ کی اونچائی چھ سات ہزار فٹ سے زائد ہی تھی۔ اور جب میں نے اسے اپنی دوربین سے دیکھا تو اس پر ایک مندر بھی بنا ہوا دکھائی دیا۔ جس کی آخری منزل پر بہت بڑا سا سانپ بنا ہوا تھا۔ ہم سب دھڑکتے دلوں کے ساتھ باری باری دوربین کے ذریعے اس پہاڑ اور مندر کو دیکھنے لگے۔ دھند آہستہ آہستہ دور ہوئی تو ہم نے دیکھا کہ پہاڑ کے دامن میں ایک گاؤں آباد ہے جہاں سینکڑوں چھوٹی بڑی جھونپڑیاں بنی ہوئی ہیں۔

"آخر کار ہم کانسی گاؤں پہنچ گئے۔" کیمرہ مین خوشی سے چلایا۔

"ہاں...... یہ وہی گاؤں ہے جہاں ناگ کی پوجا ہوتی ہے۔" آرمنڈ نے کہا۔ "لیکن یہ پجاری کہاں چلا گیا مجھے خدشہ ہے کہ وہ ہمارے ساتھ کہیں فریب نہ کرے اور ہم کسی آفت میں نہ پھنس جائیں۔"

"فکر نہ کرو...... رائفلیں ہمارے ساتھ ہیں، اگر ان لوگوں نے شرارت کی تو ہم ان کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔" روزی بولی۔

"مجھے یقین ہے کہ پجاری ہمیں دھوکا نہیں دے گا۔ اس کی باوقار شخصیت سے یہ بات بعید ہے تاہم ہمیں غافل نہیں رہنا چاہیے۔"

"کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ گاؤں والوں کو ہماری آمد کے سلسلے میں کوئی خاص ہدایت دینے چلا گیا ہو کہ ہمیں دیکھ کر وہ لوگ یکدم مشتعل نہ ہوجائیں؟" کیمرہ مین نے کہا۔

"ہاں ایسا بھی ممکن ہے۔" آرمنڈ نے تسلیم کیا۔ "اچھا ہم دوپہر تک اس کا انتظار کرتے ہیں۔ اگر وہ نہ آیا تو ہم خدا کا نام لے کر خود ہی گاؤں کی طرف چل پڑیں گے۔"

سہ پہر کو جب کہ ہم گاؤں میں داخل ہونے کی تدبیریں سوچ رہے تھے پجاری ایک طرف سے نمودار ہوا۔ اس کے گلے میں ہار کی مانند دو سانپ لپٹے ہوئے تھے پجاری کے عقب میں تین قوی ہیکل اور اونچے قد کے

نوجوان تھے جنہوں نے صرف ایک لنگوٹی باندھ رکھی تھی۔ انہوں نے اپنے چہروں پر بھبھوت مل رکھا تھا اور ہاتھوں میں تیر کمان جارحانہ انداز میں تانے ہوئے تھے۔ آرمنڈ اور روزی نے پھرتی سے رائفلیں اٹھائیں اور ان کا رخ پجاری کی طرف پھیر دیا۔ پجاری اور اس کے محافظ وہیں رک گئے۔ میں نے آرمنڈ اور روزی سے کہا۔

''خبردار فائر نہ کرنا، وہ کسی بری نیت سے نہیں آئے انہیں آگے آنے دو۔'' پھر میں نے برمی زبان میں پجاری سے آگے بڑھنے کے لیے کہا وہ آہستہ آہستہ ہماری طرف آیا، محافظ دور کھڑے حیرت سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے ایک دوسرے سے کچھ کہا۔ غالباً انہیں اپنی زندگی میں پہلی بار سفید چمڑی والے انسانوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔

پجاری مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''میں آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا...... یہ میرا وعدہ ہے...... میں گاؤں کے لوگوں کو آپ کے بارے میں اطلاع دینے گیا تھا۔ وہ سب آپ کے آنے سے خوش ہیں۔ اگرچہ اجنبی لوگوں کا ہمارے ہاں داخلہ ممنوع ہے لیکن میں نے انہیں راضی کرلیا ہے۔ صدیوں بعد پہلی مرتبہ آپ لوگ اس سرزمین میں داخل ہوسکیں گے۔''

پجاری کے بارعب لہجے نے ہمیں بہت متاثر کیا۔ وہ یوں بات کرتا تھا جیسے ہم سب اس کے غلام ہیں اور وہ ہمیں آقا کی طرح حکم دے رہا ہے۔

پجاری کی رہنمائی میں ہم دن ڈھلے کانسی کی طرف روانہ ہوئے جس راستے پر ہم چل رہے تھے وہ بھی سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا گاؤں کی جانب جاتا تھا نہایت خاموشی اور آہستگی سے ہم سانپوں کی اس سرزمین میں داخل ہوئے سورج مغربی پہاڑی کے عقب میں چھپنے کی کوشش کررہا تھا اور درختوں کے سائے طویل ہورہے تھے ہم نے دیکھا کہ گاؤں کے عین درمیان میں ایک بہت اونچا درخت ہے جس کے نیچے ناگ کے پوجنے والوں کی ایک جماعت بیٹھی ہے اس جماعت میں نوجوان لڑکیاں اور عورتیں بھی شامل تھیں۔ جو بالکل برہنہ تھیں، صرف چند بوڑھی عورتیں اپنے جسم کے زیریں حصے پتوں سے چھپائے ہوئے تھیں

پھر ہم نے ایک قسم کی نفیری اور ڈھول پیٹے جانے کی آوازیں سنیں۔ یہ آواز لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جارہی تھی۔ نفیری اور ڈھول کی آوازیں سن کر اردگرد کی جھونپڑیوں سے آدمی، بچے اور عورتیں نکلنے لگیں۔ یہ عورتیں آپس میں ہماری جانب اشارے کرکے کچھ بتارہی تھیں خصوصاً عورتوں کی توجہ کا مرکز روزی تھی جو انہی کی طرح عورت ہو کر بھی اپنا پورا جسم کپڑوں سے چھپائے ہوئے تھی کیونکہ ان کے ہاں جوان لڑکیاں اور عورتیں بالکل برہنہ رہتی تھیں۔ اچانک ہم نے دیکھا کہ پندرہ بیس عورتیں اپنی جھونپڑیوں کے آگے بیٹھی رو رہی تھیں اور ان کے بین کرنے کی ملی جلی آوازیں ایسی ڈراؤنی تھیں کہ ہمارے دل لرز گئے۔ روزی نے پجاری کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا وہ کہنے لگا۔

''ڈرومت...... چپ چاپ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ...... آج پوجا کا دن ہے...... پورے ایک برس سے اس گاؤں میں کوئی لڑکا پیدا نہیں ہوا ہر عورت نے لڑکی جنی ہے...... یہ عورتیں اس لیے رورہی ہیں اور آج ہساپو کو ناگ دیوتا...... کی قربانی کے لیے پیش کیا جائے گا۔''

پجاری نے آہستہ سے جواب دیا اور ہم سے چند قدم آگے بڑھ کر چلنے لگا۔

سورج اب غروب ہوچکا تھا۔ ان لوگوں نے جگہ جگہ کسی جانور کی چربی سے جلنے والی لمبی لمبی مشعلیں روشن کردی تھیں......

جب ہم ''موسیقاروں'' کی اس جماعت کے نزدیک پہنچے تو نفیریوں اور ڈھول تاشوں کی آوازیں اور تیز ہوگئیں۔ یہ لوگ اپنے ساز بجانے میں اس قدر محو تھے کہ کسی نے آنکھ اٹھا کر ہماری طرف دیکھا نہیں البتہ ان کے گرد کھڑے ہوئے بہت سے تماشائیوں میں ایک ہلچل سی مچی اور کھسر پھسر ہونے لگی بعض کم عمر نوجوانوں نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے اپنی کمانیں سیدھی کرلیں لیکن پجاری کو دیکھتے ہی وہ پرسکون ہوگئے۔

"آپ یہاں ٹھہریے..... ابھی یہ لوگ ہساپو کو ساتھ لے کر ناگ دیوتا کے مندر میں جائیں گے۔ میرا پہلے وہاں ہونا ضروری ہے۔ آپ کو ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ کوئی شخص آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکتا....." پجاری کے مہمان خصوصی سمجھ کر لوگ ادھر ادھر ہٹ کر کھڑے ہو گئے اور انہوں نے ہمیں زیادہ سہولت سے تماشا دیکھنے کا موقع فراہم کر دیا۔ اب پہلی بار ہم نے دیکھا کہ نفیری اور ڈھول کی پرشور آوازوں کے ساتھ ایک سیاہ فام اور خاصی گیم شحیم عورت رقص کر رہی ہے۔ نہایت وحشیانہ رقص......

اس نے اپنے چہرے پر مٹی جیسا سفید پاؤڈر مل رکھا تھا ویسے پورا جسم کسی بھی قسم کے لباس سے آزاد تھا...... پھولے ہوئے...... چہرے پر سب سے مسحور کن شے اس کی آنکھیں تھیں جن میں بے پناہ چمک نظر آ رہی تھی۔ بل کھاتی جھومتی لچکتی اور پھنکارتی ہوئی کسی ناگن کی طرح وہ رقص کر رہی تھی اسے دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا بدن ربڑ کا بنا ہوا ہے۔ اس میں کوئی ہڈی اور کوئی جوڑ نہیں ...... نہ معلوم وہ کتنی دیر سے اس طرح رقص کر رہی تھی اور ابھی اس کے جوش و خروش میں اضافہ ہو رہا تھا۔

ہم خاموش کھڑے اس کا رقص دیکھ رہے تھے لیکن ہمیں معلوم نہ تھا کہ یہ عورت کون ہے دفعتاً مجمع میں سے کسی نے دوسرے سے مخاطب ہو کر چند الفاظ کہے...... پورا جملہ میں نہ سمجھ سکا مگر ایک لفظ ایسا تھا جسے سن کر سب چونک پڑے...... ہساپو......"

اس رقاصہ کا نام ہساپو تھا اور اسی کی قربانی ناگ دیوتا کے سامنے پیش کی جانے والی تھی۔ گاؤں سے باہر نکل کر یہ جلوس اس سیاہ پہاڑی کی طرف روانہ ہوا جو اس اندھیری رات میں ایک مہیب دیوتا کی مانند نظر آتا تھا۔ یہاں تک کہ یہ جلوس پہاڑ کے عین نیچے پہنچ گیا جہاں ایک تاریک سا غار تھا جس میں اندر اترنے کے لیے پہاڑ کو کاٹ کر سیڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ یہ غار کافی وسیع اور گہرا تھا ہساپو اور اس کی جماعت کے سب لوگ ایک ایک کر کے مشعلوں کی روشنی میں اس کے اندر داخل ہو گئے۔ غار کے اندر ناقابل برداشت بدبو نے ہمارا استقبال کیا تو ہم نے رومال منہ پر رکھ لیے، ہمیں یقین تھا کہ یہاں پجاری ضرور ہوگا۔

ڈھول تاشوں کی آوازوں سے غار میں ایک بے پناہ شور مچ گیا تھا کہ کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے خدا کا شکر ہے کہ چند منٹ بعد اچانک سازوں کی آواز بند ہو گئیں اور غار میں ایک بھیانک خاموشی پھیل گئی۔ ہساپو اب بے حس و حرکت ایک جگہ کھڑی تھی پھر ہم نے اس پجاری کو دیکھا جو ہساپو سے چند قدم کے فاصلے پر تن کر کھڑا تھا اور غار میں موجود ہر شخص کا غور سے جائزہ لے رہا تھا۔ شاید اسے کسی خاص آدمی کی تلاش تھی فوراً ہی اسے پتا چل گیا کہ وہ ہمیں ڈھونڈ رہا تھا اسے اطمینان ہوا کہ ہم وہاں موجود ہیں۔ وہ مسکرایا اور دایاں ہاتھ اٹھا کر ہساپو کے سر پر رکھا۔ ہساپو سیدھی کھڑی ہو گئی ہم نے دیکھا کہ دہشت سے اس کا سارا بدن لرز رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک بار پھر نفیریوں کے سینے سے وہی غم انگیز راگ نکلنے لگا اور ہساپو نے رقص شروع کر دیا۔ پجاری آہستہ سے مڑا اور غار کے اندر اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ پھر ہم نے ایک آواز سنی جیسے کوئی بڑا پتھر اپنی جگہ سے سرکایا گیا ہو......

پجاری چند سیکنڈ بعد واپس آ گیا اور موسیقاروں کو نغمہ بند کر دینے کا اشارہ کیا اور خود ایک طرف ہٹ کر بین پر ایک مسحور کن دھن چھیڑ دی ابھی بین کی لے زیادہ اونچی نہ ہوئی تھی کہ اچانک ہلکی سی سرسراتی ہوئی آواز ہمارے کانوں میں آئی۔

خدا کی پناہ سیاہ رنگ کا ایک زبردست، ہیبت ناک، ڈراؤنا اور خوفناک موٹا ناگ آہستہ آہستہ غار کے ایک گوشے سے نکل کر ہساپو کی طرف بڑھ رہا تھا، سب خاموش کھڑے تھے لیکن ہم پانچ افراد پر کیا قیامت بیت رہی تھی۔ اس کیفیت کو الفاظ میں سمویا نہیں جا سکتا۔

میں نے اپنی زندگی میں سینکڑوں سانپ دیکھے تھے لیکن اس ناگ جیسا سانپ پھر کبھی دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ اس کا پھن ایک فٹ کے قریب چوڑا ہوگا خود سانپ کی لمبائی دس فٹ سے کم نہ تھی زمین سے چار فٹ اونچا ہو کر اس نے اپنی سحر انگیز چمکتی ہوئی آنکھیں ہساپو کے

چہرے پر گاڑ رکھی تھیں۔ کبھی کبھی وہ مستی میں آ کر اپنا پھن پیچھے ہٹا کر بل کھاتا اور بڑا سا منہ کھول کر زور سے پھنکار مارتا۔

پجاری پوری قوت سے بین بجا رہا تھا اور اس کی آواز لحہ بہ لحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ہساپو کے جسم میں حرکت ہوئی پہلے اس نے دونوں بازو او پر اٹھائے پھر کمر کو جنبش دی اور ایک نیا رقص شروع کیا۔ وہ ناگ کے چاروں طرف ناچ رہی تھی اور سانپ اس کے ساتھ ساتھ حرکت کررہا تھا۔ عورت کا منہ جدھر ہوتا سانپ فوراً اسی طرف مڑ جاتا۔ رقاصہ اب رقص کے نقطہ عروج پر پہنچ چکی تھی۔ یکا یک وہ زمین پر دوزانو ہو کر اس طرح بیٹھ گئی کہ ناگ کا پھن اس کے چہرے کو چھونے لگا۔ عین اس لمحے ایک ہولناک کڑک سنائی دی۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور بجلی چمکنے سے غار کا اندرونی حصہ بار بار روشن ہو اٹھتا تھا۔ ہساپو نے دفعتاً اپنے گھٹنے زمین پر ٹیک دیے اور...... زور زور سے گردن گھمانے لگی۔

ناگ بھی تیزی سے اپنا پھن پھیلائے جھومنے لگا، ہساپو نے ایک دم اپنے ہاتھ سے سانپ کا گلا پکڑ لیا۔ اس وقت بجلی زور سے چمکی اور بادل کڑکے ہمارے حلق سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ ہساپو نے فوراً ہی اسے زمین پر پٹخ دیا۔

ناگ دیوتا غصے سے فوں فوں کرتا ہوا تیزی سے بل کھا رہا تھا۔ پھر ہم نے دیکھا کہ سانپ نے ہساپو کے برہنہ اثمار شباب پر اپنا منہ پھیرنا شروع کر دیا، چند لمحے تو وہ اپنا منہ ان پر پھیرتا رہا۔

یکا یک پجاری نے بین پوری قوت سے بجانی شروع کر دی، بارش اور تیز ہو گئی ہمارے دل دھڑکنے لگے شاید قربانی کا وقت آ گیا تھا۔ ہساپو اب پھر زمین پر دوزانو بیٹھ گئی۔ اس نے سانپ کے سر پر اپنا ہاتھ رکھا۔ سانپ جھک گیا۔ اب اس کا منہ ہساپو کے منہ کے عین مقابل تھا۔ تب ہساپو نے اپنی زبان باہر نکالی اور سانپ کے منہ کے قریب کر دی......

روزی نے خوف سے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ سیاہ ناگ اچھلا اور ہساپو کی زبان پر ڈس لیا۔ ہساپو کے حلق سے ایک دل دوز چیخ نکلی اردگرد کھڑے ہوئے تماشائیوں نے زور زور سے ڈھول بجانا اور ڈھول پیٹنا شروع کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے ہساپو کی بے حس لاش فرش پر پڑی تھی۔ اس کا جسم نیلا پڑ گیا تھا اور منہ سے جھاگ نکل رہا۔ تھا ناگ نے اس کی لاش کے گرد دو تین چکر لگائے اور پھر آہستہ آہستہ رینگتا ہوا غار کے اندھیرے میں واپس چلا گیا۔

مجھے یاد نہیں کہ ہم سب آدھی رات کو اس طوفان بادوباراں میں کس طرح پجاری کی جھونپڑی تک پہنچے۔

دوسرے روز صبح کے وقت پجاری نے ہمیں بتایا کہ رات کو گاؤں کی ایک حاملہ عورت نے لڑکا جنا ہے اور یہ بچہ عین اس وقت پیدا ہوا جب سانپ نے ہساپو کو ڈس لیا تھا اس کا مطلب صاف تھا کہ ناگ دیوتا نے ہساپو کی قربانی قبول کر لی تھی۔

جب پجاری ہم سے محوِ گفتگو تھا تو میں نے روزی کے چہرے پر بے چینی کے اثرات دیکھے۔ وہ شاید کسی اندرونی کرب میں مبتلا تھی۔ دوران گفتگو اس کی خاموشی معنی خیز تھی۔ وہ مستقل کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ شاید رات کے سانحے کے اثرات ابھی تک اس کے ذہن میں تازہ تھے۔

پجاری کچھ دیر کے بعد چلا گیا، ہمیں آبادی اور اس کے قرب وجوار میں گھومنے پھرنے کی آزادی تھی۔ پجاری نے ایک آدمی ہماری رہنمائی کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ قدرتی مناظر سے تو ایسی کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی ہاں اس ناگ دیوتا کے پجاریوں کے طور طریقے قلمبند کرنے کے ضرور خواہش مند تھے۔ ایک مشکل یہ درپیش تھی کہ ان کی مذہبی تقریبات عام طور پر پگوڈا میں منعقد ہوتی تھیں جب کہ ہمارے پاس روشنی کے انتظامات نہیں تھے۔ بہر حال اپنے حاصل سفر کے طور پر وہاں کے باشندوں کے رہن سہن اور ان کے مخصوص رقص کی عکاسی شروع کر دی۔

سرِ شام ہم لوگ واپس اپنی قیام گاہ میں آ گئے، روزی نے چائے تیار کی اور اس کے بعد عام گفتگو شروع

ہو گئی۔ ہر آدمی کا موضوع سخن وہاں کے لوگ اور ان کے طور طریقہ تھا اس تمام عرصہ روزی غیر معمولی طور پر خاموش رہی اس رات کچھ زیادہ ہی تھکن محسوس ہو رہی تھی، الہٰذا ہم جلد سو گئے۔

صبح سب سے پہلے میری آنکھ کھلی۔ روزی کا بستر خالی پڑا تھا، میں سمجھا کہ شاید چہل قدمی کے لیے باہر چلی گئی ہوں، میں بھی باہر نکل آیا دور دور تک خاموشی چھائی ہوئی تھی میں ایک جانب ایسے ہی بڑھنے لگا۔ کافی دور چلنے کے بعد مجھے ایک مرتبہ پھر روزی کا خیال آیا اور میں واپس پلٹ آیا۔ باقی لوگ بھی بیدار ہو چکے تھے۔ انہوں نے جب مجھے تنہا دیکھا تو روزی کے بارے میں دریافت کیا وہ سمجھ رہے تھے کہ شاید ہم دونوں چہل قدمی کے لیے چلے گئے تھے۔

روزی کی گمشدگی تعجب خیز تھی۔ سب کے سب باہر نکل آئے اور چاروں طرف پھیل گئے ہم لوگوں نے روزی کو پکارا بھی مگر کوئی جواب نہ ملا۔ بات کافی سنگین تھی ہمیں خدشا تھا کہ شاید کسی نے روزی کو اغواء کر لیا ہے ابھی ہم اس مسئلہ پر تبادلہ خیال کر ہی رہے تھے کہ پجاری آ گیا۔ ہم نے اسے روزی کی گمشدگی سے مطلع کیا اور الزام لگایا کہ اس کے کسی آدمی نے روزی کو اغوا کر لیا ہے اس کے ہونٹوں پر زہر خند مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"یہ سب تمہارے دیس میں ہوتا ہے۔" اس نے نفرت سے ہونٹ سکیڑ کر کہا۔ "ہماری بستی میں عورت کے ساتھ زبردستی کا رواج نہیں ہے، تمہاری عورت خود کسی کے ساتھ چلی گئی ہو گی۔"

"یہ کس طرح ممکن ہے؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "وہ کس طرح تم لوگوں کے ساتھ جا سکتی ہے؟"

"میں یہ سب نہیں جانتا لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اس کے ساتھ زبردستی نہیں کی گئی ہو گی۔" پجاری کے لہجہ میں سختی تھی۔

"ہم اس کی واپسی چاہتے ہیں۔" میں نے بھی سختی سے کہا۔ "واپسی اس لڑکی کی مرضی پر منحصر ہو گی۔ آج شام پگوڈا میں آ جانا۔" اس نے کہا اور تیزی سے مڑ گیا۔

"ہم لوگ اس صورت حال سے پریشان تھے پجاری کی گفتگو مبہم تھی۔ اس کی بات چیت سے جو اندازہ قائم ہو سکتا تھا وہ یہ تھا کہ روزی کی بابت سب کچھ جانتا ہے۔ دن بہت بے چینی سے گزرا شام ہوتے ہی ہم پگوڈا میں پہنچ گئے۔ وہاں بہت سے پجاری عجیب و غریب قسم کی عبادت میں مصروف تھے۔

ایک پجاری نے ہم کو راہ دکھائی اور ہم اندر ہی اندر ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں چلتے گئے۔ خدا جانے پگوڈا ہی میں سفر ہو رہا تھا یہ وہ کوئی زمین دوز راستہ تھا ہم کسی قسم کا اندازہ کرنے سے قاصر تھے کئی کمروں سے گزرنے کے بعد ایک وسیع ہال آ گیا۔ وہاں وہ پجاری بڑی شان سے ناگ دیوتا کے عظیم الشان بت کے نیچے عبادت میں مصروف تھا...... اس کے ارد گرد اور کئی پجاری اس کی تقلید کر رہے تھے ہماری آمد کی آہٹ پر انہوں نے عبادت مختصر کی اور پھر پجاری ہم سے مخاطب ہوا۔

"اس سے پہلے کہ میں لڑکی کو بلواؤں تم بتاؤ کہ اگر کوئی لڑکی اپنی رضا سے کسی مرد کے ساتھ چلی جائے تو کیا تمہارے ملک کا قانون اس کی واپسی کے لیے تمہاری مدد کر سکتا ہے؟"

"نہیں اگر کوئی لڑکی بہ رضا کسی شخص کے ساتھ چلی جائے یا اپنا گھر چھوڑ دے تو اسے قانوناً واپس نہیں لایا جا سکتا۔" میں نے وضاحت کی۔

"اگر وہ لڑکی روزی یہاں قیام کے لیے اپنی رضا مندی ظاہر کرے اور تمہارا اطمینان ہو جائے تو کیا تم اس سے دستبردار ہو جاؤ گے۔" پجاری نے عجیب و غریب شرط ہمارے سامنے رکھ دی۔ ہمیں یقین تھا کہ روزی کسی طرح بھی ان غیر تہذیب یافتہ لوگوں کے ساتھ رہنا پسند نہیں کر سکتی۔ اس لیے ہم نے وعدہ کر لیا کہ اگر یہاں رہنا چاہے گی تو ہم لوگ اس کے حصول کی کوششیں چھوڑ دیں گے۔

پجاری نے ایک دوسرے پجاری کو ایک مخصوص اشارہ کیا۔ وہ ہال سے باہر چلا گیا۔ چند لمحوں بعد وہ واپس ہوا تو اس کے ساتھ روزی تھی جو کہ اپنی اصلی وضع قطع بالکل بدل چکی تھی۔ وہ دوسری عورتوں کی طرح برہنہ تھی۔ اس

نے سفید پھولوں کا ایک لمبا گجرا اپنے گلے میں ڈالا ہوا تھا جس سے اس کے جسم کے چند حصوں کی پردہ پوشی ہو رہی تھی۔ وہ جنگلی عورتوں کی طرح مٹکتی مسکراتی بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ اس نے ایک نگاہ غلط ہم لوگوں پر ڈالی سر کو ہلا کر خوشنودی کا اظہار کیا اور پجاری کے قریب شانہ سے شانہ ملا کر بیٹھ گئی۔

''روزی......'' ڈینس نے اسے مخاطب کیا۔ روزی نے ڈینس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ میں نے محسوس کیا کہ ڈینس کچھ بے چین سا ہو چکا ہے، اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی مگر ہکلا کر آنکھوں کا سحر اس پر طاری ہو چکا تھا۔ میں نے واضح طور پر روزی کی آنکھوں میں ایک ایسی انوکھی چمک دیکھی تھی جو پہلے نہ تھی۔

''ہم لوگ واپس جانے والے ہیں......'' اس مرتبہ میں نے روزی سے خطاب کیا۔

''اتنی جلدی......؟'' اس نے ایک ادا کے ساتھ دریافت کیا۔ ''ہاں ہمارا مقصد حل ہو چکا ہے۔ دوسرا ہم پہلے ہی کافی لیٹ ہو چکے ہیں تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

''میرا ارادہ......'' اس نے ایک نظر پجاری پر ڈالی۔ ''میں پجاری کی پجارن بن چکی ہوں۔ میں نے انہیں اپنا شوہر تسلیم کر لیا ہے۔''

''روزی......'' میں بے ساختہ چلا اٹھا۔

''یہاں سکون ہے...... امن ہے...... کوئی کسی کا دشمن نہیں ہے، کوئی بناوٹ نہیں ہے...... تصنع نہیں ہے مجھے میری منزل مل چکی ہے۔ میں اب ناگ دیوتا کی پجارن ہوں میں اس بستی کے لیے لڑکوں کو جنم دوں گی تاکہ یہ بستی قائم و دائم رہے۔''

''تم پاگل ہو گئی ہو......'' میں نے اس سے کہا۔

''کون پاگل ہے اور کون ہوش مند...... اس کا فیصلہ اتنا آسان نہیں ہے میں نے جس چیز کو بہتر جانا، اپنے لیے چن لیا۔ تم لوگ واپس جا سکتے ہو...... میں اب ہمیشہ یہیں رہوں گی۔'' روزی کے لہجے میں عزم تھا۔

ہم سب پریشان تھے پجاری کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی اس کی نظریں ہم سب پر جمی ہوئی تھیں۔ ''یہ زیادتی ہے......؟'' میں نے پجاری سے احتجاج کیا۔

''اب بھی کوئی اعتراض باقی ہے......؟'' پجاری نے خشک لہجہ میں کہا۔

''یہ لڑکی کسی غیر فطری طاقت کے زیر اثر ہے تم نے اس پر جادو کر دیا ہے۔''

''تم حد سے بڑھتے جا رہے ہو......'' پجاری کے لہجے میں سانپ کی پھنکار تھی۔ ''نہ بھولو کہ میں اتنی طاقت کا مالک ہوں کہ تم سب کو ختم کر دوں چونکہ تم میری بیوی کے دوست ہو اس لیے میں نے تمہاری اتنی بحث قبول کی۔ تم کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ورنہ دوسری صورت میں مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ تم کو احساس نہیں ہے کہ تم کس قدر مجبور ہو۔ تم کوشش کے باوجود صدیوں اس بستی سے اپنی بستی تک کی راہ تلاش نہیں کر سکتے پھر بھی میں تم پر مہربان ہوں۔ کل صبح میرے آدمی تمہیں وہیں چھوڑ آئیں گے جہاں تمہاری سواریاں کھڑی ہیں۔'' اور پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ساتھ ہی روزی بھی ایک زر خرید لونڈی کی طرح پجاری کے پیچھے پیچھے جا رہی تھی اور ہم سب دم بخود حالات کی نزاکت پر غور کرتے رہ گئے۔ ہمارے رہبر پجاری نے اشارہ کیا اور پھر ہم اسی راستے سے باہر آ گئے۔

ہمارے لیے پجاری کے حکم کی پابندی کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔

دوسری صبح جب ہم واپس روانہ ہوئے تو راستہ بھر خاموش رہے۔ سب کو روزی کی اس حالت کا افسوس تھا۔ وہ ہماری بہت اچھی دوست تھی۔ خدا جانے کون سی طاقت تھی جس نے اس کے خیال کو یکسر بدل دیا تھا، شاید یہ پجاری کی ناگ جیسی آنکھوں کی کشش تھی۔ یا واقعی روزی اپنے معاشرے سے فرار کی خواہش مند تھی۔ اس راز کو ہم کبھی نہ پا سکے کیونکہ روزی کبھی واپس نہ آئی۔





ہم رقص

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

خوبرو حسینہ اپنے ہم رقص کی بانہوں میں جھولتی ہوئی واش روم کے دروازے تک گئی اور پھر اندر داخل ہو کر اس نے دروازہ بند کرلیا۔ کافی دیر بعد بھی وہ واش روم سے نہ نکلی تو مجبوراً کئی لوگوں نے دروازہ توڑ دیا مگر یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اندر سے خوبرو حسینہ غائب تھی۔

خوف و دہشت کی سرد لہر ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کرتی ایک خوفناک سحر انگیز ڈراؤنی کہانی

ڈیلانٹ کلب کی رونقیں عروج پر تھیں..... ایک حسین لڑکی ایک کونے میں تنہا ایک کرسی پر اداس بیٹھی تھی۔ آرکیسٹرا نغمے بکھیر رہا تھا اور لاتعداد جوڑے چکنے فرش پر پھسل رہے تھے۔

''کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟'' ایک نوجوان سے یہ جملہ سن کر لڑکی چونک پڑی۔

''بیٹھ جائیے'' وہ مسکرا کر بولی۔

''نوجوان اس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ لڑکی کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

''معاف کیجئے'' نوجوان نے لڑکی پر ایک گہری نظر ڈال کر کہا۔ ''آپ اتنی سنجیدہ کیوں ہیں؟''

''میں اپنے ایک ساتھی کا انتظار کررہی ہوں۔'' لڑکی بولی۔ ''ہم ہر سال اسی جگہ یکم جنوری کو ملتے ہیں۔''

''سال میں صرف ایک بار'' نوجوان کے لہجے میں حیرت کا عنصر نمایاں تھا۔

''ہاں'' لڑکی مسکرا کر بولی ''سال میں صرف ایک بار ہم دونوں کی مجبوریاں ہی کچھ ایسی ہیں۔''

''عجیب بات ہے۔'' نوجوان بولا

''دنیا میں ایسا ہوتا ہے!'' دنیا میں سب کچھ ہوسکتا ہے مسٹر!'' لڑکی بولی ''ہماری دنیا اس دنیا سے مختلف ہے۔''

''ہر نوجوان لڑکی یہی سوچتی ہے۔'' نوجوان بولا

''محبت کی دنیا واقعی ایک عجیب دنیا ہے۔'' لڑکی مسکرا کر خاموش ہوگئی۔

''معاف کیجئے'' نوجوان پھر بولا۔ ''کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟''

''میرا نام پروین ہے'' لڑکی بولی۔ ''اور آپ کا......؟''

''مجھے سلیم کہتے ہیں۔''

''آپ آج تنہا اس فنکشن میں آئے ہیں؟''

''جی ہاں'' وہ بولا ''مجھے ایک ہم رقص کی تلاش تھی۔ جب تک آپ کا ساتھی نہ آئے مجھے اپنے ساتھ رقص کرنے کا شرف بخشیے۔''

''جی...... دراصل......'' لڑکی کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار تھے ''میں......''

''دیکھئے۔ تکلف نہ کیجئے'' سلیم نے لڑکی کا ہاتھ تھام لیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے برف کی سل پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ ''آپ کے ہاتھ...... اتنے ٹھنڈے ہیں۔''

''میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا'' لڑکی بولی۔

''اوہ! تو آپ سردی سے پریشان ہیں۔'' سلیم بولا ''گھبرایئے نہیں۔ میرا کوٹ حاضر ہے...... اس سے یقیناً سردی بھاگ جائے گی۔'' اور سلیم نے بے تکلفی سے لڑکی کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ کھڑی ہوگئی تو اس نے اپنا کوٹ اتار کر اس کے حوالے کردیا۔

سلیم نے لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور آگے بڑھ گیا یہاں کے دیگر جوڑے ہم رقص تھے۔ دونوں ناچتے رہے۔

''کوٹ پہن کر رقص کرنے میں بھی ایک عجیب لطف ہے۔'' لڑکی بولی۔

''اس کوٹ نے آپ کے حسن میں اضافہ کردیا ہے۔'' سلیم بولا ''دودھ جیسے سفید بدن پر...... سفید کپڑوں کے ساتھ یہ کوٹ کتنا بھلا لگ رہا ہے۔ اگرچہ ہے مردانہ۔''

''آپ تو شاعری کرنے لگے۔'' پروین بولی۔

''یہ شاعری نہیں پروین! حقیقت ہے۔'' سلیم بولا۔ ''تمہارے حسین چہرے کو دیکھ کر دل چاہتا ہے دل کھول کر تمہاری تعریف کروں۔''

''بڑی سردی ہے'' پروین اس کی بات کو نظر انداز کرکے بولی۔

''تمہارا جسم تو واقعی بہت سرد ہے'' سلیم بولا۔ ''چلو...... کافی پئیں''۔

دونوں دوبارہ اس میز پر آکر بیٹھ گئے۔ سلیم نے کافی کا آرڈر دیا تو چند منٹ میں کافی آگئی اور دونوں چسکیاں لینے لگے۔

''تم کہاں رہتی ہو؟'' سلیم نے سوال کیا۔

''میں......'' وہ کچھ گھبرا سی گئی۔

''گھبراؤ مت'' سلیم ہنس کر بولا ''میں تمہارے گھر کے پھیرے نہیں لگاؤں گا۔''

''میں اسلام آباد...... روز کالج میں رہتی تھی'' آواز میں لرزش تھی۔

''رہتی تھی......؟'' سلیم حیران ہوگیا۔

''میرا مطلب تھا...... رہتی ہوں...... اوہ! کتنی سردی ہے'' وہ بولی۔

''واقعی بہت سردی ہے'' سلیم سگریٹ کا کش

لیتے ہوئے بولا ''اتنی سردی میں تم شال وغیرہ لے کر بھی نہیں نکلیں؟''

''مجھے صرف انہی کپڑوں میں آنے کی اجازت ملی۔'' وہ بولی۔

''اوہ! تمہارا ساتھی ابھی تک نہیں آیا؟''

''شاید اسے چھٹی نہیں ملی'' وہ بولی ''وقت کیا ہے؟''

''تین بج گئے'' سلیم گھڑی دیکھ کر بولا۔

''تین ......!'' وہ چونک پڑی ''مجھے ایک گھنٹہ کے اندر اندر وہاں پہنچنا ہے۔'' وہ بولی

''کہاں؟''

''اپنے ٹھکانے پر'' وہ بولی۔

''یہاں سے اسلام آباد جانے کے لئے پندرہ منٹ درکار ہیں۔'' سلیم بولا۔ ''میں تمہیں ٹیکسی میں چھوڑ دوں گا۔''

''میں خود چلی جاؤں گی'' وہ گھبرا کر بولی۔

''خیر ...... تم خود چلی جانا۔ آؤ ایک آخری راؤنڈ۔''

''نہیں میں بہت تھک گئی ہوں۔'' وہ بولی ''کیا باتھ روم میں گرم پانی ملے گا؟ مجھے منہ ہاتھ دھونا ہے۔''

''چلو...... اس طرف۔''

دونوں باتھ روم کی طرف گئے۔ لڑکی اندر داخل ہو گئی اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ سلیم باہر کھڑا انتظار کرتا رہا۔

جب بہت دیر بعد بھی دروازہ نہیں کھلا تو سلیم پریشان ہو گیا، اس نے دروازے پر دستک دی۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا اور پھر باقاعدہ دروازہ پیٹنے لگا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

وہ سخت پریشان ہو کر دروازہ پیٹ رہا تھا اور ''پروین ...... پروین'' چلا رہا تھا۔

چیخ و پکار سن کر وہاں مجمع جمع ہو گیا۔

''کیا بات ہے...... کیا بات ہے؟'' کئی

محبت

زندگی ایک پھول ہے۔ اور محبت اس کی خوشبو۔

محبت ایک ساز ہے۔ جو دلوں کی دھڑکن سے بجتا ہے۔

سچی محبت کے راستے میں نشیب و فراز ضرور آتے ہیں۔

محبت کے بغیر زندگی بےکار و بےسود ہے۔

دل میں سچی محبت کا جذبہ ہو تو دنیا کی ہر زنجیر ٹوٹ جاتی ہے۔

محبت ایک ایسی تتلی ہے جو ہمیشہ کانٹے کی نوک پر گھر بناتی ہے۔

(سائقہ خان۔ لیہ)

آوازیں آئیں۔

''میری گرل فرینڈ میرا کوٹ لے کر اندر گئی ہے'' وہ گھبرا کر بولا ''ایک گھنٹہ سے باہر نہیں نکلی۔''

''آخر کیا بات ہے؟'' ایک نے سوال کیا۔

''پتہ نہیں'' وہ بولا۔ ''میں دروازہ پیٹ رہا ہوں مگر جواب ندارد ہے۔''

''ضرور کوئی بات ہے! دروازہ توڑ دو'' ایک بولا۔

''ہاں...... ہاں...... دروازہ توڑ دو'' کئی آوازیں سنائی دیں۔

دروازہ توڑ دیا گیا...... پروین کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ سلیم پریشان ہو گیا۔

''یہاں سے نکلنے کے لئے تو کوئی اور راستہ بھی نہیں ہے'' ایک بولا۔ ''آخر لڑکی کہاں چلی گئی؟''

''اس روشندان سے!'' ایک بولا۔

''عقل سے کام لیجئے'' ایک بوڑھے نے کہا ''اول تو اتنی اونچائی تک پہنچنا کسی لڑکی کے بس کا روگ نہیں اور پھر اس میں سے کود کر باہر جانا اور بھی زیادہ مشکل ہے۔''

''میرا کوٹ!'' سلیم بڑبڑایا ''میرا قیمتی کوٹ...... وہ لے کر چلی گئی۔''

''اس کا پتہ معلوم ہے؟'' ایک نے سوال کیا۔

"معلوم ہے۔"

"تو پھر اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے، وہاں جا کر تلاش کر لیجئے۔"

"جی ......" سلیم بڑبڑایا۔ اس کی عقل حیران تھی، ذہن جیسے ماؤف ہو گیا تھا، یہ کیسے ہو سکتا تھا۔

بہر حال نڈھال قدموں سے جب وہ کلب سے باہر نکلا تو ہلکی ہلکی روشنی پھیل گئی تھی۔ دن نکل رہا تھا اور اندر سے پروین غائب ہو گئی تھی۔ کیونکہ وہ تو پورے وقت دروازے کے سامنے ہی کھڑا رہا تھا۔ وہ ایک ٹیکسی کے ذریعہ اسلام آباد روانہ ہو گیا۔

روز کاٹیج ڈھونڈنے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ پائیں باغ سے گزر کر اندر داخل ہو گیا اور دروازے پر دستک دی، اجالا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔

ایک بڑھیا نے دروازہ کھولا "کون؟" وہ اپنی عینک صاف کرتے ہوئے بولی۔

"میرا نام سلیم ہے...... کیا پروین یہیں رہتی ہے؟"

"پروین......" بڑھیا حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر بولی "پروین...... ہاں! وہ اسی جگہ رہتی تھی۔"

"کیا اس نے یہ گھر چھوڑ دیا؟" سلیم جیسے تقریباً چیخ پڑا۔

"اس نے اس دنیا کو چھوڑ دیا۔" بوڑھی بولی۔ "وہ میری بیٹی تھی، تین سال پہلے سال نو پر ایک کلب میں ڈانس کرتے ہوئے اس کا انتقال ہوا تھا۔"

"کون سا کلب" سلیم تھوک نگلتا ہوا بولا۔

"ڈیلائٹ کلب" بڑھیا کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

"ڈیلائٹ کلب" سلیم کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ "لیکن......"

"اندر آ جاؤ" بڑھیا بولی۔

سلیم اندر داخل ہو گیا...... سامنے ایک بڑی سی تصویر تھی جسے دیکھ کر وہ چونک پڑا۔

"ہاں...... یہ پروین کی تصویر ہے" بڑھیا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"ابھی چند گھنٹے پہلے یہ ڈیلائٹ کلب میں میرے ساتھ ڈانس کر رہی تھی۔" وہ بولا۔ "ابھی...... زیادہ دیر نہیں ہوئی...... اور میرا کوٹ بھی اس کے پاس تھا۔"

"وہ کوئی اور لڑکی ہوگی۔" بڑھیا بولی "ڈیلائٹ کلب میں آج سے ٹھیک تین سال پہلے دل کی حرکت بند ہو جانے سے پروین کا انتقال ہوا تھا۔"

"یقین کیجئے" سلیم قسمیں کھانے لگا "یقیناً یہی تھی...... ہم دونوں بہت دیر تک ساتھ رہے...... ہم نے کافی پی...... صبح چار بجے کے قریب وہ باتھ روم میں گئی اور غائب ہو گئی۔"

"یہ تمہارا وہم ہے بیٹا!" بڑھیا بولی "میں آج پروین کی قبر پر پھول چڑھانے جا رہی ہوں۔ تم بھی میرے ساتھ چلو اور اپنی غلط فہمی رفع کر لو۔"

سلیم بڑھیا کے ساتھ قبرستان تک پہنچا۔

"وہ رہی پروین کی قبر۔" بڑھیا دور سے اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

قبر پر ایک کتبہ موجود تھا۔ جس پر پروین کا نام اور اس کی تاریخ وفات درج تھی۔ بڑھیا نے بڑی عقیدت کے ساتھ قبر پر پھول چڑھائے اور آنکھیں بند کر کے کھڑی ہو گئی۔

سلیم نے سرسری نظر سے گرد و نواح کا جائزہ لیا۔ یکا یک وہ ایک دل خراش چیخ مار کر گر پڑا......

بڑھیا چونک پڑی اور سلیم کو جھنجھوڑنے لگی۔ قبر کے پاس ہی وہ گر گیا تھا...... اور پروین کی قبر کے قریب ہی اس کا کوٹ پڑا ہوا تھا۔



مردوں کا جنگل

ایس امتیاز احمد-کراچی

پورے جنگل میں ھو کا عالم تھا خوف نے نوجوانوں کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا کہ انھوں نے سامنے ایک کٹیا دیکھی اور وہ اس طرف بڑھنے لگے اور جب وہ اس جگہ پہنچے تو ان کی موت آگے بڑھی اور پھر......

خاموشی کا سینہ چیرتی موت کی آواز جو کہ پڑھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دے گی

چالیس سال کی عمر کا صحت منداور دراز قد ہیڈن فلپ کئی سال سے ناٹال افریقہ میں مقیم تھا۔ اس کے پاس دو چھکڑے جن کے ذریعے وہ زولولینڈ کے قبائل سے تجارت کرتا تھا۔ ایک بار ایک دکان دار کے ساتھ اس کی لڑائی ہوگئی، اس نے چاقو سے دکاندار کو شدید زخمی کر دیا اور سزا سے بچنے کے لئے وہاں سے بھاگ نکلا۔ اس نے زولو قبائل کے لئے بہت سا سامان جمع کر لیا جسے بیچنے کے لئے زولولینڈ گیا، سامان بیچ کر اسے خیال آیا کہ تجارت کو جاری رکھنے کے لئے اسے ناٹال جانا پڑے گا مگر وہ گرفتاری کے خطرے کے پیش نظر وہاں نہ گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ لو چلو بہت کما لیا اور اب کچھ وقت شکار کھیلا جائے، تفریح بھی ہو جائے گی اور ممکن ہے اس عرصے میں اس کی مشکل کا کوئی حل بھی نکل آئے۔

چند روز بعد وہ زولو کے بادشاہ سیٹی وایو کے پاس اس کے جنگلوں میں شکار کھیلنے کی اجازت کے حصول کے لئے جا پہنچا۔ سیٹی وایو نے شکار کی اجازت دینے سے صاف انکار کر دیا جس کی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں زولو بادشاہ اور ناٹال کے سفید فام حکام کے درمیان سخت اختلافات پیدا ہو گئے تھے اور دونوں کے درمیان کسی وقت بھی خون ریز قسم کی جنگ چھڑ جانے کا خطرہ تھا۔

''میرا خیال تم شکار کے بہانے یہاں جاسوسی کرنے کے لئے آئے ہو۔'' بادشاہ نے شبہ کا اظہار کیا۔ ہیڈن نے اس کی تردید کی، لیکن سیٹی وایو کا شک دور نہ ہوا۔ آپ کچھ بھی سمجھیں لیکن میں جاسوس نہیں ہوں۔ میں تو صرف یہاں شکار کھیلنے آیا ہوں۔ اگر آپ اجازت نہیں دیتے تو بھی مجھے کوئی افسوس نہیں ...... بہر حال میں اپنی طرف سے ایک شاندار بندوق آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں ہیڈن نے کہا ۔ ابھی دونوں کی گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک عجیب واقعہ ہوا۔ دربان نے بڑے ادب کے ساتھ بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ زولو ملاقاتی آئے ہیں۔

''بھیج دو۔'' سیٹی وایو نے کہا اور تھوڑی دیر بعد دو زولو وہاں آئے، ان میں سے ایک دراز قد صحت مند نوجوان زولو سپاہی تھا اور پوری طرح مسلح، وہ کپتان تھا، دوسرا آدمی ادھیڑ عمر تھا اور غیر مسلح وہ سپاہی نہیں تھا۔

نوجوان کپتان ادب سے زمین پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''میرا نام ناہون ہے، میں زومبا کا بیٹا ہوں۔ یہ میرا ماموں اگوتا ہے میرے باپ کی سب سے چھوٹی بیوی کا بھائی۔''



''تم یہاں کیوں اور کس لئے آئے ہو فوج کو چھوڑ کر یہاں آنے کی تمہیں جرأت کس طرح ہوئی؟'' بادشاہ نے گرج کر پوچھا۔

''میں اپنے افسر سے رخصت لے کر حاضر ہوا ہوں۔'' ناہون نے جواب دیا اور میرے آنے کا مقصد آپ سے اجازت حاصل کرنا ہے۔

''کس بات کی اجازت؟'' بادشاہ نے پھر اسی غصیلے لہجے میں دریافت کیا۔

''میرے ماموں کی ایک بیٹی ہے۔ نانیا اس کا نام ہے، ہم شادی کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی اجازت کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ شادی کے معاوضے کے طور پر اپنے ماموں کو پندرہ عمدہ گائیں اور بچھڑیں پہلے ہی دے چکا ہوں، لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ ہی کے علاقے کا ایک سردار ماپوٹا جو بڑا طاقت ور ہے ہماری شادی کی راہ میں روڑے اٹکا رہا ہے، کیوں کہ وہ بھی نانیا سے شادی کرنے کا خواہش مند ہے۔''

''خاموش'' سیٹی وایو نے چیخ کر کہا۔ ''تمہیں شرم نہیں آتی کہ اس وقت شادی کرنے کی خواہش کا اظہار کر رہے ہو جب سفید فام ہمارے سروں پر جنگ مسلط کرنے کے لئے پر تول رہے ہیں، تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ کل ہی میں نے بیس لڑکیوں اور ان کے باپوں کو موت کی سزا دی ہے اس لئے کہ انہوں نے میری اجازت کے بغیر اپنی بیٹیوں کی شادیاں کر دی تھیں، میں نے ان کی لاشیں چوراہوں پر پھنکوا دیں تا کہ دوسروں کو عبرت ہو کیا تم لوگ بھی اپنا یہی حشر چاہتے ہو، تمہاری گستاخی کی سزا بڑی ہے لیکن چونکہ تم میری فوج کے افسر ہو، میں تمہیں معاف کرتا ہوں، شادی کا خیال دماغ سے نکال دو اور سن بڈھے! تیری سزا یہ ہے کہ تو اگلے چاند کے پہلے ہفتے میں اپنی بیٹی جسے ناہون بڑی خوبصورت دوشیزہ کہتا ہے اور پندرہ گائیں اور بچھڑے جو تمہیں پیش کئے، لے کر شاہی محل میں حاضر ہو جا۔ نانیا اگر واقعی خوبصورت ہوئی تو میں اسے اپنی بیوی بناؤں گا۔''

ہیڈن خاموشی سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا بڈھے اگوتا کا رنگ یک لخت زرد پڑ گیا۔ ناہون کا البتہ حال مختلف تھا۔ ہیڈن نے دیکھا بادشاہ کے انکار سے پہلے تو اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے پھر آہستہ آہستہ اس کی جگہ غصے نے لے لی۔ اس کی گردن اور پیشانی کی رگیں تن کر ابھر آئیں۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ ذرا دیر بعد یہ تاثرات ماند پڑ گئے۔

''سنو! ناہون...... ابھی فوج میں واپس جانے کی بجائے تم اس سفید فام کے ساتھ جاؤ، یہ ہمارے جنگلوں میں شکار کھیلنے کا خواہش مند ہے، یہ ہمیں ایک بندوق بھی پیش کر چکا ہے، اس لئے اسے شکار کی اجازت ہے، جاؤ اور اسے ساتھ رکھو، یہ دھیان رکھنا کہ یہ بھاگ نہ جائے، مجھے اس سے کئی کام لینے ہیں۔ جاتے ہوئے اپنے ساتھ کچھ سپاہی لیتے جاؤ، اگلے چاند کے پہلے ہفتے میں اسے لے کر یہاں آ جانا، اب تم جا سکتے ہو۔''

دس دن تک وہ جنگل میں مارے مارے پھرتے رہے لیکن انہیں شکار نہ ملا، ایک روز وہ ایک پہاڑی کے دامن میں ڈیرہ ڈالے پڑے ہوئے تھے، ہیڈن سمجھ چکا تھا کہ وہ قیدی ہے اور ناہون اس کا نگران...... وہ سوچ رہا تھا کہ موقع ملتے ہی فرار ہو جائے، اس وقت ہیڈن اور ناہون ایک چھوٹی سی پہاڑی پر کھڑے تھے، ان کے بائیں طرف ایک چھوٹا سا بے حد گھنا جنگل تھا، جنگل کے بیچوں بیچ ایک دریا گزرتا تھا، ''اس جنگل کا کیا نام ہے؟'' ہیڈ نے دریافت کیا۔

''مردوں کا جنگل......'' ناہون نے بے خیالی میں جواب دیا۔ وہ اس وقت نانیا کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کا گھر وہاں سے کوئی ایک گھنٹے کی مسافت پر تھا۔

''مردوں کا جنگل...... وہ کس طرح؟'' ہیڈن نے تعجب سے پوچھا۔

''اس لئے کہ وہاں روحیں رہتی ہیں اور وہ تمام روحیں زندہ ہیں۔ وہاں کوئی زندہ انسان نہیں جا سکتا۔''

ہیڈن آہستہ آہستہ آگے بڑھا، چٹان کے کنارے پر کھڑے ہوکر اس نے پھر غور سے دیکھا۔ بائیں جانب ایک گہری جھیل تھی اور اس کے دامن میں اس راستے پر جو چٹان اور جنگل کے درمیان تھا، ایک جھونپڑی تھی، تنہا اکیلی جھونپڑی۔ ''اس جھونپڑی میں کون رہتا ہے......؟'' ہیڈن نے متعجب ہوکر پوچھا۔

''عظیم کاہنہ سانوسی...... جس کا مطلب ہے نگس شہد کی مکھی کیونکہ وہ ان روحوں سے مستقبل کی پیشگوئیاں جمع کرتی ہیں جو مردوں کے جنگل میں رہتی ہیں۔''

''کیا وہ یہ بتاسکے گی کہ مجھے کوئی شکار ملے گا یا نہیں۔''

''شاید......'' ناہون نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''جو لوگ کاہنہ کے پاس جاتے ہیں یا تو انہیں کچھ بھی سننا نہیں پڑتا یا پھر انہیں وہ باتیں سننی پڑتی ہیں جن کا تذکرہ انہیں ناگوار گزرتا ہے۔''

ناہون اور ہیڈن کاہنہ کی جھونپڑی میں داخل ہوگئے، وہ عجیب وغریب حلیے میں تھی شیر کی گندی کھال میں ملبوس اس بوڑھی کاہنہ کو دیکھ کر دل پر خوف طاری ہوجاتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چیتے کی آنکھوں جیسی چمک اور عیاری تھی۔ وہ جلتے ہوئے الاؤ کے پاس بیٹھی تھی جس کے گرد انسانی کھوپڑیاں یوں جوڑ، جوڑ کر کے رکھی تھیں جیسے وہ آپس میں باتیں کررہی ہوں...... ہیڈن نے دیکھا اس کی گردن کے گرد ایک سانپ لپٹا ہوا تھا اور اسے پتہ تھا کہ وہ افریقہ کا سب سے زہریلا اور خطرناک ترین قسم کا سانپ ہے...... ہیڈن اور ناہون چپ چاپ اس کے پاس بیٹھے رہے۔

''سفید فام کس لئے آئے ہو؟'' بوڑھی کاہنہ نے کہا۔ ''بولتے کیوں نہیں؟ لیکن نہیں...... تمہارے بولنے کی ضرورت نہیں، میں تمہارے خیالات پڑھ سکتی ہوں......اور ناہون زومبا کے بیٹے! تمہیں تو اپنی فوج کے ساتھ ہونا چاہئے تھا، سفید فاموں سے جنگ کرنے کے لئے جو سفید فاموں اور زولوؤں کی آخری خوف ناک جنگ ہوگی۔ اگر جنگ سے خوف زدہ ہو تو تمہیں حسین نانیا کے پاس ہونا چاہئے تھا مگر تم زندگی میں اس سے نہیں مل سکتے۔''

''میں اس لئے آیا ہوں کہ تم اپنے علم سے مجھے یہ بتاؤ کہ مجھے کوئی شکار ملے گا یا نہیں......'' ہیڈن نے کہا، ناہون نے کوئی جواب نہ دیا وہ ادب سے بیٹھا رہا......

کاہنہ نے ایک قہقہہ لگایا اور بولی۔

''سفید فارم بتاؤ مجھے اس کا کیا معاوضہ دوگے۔''

''اس وقت تو میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔'' ہیڈن نے کہا۔

''کوئی بات نہیں......'' کاہنہ نے پھر قہقہہ لگاتے ہوئے۔ ''کہا کوئی بات نہیں میں زیادہ لالچی نہیں ہوں...... میں معاوضہ پھر لے لوں گی۔ اس وقت جب ہم دوبارہ ملیں گے اور وہ وقت دور نہیں۔''

پھر کاہنہ دفعتاً اپنی جگہ سے اچھلی اور اس سے پہلے کہ ہیڈن کچھ سمجھ سکتا، اس نے اس کے سر سے بالوں کی ایک لٹ کاٹ لی۔ ''بس مجھے یہی کچھ درکار تھا، آئے ہو تو اپنی تقدیر کا لکھا سن لو...... زومبا کے بیٹے تم بھی اپنے بالوں کی ایک لٹ کاٹ کر مجھے دو۔''

ناہون نے فوراً کاہنہ کے حکم کی تعمیل کی۔ اب وہ پھر آگ کے روبرو کھڑی تھی، اس نے اپنے تھیلے میں سے چند خشک جڑی بوٹیاں نکالیں اور شعلوں میں پھینک دیں۔ گاڑھا نیلگوں دھواں اٹھا اور اس نے کاہنہ کے چہرے کو لپیٹ میں لے لیا۔ پھر اس نے ہیڈن اور ناہون کے بالوں کی لٹیں بھی آگ میں پھینک دیں جو چرمرا کر جلنے لگیں...... اب وہ زور زور سے سانس لے کر دھواں اپنے پھیپھڑوں میں کھینچ رہی تھی۔ چند لمحوں میں اس کا جسم اکڑنے لگا، اس نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کئے اور دفعتاً بیٹھ گئی۔ اس کا سر اوپر کی جانب اٹھا ہوا تھا، ہیڈن نے دیکھا اس کے چہرے کا رنگ نیلگوں ہوچکا تھا، اور آنکھیں اپنے حلقوں میں

اس طرح ڈوب گئی تھیں جیسے مردے کی...... تھوڑی دیر خاموشی طاری رہی...... پھر وہ بولنے لگی۔

"سن اے سفید فام!، تیرا جسم خوبصورت اور سفید ہے، لیکن دل سیاہ ہے تجھے شکار ضرور ملے گا اور وہ تجھے مردوں کے جنگل میں لے جائے گا، اس کی شکل ایک شیر کی ہوگی۔ وہ دوشیزہ جسے بادشاہ اور دریا کوئی نقصان نہیں پہنچاسکتے۔ سفید جسم اور سیاہ دل !میرے الفاظ اس وقت یادکرنا جب جنگ کی حشر سامانیاں تیرے اردگرد پوری شدت سے برپا ہوں گی اور میرے لفظ ان آخری لمحات میں موت کے روبرو کھڑے ہوں گے۔

سن اے سیاہ چہرے اور سیاہ جسم والے ناہون !میں تیرے دل میں جھانکتی ہوں جو دودھ کی طرح سفید ہے...... ہاں جنگ کا بازار گرم ہے۔ تعاقب کر کیوں کہ وہ زبان جو جھوٹ بولتی ہے رحم کی درخواست نہیں کر سکے گی۔

"سفید دل !موت کیا ہے؟ موت میں زندگی ہے، اور مردوں کے درمیان تو اپنی زندگی تلاش کرے گا جو کھوگئی کہ وہ جسے بادشاہ اور دریا کوئی نقصان نہیں پہنچاسکتے وہاں تیرا انتظار کرتی ہوگی۔"

"سفید فام تو ہنس کیوں رہا ہے؟" ناہون نے پوچھا۔

"میں اس بڑھیا کی بے معنی باتوں پر ہنس رہا ہوں" ہیڈن نے کہا۔

"وقت بتائے گا کہ یہ باتیں بے معنی ہیں یا بامعنی۔" کاہنہ نے کہا۔ اس کی نظر ہیڈن کی انگلی میں پڑی ہوئی اس طلائی انگوٹھی پر پڑی جو سانپ کی شکل کی تھی، سانپ کی آنکھوں کی جگہ دو چھوٹے چھوٹے قیمتی زمرد جڑے ہوئے تھے۔

"سفید فام ایک سانپ میرے گلے میں ہے اور دوسرا یہ تم مجھے دے دو۔" کاہنہ نے کہا۔ "میں اسے اپنی انگلی میں پہنوں گی۔"

"اس کے لئے تو تمہیں میری موت کا انتظار کرنا پڑے گا۔" ہیڈن نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" کاہنہ نے مطمئن لہجے میں کہا۔ "میں اس وقت کا انتظار کروں گی جب تم مردہ ہو گے۔ اس وقت یہ انگوٹھی لے لوں گی اور کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکے گا کہ میں نے چوری کی ہے۔ ناہون تم سفید فام کے اس وعدے کے گواہ ہو گے۔"

ہیڈن کانپ گیا۔ کیا بڑھیا جو کچھ کہہ رہی ہے وہ سچ ثابت ہوگا؟ مگر جلد ہی اس نے ان خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا اور ناہون سے کہا۔ "اٹھو چلیں۔"

دوسرے ہی دن کاہنہ کی پہلی پیشن گوئی سچ ثابت ہوئی۔ اس روز بھی وہ شکار کی تلاش میں نکلے تھے۔ اور بالکل غیر متوقع طور پر انہیں جنگل میں ایک جگہ بھینسیں ملی تھیں اور ان کے ساتھ ایک قوی ہیکل بھینسا تھا۔ ہیڈن اور اس کے ساتھی پیٹ کے بل رینگتے ہوئے آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھنے لگے بندوق صرف ہیڈن کے پاس تھی اس کے ساتھی تیروں اور برچھوں سے مسلح تھے۔ تیس گز کے فاصلے پر پہنچ کر ہیڈن رک گیا۔ اور بھینس کا نشانہ لے کر اس نے پہلی گولی چلائی جو شاید اس کے دل میں لگی اور بھینس مرگئی۔ دوسری بھینسوں نے بھاگنے کی بجائے ادھر ادھر دیکھنا شروع کردیا۔ ہیڈن نے فوراً دوسرا کارتوس نال میں ڈال کر بھینسے کا نشانہ لیا اور گولی چلادی جو بھینسے کی گردن یا شاید کندھوں پر لگی۔

وہ اگلی ٹانگوں کے بل زمین پر گرا پھر دفعتاً اٹھا اور بھاگ کھڑا ہوا، اور اس کے پیچھے ریوڑ دوڑ پڑا۔

ہیڈن نے کچھ آدمی تو مری ہوئی بھینس کا گوشت کاٹ کر کیمپ میں لے جانے کے لئے وہیں چھوڑ دیئے اور خود ناہون اور چند ساتھیوں کے ہمراہ زخمی بھینسے کے تعاقب میں چل پڑا۔ زمین پر گرے ہوئے خون کے دھبے ان کی رہنمائی کررہے تھے...... لمبی لمبی گھاس جھاڑیوں اور سبزے کو عبور کرتے ہوئے آخر وہ ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں زمین پتھریلی تھی۔ لیکن یہاں آکر خون کے دھبے غائب ہوگئے تھے۔ کئی گھنٹے کے طویل سفر اور دھوپ کی وجہ سے وہ تھک گئے تھے۔

اس لئے انہوں نے درختوں کی چھاؤں تلے بیٹھ کر خشک گوشت کھانا شروع کر دیا، ان کے چار ساتھی پانی پینے کے لئے قریب ہی بہتی ہوئی ایک ندی کی طرف چلے۔ بمشکل آدھ منٹ بعد ایک ہولناک چیخ سنائی دی۔ سب نے چونک کر دیکھا۔ ان کا ایک ساتھی فضا میں بلند تھا...... دوسرے لمحے وہ زمین پر گرا تو سب اس کی طرف دوڑے پڑے۔

زخمی بھینسا ان کے قریب ہی ندی کے کنارے گھنی جھاڑی میں دیر سے چھپا بیٹھا تھا۔ اس نے ایک آدمی پر حملہ کیا اور نوکیلے سینگوں پر اٹھا کر اوپر اچھال دیا تھا اس آدمی کا سینہ کھل گیا تھا اور وہ مر چکا تھا۔ بھینسا بھاگ اٹھا، ہیڈن اور ناہون کو اپنے ساتھ لے کر اس کے تعاقب میں چل پڑا۔

''جانتے ہو۔ اس وقت ہم کہاں ہیں؟'' ایک چھوٹی سی چٹان پر کھڑے ہوئے ناہون نے ہیڈن سے کہا۔'' وہ دیکھو سامنے مردوں کا جنگل ہے اور بھینسے کا رخ اسی طرف ہے۔''

''ٹھیک ہے ہمیں اس کے پیچھے جنگل میں جانا پڑے گا۔''

''نہیں تم مردوں کے جنگل میں نہیں جاؤ گے۔'' ناہون بولا۔

''میں ضرور جاؤں گا۔ ہاں اگر تم خوف زدہ ہو تو بے شک یہیں رہو، میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا۔'' ہیڈن نے جواب دیا۔

''میں روحوں سے خوف زدہ ضرور ہوں لیکن اس کے باوجود میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔'' ناہون نے کہا۔'' اس لئے کہ بادشاہ نے مجھے حکم دیا تھا کہ ہر وقت تمہارے ساتھ رہوں اور تمہاری نگرانی کروں۔''

دونوں مردوں کے جنگل میں داخل ہو گئے۔ وہ واقعی بہت ڈراؤنی جگہ تھی۔ بلند و بالا درختوں کی پھیلی ہوئی شاخیں اوپر جا کر آپس میں مل گئی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پورے جنگل پر ایک چھت سی پڑی ہوئی ہے۔ ہوا میں عجیب قسم کی نمدار بو رچی ہوئی تھی اور پورے جنگل پر پراسرار سناٹا طاری تھا۔ کسی پرندے کی چہکار تک سنائی نہ دیتی تھی۔ دونوں جنگل میں آگے ہی بڑھتے چلے گئے جا بجا گلے سڑے پتوں اور نمدار زمین پر پڑے ہوئے خون کے دھبے ان کی رہنمائی کر رہے تھے۔ کوئی ایک میل آگے جا کر انہوں نے دیکھا کہ خون کے دھبے اب بڑے بڑے ہو گئے تھے بلکہ اب تو خون کی ایک لکیر دکھائی دینے لگی تھی جس کا مطلب تھا کہ بھینسے کے زخم کا منہ زیادہ کھل گیا ہے اور خون زیادہ تیزی سے بہنے لگا ہے، ہلکی سی روشنی میں وہ احتیاط سے چلتے ہوئے کچھ ہی آگے گئے ہوں گے کہ ناہون یک لخت رک گیا۔ کچھ دیر وہ غور سے دیکھتا رہا پھر بولا۔'' ادھر دیکھو! ان دو درختوں کے پتوں کے درمیان۔'' ہیڈن نے بھی غور سے دیکھا۔ دونوں تنوں کے درمیان اس طرف کوئی سیاہ رنگ کی بڑی سی چیز تھی۔ پھر اسے سینگ نظر آئے۔ وہ بھینسا تھا جو بالکل بے حس و حرکت پڑا تھا۔ ہیڈن نے کہا کہ وہ مر چکا ہے۔ لیکن ناہون نے اسے خبردار کرتے ہوئے کہا۔'' اس پر ایک اور گولی چلاؤ۔''

ہیڈن ایک گھٹنا ٹیک کر زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے بڑی احتیاط سے بھینسے کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی جنگل کی گھمبیر خاموشی میں ایک خوف ناک دھماکہ ہوا گولی بھینسے کی ریڑھ کی ہڈی پر لگی اگلے لمحے بھینسا اٹھا اور ان کی طرف لپکا...... ہیڈن کے لئے اتنا وقت نہیں تھا کہ بندوق کھول کر دوسرا کارتوس ڈال سکے بھینسا سر پر آن پہنچا تھا۔ موت سر پر کھڑی تھی...... لیکن دفعتاً ناہون اپنا نیزہ تول کر آگے بڑھا اور جونہی بھینسا اس کی زد میں آیا پوری قوت سے نیزہ بھینسے کے جسم میں اتار دیا۔ بھینسا رک گیا ادھر ادھر دیکھا اور گر پڑا۔ اب وہ مر چکا تھا۔

ہیڈن اور ناہون واپس چل پڑے۔ ہیڈن کو ایک خیال سوجھا...... فرار کا یہ بہترین وقت ہے، اس نے سوچا۔'' میں اگر دوڑ پڑوں تو ایک گھنٹے میں زولولینڈ کی سرحد پر پہنچ جاؤں گا۔ اس کے بعد کوئی خطرہ نہیں...... ناہون اس وقت اکیلا میرے ساتھ ہے۔ اس

کا نیزہ ٹوٹ چکا ہے اور وہ بالکل غیر مسلح ہے اس کے مقابلے میں میرے پاس بھری ہوئی بندوق ہے۔ اگر اس نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی تو میں آسانی سے گولی کا نشانہ بنا سکتا ہوں۔"

ہیڈن نے ایک درخت تلے رک کر بندوق کی نالی ناہون کی طرف کردی اور کہا۔ "ناہون! اپنی جگہ سے جنبش نہ کرو ورنہ گولی چلا دوں گا، میری بات سنو اور سمجھنے کی کوشش کرو، تمہیں معلوم ہے میں یہاں قیدی ہوں۔ اب میں آزادی چاہتا ہوں، اور آزادی کا یہ بہترین وقت ہے، اگر تم میرا راستہ نہ روکو تو میں ایک گھنٹہ بعد زولو لینڈ کی سرحد عبور کر جاؤں گا اور اگر تم میری راہ میں حائل ہوئے تو یہ نہ بھولنا کہ میرے پاس بندوق ہے۔"

ناہون...... بڑے پرسکون انداز میں اس کی طرف تھوڑی دیر دیکھتا رہا پھر بولا۔

"سفید فام تم واقعی سیاہ دل ہو...... تم جانتے ہو کہ بادشاہ نے مجھے تمہاری نگرانی کا حکم دیا تھا...... پھر میں تمہیں جانے کی کس طرح اجازت دے سکتا ہوں؟"

"تم اس بادشاہ کا حکم مان رہے ہو جو تمہاری منگیتر پر قبضہ جمانے کی فکر میں ہے...... چھوڑو اسے اور اگر چاہو تو تم بھی میرے ساتھ بھاگ چلو۔"

"اپنے سارے خاندان کو بادشاہ کے رحم و کرم پر چھوڑ کر میں کیسے جا سکتا ہوں سفید فام۔"

"تو پھر میرا راستہ نہ روکو...... مجھے جانے دو۔" ہیڈن نے کہا۔

"یہ نہیں ہو سکتا...... تم میرے سینے پر گولی مار کر ہی فرار ہو سکو گے۔ میں سپاہی ہوں اور اپنے فرض کو پہچانتا ہوں۔ لو مارو گولی۔"

ناہون مسکراتا ہوا سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔

"میں تمہاری بہادری اور فرض شناسی کی داد دیتا ہوں۔" ہیڈن نے بندوق سے اس کے دل کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے تمہیں ہلاک کرتے ہوئے دکھ ہو رہا ہے۔ لیکن میں اپنی جان کی حفاظت کے لئے ایسا کر رہا ہوں۔"

ہیڈن لبلبی دبانا چاہتا ہی تھا کہ قریبی درخت کی ایک موٹی شاخ پر موجود ایک چیتا غرایا اور بجلی کی طرح ہیڈن پر کود پڑا۔ دوسرے ہی لمحے بندوق دور جا پڑی تھی، ہیڈن زمین پر پڑا ہوا تھا اور چیتا اس کے سینے پر سوار تھا، چیتے کا ایک پنجہ ہیڈن کی ران میں اور دوسرا سینے میں اتر گیا۔ چیتے نے منہ کھول کر ہیڈن کے سر کو جبڑوں میں لینا چاہا تو چیتے کی پیٹھ پر زور سے ڈنڈا پڑا۔ چیتے نے ہیڈن کو چھوڑ دیا اور ناہون پر لپکا۔ اسے ڈنڈا اسی نے مارا تھا۔ اس کا نیزہ تو بھینسے کے جسم میں ٹوٹ گیا تھا اب اس کے ہاتھ میں اتفاق سے درخت کی موٹی اور خشک شاخ آ گئی تھی۔ چیتا اس کی طرف مڑا تو ناہون نے اس کے منہ پر ڈنڈا مارا اور اس کی جست کی زد سے ایک طرف ہو گیا۔ چیتا پیچھے ہٹ کر پھر حملہ آور ہوا لیکن ناہون بہت پھرتیلا ثابت ہوا۔ وہ ہر حملے میں چیتے کے منہ اور سر پر وار کرتا تھا، ہیڈن ایسا بری طرح زخمی تھا کہ ناہون کی مدد کرنے کے قابل نہ تھا۔ آخر ناہون نے چیتے کی کھوپڑی توڑ کر مار دیا۔

ہیڈن نے اس کا شکریہ ادا کیا تو ناہون نے اس سے کہا۔ "شکریہ ہمارے بادشاہ کا ادا کرو جس نے مجھے تمہاری حفاظت کے لئے مجھے ساتھ بھیجا ہے۔" ناہون بات کر ہی رہا تھا کہ ہیڈن پر غشی طاری ہو گئی۔

جب ہیڈن کو ہوش آیا تو اس نے ایک نسوانی آواز سنی۔ "ناہون! سفید فام کو ابھی تک ہوش نہیں آیا۔"

"کوئی بات نہیں نانیا!" ہیڈن کو ناہون کی آواز سنائی دی۔ "یہ خطرے سے نکل آیا ہے۔ زخم جلد ہی ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ناہون۔" نانیا نے دکھی لہجے میں کہا۔ "ناہون! اگر تم سفید فام کی بات مان لیتے تو کیا ہرج تھا؟ اس نے تمہیں بھی اپنے ساتھ بھاگ چلنے کے لئے کہا تھا۔ اس کی بھی جان بچ جاتی اور تمہاری بھی...... اب بھی وقت ہے۔ آؤ یہاں سے بھاگ چلیں، اس

وقت سے اگر ہم نے فائدہ نہ اٹھایا تو ہم ایک دوسرے کو ساری عمر نہ پاسکیں گے۔"

"میرا امتحان نہ لو نانیا۔" ناہون نے جواب دیا۔ "محبت اور فرض کی جنگ میں فرض نے فتح پائی ہے، میں سپاہی ہوں بادشاہ کا ہر لفظ اور ہر حکم میرے لئے تقدیر کی حیثیت رکھتا ہے۔"

"نہیں ناہون۔" نانیا نے غم زدہ لہجے میں کہا۔ "اپنے آپ کو فریب نہ دو، تم اس بادشاہ کے لئے اپنا سب کچھ قربان کررہے ہو جو تمہاری منگیتر پر قبضہ کرنے کی فکر میں ہے۔" نانیا نے کہا۔ "صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ تمہیں مجھ سے بالکل محبت نہیں ہے۔"

"یہ بات کہہ کر میرے دل کے ٹکڑے نہ کرو نانیا۔ چپ رہو، خدا کے لئے مجھے مجبور نہ کرو...... تم نہیں جانتیں کہ میرے جذبات کی کیا حالت ہے۔" ناہون نے گلوگیر آواز میں کہا اور نانیا کے جواب کا انتظار کئے بغیر باہر نکل گیا، نانیا اب سسکیاں لے رہی تھی۔

ہیڈن نے آنکھیں کھول دیں اور اس کی طرف دیکھا...... اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ بادشاہ کے سامنے ناہون نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ وہ خوب صورت تھی، بلاشبہ بے پناہ خوب صوت بہت دیر تک ہیڈن کی نگاہیں اس کے دل کش چہرے اور سڈول بدن کا جائزہ لیتی رہیں۔ نانیا اپنے خیالوں میں ڈوبی پریشان اور رنجیدہ جھونپڑی کی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی اس کی نظر ہیڈن پر پڑی تو بولی۔ "ہوش آ گیا تمہیں سفید فام۔"

"ہاں، شکریہ خاتون۔" ہیڈن نے جواب دیا۔ "لیکن میں اٹھ نہیں سکتا۔"

نانیا نے دودھ کا پیالہ اٹھایا اور دوسرے ہاتھ سے ہیڈن کو سہارا دے کر بٹھادیا۔ اور بولی...... "دودھ پی لو۔"

ہیڈن نے دودھ پیا تو جیسے اس کے رگ و پے میں ایک نئی روح دوڑ گئی۔ ہیڈن کو لٹا کر وہ خاموشی سے اس کے زخموں کی مرہم پٹی کرنے لگی۔ ہیڈن چپ چاپ اس کو دیکھتا رہا۔ اس پرزولولڑکی کے حسن کا سحر طاری ہو چلا تھا۔ نانیا مرہم پٹی سے فارغ ہوکر اٹھی اور پھر دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی۔

ہیڈن نے اس کے اچھے سلوک کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ "تم خوش قسمت ہو کہ اپنے بادشاہ کی ملکہ بن رہی ہو۔"

نانیا نے آہ بھر کہا۔ "کاش ایسا کبھی نہ ہو، یہی تو ایک غم ہے جو مجھے کھائے جارہا ہے۔"

ہیڈن اس کے جذبات کو خوب سمجھتا تھا، اس نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا "غم نہ کرو...... انتظار کرو...... بڑی کٹھن مشکلیں آسان ہوجایا کرتی ہیں۔"

نانیا ہرروز آتی اور اس کی مرہم پٹی اور تیمارداری کرکے چلی جاتی۔ وہ ہیڈن کے دل میں اترتی چلی جارہی تھی لیکن وہ کبھی اظہار محبت کی جرأت نہ کرسکا آخر وہ وقت آیا کہ ہیڈن کے زخم بھر آئے اب وہ ہر وقت جھونپڑی میں رہنے کی بجائے وقتاً فوقتاً باہر ٹہلنے کے لئے بھی نکل جاتا تھا۔

ایک روز شام کے جھٹپٹے میں وہ باہر نکلا، دور دور تک سبزہ اور جھاڑیاں تھیں وہ ایک درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا اور نانیا ہی کے بارے میں سوچنے لگا۔ نانیا چشمے سے پانی بھر کر آرہی تھی۔ وہ لمحہ بہ لمحہ اس کے قریب آرہی تھی لیکن اس نے ابھی تک ہیڈن کو دیکھا نہیں تھا جب وہ اس سے تھوڑے سے فاصلے پر رہ گئی تو اچانک ایک چھوٹا سے سانپ جو شاید راستے میں پڑا تھا نانیا کے قدموں کی چاپ سن کر اٹھا اور جلدی سے گھاس میں چلا گیا۔ نانیا خوف زدہ ہوکر اچھلی تو پانی کا گھڑا اس کے سر سے گر گیا اور سارا پانی بہہ گیا۔ ہیڈن جلدی سے آگے بڑھا اور بولا۔ "کوئی بات نہیں نانیا تم یہیں رکو، میں تمہارے لئے چشمے سے پانی لے کر آتا ہوں۔"

"نہیں سفید فام شکریہ...... میں خود ہی لے آتی ہوں۔" نانیا نے کہا لیکن ہیڈن گھڑا اٹھا کر چشمے کی طرف جاچکا تھا جب وہ پانی لے کر واپس آیا تو نانیا وہیں

کھڑی تھی۔
''کہو تو میں تمہیں گھر تک چھوڑ آؤں۔'' ہیڈن نے کہا اور شکریہ کے لہجے میں کہنے لگا۔ ''تم نے میری جان بچائی ہے اگر تم نہ ہوتیں تو اب تک میں مر چکا ہوتا۔''
''میں نے نہیں بلکہ ناہون نے چیتے کو ہلاک کر کے تمہاری زندگی بچائی اور پھر زخمی ہونے کے باوجود تمہیں اٹھا کر یہاں تک لایا۔''
''لیکن اس نے میرا جسم بچایا اور تم نے میری روح کو نئی زندگی بخشی ہے۔'' ہیڈن نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''سنو نانیا میں تم سے محبت کرتا ہوں۔''
''مجھ سے؟ ایک زولو لڑکی سے؟'' نانیا نے حیرت زدہ ہو کے کہا۔ ''سفید فام تم یہ کہہ رہے ہو؟''
''بالکل سچ کہہ رہا ہوں نانیا۔ میں تم کو اپنی بیوی بنانے کا خواہش مند ہوں۔''
''شکریہ سفید فام، تم نے مجھے عزت بخشی ہے۔ لیکن میں پہلے ہی کسی کی ہو چکی ہوں۔''
''لیکن تمہاری شادی بادشاہ سے ہونے والی ہے۔''
''یہ شادی نہیں ہوگی سفید فام۔ زولو لڑکیاں اپنی محبت کے لئے جان دے دیا کرتی ہیں۔ میں دریا میں خود کو خودکشی کر لوں گی۔''
''تم جیسی حسین لڑکی کو بے بسی کی موت نہیں مرنا چاہئے نانیا۔ میری مانو اور میرے ساتھ چلی چلو۔ ہم راتوں رات زولو لینڈ سے نکل کر ناتال چلے جائیں گے۔''
''نہیں سفید فام میں ناہون کی ہو چکی ہوں۔ اب اس سے مجھے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔''
ہیڈن بے بس ہو گیا۔ اس زولو لڑکی کے آگے وہ شکست کھا گیا۔ لیکن ابھی اس کے پاس ایک حربہ تھا مکاری کا...... وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ اور پھر بولا۔
''ٹھیک ہے نانیا...... میں تمہاری محبت اور وفا کی قدر کرتا ہوں۔ مجھے بھی تم سے محبت ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ تم کسی اور کی ہو لیکن میری محبت کا تقاضہ ہے کہ میں تمہیں خوش دیکھوں اور تمہاری حفاظت کروں۔ ابھی مجھے ایک تجویز سوجھی ہے تم اگر ناہون کو تیار کر لو تو ہم سب اکٹھے یہاں سے فرار ہو کر ناتال چلے جائیں گے وہاں تم دونوں شادی کر لینا، اور بلا خوف وخطر میرے پاس رہنا۔ زولو بادشاہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں تم لوگوں کی ہر طرح سے مدد کرنے کے لئے تیار ہوں گا۔''
''مگر ناہون مانے گا نہیں۔'' نانیا نے کہا۔
''تم کوشش کرو نانیا، اگر وہ تم سے سچی محبت کرتا ہے تو ضرور مانے گا۔ تم اسے چلنے پر مجبور کرو۔''
''بہتر ہے میں کوشش کروں گی، شاید...... شاید وہ مان جائے۔''
اس رات نصف شب کے قریب ہیڈن کی جھونپڑی پر آہستگی سے دستک ہوئی اس کے ساتھ ہی نانیا اندر آئی اس کے پیچھے اس کا باپ اور اس کے پیچھے ناہون بھی اندر آ گیا نانیا نے کہا۔ ''سفید فام ناہون میری بات مان گیا ہم سب چلیں گے۔ میرا باپ بھی ہمارے ساتھ ہوگا۔''
باقی تمام رات وہ فرار کی اسکیم مرتب کرتے رہے۔ صبح کے وقت جھونپڑی سے باہر کسی شور وغل سے ہیڈن کی آنکھ کھل گئی۔ باہر جا کر دیکھا۔ ایک ہٹا کٹا زولو، نانیا کے باپ کو گالیاں دے دے کر کہہ رہا تھا۔ ''تو نے اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر اس سپاہی ناہون سے اس کی منگنی کر دی۔ اس کے بعد تم دونوں نے جا کر میرے خلاف بادشاہ کے کان بھرے، اسے میرے خلاف کر دیا اور تو نے اپنے مکروہ جادو سے میرے جانوروں کا دودھ خشک کر دیا، اب گائیں دودھ کا ایک قطرہ نہیں دیتیں۔ میں تجھ سے تیرے کرتوت کا بدلہ لوں گا اور تیرے سارے خاندان کو ہلاک کر کے تیرے گھر کو آگ لگا دوں گا۔''
نانیا کا باپ خوف سے کھڑا کانپ رہا تھا، ناہون نے اس زولو کو جس کا نام ماپوتا تھا۔ گردن سے پکڑ کر اس

نذر زور سے دھکا دیا کہ وہ دور تک لڑھکتا چلا گیا۔
ہیڈن نے یہ نظارہ دیکھا اور قہقہہ لگا کر چشمہ کی طرف چلا۔ جو وہاں سے کچھ فاصلے پر تھا، چشمے کے کنارے جا کر وہ رک گیا۔ بلند و بالا درختوں، سربفلک پہاڑیوں اور حد نظر تک پھیلے ہوئے سبزے کو دیکھنے لگا۔ بڑا خوبصورت منظر تھا، شکست خوردہ ماپوٹا گھوڑے پر سوار چلا آرہا تھا۔ اس کا منہ غصے اور بے عزتی کے جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔ ہیڈن چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ دفعتاً اسے ایک تجویز سوجھی اس نے ماپوٹا کو روک کر کہا۔ ''سردار ماپوٹا مجھے تمہاری بے عزتی پر دلی رنج ہوا ہے، اس لونڈے اور بے حقیقت سپاہی نے تمہارا لحاظ نہیں کیا۔''

''میں اس سے خوف ناک انتقام لوں گا۔'' ماپوٹا نے پھنکار کر کہا۔

''کس طرح؟'' ہیڈن نے پوچھا اور کہا۔'' کہو تو میں ایک تجویز بتاؤں جس سے تم اپنے دشمنوں سے بے عزتی کا انتقام لے سکتے ہو۔ لیکن اس کے بدلے تمہیں ایک چیز میرے حوالے کرنی ہوگی۔''

''وہ کون سی چیز ہے سفید فام؟'' اس نے پوچھا۔

''نانیا۔'' ہیڈن نے کہا۔''میری کامیابی کے بعد تمہیں نانیا میرے حوالے کرنی ہوگی۔ اور اس کے بدلے، میں تمہیں اپنی ولایتی بندوق دوں گا۔''

ماپوٹا چند لمحے غور کرتا رہا۔ پھر بولا۔''نانیا سے میں خود شادی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس جیسی لڑکیاں میں پھر بھی حاصل کرسکتا ہوں، مجھے منظور ہے تم مجھے بندوق دے دینا۔ مجھے بندوق کی بڑی آرزو ہے۔''

''تو سنو ماپوٹا، آج سے چار دن بعد نانیا اس کا باپ اور اس کا منگیتر ناہون یہاں سے اپنے تمام مویشیوں کو لے کر فرار ہو رہے ہیں، ہیڈن نے راز داری سے کہا بعض وجوہات کی بنا پر میں بھی اس کا ساتھ دینے پر مجبور ہوں۔ وہ صبح کے وقت اس دریا کے کنارے پہنچیں گے جو ناٹال اور زولینڈ کے درمیان سرحد کا کام دیتا ہے۔ تم وہاں اپنے آدمی لے کر آ جانا۔ نانیا کے باپ اور ناہون کو قتل کر کے تم اپنا بدلہ لے لینا وہیں پر تم نانیا کو میرے حوالے کردو گے، اور اس کے بدلے، میں تمہیں اپنی قیمتی بندوق دوں گا۔''

''مجھے منظور ہے۔'' ماپوٹا کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔''سفید فام تم نے مجھے ایسا راز بتا دیا ہے جس سے میں دشمنوں کو فنا کرسکتا ہوں۔''

اس کے بعد وہ دیر تک اس تجویز کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے رہے لیکن اس وقت بڈھے ماپوٹا کا دماغ کسی اور طرف لگا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا''اگر میں اس سازش کی خبر بادشاہ کو پہنچادوں تو نہ صرف وہ ان کا خاتمہ کردے گا۔ بلکہ مجھے انعام دے گا اور ہوسکتا ہے کہ خوش ہو کر وہ نانیا ہی مجھے بخش دے۔''

دو گھنٹے کے بعد جب ماپوٹا اپنی جھونپڑی میں پہنچا تو اس نے سب سے پہلے کام یہ کیا کہ اپنے دو قابل اعتماد آدمیوں کو ساری بات سمجھا کر بادشاہ کی طرف روانہ کردیا۔

چار دن بعد ناہون نانیا اس کا باپ اور ہیڈن پروگرام کے مطابق فرار کی راہ پر چل پڑے ان کا رخ جنوب کی طرف تھا۔ دریا عبور کر کے انہیں ناٹال کے علاقے میں داخل ہونا تھا لیکن دریا تک پہنچنے سے پہلے ہی انہیں ماپوٹا کی سرگردگی میں زولو سپاہیوں کے ایک دستے نے گھیرے میں لے کر روک لیا۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ نانیا کے باپ نے خوف زدہ ہونے کے باوجود جرأت کر کے پوچھا۔''ہم تو بادشاہ کے حضور میں جارہے ہیں۔''

ماپوٹا نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔''بڈھے شاید تیری عقل ماری گئی ہے، بادشاہ جنوب کی طرف نہیں رہتا ادھر تو دریا ہے اور دریا کے پار ناٹال...... سنو! بادشاہ کو پتہ چل گیا ہے کہ تم فرار ہونا چاہتے ہو۔ اور اس سازش کا راز فاش کرنے والا تمہارا یہ ساتھی سفید فام تھا۔ بادشاہ نے یہ خبر سنتے ہی مجھے حکم دیا کہ مقررہ وقت پر تمہیں پکڑلوں اور اس کے بعد تمہیں دریا کے حوالے کردیا جائے۔''

ماپوٹا کی زبان سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ ناہون نے پلٹ کر ہیڈن کی طرف دیکھا اور اس پر چھلانگ لگائی۔ مگر وہ ہیڈن تک نہ پہنچ سکا کیونکہ زولو

سپاہیوں نے راستے ہی میں اسے پکڑ لیا۔ ''اس بدمعاش کو اچھی طرح قابو کیے رکھو۔'' ماپوٹا سردار نے حکم دیا۔

ہیڈن کا دل دھڑک رہا تھا۔ اسے ماپوٹا کی عیاری پر بڑا طیش آرہا تھا کہ اس گنجے سردار نے اس کے ساتھ دھوکہ کیا ہے، نانیا نے پلٹ کر ہیڈن کی طرف دیکھا۔ اس نے زبان سے ایک لفظ نہ کہا۔ اس کی آنکھوں میں حقارت تھی۔

''چلو اب تمہارا انجام تمہارا منتظر ہے۔'' ماپوٹا نے کہا۔

سپاہیوں کے گھیرے میں وہ آگے بڑھے۔ اور ایک چٹان کے کنارے آکر رک گئے۔ یہ ایک بلند جگہ تھی۔ اور یہیں سے ایک آبشار پچاس فٹ نیچے دریا میں گرتا تھا، اس مقام کو زولو موت کا دریا کہتے تھے کیونکہ سزائے موت کے مجرموں کو یہاں سے نیچے دریا میں گرا کر ہلاک کردیا جاتا تھا۔

''چلو بڈھے پہلے تم۔'' ماپوٹا نے نانیا کے باپ کو حکم دیا۔ سپاہی اسے گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھے۔

''نہیں مجھے چھوڑ دو، میں خود ہی آگے جاؤں گا۔'' نانیا کے باپ نے عزم سے کہا۔ سپاہیوں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ بڑے استقلال سے چلتا ہوا کنارے تک آیا۔ ایک بار اس نے سارے منظر کو دیکھا جیسے اس خوبصورت دنیا کو آخری بار دیکھ رہا ہوں اور اس کے بعد بغیر کچھ کہے نیچے کود گیا۔

''خوب صورت لڑکی اب تمہاری باری ہے۔'' ماپوٹا نے کہا۔ ''مجھے امید ہے کہ تم اپنے باپ کی طرح بہادری کا ثبوت دو گی اور خود ہی اپنے آپ کو دریا کی لہروں کے حوالے کردو گی۔''

''یقیناً......'' نانیا نے بغیر کسی خوف کے کہا اور باوقار انداز میں چلتی ہوئی چٹان کے کنارے جا کھڑی ہوئی۔ ''مرنے سے پہلے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''یہ درست ہے کہ ہم لوگ یہاں سے فرار ہورہے تھے۔ اور فرار کی سزا چونکہ موت ہے اس لئے ہمیں یہ سزا قبول ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سازش کا منصوبہ تیار کرنے والا یہ شخص ہے جو سفید فام ہے، لیکن اس کا دل سیاہ ہے، اس نے ہمیں فرار ہونے کے لئے ورغلایا تھا۔ پھر اس نے غداری کی اور ہمیں موت کے منہ میں دھکیل دیا اور مرنے سے پہلے یہ بھی بتانا چاہتی ہوں کہ سیاہ دل نے ایسا کیوں کیا۔ اس لئے کہ یہ مجھ سے محبت کرنے لگا تھا اور مجھ سے شادی کرنے کا خواہشمند تھا اس نے مجھے اپنے ہمراہ فرار ہونے کے لئے بھی اکسایا لیکن میں نے اس کی محبت کو ٹھکرا دیا جس کا انتقام اس نے اس طرح لیا ہے۔''

''تم سچ کہتی ہو۔'' بڈھے ماپوٹا نے کہا۔ ''اس نے مجھے اس سازش میں شریک کیا تھا، کہ میں ناہون اور تیرے باپ کو قتل کردوں اور تجھے اس کے حوالے کردوں جس کے بدلے میں اس نے مجھے اپنی بندوق دینے کا وعدہ کیا تھا۔''

''دیکھا تم نے ناہون۔'' نانیا نے مڑ کر ناہون سے کہا۔ ''جس شخص کی تم نے جان بچائی تھی اس نے یہ صلہ دیا ہے۔''

چند لمحے وہ خاموش رہی پھر بولی۔ ''ناہون میں تم سے بڑی شرمسار ہوں، میں نے تمہیں فرار ہونے اور اپنے فرض سے منہ موڑنے پر مجبور کیا مجھے معاف کردینا۔ ناہون اب ہم آگے کا سفر کررہے ہیں، ہم اس دنیا میں تو ایک دوسرے کو نہیں پا سکے، لیکن موت کے دروازے سے گزر کر ہم ایک دوسرے کو ضرور مل جائیں گے، میں جارہی ہوں تم میرے پیچھے آؤ۔ روحوں کے جنگل میں ہماری ملاقات ہوگی۔''

نانیا نے آخری بار ناہون کو دیکھا جو بالکل خاموش کھڑا تھا پھر ایک ہلکی سی چیخ سنائی دی اور پچاس فٹ نیچے بہتے ہوئے دریا کی طوفانی لہروں اور آبشار کے قیامت خیز دھارے میں کود گئی۔

''اب ناہون تم آگے بڑھو۔'' ماپوٹا نے چیخ کر کہا۔ ''لیکن ناہون جو ابھی تک چپ چاپ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ شیر کی طرح دھاڑا اور اپنے اردگرد کھڑے سپاہیوں کو جنہوں نے اسے پکڑ رکھا تھا۔ ادھر ادھر کر دیوانوں کی طرح آگے بڑھا اور چیخا۔ ''اب تیری

باری ہے غدار...... اب تیری باری ہے۔" اس کے منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔ سپاہیوں سے الجھتا ہوا آگے بڑھا تو راستے میں ماپوتا کو حائل دیکھ کر اس نے پوری قوت سے اچھل کر اسے ایک گھونسہ مارا۔ ماپوتا دور جا گرا بیشتر اس کے کہ ناہون سفید فام تک پہنچتا۔ زولو سپاہیوں نے جھپٹ کر اسے پکڑ لیا۔ اور اس کے ہاتھ پیر باندھ کر اسے بے بس کر دیا۔

"کیا اسے دریا میں پھینک دیا جائے؟" ایک زولو سپاہی نے ماپوتا سے پوچھا۔

"نہیں......" ماپوتا نے ناہون کی دیوانگی سے متاثر ہو کر کہا۔" اس کے دماغ کو آسمانی آتش نے چھو کر مقدس بنا دیا ہے، اب ناہون بھی مقدس ہو گیا ہے۔ اب اسے حفاظت سے ہمیں بادشاہ کے پاس پہنچانا ہو گا۔ اس کے بارے میں وہ فیصلہ کرے گا۔"

زولو پاگل آدمی کو مقدس انسان گردانتے ہیں ان کا خیال ہے کہ مقدس آسمانی آتش جب کسی انسان کے دماغ کو چھو لے۔ تو وہ مقدس یعنی پاگل ہو جاتا ہے۔

ہیڈن نے دیکھا کہ سب لوگ ناہون کے اردگرد کھڑے ہیں اور اس کی طرف کسی کی توجہ نہیں اور ماپوتا کا گھوڑا ابھی خالی کھڑا ہے اور اس کی بندوق جو ماپوتا نے چھین لی تھی زمین پر پڑی ہے۔ ہیڈن یک لخت دوڑ پڑا۔ اس نے بندوق اٹھا کر گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہوا۔ اور جب زولو سپاہیوں نے اسے دیکھا تو وہ کئی سو گز دور جا چکا تھا۔ ماپوتا پاگلوں کی طرح اس کے پیچھے بھاگا۔" میرا گھوڑا میرا بندوق" وہ چیخ کر دوڑ رہا تھا۔

ہیڈن نے ماپوتا کو عیاری کی سزا دینے کے لئے گھوڑا روکا اور اتر کر زمین پر کھڑا ہو گیا پھر اس نے بندوق میں کارتوس ڈالا اور گھٹنا ٹیک کر ماپوتا کا نشانہ لینے لگا۔ ماپوتا کی نظر جو ایک دم بندوق پر پڑی تو وہ دہشت زدہ ہو کر جہاں تھا وہیں رک گیا۔ پھر ایک لمحہ کے بعد وہ جس طرح چیختا ہوا آ رہا تھا اسی طرح شور مچاتا ہوا واپس دوڑ رہا تھا۔ ہیڈن نے بندوق کا ٹریگر دبا دیا۔ گولی ماپوتا کی پیٹھ پر لگی۔ وہ لڑکھڑا کر زمین پر گرا اور ساکت ہو گیا۔

ہیڈن اچھل کر گھوڑے پر سوار ہوا اور گھوڑے کو سرپٹ دوڑانے لگا۔ اس کا رخ ناٹال کی طرف تھا۔

ہیڈن جب ناٹال پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ سفید فاموں اور زولو کے درمیان اعلان جنگ ہو چکا ہے۔ ہیڈن کے دو چھکڑے کرائے پر اور ہیڈن کی خدمات معقول معاوضے پر حاصل کر لی گئیں۔ ہیڈن کا تقرر کالم نمبر 3 میں ہوا جس کا کمانڈر لارڈ چیمس فورڈ تھا۔ 20 جنوری 1879ء کو انہوں نے کوچ کیا۔ اور تیز رفتاری سے زولو لینڈ جا پہنچے۔

دوسری طرف سے زولو فوجیں بھی چل پڑیں۔ اور کھلے میدان میں دونوں فوجوں نے ایک دوسرے کے مقابل آ کر ڈیرے ڈال دیئے۔

"وہ پاگل سا نوجوان کون ہے جو جھومتا جھامتا چلا آ رہا ہے۔" زولو سردار نے ایک سپاہی سے پوچھا۔

"وہ ناہون ہے زومبا کا بیٹا چند دن پہلے اس کی منگیتر اور اس کا باپ بادشاہ کے حکم سے مار دیئے گئے تھے، ناہون اس صدمے سے پاگل ہو گیا ہے کیونکہ مقدس آسمانی آگ نے اس کے دماغ کو چھو لیا ہے۔" اتنی دیر میں ناہون بھی وہاں پہنچ گیا۔

"ناہون کیا چاہتے......؟" سردار نے بلند آواز میں پوچھا۔

"میری فوج اور میرے ساتھی سفید فاموں سے جنگ کے لئے جا رہے ہیں۔ مجھے بھی ایک نیزہ اور دو ڈھال دے دو کیونکہ میں بھی لڑنا چاہتا ہوں کیونکہ دشمن فوجوں میں مجھے ایک شخص کی تلاش ہے۔"

ناہون کو دونوں چیزیں دے دی گئیں۔

اگلے دن باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی، انگریزی فوجوں کی طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ آئی تو زولو سپاہی بھی اپنی ڈھالیں لے کر اور نیزے لے کر نعرے لگاتے اور چنگھاڑتے ہوئے آگے بڑھے، گولیاں ان کی ڈھالوں پر پڑ رہی تھیں۔ دونوں طرف کے آدمی زخمی ہو رہے تھے مر رہے تھے، نعروں چیخوں کراہوں اور آوازوں سے میدان اور پہاڑ گونج اٹھے۔

جنگ کی غارت گری میں ایک زولو سپاہی شیر کی طرح دھاڑتا ہوا دشمنوں کی صف کی طرف جارہا تھا۔ وہ ناہون تھا زوما کا بیٹا، یوں لگتا تھا جیسے اسے دوسرے سفید فام سپاہیوں سے کوئی غرض نہیں۔ وہ تو صرف اس شخص کی تلاش میں تھا جو اس کی ساری تباہیوں اور ساری محرومیوں کا ذمہ دار تھا۔ وہ ہیڈن کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اور آخرکار اس نے ہیڈن کو ڈھونڈ ہی لیا، چھکڑوں کے پاس جہاں سے گولیوں کی بارش ہو رہی تھی ناہون دیوانوں کی طرح آگے بڑھا۔

ہیڈن نے ناہون کو دیکھا اور ناہون نے ہیڈن کو، ہیڈن نے اپنی رائفل ناہون کی طرف کی لیکن عین وقت پر پتہ چلا کہ وہ آخری گولی تک فائر کر چکا ہے۔ بارود اس کے پاس ختم ہو چکا تھا۔ ناہون اپنا نیزہ تان کر اس کی طرف لپکا لیکن ہیڈن نے بندوق ایک طرف پھینک دی اور بھاگ کر اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ سپاہیوں کے درمیان وہ لاشوں کو روندتا ہوا گھوڑے پر سرپٹ بھاگا۔

وہ جنگ کے شوروغل سے بہت دور نکل آیا۔ تو اس نے ایک بار پلٹ کر دیکھا ایک گھوڑے پر اس کے پیچھے تھا۔ اس نے ڈھال پھینک دی تھی اور صرف برچھی لئے ہوئے اس کے تعاقب میں شکاری کتے کی طرح آرہا تھا۔ ہیڈن کو یاد آیا کہ اس کے پستول میں ایک گولی بچی ہوئی ہے۔ جس سے اسے آسانی سے نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔ ہیڈن نے سوچا لیکن اگر نشانہ خطا گیا تو ناہون کی برچھی سے مجھے کوئی نہ بچا سکے گا۔ وہ خطرہ مول لینے کو تیار نہ ہوا تو گھوڑے کو پھر ایڑ لگا دی، بہت دیر بھاگنے کے بعد ہیڈن کا گھوڑا تھک کر چور ہو گیا۔ وہ خود بھی بے دم ہوا جارہا تھا۔ پھر اس نے دیکھا سامنے چند قدم دور ایک جھونپڑی تھی۔ اور وہ جھونپڑی زولو کاہنہ کی تھی جسے وہ مکس کہتے تھے۔

یکایک ہیڈن کا گھوڑا تھرایا اور زمین پر گر کر ساکت ہو گیا۔ اس وقت ہیڈن نے دیکھا کاہنہ جھونپڑی کے باہر کھڑی مضحکہ خیز انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے پلٹ کر دیکھا کوئی دوسو گز دور ناہون اسی رفتار سے چلا آرہا تھا۔ اور برچھی کی انی دھوپ میں چمک رہی تھی۔

''سیاہ دل کہو جنگ کا کیا حال ہے؟ تم جنگ سے کیوں بھاگ آئے ہو؟'' کاہنہ نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''مجھے بچاؤ! وہ میرا تعاقب کر رہا ہے۔'' ہیڈن نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''سیاہ دل مقابلہ کرو کہ آخر یہ دن آنا ہی تھا۔ آج پھر ایک ایک مدت کے بعد سیاہ دل اور سفید فام میرے پاس اکٹھے ہو رہے ہیں۔ مقابلہ کرو اور اگر نہیں کر سکتے تو بھاگو اور مردوں کے جنگل میں پناہ لو۔ کیونکہ وہی ہے جو آخرکار سب کو پناہ دیتا ہے۔''

ہیڈن نے سنا اور سوچا دریا کی لہریں طوفانی تھیں وہ تیر کر دریا عبور نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے سوچا جنگل میں پناہ لی جائے اور وہ دریا کے کنارے کنارے دوڑنے لگا۔ وہ جنگل میں دوڑتا رہا۔ دوڑتا رہا اور آخر تھک کر چور ہو گیا۔ مزید ایک قدم بھی چلنا اس کے لئے محال ہو گیا تو وہ رک گیا۔ اور دیکھا ناہون بدستور اس کے پیچھے تھا۔ اس کی پشت پر ایک عظیم الشان درخت تھا جس کے تنے میں ایک بہت بڑی کھوہ تھی اور جنگل میں سناٹا تھا۔

ہیڈن نے اپنا پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔

''ناہون رک جاؤ۔'' ہیڈن نے پستول کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ وہ رک گیا۔ ''دیکھو ناہون ہم بہت لڑے ہیں بہت دوڑے ہیں میں جانتا ہوں تم میرا تعاقب کیوں کر رہے ہو لیکن جو ہو چکا اس کا مداوا اب کوئی نہیں کر سکتا، جو مر چکے ان کو اب کوئی واپس نہیں لاسکتا۔ میرے ہاتھ میں پستول ہے تمہارا برچھی والا ہاتھ ہلنے سے پہلے میں تمہیں گولی کا نشانہ بنا سکتا ہوں۔ لیکن نہیں، میں تمہیں زندہ چھوڑتا ہوں اور تم مجھے زندہ رہنے دو۔''

ناہون خاموشی سے سنتا رہا۔ اور چپ چاپ ہیڈن کی طرف دیکھتا رہا۔ کچھ دیر تک یہی کیفیت رہی۔ پھر ناہون برچھی تول کر اس کی طرف بڑھا۔ اس نے دور سے برچھی پھینکی اور اسی لمحے ہیڈن نے گولی چلا دی۔

برچھی ہیڈن کے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ اور گولی نے ناہون کے دائیں بازو کو زخمی کر دیا۔ پھر دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ ناہون زخمی تھا لیکن وہ جان توڑ کر لڑ رہا تھا، ہیڈن ٹھیک ٹھاک تھا۔ اس لئے اس کا پلہ بھاری تھا۔ آخر ہیڈن نے ناہون کو گرالیا۔ اور اس کے سینے پر سوار ہو بیٹھا۔

''ناہون،اب اپنے انجام کے لئے تیار ہو جاؤ۔'' ہیڈن نے کہا لیکن اسی لمحے اس کے منہ سے ایک فلک شگاف چیخ نکل گئی اور وہ جیسے پتھر بن گیا۔ سفید لبادے میں ملبوس نانیا ناہون کی برچھی ہاتھ میں لئے ہوئے اس کے سامنے کھڑی تھی۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ نانیا کا ہاتھ حرکت میں آیا۔ اور برچھی ہیڈن کے سینے میں پیوست ہو گئی، ہیڈن نے ایک دل دوز چیخ ماری اور زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔

''ناہون......ناہون......اٹھو......آنکھیں کھولو۔''

نانیا مترنم آواز میں کہہ رہی تھی۔'' اٹھو نا ہون...... میں روح نہیں ہوں۔''

ناہون نے آنکھیں کھول دیں ،اس کا سارا پاگل پن جاتا رہا،وہ بے اختیار نانیا سے لپٹ جانا چاہتا تھا۔مگر نانیا نے اسے یہ کہہ کر روک دیا کہ''محبت میں اتنی بے صبری اچھی نہیں میرے پیچھے آؤ اور جتنی جلد ممکن ہو سکے اس دنیا سے دور بھاگنے کی کوشش کرو۔ دنیا کے بے رحم اصول ہمیں ملنے نہیں دیں گے۔''

ناہون پہلے ہی اپنے مرنے والی محبوبہ کو زندہ دیکھ کر دم بخود ہو گیا تھا۔ اب اس کی زبان سے ایسی مایوس کن باتیں سن کر سناٹے میں آ گیا۔''نانیا مجھے اتنا تو بتاؤ کہ تم زندہ کیسے بچیں؟'' ناہون کے لہجے میں عجیب سی بے قراری تھی۔

''پھر بتادوں گی۔میرے پاس اتنا وقت نہیں جلدی کرو۔''

نانیا کے مسلسل انکار سے ناہون بجھ کر رہ گیا تھا۔ ابھی وہ اپنے خیالات میں الجھا ہوا تھا کہ نانیا نے اسے پھر پکارا۔''آؤ میرے وفادار ساتھی۔''

ناہون کو سر جھٹک کر تیزی سے آگے بڑھا۔ وہ نانیا کے قریب ہونا چاہتا تھا مگر نانیا کی رفتار کئی گناہ تیز تھی جیسے ہوا درختوں کے درمیان سے گزر رہی ہو۔ ناہون نے کئی مرتبہ اپنی بے چینی کا اظہار کرنے کی کوشش کی مگر نانیا ہر مرتبہ اسے انگلی کے اشارے سے خاموش کر دیتی۔ دو دھڑکتے ہوئے دل ،مردوں کے جنگل میں سے گزر رہے تھے ،عجیب تحیر انگیز سناٹا تھا عجیب پراسرار خاموشی تھی۔

مردوں کے جنگل سے گزرنے کے بعد نانیا کا رخ پہاڑوں کی طرف تھا۔ ناہون کچھ کہے بغیر نانیا کے پیچھے چلتا رہا۔ اب دونوں پہاڑ کی سب سے بلند چوٹی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ نانیا کی رفتار یہاں تیز تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ پہاڑ پر دوڑ رہی ہو۔ چوٹی پر پہنچنے کے بعد ناہون نے دیکھا کہ کوئی دو سو گز کے فاصلے پر ایک خوبصورت محل اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہے، پہاڑ اور محل کے درمیان سنگ مرمر کی خوبصورت سڑک بنی ہوئی تھی۔ نانیا اچانک مڑتے ہوئے بولی۔

''ناہون!وہ ہے ہمارے خوابوں کی منزل'' نانیا کا اشارہ محل کی طرف تھا۔ اس کے دونوں بازو پھیلے ہوئے تھے جیسے وہ اپنے محبوب کی آغوش میں سما جانے کے لئے بے چین ہو۔ نانیا کا یہ انداز دیکھ کر ناہون عجیب سے وارفتگی میں آگے بڑھا۔ جیسے ہی اس نے سنگ مرمر کی سڑک پر قدم رکھا اس کے پاؤں زمین سے اکھڑ گئے اور وہ ہزاروں فٹ گہری وادی میں گرتا چلا گیا۔ کچھ دیر بعد لوگوں نے دیکھا کہ سفید فاموں سے لڑنے والا جانباز سپاہی خون میں نہایا ہوا بے حس و حرکت پڑا ہے۔

ادھر جو لوگ بوڑھی کاہنہ سے اپنے مستقبل کا حال معلوم کرنے آئے تھے انہوں نے دیکھا کہ سانپ بار بار اپنا پھن بوڑھی کاہنہ کی گردن پر مار رہا تھا اور کاہنہ عجیب سے وحشیانہ قہقہے لگا رہی تھی۔

''میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں،دلوں کے فاصلے ختم ہو گئے''





روحانی لگاؤ

راوی: عزیز الرحمٰن

تحریر: ایس امتیاز احمد۔ کراچی

اور پھر اچانک ایسا خوفناک حادثہ وقوع پذیر ہوا کہ اس کہانی کے تمام ہنستے کھیلتے کردار یکدم غم کی اتھاہ گھرائیوں میں ڈوب گئے...... ایک سچا، حیرتناک اور ذہن کو خوف کے شکنجے میں جکڑتا ہوا حقیقی روداد.

اچھی کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے ایک دلگداز دلفریب اور حیرت انگیز سبق آموز کہانی

کتابی چہرہ کھلتی ہوئی گندمی رنگت اور ذہانت سے بھر پور، سیاہ آنکھوں والا تجمل میرا ہم جماعت تھا۔ ہم مسلسل چھ سال سے ہم جماعت چلے آرہے تھے۔ قائد ملت ہائی اسکول کی چہار دیواری میں یہ ہمارا آخری سال تھا۔ نویں درجہ تک ہماری ملاقات صرف سلام دعا کر لینے اور حال احوال پوچھنے تک محدود تھی۔ اور ان سرسری تعلقات کے پس پردہ موہوم سا جذبۂ رقابت، بہت زیادہ تھا۔

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ تجمل نہ صرف ذہین بلکہ میری نسبت محنتی بھی بہت زیادہ تھا۔ لیکن نہ معلوم کس طرح ہر امتحان میں، میں اس سے دو چار نمبر زیادہ ہی لے جاتا، اور اس طرح کلاس مانیٹر ہونے کا شرف مجھے ہی حاصل ہوتا رہا۔ اب دسویں جماعت کے سہ ماہی امتحانات ہونے کو تھے۔ تجمل ان تھک محنت کر رہا

تھا۔ کلاس روم اور کلاس روم سے باہر کاریڈور، لائبریری لان حتیٰ کہ پلے گراؤنڈ میں بھی وہ کتابوں کا کیڑا بنا ہوا نظر آتا۔ میں جب بھی اس کے سامنے سے گزرتا کسی نہ کسی طرح اس کا مذاق اڑانے کی کوشش ضرور کرتا۔ ایک آدھ طنزیہ جملہ بھی ضرور کہتا، اور پھر اس کو دکھانے اور چڑانے کے لئے کھیل کود میں مصروف ہو جاتا۔

گویا ان حرکتوں سے میں اس پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا کہ جو چاہے کرو، برتری تو میری ہی رہے گی۔ تجمل میرے ہر طنز کو بڑی متانت اور خاموشی کے ساتھ برداشت کر جاتا۔ گویا میری ان باتوں کا اس کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔ امتحانات ہوئے اور نتیجہ بر آمد ہوا۔ تجمل نے میری نسبت اتنی نمایاں کامیابی حاصل کی تھی جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ احساس شکست اور شرمندگی کی وجہ سے جو میری حالت ہو سکتی تھی اس کا اندازہ آپ بخوبی کر سکتے ہیں۔

اور جب تجمل کو میری جگہ مانیٹر بنا کر کھڑا کیا گیا تو میں نے تحریری طور پر احتجاج کیا کہ تجمل کی ایک دفعہ کی اتفاقیہ کامیابی پر مجھ سے یہ اعزاز چھینا جانا زیادتی ہے۔ اور یہ کہ میرے سابقہ ریکارڈ کی بناء پر مجھے ہی کلاس کا مانیٹر رہنے دیا جائے۔ لیکن میری اس درخواست کو رد کر دیا گیا۔ مانیٹر مقرر ہونے کے دسرے روز جب حاضری لیتے وقت اس نے میرا رول نمبر پکارا تو میں نے صرف YES کہنے پر اکتفا کیا۔ اس پر اس نے ایک لمحہ کے لئے مجھے گھور کر میری طرف دیکھا اور پھر سے حاضری لینے میں مصروف ہو گیا۔ آخری نمبر پکارنے کے بعد رجسٹر بند کرتے ہوئے اس نے مجھے مخاطب کیا۔

''مسٹر عزیز! آئندہ YES کے ساتھ SIR کہنا ہرگز نہ بھولئے گا۔''

میری قوت برداشت ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ احتجاج کے طور پر پیر پٹختا ہوا کلاس روم سے واک آؤٹ کر گیا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے مانیٹر بک میں میرا نام بلیک لسٹ میں لکھ دیا تھا۔ اور پھر دوسرے روز کلاس شروع ہوتے ہی ساری کلاس کے سامنے مجھے شدید سزا دی گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے اس قدر شدید سزا ملی۔ باون لڑکوں کی کلاس میں ماسٹر امان اللہ کے بید کی شڑاپ شڑاپ کے علاوہ دیگر کوئی آواز نہ سنائی دے رہی تھی۔ سزا خفت اور ندامت کی وجہ سے میں رو پڑا۔ اور ڈیسک پر دونوں ہاتھوں کے درمیان سر ڈالے میں سسک رہا تھا۔ رونے کی وجہ سے میری ہچکی بندھی ہوئی تھی۔ آج کلاس میں پڑھائی بھی نہیں ہوئی۔

مجھے سزا دینے کے بعد امان اللہ سر بھی تمام وقت اپنی کرسی پر خاموش بیٹھے رہے۔ پوری کلاس پر خاموشی طاری ہو چکی تھی۔ صرف میری ہچکیوں کی آواز سنی جا سکتی تھی۔ حتیٰ کہ پیریڈ ختم ہو گیا۔ لڑکے اپنی اپنی کتابیں سنبھال کر چلے گئے۔ کلاس خالی ہو چکی تھی لیکن میں بدستور ڈیسک پر سر رکھے ہچکیاں لے رہا تھا۔ مجھے اپنے بالوں میں کسی کی انگلیوں کی سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا وہ تجمل تھا۔ نفرت سے میں نے منہ پھیر لیا۔

''اب خدا کے لئے چپ ہو جاؤ۔ میں تم سے شرمندہ ہوں......!'' یہ تجمل کی آواز تھی۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم مجھے اپنا بھائی سمجھ کر معاف کر دو۔'' وہ دوبارہ بولا۔ میں اس دفعہ بھی خاموش ہی رہا۔

''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم اتنا FEEL کرو گے تو کبھی بھی ایسی کامیابی حاصل کرنے کی کوشش نہ کرتا۔''

میں نے محسوس کیا اس کے لہجہ میں اپنائیت اور ہمدردی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس نے اپنے انگوٹھوں کے پوروں سے میرے آنسو صاف کر دیئے۔ مجھے شانوں سے پکڑ کر اٹھا لیا اور گلے سے لگا لیا۔

''آج سے ہم نہ صرف دوست ہیں بلکہ بھائی بھی ہیں۔'' آواز یقیناً اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلی تھی۔ اور یہاں سے یوں ہماری بے مثال دوستی کا آغاز ہوا۔

تجمل اب بھی بدستور مانیٹر تھا۔ لیکن بس برائے نام! وہ بھری کلاس میں بار بار میری برتری کو تسلیم کرتا۔

اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا کہ وہ میرے تعاون ہی کی وجہ سے مانیٹری کرنے کا اہل ہے۔ ورنہ وہ شاید اس قابل نہیں۔ یہاں تک کہ ڈیڑھ ماہ بعد ہی اس نے امان اللہ سر کی خدمت میں درخواست پیش کردی کہ وہ چونکہ اپنی نسبت مجھے زیادہ اہل سمجھتا ہے اس لئے اس کے بجائے مجھے مانیٹر بنادیا جائے۔

اسٹاف روم میں ہماری طلبی ہوئی جہاں تجمل کی درخواست کا متن پڑھ کر سنایا گیا۔ ''نہیں سر ایسی کوئی بات نہیں یہ صرف مجھ سے دوستی کا حق نبھانا چاہتا ہے۔ ورنہ مانیٹر ہونے کا حق صرف اسی کا ہے۔'' میرا جواب تھا۔

امان اللہ سر اور مشتاق حسین (ہیڈ ماسٹر) دونوں ہی ہنس پڑے اور تجمل کو بدستور مانیٹر رہنا پڑا۔ اب ہم دونوں کا بیشتر وقت ایک ساتھ گزرتا کلاس روم اور کلاس روم سے باہر ہم اکٹھے ہی دیکھے جاتے۔ اسکول میں ہمیں لازم وملزوم کی سی حیثیت حاصل تھی۔ اسکول ٹائم ختم ہونے کے بعد میں اس کو اس کے گھر تک الوداع کہنے جاتا۔ اور اس کے بعد اپنے گھر واپس آتا۔ (حالانکہ اس طرح مجھے ایک میل کا چکر کاٹنا پڑتا) جونیئر کلاس کے اکثر لڑکے ہمیں آپس میں رشتہ دار اور بعض سگا بھائی تک سمجھنے لگے تھے۔ غرض یہ ہے کہ ہر آنے والا دن ہمیں ایک دوسرے کے قریب تر کرتا جارہا تھا اور یہیں سے ان واقعات نے جنم لینا شروع کیا جنہیں میں آپ کے سامنے پیش کرنے کے لئے بے چین ہوں۔

ایک روز جب میں تجمل کو چھوڑنے اس کے گھر کی طرف جارہا تھا تو تجمل نے یکبارگی مجھ سے پوچھا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ اس دفعہ امتحان میں اتنی نمایاں کامیابی میں نے کس طرح حاصل کی؟''

''اس میں معلوم کرنے کی کیا بات ہے۔؟ ظاہر ہے محنت کرکے!'' میں نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

''لیکن یہ بھی پتہ ہے کہ میں نے پڑھا کس سے؟''

''کس سے؟'' میں نے سرسری طور سے پوچھا۔

''غلام عباس سے!'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''کون غلام عباس؟'' میں نے استفسار کیا۔

''غلام عباس کو نہیں جانتے۔ بھئی اپنا کلاس فیلو!''

''تو کیا غلام عباس اتنا قابل ہے؟'' میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

''اور نہیں تو کیا!'' تجمل نے بھر پور لہجہ میں جواب دیا۔

''لیکن اس کے اپنے نمبر تو کبھی سیکنڈ ڈویژن سے بھی زیادہ نہیں آئے۔'' میں نے تمسخر آمیز لہجے میں کہا۔

''تمہیں شاید معلوم نہیں کہ وہ سات سوالوں میں سے صرف چار حل کرکے پرچہ دے آتا ہے۔'' اس نے کہا کہ یہ چار سوال بھی میں اس لئے حل کرتا ہوں کہ کہیں میرے والدین مجھ سے بالکل ہی مایوس نہ ہوجائیں۔'' ورنہ اس کا مقصد تعلیم حاصل کرنا ہے ہی نہیں۔''

''لیکن آخر یہ سب کچھ کیوں؟'' میری حیرت بڑھتی جارہی تھی۔

''وہ کہتا ہے کہ پڑھائی، نوکری یا کاروبار قسم کی کسی چیز سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور نہ آئندہ ہوگا۔ بلکہ کوئی خاص کام اس کی ذات سے انجام پذیر ہوگا۔ اور وہ غیر فانی قوتوں کا مالک کہلائیگا۔ وغیرہ وغیرہ۔''

''بس بس! زیادہ نہ پھینکو صرف اپنی کمزوری کو چھپانے کے لئے یہ من گھڑت بات اس نے سنادی ہے ورنہ قابلیت اس میں خاک بھی نہیں!'' میری حسد عود کر آئی تھی۔

تجمل بھی ہنس کر خاموش ہوگیا اور بات آئی گئی ہوگی۔

یہاں میں غلام عباس کے کچھ حالات بتاتا چلوں، تو آپ کو آئندہ کے واقعات کے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ غلام عباس غریب والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کا باپ کھسے (پنجابی جوتیاں) بنا کر اپنے اخراجات پورے کرتا تھا۔ اور اس کے قریبی رشتہ داروں

میں کوئی فرد ایسا نہیں دکھائی دیتا تھا جوان کی مالی اعانت کرتا ہو۔ غرض یہ کہ غلام عباس کے گھر کو ایک انتہائی غریب گھرانہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ اسکول میں ہم نے غلام عباس کو کسی کے ساتھ زیادہ بات چیت کرتے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ اکثر اکیلا رہتا۔ اور کچھ نہ کچھ سوچتا ہوا پایا جاتا۔ اسکول کے اکثر لڑکے اسے فلاسفر کہہ کر چھیڑتے تھے۔ لیکن غلام عباس کی گفتگو میں جتنی شائستگی، تہذیب، برد باری اور عمدہ الفاظ کا ذخیرہ ہوتا وہ اسکول کے کسی لڑکے میں نہ تھا۔ اس کو ہم نے کبھی اسکول کی کسی ACTIVITY یا کھیل میں حصہ نہیں لیتے دیکھا۔ وہ شاید مہینہ میں ایک بار سر کے بالوں میں تیل لگاتا اور ہمیشہ سفید شلوار اور سفید قمیض میں ملبوس نظر آتا تھا۔ میرے خیال میں دو ہزار لڑکوں کے اجتماع میں بھی وہ منفرد حیثیت کا حامل تھا اور اس کی وجہ اس کا وہ لاابالی پن تھا جس کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں۔

کہنے کو بات آئی گئی ہوگئی تھی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ تجمل کی بات میرے ذہن میں جم کر رہ گئی تھی اور اب میں خود بھی غلام عباس سے مل کر یہ اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ تجمل کی بات میں کس قدر صداقت ہے۔ اور پھر اسی دن شام کے کوئی ساڑھے پانچ کا عمل ہوگا۔ جب میں غلام عباس کے گھر دستک دے رہا تھا۔

''حاضر ہو رہا ہوں!'' اندر سے اس کی آواز آئی۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اس کی گفتگو تہذیب اور شائستگی سے پر ہوتی تھی۔ باہر آ کر مجھے پہچاننے میں اس نے دیر نہیں کی۔

''اوہو! آپ! اندر تشریف لائیے! آج آپ نے کیسے زحمت فرمائی۔'' وہ انتہائی انکساری سے بولا۔

کمرے میں ایک چارپائی ایک کرسی اور ایک چھوٹی سی میز رکھی تھی۔ ایک طرف کونے میں کچھ چمڑا اور جوتیاں بنانے کا سامان پڑا تھا۔ مجھے بیٹھا کر، وہ گھر میں چائے لینے کے لئے چلا گیا اور چند ہی لمحوں میں واپس آ گیا۔

''اب فرمائیے کیسے قدم رنجہ فرمایا آپ نے؟'' اس نے کہا۔

میں نے کہا۔ ''دیکھئے ایک تو آپ میرے آنے کو اتنی اہمیت نہ دیجئے کہ میں دوسری دفعہ آنے میں ہچکچاہٹ محسوس کروں۔ اور دوسری بات یہ کہ ہم آپس میں کلاس فیلو ہیں اور اس رشتہ سے ہمیں آپس میں بے تکلفی سے گفتگو کرنا چاہیے کیا خیال ہے آپ کا؟'' میں نے کہا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو عزیز میاں!'' وہ ایک دم بے تکلفی پر اتر آیا۔

''اور میں بھی تم سے بے تکلف ہونے میں کوئی امر مانع نہیں سمجھتا۔ جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ تم تجمل کے دوست ہو اور میں اس گلی کی مٹی سے بھی پیار کرتا ہوں جس پر سے تجمل گزرتا ہے!'' اس نے کہا۔

''لیکن اسکول میں تو میں نے کبھی تمہیں تجمل سے بات بھی کرتے نہیں دیکھا۔'' میں بھی بے تکلفی پر اتر آیا۔

''یقیناً نہیں دیکھا ہوگا۔ اسکول تو کیا اسکول سے باہر بھی میں نے اس سے بالمشافہ بات نہیں کی۔ لیکن تم میری بات کا یقین کرلو کہ میں جو بات بھی تجمل سے کرنا چاہتا ہوں یہیں بیٹھ کر کر لیتا ہوں۔ اور اسے بھی محسوس ہوگا کہ گویا اس نے مجھ سے اور میں نے اس سے بالمشافہ بات چیت کی ہے۔ میرا اور تجمل کا یہ رشتہ جسمانی نہیں روحانی ہے۔ اور اس رشتہ کو کوئی نہیں توڑ سکتا۔ میں تمہیں یہ باتیں بلا جھجک اس لئے بتا رہا ہوں کہ تم بھی اس راستہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتے۔ اور تم کیا خود تجمل بھی مجھے اس سے نہیں روک سکتا!'' اس کے چہرے پر کرب کے آثار پیدا ہو چلے تھے۔

میں نے غلام عباس کا موڈ بدلتے دیکھ کر بات بدلنے کی کوشش کی۔

''غلام عباس میں تمہیں کریدنے یا ذہنی کرب میں مبتلا کرنے نہیں آیا بلکہ میں تو یہ پوچھنے آیا تھا کہ تم نے تجمل کو امتحان کے لئے تیاری کروائی تھی۔ ہو سکے تو تھوڑا سا وقت میرے لئے بھی نکال لیا کرو۔''

اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔
"تم شاید بات بدلنے کی کوشش کررہے ہو۔ سنو عزیز الرحمٰن! میں نے تجمل کو کبھی بھی نہیں پڑھایا بلکہ جو بات سمجھانی چاہی یہیں سے بیٹھ کر سمجھادی۔ اور تجمل یہی سمجھتا رہے گا کہ میں اس کو باقاعدہ پڑھاتا رہا اب تمہیں میری باتوں پر یقین ہرگز نہیں آرہا ہوگا۔"
اس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"سوچ رہا ہوں کہ تمہاری باتوں پر یقین کروں یا نہ کروں!" میں نے جواب دیا۔
وہ بغیر کچھ کہے اندر گیا۔ واپسی پر اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں چائے دانی اور دو پیالیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے چائے دانی سے چائے انڈیلی۔ ایک پیالی مجھے دی اور دوسری خود تھام لی۔
"ہوں! تو تمہیں میری باتوں پر یقین نہیں آیا" مجھے خاموش دیکھ کر اس نے کہا۔
"تمہاری گھڑی میں کیا وقت ہوا ہے؟"
"سوا چھ!" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے جواب دیا۔
"دیکھو اب میں تجمل کے گھر جارہا ہوں۔" وہ چائے کی پیالی ٹرے میں رکھتا ہوا بولا۔
"کب؟" میں نے پوچھا۔
"ابھی اور اسی وقت جب کہ تم بھی یہیں رہو گے اور میں بھی یہیں رہوں گا۔ اور کل تجمل میری اس ملاقات کی تصدیق کردے گا۔ پھر تو تمہیں یقین آجائے گا!"
میں نے جواب میں صرف سر ہلادیا۔
اس نے اپنی آنکھیں بند کیں جیسے مراقبے میں چلا گیا ہو۔ تقریباً آدھے منٹ بعد اس کی آواز دور سے آتی سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔
"تجمل! باہر آؤ۔ غلام عباس آیا ہے۔ میں صرف یہ کہنے آیا تھا کہ آج عزیز الرحمٰن میرے پاس آیا تھا۔ دوستی کا ہاتھ بڑھانے، صرف اس لئے کہ وہ مجھ میں دلچسپی لینے لگا ہے۔ اسے میری ذات مشکوک معلوم ہونے لگی ہے۔ بس اب میں چلتا ہوں اجازت دو۔"
اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔
"اب کل تمہیں میری صداقت کا ثبوت مل جائے گا!" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ مجھے اس کی آنکھوں سے خوف سا محسوس ہونے لگا تھا۔
"گھر کی چائے میں مزہ نہیں آیا۔ چلو کسی ہوٹل میں چلتے ہیں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔
میں بلا پس وپیش اس کے ساتھ ہولیا۔ راستہ بھر میری اس سے بات نہ ہوئی۔ ہوٹل میں بیٹھ کر اس نے چائے کا آرڈر دیا۔ چائے آئی اور ہم خاموشی سے چائے پینے لگے۔ اب تک ہم دونوں میں سے کسی نے بھی کوئی بات نہ کی تھی۔ مسلسل خاموشی سے اکتا کر میں نے اس سے اجازت چاہی۔
"کیا ٹائم ہوا ہے؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔
"آٹھ بج کر بیس منٹ!" میں نے جواب دیا۔
"تم اس بات کے گواہ رہو کہ ساڑھے پانچ سے لے کر 8 بجکر 20 منٹ تک میں تمہارے ساتھ تھا۔"
جواب میں، میں نے گردن ہلادی۔ اور اس سے رخصت ہوگیا۔ اس تمام رات میرا دماغ الجھنوں میں گرفتار رہا۔ تمام وقت غلام عباس میرے دماغ میں گھومتا رہا۔
دوسرے روز صبح اسکول کے گیٹ پر ہی حسب معمول میری تجمل سے ملاقات ہوئی۔ اس نے چھوٹتے ہی مجھ سے سوال کیا۔
"کل غلام عباس کے پاس کیا کرنے گئے تھے؟"
"تمہیں کس نے بتایا؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔
"خود غلام عباس نے اور کس نے!" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
"کب؟" میری پیشانی پسینے سے تر ہوچکی تھی۔
"بھئی کل کوئی چھ ساڑھے چھ بجے وہ خود میرے گھر آیا تھا۔ کہنے لگا" آج عزیز الرحمٰن میرے پاس آیا تھا دوستی کا ہاتھ بڑھانے!"
میں گویا گرنے والا ہوگیا تھا۔ میرا رنگ زرد

ہوگیا تھا اور جسم پسینے میں بھیگ چکا تھا۔
تجمل میری حالت کو دیکھ کر یہ سمجھا کہ شاید شرمندگی کی وجہ سے میری ایسی حالت ہو رہی ہے۔ جھٹ سے بولا۔ ''بھئی اس میں کوئی برائی تھوڑی ہے۔ غلام عباس آخر ہمارا کلاس فیلو ہے۔ اگر تم اس سے ملنے چلے گئے تو کیا ہوگیا۔''
طوہاً وکرہاً میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ غلام عباس کی بات کی تصدیق ہو چکی تھی۔ اور اب مجھے مکمل یقین ہوگیا تھا کہ غلام عباس کے قبضہ میں کوئی پراسرار غیر مرئی قوت موجود ہے۔
بہر حال بات آئی گئی ہوگئی۔ اور میں غلام عباس اور تجمل دونوں سے کھچا کھچا رہنے لگا تھا۔ لیکن تجمل بدستور مجھ سے اسی طرح ملتا اور ہمیشہ محبت اور خلوص اس کی باتوں سے چھلکتا نظر آتا۔ دبے لفظوں میں اس نے کئی بار مجھ سے شکایت بھی کی کہ میرا رویہ اس کے ساتھ اب پہلے جیسا نہیں ہے۔ بہر حال وقت گزرتا رہا۔ حتیٰ کہ ہمارے ششماہی امتحانات سر پر آن پہنچے اور ہم ایک دفعہ پھر اپنی کتابوں میں گم ہوگئے۔
غلام عباس اب اسکول میں بہت کم دکھائی دیتا تھا۔ وہ کلاس سے کئی کئی روز غائب رہتا اور پھر کسی دن اچانک ہی کلاس میں آدھمکتا۔
میں دیکھ رہا تھا کہ غلام عباس اب پہلے کی نسبت کچھ کھویا کھویا سا رہتا اس کے بال اب زیادہ الجھے رہنے لگے تھے اور آنکھیں انگارے کی طرح سرخ رہنے لگی تھیں۔ میں اس سے دوبارہ تعلقات بڑھانے کا خیال بھی دل میں نہ لانا چاہتا تھا۔ کیونکہ میرے دل میں اس کا خوف سا بیٹھ گیا تھا۔ لیکن ایک روز جب کہ میں پلے گراؤنڈ میں پوئٹری کی کتاب کھولے بیٹھا تھا کہ اچانک ہی کسی طرف سے وہ آن دھمکا۔
''سناؤ عزیز میاں! کیا ہو رہا ہے؟'' وہ میرے قریب آتے ہوئے بولا۔
''کچھ نہیں بس ایسے ہی بیٹھا تھا۔''
جان چھڑانے کے لئے مختصر سا جواب دیا۔ وہ بے تکلفی سے میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔
''تم اس دن کے بعد پھر ملے ہی نہیں!'' اس نے پوچھا۔
''بس کچھ فرصت ہی نہیں مل سکی۔'' میں نے دوبارہ مختصر سا جواب دیا۔
اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بولا۔ ''نہ معلوم لوگ مجھے اتنا برا کیوں سمجھتے ہیں۔ حالانکہ میں نے کبھی کسی کے متعلق برا نہیں سوچا۔''
''تمہیں برا تو کوئی نہیں سمجھتا۔ البتہ پراسرار ضرور سمجھتے ہیں!'' میں نے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔
وہ کھوکھلی سی ہنسی ہنسا۔
''جب مجھے کوئی سمجھنے کی ہی کوشش نہیں کرتا تو یہ نتیجہ اخذ کر لینا کہ میں پراسرار ہوں، کہاں کا انصاف ہے؟'' اس کا لہجہ درد سے بھرپور تھا۔
''لیکن اس دن جو تم غائبانہ ہی تجمل سے ملاقات کرآئے تو وہ کیا کوئی کم پراسرار بات ہے؟'' میں نے اسے ٹٹولنے کے انداز میں پوچھا۔
وہ زیر لب مسکرایا اور بولا۔ ''یہ کوئی اسرار نہیں اس لئے کہ میں تجمل سے والہانہ لگاؤ رکھتا ہوں۔ اور اگر تم اس لگاؤ کو عشق کا نام بھی دے دو تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ مجھے بعض اوقات خود اپنی حرکات وسکنات پر شبہ گزرتا ہے کہ کہیں میں پاگل تو نہیں ہوگیا ہوں۔ مجھے اکثر محسوس ہوتا ہے کہ میرا جسم ہوا میں تحلیل ہوگیا ہے اور میری روح تجمل کے سر میں داخل ہوگئی ہے۔ اور میں بذات خود کچھ بھی نہیں!''
''اور تمہاری یہ حالت کب سے ہے؟'' اب میں اس کی باتوں میں دلچسپی لینے لگا تھا۔
''تقریباً ایک سال سے!'' وہ جیسے خواب میں بڑبڑا رہا تھا۔ ''میں مسلسل کئی دن اور کئی کئی راتیں جاگ کر گزار دیتا ہوں۔ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے عزیز! میری ہر سوچ کا دائرہ تجمل کے گرد گھومتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ ایسا کیوں ہے؟ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ یہ دیوانگی ضرور کوئی رنگ لاکر رہے گی۔''

''اگر جل لڑکی ہوتا تو تمہاری اس سے شادی ہوجاتی!'' میں اب شرارت کے موڈ میں آ چکا تھا۔
اس نے کڑی نظروں سے گھور کر مجھے دیکھا۔
''تمہاری غور وفکر کی حد ہی اتنی ہے اور شاید تم اس سے آگے سوچ بھی نہیں سکتے۔'' اس کا موڈ بالکل آف ہو چکا تھا۔ وہ یکدم اٹھا اور تیز تیز قدموں سے بیرونی گیٹ کی طرف بڑھتا چلا گیا۔
مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میری بات سے ناحق اس کے جذبات مجروح ہوئے تھے۔ مجھے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔ اور اسی لئے میں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ اب میں غلام عباس سے دوبارہ ملوں گا اور اس سے اپنی اس زیادتی کی معافی مانگ لوں گا۔ مجھے غلام عباس پر اب کچھ ترس سا آنے لگا تھا اور میں سوچنے لگا تھا کہ غلام عباس کے پاس اگر غیر مرئی طاقتیں موجود بھی ہیں تب بھی یہ شخص ان سے بجائے کوئی ناجائز کام لینے یا کسی کو تنگ کر کے صرف جل ہی کے بارے میں غور وفکر کرتا رہتا ہے۔
چنانچہ اسی شام میں غلام عباس کے گھر پہنچ گیا۔
''میں تم سے شرمندہ ہوں غلام عباس! صبح مجھ سے واقعی بڑی زیادتی ہوئی!'' میں نے اسے دیکھتے ہی دل کی بات کہہ ڈالی۔
''کوئی بات نہیں! کوئی بات نہیں!'' وہ اس طرح پر سکون تھا جیسے سمندر طغیانی آنے کے بعد پر سکون ہوجاتا ہے...... ''میں تمہاری بات کا برا مان ہی نہیں سکتا عزیز!'' وہ چار پائی پر بیٹھتے ہوا بولا۔ ''کیوں کہ تم جل کے دوست ہو اور مجھے تمہارے ملنے سے دلی راحت ہوتی ہے۔ بولو کیا پیو گے؟''
''کچھ نہیں!'' میں نے جواب دیا! ''میں جلدی جاؤنگا کیوں کہ تمہیں معلوم ہے، پرسوں سے امتحان شروع ہو رہے ہیں۔''
''تو خوب تیاری ہے نا!'' اس نے پوچھا۔
''کوئی خاص نہیں۔ بس گزارہ ہی سمجھو، ظاہر ہے کہ LEAD تو جل ہی کرے گا!'' میں نے اسے

بہادر، بزدل

☆ 1940ء میں چین میں چینی کا بحران آیا تو چینی قوم نے مل کر بائیکاٹ کیا۔
☆ دوسری جنگ عظیم میں جرمنی میں دودھ کا بحران آیا تو ان لوگوں نے دودھ پینا چھوڑ دیا۔
☆ اسرائیل کی حمایت کرنے پر عرب دنیا نے امریکہ کا تیل بند کردیا تو 60 فیصد امریکیوں نے پیدل چلنا شروع کردیا۔ چنانچہ شدید نقصان اٹھانا پڑا اور انہیں تیل دینا پڑا۔
☆ یو کے میں انڈوں اور سوڈان میں چاول کا بحران آیا تو وہاں کی عوام نے ان کا بائیکاٹ کیا اور ضرورت ہونے پر بھی دوسرے ملکوں سے نہیں لیا، نتیجہ یہ نکلا کہ سارے بحران ختم ہوگئے۔
☆ اور ایک ہم ہیں کہ پیٹرول 95 روپے منظور ہے، چینی 70 روپے وہ بھی منظور ہے۔ چاول 120 روپے منظور ہے دیگر اشیا بھی حکومت کے اضافی ٹیکس کے ساتھ قبول ہیں۔ شاعر مشرق نے بجا فرمایا ہے۔
خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا
(ایس امتیاز احمد۔ کراچی)

چھیڑنے کی کوشش کی۔ وہ کچھ بولا نہیں۔ میں نے دوبارہ بات چھیڑنے کی کوشش نہیں کی۔ مبادا کہ پھر بات بگڑ جائے۔

''کیا سوچنے لگے غلام عباس؟'' میں نے اس کی خاموشی سے اکتا کر کہا۔ اس کی یہ خاص عادت تھی کہ وہ بات کرتے کرتے ایک دم غائب ہو جاتا تھا۔

''کچھ نہیں!'' وہ جیسے چونک سا گیا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سلسلہ گفتگو کیسے جاری رکھا جائے۔ غلام عباس پھر گم ہو چکا تھا۔ ''سوائے تجمل کے ذکر کے یہ کسی اور بات میں دلچسپی نہیں لے گا۔'' میں نے سوچا۔

''کیا تجمل سے ملنے چل دیئے غلام عباس؟'' میں نے ہمت کر کے اسے چھیڑا۔ اس نے آہستہ سے مسکرا کر آنکھیں کھول دیں اور بولا۔ ''نہیں اب میں اس سے ملنے نہیں جاتا۔''

''کیوں؟'' میں نے آہستہ سے پوچھا۔

''اس لئے کہ اس سے میری تسلی نہیں ہوتی بلکہ آگ کچھ اور بھڑک جاتی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''بہرحال جب تم مجھے اس طرح چھیڑتے ہو عزیز! تو میں ایک عجیب سا لطف محسوس کرتا ہوں۔ تم یقین کرو میں تمہیں اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک یاد رکھوں گا، تمہاری باتیں میرے زخموں کے لئے مرہم کی حیثیت رکھتی ہیں۔''

''اچھا تو پھر اسی خوشی میں مجھے اجازت دو۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا ''کچھ پڑھائی وغیرہ بھی کرنی ہے۔'' وہ باہر گلی تک مجھے چھوڑنے آیا۔

''اچھا تو پھر خدا حافظ!'' اس نے مسکراتے ہوئے مجھ سے مصافحہ کیا۔ میں خوش تھا کہ میری باتوں سے اس کا موڈ خوشگوار ہو گیا تھا۔ اور صبح کی بات سے پیدا شدہ تلخی ختم ہو گئی تھی۔

ہمارے ششماہی امتحان شروع ہو چکے تھے۔ اور غلام عباس امتحان میں شریک نہیں ہو رہا تھا۔ وہ آج کل مسلسل اسکول سے غائب تھا اور اس کی غیر موجودگی کو میں محسوس کر رہا تھا۔ میں نے تجمل کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔

''غلام عباس کیوں امتحان نہیں دینے آ رہا!'' میں نے ایک روز تجمل سے پوچھ ہی لیا۔

''کیا پتہ بھئی اس کی وہی جانے!'' اس کا رویہ بالکل سرد تھا۔ ''تو کیا تمہارے اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔'' میں نے پوچھا۔

''نہیں!'' اس نے انتہائی مختصر جواب دیا۔ اس کے انداز گفتگو سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس موضوع سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔

''لیکن پہلے تو تم اس کی بہت تعریفیں کیا کرتے تھے۔'' میں کہنے سے نہ رہ سکا۔

''کیا کرتا تھا لیکن اب نہیں کرتا!'' وہ منہ سکیڑ کر بولا۔ ''کیوں اب کیا ہو گیا ہے؟'' میں نے پھر پوچھا۔

''کیوں کہ میں نے سنا ہے کہ وہ میرے متعلق بہت کچھ اول فول بکتا رہتا ہے۔''

''مثلاً کیا؟'' میں نے اسے مزید کریدنے کی کوشش کی۔

''مثلاً یہی کہ اس کی روح میرے جسم میں سرائیت کر جاتی ہے۔ اور یہ کہ وہ مجھ سے عشق حقیقی کرتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ اور اسی قسم کی اور بہت سی بکواس۔'' اس نے ناک بھنوں چڑھا کر کہا تو میں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ اس گفتگو کو مزید طول دینے کی بجائے پھر کسی وقت کے لئے اٹھا رکھنا چاہیے۔

مجھے خاموش ہوتا دیکھ کر اس نے خود ہی بات کا رخ بدل دیا۔

''تمہارا آج کا پیپر کیسا ہوا؟'' اس نے پوچھا۔

''ٹھیک ہی ہو گا!'' میں نے جواب دیا۔

''اپنے دماغ سے غلام عباس کے خیال کو نکال پھینکو، کہیں فیل ہی نہ ہو جانا!'' اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا۔

اس کی اس حرکت پر مجھے خود ہنسی آ گئی۔ اس نے مجھے نارنگیاں کھانے کی دعوت دی۔ نارنگیاں وہ شوق سے کھاتا تھا، اور ہم اپنے موڈ کو مزید خوش گوار

بنانے کے لئے نارنگیاں کھانے چل دیئے۔

وقتی طور پر واقعی غلام عباس کا خیال ہمارے ذہن سے نکل گیا تھا۔ لیکن اسی روز شام کے وقت غلام عباس اچانک میرے گھر آن دھمکا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ غلام عباس میرے گھر آیا تھا۔ اس کی میرے ساتھ اب خاصی بے تکلفی ہوچکی تھی۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے آتے ہی مجھ سے سوال کیا۔

''امتحان ہو رہے ہیں!'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''لیکن تم امتحان میں کیوں شریک نہیں ہوئے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس ایسے ہی دل نہیں چاہا۔'' اس نے لاپرواہی سے سر جھٹکا۔ ''ایک بات بتاؤں۔'' وہ قدرے توقف سے مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میرے والدین میرے مستقبل سے اب بالکل مایوس ہوچکے ہیں۔ اور ان کے خیال میں میرے سدھرنے کا ایک ہی راستہ رہ گیا ہے اور وہ یہ کہ میری شادی کردی جائے۔''

''خیال تو بہت حسین ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''لیکن سوال تو یہ ہے کہ جس غریب کی قسمت وہ میرے ساتھ پھوڑنا چاہتے ہیں، اس کے مستقبل کا کیا ہوگا؟'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''تو کیا واقعی معاملہ اس حد تک SERIOUS ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''بالکل! بلکہ یہاں تک کہ میری دور کی ایک رشتہ دار لڑکی کے لئے رشتہ بھی بھیجا جاچکا ہے۔ اور تعجب اس بات کا ہے کہ لڑکی والوں کی طرف سے بھی تقریباً نیم رضا مندی کا اظہار ہوگیا ہے۔ بس معاملہ طے پایا ہی سمجھو!'' اس نے جواب دیا۔

''مقدر کے تم بہت دھنی نکلے ! بہت جلدی میدان مارلیا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

وہ تقریباً میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن آج میں نے بھی اپنے والد کے سامنے یہ بات پیش کردی۔ کہ وہ لڑکی برائے نام میری بیوی ہوگی۔ اس کی حیثیت میرے لئے ایک واقف کار سے زیادہ نہ رہے گی۔ اور اس کو تجمل کی آمد ورفت پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔''

میں اس کی اس بات پر گم صم رہ گیا۔ ''اور جانتے ہو اس کا ردعمل کیا ہوا؟'' وہ خود ہی بولا۔

''کیا ہوا؟'' میں نے بہت آہستہ سے پوچھا۔

''میرے والد نے اسی وقت دھکے دے کر مجھے گھر سے نکال دیا۔'' اس نے زہر خند مسکراہٹ سے جواب دیا۔

''تمہیں اپنے والد سے فوراً معافی مانگنی چاہیے۔ تمہاری یہ بات ایسی ہے کہ اسے تمہارے والد تو کیا کوئی بھی برداشت نہیں کرسکتا۔'' مجھے اب یہ خدشہ لاحق ہو رہا تھا کہ اب کہیں غلام عباس میرے گھر رہنے کا ہی مطالبہ نہ کربیٹھے۔ اس لئے اب میں اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔

''تو کیا تم میری صاف گوئی کی داد نہ دوگے۔ میں شادی ہونے کے بعد بھی تو یہی سب کچھ کرسکتا تھا۔ اس وقت کوئی کیا کرلیتا۔'' اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''بہر حال معاف کرنا، میں تمہاری اس بات کی کوئی داد نہیں دے سکتا۔ میرے خیال میں تمہاری بات اس قابل نہیں کہ اس کی تعریف کی جائے۔'' میں نے دو ٹوک جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے کوئی بھی نہیں سمجھ سکا تم کیا سمجھو گے!''

اس بات کو تقریباً ڈیڑھ مہینہ گزر گیا۔ اس دوران میں غلام عباس اسکول یا اسکول سے باہر کہیں دکھائی نہیں دیا۔ اسکول سے اس کا نام خارج ہوچکا تھا۔ اور تجمل اس کے غائب ہونے کی وجہ سے خاصا مطمئن رہنے لگا تھا۔ ورنہ اسے ہردم اپنی تذلیل کا خدشہ لاحق رہتا تھا۔

میں آپ کو یہ بتانا بھول ہی گیا کہ اس دوران ہمارے ششماہی امتحانات کا نتیجہ برآمد ہوچکا تھا۔ اور اب چونکہ میری اور تجمل کی چپقلش ختم ہوچکی تھی۔ اس لئے ہم دونوں کی اس غفلت سے فائدہ اٹھا کر ہمارے

گنجان علاقے میں غلام عباس کا گھر ڈھونڈ سکوں گا۔ مگر اس علاقے میں داخل ہوتے ہی میں نے جس پہلے شخص سے غلام عباس کا پتہ پوچھا، تو وہ فوراً اس کے گھر تک میری رہنمائی کرنے پر تیار ہوگیا۔

''غلام عباس سے کام ہے بابو جی!'' اس نے راستہ میں مجھ سے پوچھا۔

''ایسے ہی دوست ہے۔ ملنا ہے صرف!'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔

''اگر آپ کا دوست ہے تو میرا ایک کام کرا دیجئے۔ ایک نمبر تو پوچھ دیجئے!'' اس نے عاجزانہ لہجے میں مجھ سے درخواست کی۔

''کیسا نمبر؟'' میں نے مصنوعی حیرانی سے پوچھا۔ کیا غلام عباس کوئی نمبر وغیرہ بھی بتاتا ہے!

''اجی صاحب! وہ کیا نہیں بتاتا۔ سٹے کا نمبر، ریس کا گھوڑا، دکھ تکلیف، بیماری کا علاج، لڑکا ہوگا یا لڑکی، پاس ہوگا یا فیل۔ ہر مرض کا علاج ہے اس کے پاس لیکن بتاتا اپنی مرضی سے ہے۔ طبیعت آئی تو بتا دیا، ورنہ جھڑک دیا!''

اب میں واقعی حیرانی سے اس اجنبی شخص کی باتوں میں دلچسپی لے رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ غلام عباس کیا سے کیا ہوگیا۔ اس ادھیڑ بن میں ہم غلام عباس کی جھونپڑی تک پہنچ گئے۔

''لیجئے صاحب! یہ رہا غلام عباس کا گھر۔'' اس نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بتلایا ''میری بات نہ بھولئے گا۔'' اس نے سرگوشی کی اور میں جواب میں سر ہلاتا ہوا غلام عباس کی کٹیا میں داخل ہوگیا۔ اندر غلام عباس فرش پر آلتی پالتی مارے کسی خیال میں گم بیٹھا تھا۔ میرے پیروں کی آہٹ سن کر وہ چونکا۔

''ارے آؤ بھئی۔ خوب آئے، گھر ڈھونڈنے میں کوئی دشواری تو نہیں ہوئی۔'' اس نے کھڑے ہوکر میرا استقبال کرتے ہوئے پوچھا۔

''بالکل تکلیف نہیں ہوئی۔ تم تو اس علاقے میں بہت مشہور و معروف ہو، پہلے ہی شخص سے میں نے تمہارا پوچھا تو اس نے یہاں تک پہنچا دیا۔'' میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

''تمہارے کل کے دیئے ہوئے سو روپوں کے پانچ ہزار روپے بن گئے ہیں، وہ بے تابشیر خانساماں اس کے پاس ہیں، میں دانستہ نہیں لایا کل لیتا آؤں گا!'' میں نے گویا اسے رپورٹ پیش کی۔

''مجھے ان پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔ اس میں سے 1000 روپے لے کر اس گھوڑے پر لگا دو۔'' اس نے ایک چھوٹی سی پرچی پر کچھ لکھ کر دیا۔ میں نے دیکھا پرچی پر ''پرنس آف سرنیہ'' لکھا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد میں اٹھ آیا۔ باہر وہی شخص میرا منتظر تھا جس نے غلام عباس کے گھر تک میری رہنمائی کی تھی۔

مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف لپکا۔ ''کیوں بابو جی کچھ بتایا۔'' میں نے وہی پرچی اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے پرچی دیکھ کر واپس لوٹاتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''صاحب! گھوڑے کا نہیں، مجھے تو سٹے کا نمبر چاہئے، گھوڑے پر لگانے کے لئے اتنے پیسے کہاں سے لاؤں گا۔'' وہ منہ بسورتے ہوئے بولا۔

''اچھا اچھا اب دوبارہ آؤں گا تو سٹے کا نمبر بھی پتہ کردوں گا!'' میں نے اس کی آس بندھائی۔ لیکن میرے جواب سے شاید وہ مطمئن نہ ہوسکا تھا۔ بغیر کچھ کہے ایک طرف کو مڑ گیا۔

''شکر ہے پیچھا چھوٹا!'' میں نے دل میں کہا، گھر پہنچ کر سب سے پہلے میں نے بشیر خانساماں سے روپے لئے۔ میں اس دفعہ ایک ہزار روپے خود اپنے ہاتھوں سے گھوڑے پر کھیلنا چاہتا تھا۔

اس سے پیشتر کبھی میں نے ریس کورس کی شکل بھی نہ دیکھی تھی۔ ریس کورس میں افراتفری کا ایک عجیب عالم تھا۔ عورتوں اور مردوں کی ایک بھرمار تھی۔ کھوے سے کھوا چھلا جاتا تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر داؤ لگا رہے تھے۔ غلام عباس کے بتلائے ہوئے گھوڑے پر میں نے بھی =/1000 روپے لگا دیئے۔ ریس شروع ہوئی غلام عباس کا بتلایا ہوا گھوڑا سب سے

آگے چلا آ رہا تھا۔ ریس ختم ہوئی تو میں جیت چکا تھا اور دس ہزار روپے کے کرکراتے ہوئے نوٹ میرے ہاتھ میں تھے۔

ٹیکسی لے کر میں سیدھا غلام عباس کے ٹھکانے پر پہنچا اس کے گھر کے سامنے پانچ چھ حاجت مند قسم کے مرد اور عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ غلام عباس نے بیٹھتے ہی مجھے دیکھا۔ میرا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

''جیت گئے ہو؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے اقرار میں سر ہلایا۔

''تو پھر جاؤ اور جا کر عیش کرو۔ اور جب ختم ہونے کو آئیں تو پھر میرے پاس چلے آنا!'' وہ ایسے بول رہا تھا جیسے کوئی بہت بڑا ابزرگ مجھ سے مخاطب ہو۔

''پانچ سو روپے سامنے بیٹھی اس بڑھیا کو دیدو ضرورت مند ہے بے چاری۔'' اس نے بڑھیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

پانچ سو روپے بڑھیا کو دے کر میں الٹے پاؤں واپس لوٹ آیا۔ سچ پوچھیے تو مجھے غلام عباس کا یہ انداز بالکل ہی نہ بھایا تھا۔ چند دن تک میں مصروفیت کی بناء پر غلام عباس کی طرف نہ جا سکا۔ اس دوران ہمارے سالانہ امتحان بھی سر پر آن پہنچے اور میں ایک دفعہ پھر اپنی کورس کی کتابوں میں گم ہو گیا۔ امتحانات کی تیاری اور امتحان دینے میں ڈیڑھ ماہ کا عرصہ بیت گیا۔ اس دوران میں، میں غلام عباس کی طرف سے بالکل غافل رہا۔ امتحانات سے فراغت کے بعد ہر طالب علم کی طرح میرا زیادہ وقت نمازیں پڑھنے اور پاس ہونے کی دعائیں مانگنے میں صرف ہونے لگا تھا۔

ایک روز بیٹھے بیٹھے مجھے خود ہی خیال آیا کہ غلام عباس کے پاس تو پاس اور فیل کا پوچھنے والے بھی آتے ہیں۔ کیوں نہ اس سے ملا جائے۔ میں نے جب تجمل سے اپنے خیال کا اظہار کیا تو خلاف توقع تجمل نے بھی میرے ساتھ چلنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ دراصل میرے خیال میں ہر طالب علم کی کمزوری اس کے امتحان کا ریزلٹ ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ تجمل فوراً ہی میرے ساتھ چلنے پر رضامند ہو گیا۔

جس وقت ہم غلام عباس کے گھر پہنچے، اس کے گھر کے سامنے باقاعدہ ایک بھیڑ سی لگی ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس دوران میں غلام عباس کی شہرت کافی پھیل گئی تھی۔ حاجتمندوں کی اس بھیڑ میں زیادہ تعداد ہم جیسے طالب علموں کی تھی، جن کو ہماری ہی طرح میٹرک کے ریزلٹ کا انتظار تھا۔ غلام عباس نے ہمیں دیکھتے ہی باقی سب لوگوں کو اپنی کٹیا سے باہر نکال دیا۔ تجمل کو میرے ساتھ دیکھ کر اس پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی تھی جس کا اظہار الفاظ کے ذریعے مشکل ہے۔ اس کا سیاہی مائل رنگ گلابی ہو گیا تھا اور ہونٹوں پر جیسے کپکپاہٹ طاری ہو گئی۔

''آؤ! آؤ! آج کیسے بھول پڑے؟ امتحان کا نتیجہ تو معلوم کرنے نہیں آئے کہیں!'' وہ زیر لب مسکرا کر جلدی جلدی بولا۔

''بات تو کچھ ایسی ہے!'' میں نے جواب دیا۔

''تم دونوں کو کون فیل کر سکتا ہے۔ بس جاؤ اور جا کر کالج میں داخلہ لینے کی تیاری کرو۔'' اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا جیسے کوئی شفیق باپ اپنی اولاد سے مخاطب ہو۔

''لیکن غلام عباس بھائی! کچھ پیسوں کی بھی ضرورت ہے نا!'' میں نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔ وہ زور سے کھلکھلا کر ہنسا اور ایک پرچی پر کچھ لکھ کر مجھے پکڑا دیا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ گھوڑے کا نام ہے۔

''تجمل کو نہیں دو گے؟'' میری شرارت کی رگ پھر پھڑ پھڑائی۔

اس نے ایک لمحہ کے لئے تجمل کو اتنے پیار بھری نظروں سے دیکھا کہ تجمل کو جھرجھری سی آ گئی۔

''تجمل کی خوشی میری زندگی کی سب سے اہم خواہش ہے۔ اس کے سر پر کبھی مایوسی کے بادل نہ منڈلائیں گے۔ اس کی زندگی سنوارنے کے لئے میں نے اپنی زندگی جو بگاڑ لی ہے!''

اس کی آواز جیسے کہیں دور سے آتی سنائی دے

رہی تھی اور اس وقت وہ مجھے کوئی محبت اور خلوص کا دیوتا معلوم ہو رہا تھا۔

تجمل نے میرا ہاتھ دبا کر مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے بھی یہ سوچ کر کہ تجمل کوئی ایسی ویسی بات نہ کہہ ڈالے، اٹھنا ہی مناسب سمجھا۔ غلام عباس نے بھی ہمیں روکنے کی کوشش نہ کی۔ البتہ کٹیا کے دروازے تک چھوڑنے ضرور آیا۔

وقت تیزی سے پر لگا کر اڑتا رہا۔ حتیٰ کہ ہم اسکول کی چہار دیواری سے نکل کر کالج کی آزاد فضاؤں میں داخل ہوگئے۔ غلام عباس سے میں ''حسب ضرورت ملتا رہتا۔ اور اسی کی پیشین گوئیوں'' کی وجہ تھی کہ میں تھوڑے ہی عرصہ میں پورے کالج میں شاہ خرچ مشہور ہوگیا۔ کالج کے کسی بھی لڑکے کی نسبت میرا کینٹین کا بل زیادہ بنتا اور ہر لڑکے کی چائے پانی سے خاطر تواضع کرنا میرے لئے گویا ایک عام سی بات تھی۔ ریس اور سٹے سے مجھے اتنی معقول آمدنی ہوتی کہ ضرورت سے کہیں زیادہ خرچ کرنے کے باوجود بھی جیب میں ہمیشہ دو چار سو پڑے ہی رہتے تھے۔

تجمل گو بذات خود کبھی غلام عباس کے پاس نہ جاتا۔ لیکن میری اس ناجائز کمائی میں وہ برابر کا شریک ہوتا تھا۔ اور اسی دوران ایک ایسا واقعہ ہوا جس سے تجمل کی شہرت کو ایک دم چار چاند لگ گئے۔ ہوا یہ کہ ہمارے ایک غریب سے کلاس فیلو کا نام بوجہ فیس داخل نہ کرنے کے خارج ہوا چاہتا تھا کہ تجمل نے بروقت اس کی طرف واجب الادا تین ماہ کی فیس اپنی گرہ سے ادا کردی۔ اور اس واقعہ نے پروفیسروں اور دوسرے لوگوں کی نظر میں تجمل کی عزت ایک دم کئی گنا بڑھادی۔ تجمل اب کالج میں اس قدر مقبول ہو چکا تھا کہ یونین کے انتخابات میں بھی وہ بلا مقابلہ سیکریٹری منتخب ہوگیا۔

اپنی باتوں میں میں آپ کو یہ بتانا بھول ہی گیا کہ اس عرصہ میں غلام عباس اس قدر مشہور ہو چکا تھا کہ اب حاجتمندوں کے جتھے کے جتھے ہر وقت اس کے گھر کا گھیراؤ کئے رہتے تھے۔ غلام عباس کے منہ سے نکلی ہوئی بات کو لوگ اس طرح پلو میں باندھ لیتے گویا یہی بات ان کی پریشانیوں کو ختم کرنیکا ذریعہ ہو۔ اب غلام عباس ہر غریب آدمی پر ہر وقت مہربان رہتا تھا۔ شاید غریبوں سے اس کی ہمدردی کی بنیادی وجہ اس کا خود پیدائشی طور پر غریب ہونا تھا۔ بہر حال گردونواح کے علاقوں کے تمام لوگوں کا وہ ہیرو تھا اور یہ حقیقت ہے کہ لوگ اس سے بھرپور محبت بھی کرتے تھے۔

اور پھر اچانک ایک ایسا اندوہناک حادثہ وقوع پذیر ہوا کہ اس کہانی کے تمام ہنستے کھیلتے کردار ایک دم غم کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گئے۔

وہ موسم سرما کی ایک خوشنما سی دوپہر تھی جب میں اور تجمل خوش گپیاں کرتے ہوئے کالج سے واپس گھر کی طرف آرہے تھے کہ اچانک کیلے کے ایک چھلکے پر سے تجمل کا پیر پھسلا اور تجمل سڑک پر جا پڑا۔ تیز رفتاری سے آتی ہوئی کار کی بریکیں لگنے کی آواز سنائی دی۔ اور بریک کی چیخوں میں تجمل کی چیخیں مدغم ہوگئیں۔ چند لمحے پیشتر کا ہنستا مسکراتا اور کھلکھلاتا ہوا تجمل خون میں لت پت بے حس و حرکت پڑا تھا۔

دہشت غم سے مجھ پر سکتہ کا عالم طاری ہوگیا۔ کب پولیس آئی اور کب تجمل کی لاش کو لے گئی۔ مجھے کچھ علم نہیں۔

چند روز کے بعد غم و اندوہ کی تصویر بنا جب میں غلام عباس کو یہ روح فرسا خبر سنانے کے لئے گیا تو یہ سن کر مجھ پر غم و حیرت کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا کہ عین اسی روز جس دن تجمل نے زندگی کا ساتھ چھوڑا، اسی دن غلام عباس کا بھی انتقال ہوگیا اور عینی شاہدوں کے بیان کردہ وقت کے مطابق میں نے سوچا، اس کی موت ٹھیک اسی وقت واقع ہوئی تھی جس وقت تجمل نے دم توڑا تھا۔

مرتے وقت اس کے لبوں سے صرف یہی فقرہ سنا گیا۔

''جب وہ نہیں رہا تو ہم جی کر کیا کریں گے!''





حاضرات

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

اچانک اندھیرے کمرے میں کسی کی تیز سرسراتی ہوئی غصہ سے بھری ہوئی آواز ابھری کہ اب وقت آگیا ہے پھر کسی کی درد ناک کربناک اور دلدوز آواز نے سارا سحر توڑ دیا، اور جب منظر سامنے آیا تو......

کیا یہ حقیقت ہے کہ روحیں باتیں کرتی ہیں، اگر شک ہے تو یہ کہانی ضرور پڑھیں، ثبوت کہانی میں ہے

مارگی نے ایک گہری سانس لی اور کمرے سے اٹھ کر باہر دالان میں آگئی، وہ اپنے نام کی روح سے باتیں کرنے میں ناکام رہی تھی۔ جب کہ مسز ڈیوی کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ پہلی ہی نشست میں روحوں سے بات کرا دیتی ہے۔

مسز ڈیوی شہر کی مشہور ترین حاضرات کی حامل تھی۔ لڑکیاں اور عورتیں اپنے مرحوم دوستوں اور رشتہ داروں کی روحوں سے باتیں کرنے کے لئے مسز ڈیوی کی خدمات حاصل کیا کرتی تھیں۔

مسز ڈیوی روحوں کو بلانے کا عمل اپنے کمرے میں کیا کرتی تھی۔ یہ کمرہ نیم تاریک اور ٹھنڈا تھا۔ لڑکیاں چاروں طرف یوگا کے انداز میں فرش پر بیٹھ جاتیں۔ درمیان میں ایک موم بتی روشن کردی جاتی۔ کھڑکی اور دروازے بند کردیئے جاتے۔ مسز ڈیوی خود ایک کرسی

پر بیٹھ جاتی اور عمل شروع ہو جاتا۔
مسز ڈیوی ایسے موقعوں پر سر سے پاؤں تک ایک سیاہ چغہ پہنے رہتی۔ وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتی اور حلقے میں شریک کسی لڑکی کے کسی دوست کی جانی پہچانی آواز مسز ڈیوی کے ہونٹوں سے نکلنے لگتی۔
لیکن مارگی کے ساتھ ابھی تک کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ اسی لئے وہ اکتا کر باہر آ گئی۔
وہ اس حلقے میں اس لئے شریک ہوئی تھی کہ اسے اپنے نام کی روح سے ملنا تھا۔ اس سے باتیں کرنی تھیں۔
باہر تیز بارش ہو رہی تھی وہ دالان میں کھڑی ہو کر سیاہ امڈتے بادلوں کو دیکھنے لگی۔ کسی نے پیچھے سے آ کر اس کی پشت پر ہاتھ رکھ دیا تو وہ بے ساختہ چونک پڑی۔
مسز ڈیوی اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ''کیا بات ہے؟ تم کمرے سے باہر کیوں آ گئیں؟'' مسز ڈیوی نے سوال کیا۔
''مسز ڈیوی مجھے ناکامی ہوئی ہے۔'' مارگی نے اداسی سے جواب دیا۔
''کیا تمہیں کوئی پیغام نہیں ملا؟''
''نہیں۔''
''مجھے خود نہیں معلوم کہ کون کون سی روحیں میری زبان سے اپنا پیغام دیتی ہیں۔ اس وقت مجھے کچھ ہوش نہیں رہتا۔ میں کسی اور دنیا میں ہوتی ہوں۔'' مسز ڈیوی نے کہا۔
''لیکن میں کیا کروں؟'' مارگی نے سوال کیا۔
''کیا تمہیں کسی خاص شخص کے پیغام کا انتظار ہے؟''
''ہاں...... بہت ہی خاص......'' مارگی نے دھیرے سے جواب دیا۔
''پھر تم ایسا کرو کہ اس حلقے میں پابندی سے شریک ہوتی رہو، آج چونکہ تمہارا پہلا دن تھا اس لئے تم پوری توجہ نہیں دے سکی ہو گی۔ بہت سی لڑکیاں تو چار پانچ نشستوں تک ناکام ہی رہتی ہیں۔''
''ہو سکتا ہے......'' مارگی نے جواب دیا۔ ''بہر حال میں یہاں پابندی سے آتی رہوں گی۔''
''تمہیں کس کے پیغام کا انتظار ہے؟'' مسز ڈیوی نے پھر پوچھا۔
''اپنے بھائی کے پیغام کا پچھلے سال اس کا انتقال ہو گیا تھا۔''
''ہوں......'' مسز ڈیوی زیر لب مسکرا دی۔ ''پتہ نہیں یہ لڑکیاں اپنے عاشقوں کا نام کیوں نہیں لیتی ہیں؟ ہمیشہ کسی نہ کسی بھائی یا بہن کی کہانیاں سنائیں گی۔''
مسز ڈیوی نے دل ہی دل میں سوچا۔ مارگی اب دوبارہ بادلوں کو دیکھنے لگی تھی۔
''لڑکی کیا اس کا انتقال کسی حادثے میں ہوا تھا؟''
مسز ڈیوی نے سرسراتی ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔
مارگی پھر چونک پڑی۔ اس نے دوبارہ مسز ڈیوی کی طرف دیکھا جس کی چمکتی ہوئی آنکھیں مارگی کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔
''ہاں......'' مارگی نے جواب دیا۔ ''وہ کالے لوگوں کو ناپسند کرتا تھا۔''
''اچھا اچھا۔ میں سب سمجھ گئی۔'' مسز ڈیوی نے اپنا سر ہلایا۔ ''اب زیادہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے اردگرد ایسے بے شمار لوگ ہیں جو رنگ دار لوگوں کو پسند نہیں کرتے۔ اور جب وہ مر جاتے ہیں تو ان کی روحیں مجھ سے آ کر کہتی ہیں کہ انہیں ایسی جگہ رکھا گیا ہے جو بہت دلکش اور سرسبز ہے اور جہاں بدصورتی کا کوئی وجود نہیں ہے۔''
مارگی نے اس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے مسز ڈیوی کی طرف دیکھتی رہی۔
حلقے میں شریک ہونے والی لڑکیاں اب باہر دالان میں بارش بند ہونے کا انتظار کر رہی تھیں۔
مسز ڈیوی نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا اور جلدی سے بولی۔ ''اب تم گھر جاؤ۔ چار بج گئے ہیں۔ لڑکیوں کا دوسرا گروپ آنے والا ہو گا۔ جب تک میں آرام کر لیتی ہوں۔ اور ہاں تم اگلے سنیچر کی شام کو ضرور آنا۔ سمجھیں۔''

مارگی نے سرہلایا اور مسز ڈیوی اپنے سیاہ چغے کو سنبھالتی ہوئی کمرے کے اندر چلی گئی۔ بارش اب بند ہوگئی تھی لڑکیوں کا دوسرا گروپ دالان کی طرف آرہا تھا۔

مارگی نے آنے والی لڑکیوں کو دیکھ کر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپایا اور تیزی سے چلتی ہوئی دالان کے دوسرے سرے کی طرف چلی گئی۔

آنے والے گروپ میں دولڑکیاں ایسی تھیں جو اسے اچھی طرح پہچانتی تھیں۔ وہ دونوں لڑکیاں جب کمرے کے اندر چلی گئیں تو مارگی باہر آگئی۔

دوسرے سنیچر کی شام جب وہ مسز ڈیوی کے پاس پہنچی تو مسز ڈیوی اسے فوراً پہچان گئی۔ اس نے مارگی کو اپنی کرسی کے قریب ہی بیٹھنے کا اشارہ کیا اور موم بتی روشن کرکے درمیان میں رکھ دی۔

پھر جب لڑکیاں ایک حلقے میں بیٹھ چکیں تو حاضرات کا عمل شروع کردیا گیا۔

حسب معمول مسز ڈیوی کی آنکھیں بند ہوئیں۔ اس کی گردن ایک طرف ڈھلکی اور اس کے سارے جسم پر کپکپی سی طاری ہوگئی۔

پھر لڑکیوں کو پیغامات ملنے لگے، روحیں لڑکیوں سے ہم کلام ہوتی رہیں اور مارگی اداسی سے یہ سب سنتی رہی۔ ٹام ابھی تک وہاں نہیں آیا تھا۔

پھر اچانک کچھ ہوا۔

ایک اجنبی آواز کمرے میں ابھری اور مارگی کا سارا بدن سنسنانے لگا۔ اس کے ہاتھ پاؤں برف کی طرح ٹھنڈے ہوگئے تھے، یہ دور سے آتی ہوئی آواز ٹام کی تھی جو اسے پکار رہی تھی۔

"مارگی۔ مارگی۔"

"ٹام میں یہاں ہوں۔" مارگی بے ساختہ چلا پڑی۔ اس کے ساتھ مسز ڈیوی نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ کمرے میں روشنی ہوگئی اور حلقہ ختم ہوچکا تھا۔

مارگی بری طرح کپکپا رہی تھی۔

مسز ڈیوی نے اس کے شانے پر تھپکی دی۔ "مبارک ہو۔ تمہیں دوسری دنیا سے پیغام مل ہی گیا۔"

مارگی نے اپنی آنکھیں کھولیں اور تیزی سے بولی۔ "مسز ڈیوی یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی میں تو اس سے کچھ نہیں کہہ سکی۔"

"پہلی بار ایسا ہی ہوتا ہے۔" مسز ڈیوی نے جواب دیا۔ "اس کے بعد آہستہ آہستہ تمہیں مشق ہوجائے گی۔ تیسری یا چوتھی نشست میں تم مرنے والے کی روح سے باقاعدہ گفتگو کرسکوگی۔"

اب مارگی نے ٹام کی آواز سن لی تھی۔ اسے مسز ڈیوی کے حلقے پر یقین آگیا تھا۔ اس کے بعد وہ ہر سنیچر کی شام کو وہاں پابندی سے شریک ہوتی رہی۔ اس دوران ٹام کی روح اس سے اور زیادہ قریب آگئی تھی۔ اس روح نے اس سے بہت سی باتیں کیں۔ ایسی باتیں جنہیں صرف مارگی نے سنا تھا۔ مسز ڈیوی یا حلقے کی کسی لڑکی کو ٹام کی آواز نہیں سنائی دی تھی۔

اور ہر مرتبہ ٹام کی روح نے اس سے یہ کہا تھا کہ "اسے مارگی سے کوئی کام لینا ہے۔" لیکن مارگی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ ٹام اس سے کیا کام لینا چاہتا ہے؟

اب مارگی کی زندگی میں ایک تبدیلی آگئی تھی۔ ایک عجیب سا احساس ہر وقت اسے گھیرے رہتا وہ ایک جیتی جاگتی لڑکی تھی، بھرے پرے شہر میں ہزاروں لوگوں کے درمیان رہتی تھی، ایک اسکول میں بچوں کو پڑھاتی تھی۔ بچوں کے والدین سے گفتگو کیا کرتی۔ اپنی سہیلیوں سے دنیا بھر کے موضوعات پر باتیں کرتی۔ اس کے باوجود اس کا تعلق ایک ایسے آدمی سے تھا جو مرچکا تھا۔

وہ ظاہری دنیا میں رہتے ہوئے بھی روحوں کی دنیا کے ایک شخص سے باتیں کرتی تھی اس کی باتیں سنتی تھی اور اس کی باتوں پر عمل کرتی تھی۔

یہ سب کچھ بہت سنسنی خیز تھا۔

اب مارگی اپنے گھر میں بھی ٹام کی آواز سن لیتی تھی۔ اس سے باتیں کرلیتی تھی۔

پھر ایک شام ایسا ہوا کہ اس نے ٹام کو سیڑھیوں کے ذریعے اپنے اپارٹمنٹ کی طرف آتے ہوئے دیکھ لیا۔

وہ اس وقت اپنی کھڑکی میں کھڑی باہر خزاں رسیدہ پتوں کو گرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

کھڑکی کے ذریعے اس کے اپارٹمنٹ کی سیڑھیاں بھی نظر آجاتی تھیں۔ ٹام اپنے مخصوص انداز میں سیڑھیاں طے کرتا ہوا اس کے اپارٹمنٹ کی طرف آرہا تھا۔

وہ دوڑتی ہوئی دروازہ کھول کر باہر آئی۔ لیکن سیڑھیوں پر کوئی بھی نہیں تھا۔ صرف خزاں رسیدہ پتے تھے جو ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔

مارگی نے اداسی سے اپنے سر کو جھٹکا اور دوبارہ اپنے کمرے میں واپس آگئی۔ کمرے کے فرش پر بیٹھ کر اس نے آنکھیں بند کرلیں اور زور سے بولی۔

"ٹام میں جانتی ہوں کہ تم اس وقت میرے آس پاس موجود ہو۔ خدا کے لئے مجھے یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے کیا کام لینا چاہتے ہو؟ میں تمہارے کس کام آسکتی ہوں؟ بتاؤ ٹام بتاؤ۔"

پھر وہ اسی طرح خاموش ہوگئی جیسے ٹام کی آواز سن رہی ہو۔ حالانکہ اب اسے مسز ڈیوی کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ ٹام اس کے اپارٹمنٹ ہی میں آجاتا تھا۔

لیکن وہ پابندی سے حلقے میں شریک ہوتی رہی۔ وہ اپنے آپ کو مزید پراسرار تجربوں کے لئے تیار کررہی تھی۔

اس دوران کئی نئی لڑکیاں آئیں اور چلی گئیں، مسز ڈیوی مارگی کو اب اپنا شاگرد بنانے کی سوچ رہی تھی۔ ایک شام جب ساری لڑکیاں جاچکیں تو مسز ڈیوی نے مارگی سے بات کی۔

"دیکھو مارگی۔ تم میں اس فن کو حاصل کرنے کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے۔ تم شاید مجھ سے بھی زیادہ کامیاب ہوسکتی ہو۔ تم میرا ساتھ دو تو ہم دونوں مل کر بے تحاشہ ڈالر کما سکتے ہیں۔"

"نہیں مسز ڈیوی۔" مارگی نے ایک اداس مسکراہٹ سے جواب دیا۔ "میں ہمیشہ یہ سب نہیں کرسکتی۔ میں اسکول میں پڑھاتی ہوں۔ میرا اپنا ایک مستقبل ہے۔ میں تو یہاں صرف ٹام کی آواز سننے آئی تھی۔

"یہ ٹام آخر کون ہے؟"

"میں نے بتایا نا کہ میرا بھائی تھا۔"

ڈیوی خاموش ہوگئی۔ مارگی واپس چلی آئی۔

اسی شام مارگی نے ٹام کو اپنی کرسی کے قریب دیکھا۔ اس مرتبہ وہ اس سے بہت قریب تھا۔ اتنا قریب کہ وہ اسے چھو سکتی تھی۔ اس مرتبہ بھی ٹام نے اس سے بہت سی باتیں کیں۔

"بتاؤ نا ٹام۔ میں تمہارا کام کب کروں۔"

"میں خود ہی بتادوں گا۔" ٹام کی روح نے سرگوشی کی اور غائب ہوگئی۔

اگلے سنیچر کو حلقہ اسی طرح شروع ہوا۔

مارگی اس مرتبہ مسز ڈیوی کے بائیں طرف بیٹھی تھی۔ مسز ڈیوی نے حسب معمول اپنی آنکھیں بند کیں اور اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔

اور اچانک اسی وقت کسی کی تیز سرسراتی ہوئی غصہ بھری آواز کمرے میں گونج اٹھی۔

"مارگی۔ مارگی وقت آگیا ہے۔ وقت آگیا ہے مارگی۔"

پھر کسی کی تیز دردناک چیخ نے سارا سحر توڑ دیا۔

لڑکیاں بے تحاشہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ کسی نے کمرے کی روشنی جلادی تھی۔ اور اس روشنی میں لڑکیوں نے دیکھا کہ مسز ڈیوی کی کٹی ہوئی گردن سے خون ابل رہا تھا۔ مارگی اس کے قریب کھڑی پاگلوں کی طرح ہنس رہی تھی اور اس کے ہاتھ میں تیز دھار ایک خنجر دبا ہوا تھا۔

مارگی کے ہینڈ بیگ سے پولیس کو اخبار کا ایک تراشہ ملا۔ جو ایک برس پرانا تھا۔ اور جس میں ٹام نامی ایک نوجوان کی تصویر چھپی تھی جسے ایک عورت قتل کرکے بھاگ گئی تھی اور اس عورت کی تصویر بھی اس نوجوان کی تصویر کے برابر ہی تھی۔

اور کسی کے لئے بھی اب یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ "وہ تصویر مسز ڈیوی کی تھی۔"



موت کا حصار

ایس امتیاز احمد - کراچی

بستر پر محو خواب دوشیزہ کے وجود پر ایک لجلجی سا وجود مسلط ھوا اور وہ وجود دوشیزہ کے وجود میں گھستا چلا گیا اور پھر جب وہ لجلجی وجود دوشیزہ کے وجود سے الگ ھوا تو دوشیزہ کا ڈھانچہ تھا لیکن پھر......

خوف وہراس سے لرزا براندام دل کو مسوستی ہوئی نا قابل یقین حد تک ڈراؤنی کہانی

شام پور اس علاقے کا سب سے بڑا قصبہ تھا، اس کی آبادی کم و بیش دس ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ چوہدری گوہر اس کا سب سے بڑا زمیندار تھا۔ گاؤں سے دو میل کے فاصلے پر شمال میں اس کا وسیع و عریض زرعی فارم تھا، چوہدری علی گوہر کا بیشتر وقت زرعی فارم پر اپنی شاندار حویلی میں بسر ہوتا تھا۔

خدا نے اسے صرف ایک ہی بیٹا دیا تھا اور بیٹا بشیرا بھی ایسا جو لمبا تڑنگا، تندرست و توانا اور خوبرو مگر عادت و خصائل کے اعتبار سے وہ صحیح معنوں میں زمیندار نہیں تھا۔ وہ عام زمیندار نوجوانوں کی طرح قوت طلب کھیلوں اور کھیتوں میں ہل چلانے کے بجائے طرح طرح کے جانور پالنے کو زیادہ پسند کرتا تھا۔ چوہدری اسے کبھی کبوتروں، بطخوں اور کبھی خرگوشوں کے ہجوم میں گھرا پاتا تو دل مسوس کر رہ جاتا۔ کبھی کبھی جھلا کر وہ اسے ڈانٹنے پھٹکارنے سے بھی گریز نہ کرتا مگر بشیرا ہنس کر ٹال دیتا اور اپنے مشغلہ سے دستبردار ہونے پر تیار نہ ہوتا۔ چوہدری دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوسنے لگتا کہ کیوں اس نے بشیرے کو شہر کے عجیب ماحول میں بھیجا اور کیوں اسے بی۔اے تک تعلیم دلوائی۔ یہی وجہ تھی کہ بشیرا ناکارہ ہو کر رہ گیا تھا۔

بشیرے کی ماں کو اس دنیا سے سدھارے ایک عرصہ گزر چکا تھا۔ چچی فضیلہ اسے اولاد سے زیادہ عزیز رکھتی تھی اور وہی اس کے کھانے پینے اور دوسرے آرام سکھ کا خیال رکھتی تھی ورنہ وہ تو اس معاملے میں بھی بہت لاپروا تھا۔ عائشہ، چچی فضیلہ کی ایک ہی بیٹی تھی، جوان، صحت مند اور حور شمائل، جس کی کمر میں شہتوت کی کومل شاخ کا سا لوچ، آواز میں نقرئی گھنٹیوں کا سا ترنم، آنکھوں میں رات کی سیاہی اور تاروں کی سی چمک تھی۔ عائشہ بشیرے کو دل ہی دل میں پوجتی تھی......!

عائشہ ہی کیا گاؤں بھر کی جوان لڑکیاں بشیرے کی نظر التفات اور ایک خفیف سی مسکراہٹ کے لئے ترستی تھیں، مگر بشیرے کی نظریں اگر کسی پر گھوم پھر کر ٹکتی تھیں تو وہ صرف عائشہ تھی، عائشہ کو بھی احساس تھا کہ بشیرا اس کا اور صرف اس کا ہے۔

عائشہ اور بشیرے کی محبت پھلتی پھولتی رہی اور وقت دبے پاؤں ماضی کے دھندلکوں کی طرف کھسکتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک روز چوہدری گوہر چپکے سے اس دنیا سے کوچ کر گیا تو بشیرے کو گاؤں کا پر رونق ماحول چچی فضیلہ کا سایہ شفقت اور عائشہ کی رومان پرور رفاقت چھوڑ کر فارم کی حویلی میں ڈیرہ لگانا پڑا۔ باپ کی تمام



جائیداد کا بار براہ راست اس کے کاندھوں پر آ پڑا تھا۔ چچی نفیسہ، عائشہ، حتیٰ کہ گاؤں کے کسی فرد کو بھی یقین نہیں تھا کہ لاابالی اور خوش فکر بشیرا زرعی فارم کے وسیع کام کو سنبھال سکے گا لیکن بشیرے کی تو کایا ہی پلٹ گئی تھی۔ اس کا باپ تو پورے فارم کا چکر ہفتے عشرے میں لگایا کرتا تھا۔ مگر بشیرے کو اس وقت تک چین نہیں آتا تھا جب تک وہ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر ہر کھیت کا گہری اور محبت بھری نظروں سے جائزہ نہیں لے لیتا تھا۔

انہی دنوں بشیرے کے مزاج میں ایک عجیب و غریب تبدیلی رونما ہوئی، اس نے کبوتر آزاد کردیئے۔ خرگوش یا تو خود کھالئے یا لوگوں کو کھلا دیئے۔ اور بطخیں مزارعین میں تقسیم کردیں۔ مگر ان پر یہ شرط عائد کردی کہ وہ اسے ایک بطخ کے بدلے ایک خوبصورت بلی فراہم کریں گے۔ مزارعین اس کی فرمائش پر نہ جانے کہاں کہاں سے اس کے لئے کئی بلیاں پکڑ لائے، تین بلیاں شکل وصورت اور عادات واطوار کے اعتبار سے اسے پسند نہ آئیں، انہیں اس نے مار بھگایا اور باقی پانچ بلیوں کے ساتھ حویلی میں ایک خاندان کے سربراہ کی طرح رہنے لگا۔

ہفتے میں ایک بار وہ عائشہ اور چچی نفیسہ سے ملنے جاتا۔ اس روز تو چچی اسے دودھ اور مکھن میں نہلا دیتی۔ اس کے لئے مرغ پلاؤ پکاتی، ٹھنڈی میٹھی چھاچھ سے اس کی تواضع کرتی اور اس پر نثار ہوجاتی۔ عائشہ اس سے زیادہ دور تو نہ رہتی مگر کونوں کھدروں سے آنے بہانے اس کی آنکھوں میں جھانکتی، مسکراتی، لجاتی اور مختلف کاموں میں جتی رہتی۔

دن ڈھلتا تو بشیرا اپنے اکلوتے دوست حکیم سلیم الدین کے دواخانے میں جا بیٹھتا۔ اس سے دنیا جہان کی باتیں کرتا اور شام کو عائشہ اور چچی سے رخصت ہوکر حویلی پہنچ جاتا۔ اس نے بلیوں کے لئے گوشت فراہم کرنے کا کام اپنے ایک مزارعہ عیدو کے سپرد کر رکھا تھا اور دودھ کی فراہمی مجید کو سونپ دی تھی۔ بلیاں اب اس سے اس قدر ہل گئی تھیں کہ اسے پل بھر کے لئے بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی تھیں۔ وہ جہاں بھی جاتا اس کے ساتھ ہولیتیں۔ یہاں تک کہ اتوار کو وہ گاؤں کا رخ کرتا تو اس کے گھوڑے کے پیچھے پیچھے چل پڑتیں اور جب وہ گاؤں پہنچتا تو اس کے ہم عمر نوجوان کھلکھلا کر ہنستے، لڑکیاں اشارے کرتیں اور بچے بشیرا بلی والا، بشیرا بلی والا کے نعرے لگاتے۔ مگر وہ ہر قسم کی آوازوں سے بے نیاز، مسکراتا ہوا چچی کے ہاں جا گھستا اور جب بلیوں کا لشکر چچی کے وسیع وعریض آنگن میں داخل ہوتا تو کہرام سا مچ جاتا۔ چچی کے قہقہوں سے گھر کے در و دیوار گونجنے لگتے اور عائشہ کی پیشانی پر لاتعداد سلوٹیں ابھر آتیں۔

آخر ایک اتوار عائشہ نے بشیرے کو تنہائی میں آلیا۔

''بشیرے۔ یہ تم نے کیا مذاق بنا رکھا ہے؟'' وہ غرائی۔

''کیا۔ کیا۔ کیسا مذاق......'' بشیرا ہکلایا۔

''یہ بلیوں کی فوج تم نے کیوں اپنے پیچھے لگا رکھی ہے۔؟'' عائشہ نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے کہا۔

''بشیرا کھلکھلا کر ہنسا اور ہنستا ہی چلا گیا۔ عائشہ کا پیمانہ صبر چھلک گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کے منہ میں مکئی کا ایک بھٹہ ٹھونس دیا۔ ''کیا یہ میری بات کا جواب ہے؟'' وہ چیخی۔ ''میں کہتی ہوں بطخوں، خرگوشوں اور کبوتروں کی طرح ان بلیوں کو بھی دفعان کردو۔''

''مگر کیوں؟'' بشیرے نے پیار سے پوچھا۔

''یہ تمہارا کیا بگاڑتی ہیں؟''

''عزت!!'' عائشہ نے دانت پیسے۔ ''گاؤں بھر کی چھوکریاں چھوکرے تمہارا مذاق اڑاتے ہیں۔''

''ان کا تو دماغ چل گیا ہے۔'' بشیرے نے فیصلہ سنادیا۔

''اور تمہارا اکیلے کا دماغ ٹھیک ہے ناں۔'' عائشہ ہار ماننے پر تیار نہ ہوئی۔

''ہاں...... اگر ٹھیک نہ ہوتا تو...... عائشہ...... تم بھی مجھے آج دوسری لڑکیوں کی طرح بدصورت لگنے

لگتیں!"

"اوہ......!" عائشہ سرخ ہوگئی۔ پھر سر جھکا کر پاؤں کے انگوٹھے سے فرش کریدتے ہوئے بولی۔ "تو کیا تم ان بلیوں سے پیچھا نہیں چھڑاؤ گے؟"

"نہیں...... عائشہ......"

"خدا کرے ان سب پر کوئی وبا پڑے......!!" عائشہ نے ہاتھ اٹھا کر بد دعا دی۔ "ایک بھی زندہ نہ بچے!!"

پہلے تو بشیرے نے حیرت سے عائشہ کے چاند سے چہرے کو دیکھا پھر اس کی روہانسی صورت پر اسے بے اختیار ہنسی آ گئی وہ قہقہہ لگا ہی رہا تھا کہ فضیلہ آ گئی۔

"کیا گدھوں کی طرح ہنس رہے ہو۔ کیا ہوا تمہیں؟" چچی نے پہلے عائشہ اور پھر بشیرے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"یہ عاشی......" بشیرے نے عائشہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میری بلیوں کو ہاتھ اٹھا اٹھا کر بددعا دے رہی ہے۔"

"ارے......وہ کیوں؟" چچی بولی۔

"کہتی ہے۔ ان کی وجہ سے ہماری عزت جاتی ہے۔ لوگ ہمارا مذاق اڑاتے ہیں۔"

"ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔" چچی نے عائشہ کی تائید کی۔ "آج تک تو ہم نے کسی کو اتنی بلیاں پالتے دیکھا نہ سنا!"

"اب تو دیکھ لیا ناں؟" بشیرے نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"چچی فضیلہ اور عائشہ، بے بس ہو کر چپ ہوگئیں۔ وہ تو اسے کیا قائل کرتیں، حکیم سلیم بھی بشیرے کو بلیوں سے علیحدگی اختیار کرنے پر کسی طور پر آمادہ نہ کرسکا۔ جب وہ اس کے مطب پہنچتا تو چھوٹے بڑے بچوں کا ایک ہجوم وہاں جمع ہو جاتا اور زبردست غل غپاڑہ مچتا۔ حکیم بے چارہ کھسیانا ہو جاتا اور بعض اوقات تو جھنجلا کر ایک آدھ لڑکے کو پیٹ بھی ڈالتا مگر کیا مجال جو بشیرے کے ماتھے پر کبھی بل بھی پڑا ہو۔ وہ یوں سکون سے بیٹھا رہتا جیسے اس کے کان سماعت سے عاری ہوں۔

ایک بار جب سردیاں عروج پر تھیں اور یخ بستہ ہواؤں کی وجہ سے رگوں میں خون منجمد ہوا جاتا تھا۔ ایک دن بشیرا حویلی کے کشادہ صحن میں چارپائی پر بیٹھا دھوپ تاپ رہا تھا اور پاس رکھے طشت میں سے گوشت اٹھا اٹھا کر بلیوں کے سامنے پھینک رہا تھا کہ اس نے دیکھا سفید ریشمی بالوں والی ایک تندرست بلی کچھ فاصلے پر آ کھڑی ہوئی ہے، بلی اجنبی تھی۔ نہ جانے کہاں سے آ گئی تھی۔ وہ اپنی نیلی آنکھوں سے بشیرے کی موٹی تازی بلیوں کو گوشت کھاتے دیکھ رہی تھی، بشیرے کو اس خوب صورت بلی پر پیار آ گیا۔ اس نے اسے چمکارا مگر اس نے بشیرے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور بلیوں کی طرف متوجہ رہی۔

بشیرے نے اس کے آگے چند فٹ کے فاصلے پر گوشت کا ایک ٹکڑا پھینکا۔ بلی نے گوشت کی طرف ایک اچٹتی نظر سے دیکھا مگر اپنی جگہ سے جنبش نہ کی، اور بشیرا اس کے خلاف فطرت سے کچھ حیران سا ہو کر غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ پھر جب اس نے بلی کی نگاہوں کے مرکز کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ وہ صرف "نیمو" کو گھور رہی تھی۔ نیمو۔ جو بسیرے کی تمام بلیوں سے زیادہ حسین اور خوش قامت تھی۔ بشیرے نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ "ہوں۔ یہ تو اس کی نیمو پر فریفتہ ہوگئی ہے اور اس کی محبت نے اس کے دل پر اتنا گہرا اثر کیا ہے کہ اس کو کھانے پینے تک کا ہوش نہیں رہا۔ اور یہ نیمو بھی عجیب پاگل ہے کہ اس کی محبت آمیز نگاہوں کا جواب بڑی گرم جوشی اور لگاوٹ سے دے رہی ہے۔ اس نے بھی گوشت سے منہ کھینچ لیا ہے۔

چند منٹ تک وہ آپس میں نگاہوں کا تبادلہ کرتی رہیں۔ پھر نیمو اس کے پاس جا کھڑی ہوئی دونوں ایک دوسری کے مقابل کھڑی آنکھوں ہی آنکھوں میں تبادلہ خیال کرتی اور پھر گھر سے باہر نکل گئیں۔

نیمو شام تک گھر نہ لوٹی تو بشیرے کو تشویش ہوئی

اس نے اسے دور دور تک تلاش کیا، مگر وہ کہیں ہوتی تو نظر آتی۔ بشیرا افسردہ سا ہو کر واپس چلا آیا اور آتش دان کے پاس بیٹھ کر دوسری بلیوں سے دل بہلانے لگا۔ جب اس پر نیند غالب آنے لگی تو ناگاہ اسے خیال آیا کہ آج گھر میں غیر معمولی سکوت طاری ہے۔ دوسرے کمرے سے چوہے کی آواز سنائی دیتی تھی نہ اس کی اچھل کود! جس نے پچھلے کئی دنوں سے کافی شور مچا رکھا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ چوہا یا تو مر گیا ہے یا کہیں چلا گیا ہے۔ بہت دیر تک اسی موضوع پر سوچتے سوچتے وہ آخرکار سو گیا۔

پھر تو نہ جانے کیا بلا ٹوٹ پڑی کہ بشیرے کی بلیاں ایک کے بعد ایک غائب ہونے لگیں۔ جو بھی حویلی سے باہر نکلتی لوٹ کر نہ آتی۔ اور پندرہ دن کے مختصر عرصہ میں اس کے پاس بلیوں کا صرف ایک جوڑا رہ گیا۔ بشیرے کا دل کٹ کر رہ گیا اور اذیت ناک احساس تنہائی نے اسے جکڑ لیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بلیاں کہاں چلی گئی تھیں؟

جوں جوں وہ سوچتا یہ خیال اس کے ذہن میں پختہ ہوتا چلا جاتا کہ ہو نہ ہو کوئی بدخواہ اور کینہ پرور شخص انہیں زہر کھلا رہا ہے۔ مگر کیوں بشیرے سے تو کوئی بھی ناراض نہیں تھا؟ ادھر وہ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ یہ باقی ماندہ دو بلیاں بھی ہر وقت سہمی سہمی سی رہنے لگی ہیں، جیسے انہیں کسی نادیدہ خطرے کا احساس ختم کئے دے رہا ہو۔ وہ رہ رہ کر ٹھٹھکتیں اور متجسس و ہراساں نگاہوں سے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگتیں۔ اور ایک روز وہ بھی گھر سے ایسی نکلیں کہ لوٹ کر نہ آئیں۔

بلیوں کا آخری جوڑا بھی رخصت ہو گیا تو بشیرے نے دل شکستہ ہو کر گاؤں کی راہ لی۔ بچوں نے اسے دیکھ کر شور مچایا۔ ''بلی والا، بلی والا۔'' مگر آج یہ نعرہ اس کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح داخل ہوتا معلوم ہوا تھا، وہ جھنجھلا گیا اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر تیزی سے چچی فضیلہ کے ہاں جا پہنچا۔ چچی اسے خلاف معمول آتے دیکھ کر پہلے تو حیران ہوئی اور پھر اس کے ملول چہرے کو دیکھ کر بولی۔

''بشیرے۔ کیا بات ہے۔ آج تو بہت بجھا بجھا سا نظر آ رہا ہے؟''

''کیا بتاؤں چچی۔ بہت ہی برا ہوا۔'' بشیرے نے بڑی غمناک آواز میں جواب دیا۔ اتنے میں عائشہ بھی ان کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی۔

''آخر۔ ہوا کیا ہے بیٹا۔ کچھ بتا......!''

''بلیوں کا آخری جوڑا بھی کہیں چلا گیا ہے......!'' بشیرا افسردہ آواز میں بولا۔

''یا اللہ تیرا شکر ہے......!'' عائشہ نے بے اختیار کہا۔

''تیری ہی نظر کھا گئی ہے انہیں ڈائن!'' وہ غرایا۔ ''تو ہی ان کی دشمن ہو رہی تھی۔''

''ارے تو لڑتے کیوں ہو۔'' چچی بولی۔ ''بلیاں تھیں، سو مر گئیں، کون سی قیامت ٹوٹ پڑی۔ چلو اندر بیٹھو۔''

چچی کے گھر سے واپسی پر پہلے بشیرا سیدھا اپنے دوست حکیم سلیم کے پاس جا پہنچا۔ سلیم اس کی افسردگی سے خاصا متاثر ہوا اور جب اسے معلوم ہوا کہ اس کی افسردگی بلیوں کے پراسرار طور پر غائب ہو جانے کے سلسلے میں ہے تو اس نے بڑی ہمدردی سے اپنے دوست بشیرے کو سمجھایا کہ یہ محض ایک اتفاق ہے کہ سب بلیاں ایک ایک کر کے غائب ہو گئیں۔ ممکن ہے ویرانہ انہیں راس نہ آیا ہو اور مختلف آبادیوں کو چلی گئی ہوں۔ بشیرا اس سے بحث کئے بغیر تھوڑی دیر اس کے پاس بیٹھ کر گھر چلا آیا۔

ایک رات پھر کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ بشیرا آتش دان کے سامنے کرسی پر بیٹھا معمول کے مطابق حقہ گڑگڑا رہا تھا اس نے دروازے بند کر رکھے تھے اس لئے کمرہ خاصا گرم ہو رہا تھا۔ اس کا ایک کتا موتی اس کی کرسی کے بائیں جانب قریب ہی فرش پر سکون کی نیند سو رہا تھا اور دوسرا کتا ببر کہیں باہر تھا۔ کمرے میں موت کا سا سکوت چھایا ہوا تھا۔ بشیرے کو کرسی پر بیٹھے بیٹھے

ساڑھے نو بج گئے اور وہ غنودگی سی محسوس کرنے لگا۔ ویسے بھی وہ بستر پر دراز ہونے سے پہلے آتش دان کے سامنے کرسی پر ہی سونے کا موڈ بنالیا کرتا تھا۔ پھر نہ جانے اسے کب نیند آ گئی۔ اس کا دایاں ہاتھ کرسی کے بازو پر سے نیچے فرش کی طرف لٹک گیا۔ وہ ساڑھے دس بجے تک سوتا رہا۔ اگر اس کا توازن نہ بگڑ جاتا تو نہ جانے کب تک کرسی پر ہی پڑا سوتا رہتا۔

آنکھ کھلتے ہی اس نے عادت کے مطابق دیکھے بغیر کرسی کے قریب محو خواب موتی کی پشت سہلانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اس نے کتے کی پشت تھپتھپائی تو اس نے محسوس کیا کہ اس کا ہاتھ کتے کے جسم کے بجائے کسی اور ہی چیز سے مس ہو رہا ہے۔ واقعی یہ کتے کی پشت نہیں تھی مگر وہ چیز عین اسی مقام پر موجود تھی جہاں موتی لیٹا ہوا تھا۔ یہ جسم جس چیز کا بھی تھا پھسلنے والا تھا اور اس کے ہاتھوں کو بالوں کے لمس کا احساس تک نہیں ہوتا تھا۔ اس کا ہاتھ حرکت کرتا رہا۔ پھر دفعتاً اس کے ذہن میں یہ احساس جاگا یہ کوئی اور ہی چیز ہے کتا ہرگز نہیں کیونکہ وہ واضح طور پر محسوس کررہا تھا کہ اگر وہ اس چیز پر انگلیوں کا دباؤ ڈالے تو پورا ہاتھ اس میں دھنس جائے گا۔ اس چیز کو ٹٹولنے اور اس کی حقیقت کا جائزہ لینے کی یہ کیفیت بشیرے کے نیم خوابیدہ دماغ پر چند سیکنڈ تک طاری رہی اور پھر یہ کیفیت روح فرسا خوف کا رنگ اختیار کرنے لگی۔

بشیرا اسٹپٹا گیا۔ اس کا دماغ پوری طرح چوکس ہوگیا اور اس نے دائیں جانب سر جھکا کر فرش پر پڑی اس چیز پر نظر ڈالی۔ اور پھر اس کی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا اس کا وہ بھیانک سے بھیانک خواب میں بھی تصور نہیں کرسکتا تھا۔ وہ بے رنگ، گاڑھے اور شفاف سیال کا بے شکل ڈھیر تھا جس کے آر پار آسانی سے دیکھا جاسکتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اگر اسے ہاتھ سے پکڑ کر اوپر اٹھانے کی کوشش کی جائے تو وہ باآسانی انگلیوں سے پھسل کر پھر فرش پر ڈھیر ہوجائے گا۔

اس ہولناک حقیقت کا اسے علم کیسے ہوا۔ یہ وہ نہیں جانتا تھا بس اسے تو اتنا معلوم تھا کہ اس چیز کو دیکھے بغیر ہی محسوس کرلیا تھا کہ وہ زندگی سے معمور ہے۔ ہاں وہ شے زندہ تھی اور اس کا ایک پتلا اور بے شکل بازو کتے کی پشت سے گزر کر اس کے سر پر موجود تھا جس میں اس کا سر چھپ گیا تھا۔ موتی بالکل ساکت تھا جیسے اس کے جسم سے جان نکل گئی ہو۔

شدت خوف سے بشیرے کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ کمرے کی فضا پر خوف کا پرہول تاثر چھایا ہوا تھا۔ بشیرے کی قوت برداشت جواب دے گئی اور اس کی دہشت آمیز چیخ سے کمرے کے در و دیوار لرز گئے۔ بے اختیار وہ تڑپ کر کرسی سے اٹھا اور لوہے کی سلاخ اٹھا کر اس چیز کے قریب آ کھڑا ہوا۔ وہ اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ وہ شے بالکل ساکن تھی۔ قطعی طور پر جامد اور غیر متحرک۔ مگر نہ جانے بشیرے کو کیوں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اگر وہ چیز چاہے تو بجلی کی سی سرعت سے حرکت کرسکتی ہے۔

بشیرے نے غیر معمولی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے وزنی سلاخ سے اس بے شکل، سیال مادے پر بھرپور ضرب لگائی۔ خفیف سی آواز بھی پیدا نہ ہوئی، لوہے کی سلاخ اس میں دھنس گئی اور پھر یوں اوپر کو اٹھی جیسے اس نے ربڑ کے پھولے ہوئے غبارے پر ضرب لگائی ہو اور پھر اس کے ساتھ ہی وہ چیز حرکت میں آ گئی۔ وہ دروازے کی طرف سیلاب کی طرح بہنے لگی۔ جیسے کیچوا رینگ رہا ہو۔ مگر اس کی رفتار حیرت انگیز طور پر تیز تھی۔ اگر اس کی حرکت کو سنپولئے کے رینگنے سے تشبیہ دی جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ بشیرے کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ چیز دہلیز کے نیچے ایک چھوٹی سی درز میں داخل ہوکر غائب ہوگئی۔

بشیرا چند لمحے وہیں بے حس و حرکت کھڑا اس درز کو دیکھتا رہا پھر اس نے خوف سے ایک اعصاب شکن جھرجھری لی۔ اور ایک طویل سانس لے کر موتی کی طرف بڑھا۔ جو خاموشی سے فرش پر تھوتھنی ٹکائے پڑا

تھا۔ بشیرا کے دونوں ہاتھ آگے کو بڑھے اور وہ کتے کو جھنجھوڑنے لگے۔ موتی نے آنکھیں کھول دیں، مگر یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ آنکھیں زندہ موتی کی آنکھیں نہیں تھیں۔ بلکہ ان سے موت جھانک رہی تھی۔ بشیرے نے محسوس کیا کہ جیسے وہ اپنی آنکھوں سے موت کو مجسم دیکھ رہا ہو۔

بشیرا ہانپتا کانپتا بستر پر گر پڑا۔ مگر اسے رات بھر نیند نہ آسکی۔ اور کروٹیں بدلتے بدلتے صبح ہوگئی۔ رات بھر اس کے کان کھڑے رہے۔ کچھ سننے کے لئے۔ کیا سننے کے لئے۔ وہ کیسی آواز ہوتی جو اس چیز کے دوبارہ کمرے میں داخل سے پیدا ہوتی، اس کا ذہن آواز کا تصور باندھنے سے قاصر رہا مگر نہ وہ چیز دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی نہ بشیرے نے کوئی عجیب اور غیر معمولی آواز سنی۔ رات بھر کمرے میں موجود تمام درزوں کو دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں دکھنے لگی تھیں۔ ان میں جلن ہونے لگی تھی جیسے کسی شریر بچے نے ان میں ریت جھونک دی ہو۔

دوسرا کتا ببر نہ جانے کہاں چلا گیا تھا، وہ رات بھر لوٹ کر نہ آیا تھا کہ اسے پل بھر کے لئے بھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا تھا حتیٰ کہ رات کو بھی اس کے جسم سے پیوست ہو کر سوتا تھا۔ وہ بشیرے پر اس قدر فدا تھا کہ جب تک بشیرا رات کو اس کی پشت پر چند بار ہاتھ نہیں پھیرتا، نیند اس کے قریب بھی نہیں پھٹکتی تھی۔ مگر وہ رات بھر غائب رہا تھا۔ بشیرے نے سوچا شاید وہ اس چیز سے ڈر گیا ہو۔ ہاں یقیناً خوف زدہ ہوا ہوگا۔ یہ جانور ایسی مافوق الفطرت چیزوں کا ادراک کرنے میں انسان سے بہت آگے ہیں۔

جب دروازے کی درز سے صبح کا اجالا کمرے میں جھانکنے لگا۔ ببر لوٹ آیا۔ اس کے ہانپنے اور غرانے کی آوازیں بشیرے کے کانوں سے ٹکرائیں۔ بشیرے نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا تو ببر کو اپنا منتظر پایا۔ وہ غور سے بشیرے کے چہرے کو دیکھ رہا تھا، بشیرے نے اسے پیار سے چمکارا اور اندر داخل ہونے کے لئے اسے راستہ دے دیا۔ ببر کمرے میں داخل ہوگیا۔ بشیرا پھر پلنگ پر لحاف میں گھس گیا۔ اس نے دیکھا کہ ببر اپنے رفیق موتی کو ایک گز کے فاصلے پر کھڑا گھور رہا ہے۔

اچانک ببر کے کان کھڑے ہوئے جبڑے کھل گئے۔ منہ سے جھاگ چھوٹنے لگی اور اس کے حلق سے خوفناک غراہٹ برآمد ہونے لگی پھر وہ ایک ہی جست میں موتی کے جسم پر گرا اور انتہائی وحشت کے عالم میں اسے اپنے دانتوں سے کاٹنے اور پنجوں سے اس کی کھال ادھیڑنے لگا۔ انتہائی اذیت ناک اور دل گداز منظر تھا۔ بشیرا تڑپ کر پلنگ سے اٹھا۔ مگر اس پر خوف کچھ اس طرح غالب تھا کہ وہ آگے بڑھ کر کمزور اور مصیبت زدہ موتی کو وحشی ببر کے چنگل سے نجات دلانے کی جرأت نہ کرسکا۔

بشیرا حیران تھا کہ موتی اپنے بچاؤ کے لئے خفیف سی مزاحمت بھی نہیں کر رہا ہے۔ وہ شاید اس قدر خائف ہوگیا تھا کہ اس میں حرکت کرنے، چیخنے یا اٹھ کر باہر کو بھاگ جانے کی سکت نہیں رہی تھی۔ پھر اچانک بشیرا حرکت میں آیا۔ اگر وہ ببر کو دونوں ہاتھوں میں دبوچ کو دور کونے میں نہ پھینک دیتا تو موتی غریب کی موت واقع ہونے میں کسر نہیں رہ گئی تھی۔ مگر ببر پھر غرا کر موتی کی طرف بڑھا۔ بشیرے کو غصہ آگیا اس نے لپک کر اسے پکڑا اور کمرے سے باہر پھینک کر دروازہ بند کرلیا، وہ پھر نحیف ونزار اور قریب المرگ موتی کے پاس آ کھڑا ہوا، موتی نے جھرجھری لی اور ساکت ہوگیا، اسے اپنے زخم تک چاٹنے کی ہمت نہ ہوئی جن سے خون جاری تھا، بشیرا اس کے پاس بیٹھ گیا اور یہ جان کر اس کا دل ڈوب گیا کہ موتی سانس کی آمد و رفت سے بھی محروم ہو چکا ہے۔

بشیرے نے بڑی آزردگی کے ساتھ موتی کی دم پکڑی اور اسے گھسیٹتا ہوا صحن میں لے گیا۔ اسے گھاس پر پھینک کر چلا گیا۔ بے چارے نے ناشتہ تک نہیں کیا تھا۔ اس رات کے اذیت ناک اور ہولناک واقعات نے نیند کے ساتھ ساتھ اس کی بھوک بھی چھین لی تھی۔

جب وہ ضروری کاموں سے فراغت پا چکا تو اس نے ایک کدال کاندھے پر رکھا اور صحن کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہ موتی کو حویلی کے صحن ہی میں سپرد خاک کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ صحن میں آیا تو یہ دیکھ کر مبہوت رہ گیا کہ جس جگہ وہ موتی کی لاش چھوڑ گیا تھا۔ اب وہاں کچھ بھی نہیں تھا، تاہم اس مقام پر گھاس دبی ہوئی تھی، جو وہاں کچھ دیر قبل کسی جسم کی موجودگی کی نشاندہی کرتی تھی، اس کے باوجود نہ جانے بشیرے کو کیسے محسوس ہوا کہ اس سے غلطی ہوگئی ہوگی۔ ممکن ہے موتی کی لاش وہ عقبی دیوار کے پاس چھوڑ گیا ہو۔

وہ اس خیال کے ذہن میں ابھرتے ہی لپکتا ہوا عقبی دیوار کی طرف گیا۔ مگر وہاں بھی لاش کا کوئی وجود نہیں تھا، بشیرا چکرا گیا۔ اس کا دماغ ماؤف ہوگیا۔ انہونے اور خلاف عقل واقعات پیش آرہے تھے۔ اس پر عجیب بحرانی کیفیت طاری ہوگئی اور اسے شبہ سا ہونے لگا کہ ہو نہ ہو اس کے حواس معطل ہوگئے ہیں، جو وہ ایسے واقعات دیکھ رہا ہے جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے بشیرا چپ سادھ گیا اور ان واقعات کا کسی شخص سے ذکر تک نہ کیا حتیٰ کہ اس نے اپنے بے تکلف اور ہمراز دوست حکیم سلیم الدین سے بھی پوشیدہ رکھی۔ وہ ڈرتا تھا کہ اس کی باتیں سن کر لوگ اسے پاگل نہ قرار دے دیں۔

اور پھر بشیرا ہر لمحے کسی نئے مافوق العقل واقعہ کا منتظر رہنے لگا۔ ہر وقت اس کی نگاہیں گرد و پیش کسی چیز کی متلاشی رہنے لگیں۔ یوں ہی بیس روز گزر گئے کوئی انوکھا واقعہ ظہور پذیر نہیں ہوا، کوئی عجیب چیز نہ دکھائی دی اور پھر ایک دوپہر......

وہ حویلی سے نکل کر کھیتوں کی طرف جارہا تھا تو اسے سیاہ رنگ کا ایک کتا کھڑا نظر آیا جو بغور اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گاہے گاہے کتے کی نگاہیں بشیرے کے عقب میں بھی اس انداز میں اٹھتی تھیں جیسے اسے بشیرے کے پیچھے بھی کسی کے آنے کی توقع تھی۔ بشیرا بھی سمجھا کہ اس کتے کو اس کے اکلوتے کتے ببر کی یہاں موجودگی کا علم ہوگیا۔ بشیرا اس کتے سے چند گز کے فاصلے پر پہنچا تو چونک گیا یہ تو اس کا موتی تھا، وہ لاشعوری طور پر سیٹی بجانے لگا، وہ اس حقیقت کو لمحہ بھر کے لئے یکسر فراموش کر بیٹھا کہ اس کا موتی تو تین ہفتے قبل مرگیا تھا، مگر کتے نے سیٹی سن کر اپنی جگہ سے حرکت نہ کی تو معاً اس کے دماغ سے پردہ اٹھا اور اسے موتی کی یاد آ گئی اس نے نو وارد کتے کی طرف غور سے دیکھا تو اسے وہ موتی سے حیرت انگیز حد تک مشابہہ نظر آیا۔ اگر موتی اس کی آنکھوں کے سامنے نہ مرا ہوتا تو وہ اسے موتی ہی سمجھتا۔ لیکن وہ اب اسے موتی تسلیم کرنے پر تیار نہ تھا۔ بس اس کا ایک ہم شکل کتا تھا...... مگر...... یہ خیال نہ جانے بشیرے کے ذہن میں کیوں سختی سے جا گزیں ہو کر رہ گیا کہ یہ کتا اس کے ببر کا انتظار کر رہا ہے......

اس کے بعد بشیرے کو وہ کتا، ہر دوسرے تیسرے دن اپنی حویلی کے گرد منڈلاتا نظر آنے لگا اس کی آمد و رفت کا سلسلہ کوئی ہفتہ بھر جاری رہا۔ مگر ایک خاص بات جو بشیرے نے اس کتے میں محسوس کی۔ وہ یہ تھی کہ وہ جب بھی اسے دکھائی دیا پہلے سے کمزور ہی نظر آیا اور آخری بار تو اس کی ایک ایک ہڈی صاف دکھائی دے رہی تھی پھر وہ غائب ہوگیا۔

البتہ چار پانچ روز بعد ایک اور کتا وارد ہوا۔ وہ کتا بہت تندرست اور بھاری بھر کم تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کسی خوش حال اور جانوروں کے شوقین کا پروردہ ہے، وہ کتا بھی بشیرے کے لئے بالکل اجنبی تھا، جانے کس گاؤں سے آ گیا تھا لیکن عجیب بات یہ تھی کہ ببر جو موتی کے ہم شکل کتے کی لاکھ کوشش کے باوجود گھر سے نکل کر اس کے پاس نہیں گیا تھا، اس کتے کو دیکھتے ہی بے اختیار اس کے پاس جا پہنچا تھا اور وہ دونوں اچھلتے کودتے بشیرے کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئے۔ پھر ببر بھی کبھی لوٹ کر نہ آیا، بشیرا اس کا انتظار ہی کرتا رہا۔ نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ مگر اب بشیرے کو اپنے حواس پر شبہ نہیں رہا تھا کیونکہ یہ واقعات مربوط تھے اور ان کے پیش آنے کے انداز میں حیرت انگیز یکسانیت تھی۔ یعنی

پہلے چوہے پھر بلیاں اور پھر کتے غائب ہوگئے تھے۔

بیرے کے اغواء ہونے کے ٹھیک تین ہفتے بعد......

ایک شام ہلکی ہلکی بوندا باندی ہورہی تھی اور بشیرا حویلی کے دروازے کے باہر کھڑا کچھ سوچ رہا تھا کہ اسے شمال کی جانب سے سڑک پر ایک نوعمر لڑکا اپنی جانب آتا نظر آیا، لڑکے کی صورت جانی پہچانی نظر نہیں آتی تھی، قد قامت سے وہ کم وبیش بارہ سال کا نظر آرہا تھا مگر اس نے کپڑے بڑے عجیب پہن رکھے تھے، کپڑے کیا تھے چوں چوں کا مربہ تھا، شلوار چھوٹی تھی اور اس کے پائنچے پنڈلیوں تک تھے جسم پر قمیص بہت بڑی تھی۔ جو کسی بھاری تن وتوش کے آدمی کو بھی مشکل سے پوری آسکتی تھی۔ یوں لگتا تھا یہ کپڑے اس نے ادھر ادھر سے چرا کر پہن لئے ہیں، اس کی ہیئت کذائی دیکھ کر بشیرے کے ذہن میں فوری طور پر یہی خیال پیدا ہوا کہ ''یہ لڑکا گھر سے بھاگ کر آیا ہے۔''

جب لڑکا بشیرے کی حویلی کے سامنے پہنچا تو اس کی رفتار سست ہوگئی اور وہ حویلی کو یوں منہ اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگا، جیسے وہ رک جانا چاہتا ہو مگر وہ رکا نہیں بلکہ سست روی سے شام نگر کی طرف بڑھتا رہا، تاہم وہ بار بار مڑ کر حویلی پر ایک نظر ضرور ڈال لیتا تھا، بشیرے کو لڑکے کی خستہ حالی پر رحم آ گیا اور اس کے قدم خود بخود لڑکے کے تعاقب میں اٹھنے لگے، اس کا جی چاہا کہ وہ لڑکے کو آواز دے کر روک لے مگر اس کے ہونٹ سل گئے اور اس کے حلق سے آواز نہ نکل سکی کیونکہ کوئی نادیدہ قوت اسے بار بار روک رہی تھی۔ ''خبردار اسے روکنے کی کوشش مت کرنا۔ یہ کوئی عام لڑکا نہیں۔ بلکہ لڑکے کی شکل میں موت ہے۔''

یہ آواز بشیرے کو اپنی روح کی اتھاہ گہرائیوں سے اٹھتی محسوس ہوئی تھی۔ بشیرے کی ذہنی کیفیت بھی اس وقت عجیب تھی اس پر خوف بھی طاری تھا اور ندامت و خجالت بھی، ندامت اس لئے کہ اسے اپنا خوف بے معنی معلوم ہوتا تھا، آخر اس سے رہا نہ گیا اور وہ تیز قدموں سے لڑکے کے پیچھے روانہ ہوگیا۔ وہ لڑکے کو پکارنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک اس کی نگاہیں کچی سڑک پر پڑیں جو پھوار کی وجہ سے مرطوب ہورہی تھی مگر سڑک کا یہ حصہ انتہائی ٹھوس اور ہموار تھا۔ یہاں گرد و غبار کا نشان تک نہ تھا اسے لڑکے کے ننگے پاؤں کے نشانات نظر آرہے تھے مگر وہ نشانات کچھ ایسی غیر معمولی نوعیت کے تھے کہ فرط دہشت سے بشیرے کے رونگٹے کھڑے ہوگئے، لڑکے کے پاؤں تین تین انچ تک زمین میں دھنس رہے تھے۔ جیسے وہ انتہائی نرم اور دلدل نما زمین پر چل رہا ہو۔ بشیرے کے خوف کا باعث حقیقت میں یہ بات تھی کہ لڑکا اس کے مقابلے میں بہت ہلکا پھلکا تھا مگر اس کے اپنے پاؤں زمین پر بالکل مدھم اور غیر واضح سا نشان چھوڑتے تھے۔ ''تو کیا اس لڑکے کا یہ مختصر سا جسم ایک بھاری بھرکم بھینس کے جسم سے بھی بھاری تھا......؟ مگر یہ کیسے ممکن ہے......؟''

بشیرا ایک بار تو جھنجلا گیا اور اس نے پاؤں سے جوتے اتار کر ننگے پاؤں لڑکے کے قدموں کے نشانات کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کیا مگر اس کے پاؤں زمین میں تو کیا دھنستے مٹی پر نشانات بھی مشکل سے پیدا کر سکے۔ اب تو بشیرے کی پشت پر خوف سے چیونٹیوں کا لشکر رینگنے لگا۔ اس نے دور تک لڑکے کے پاؤں کے نشانات کا جائزہ لیا اور پھر ایک دم پلٹ کر گھر کی طرف بھاگا، اب اس کے حواس پر یہ جان لیوا خیال مسلط ہو چکا تھا کہ وہی مافوق الفطرت چیز لڑکے کی شکل میں مجسم ہو کر پھر نازل ہوگئی ہے، ممکن ہے اس کی حویلی ہی اس چیز کا گھر ہو۔

بشیرا حویلی سے اس قدر خائف ہوگیا کہ دوسرے روز صبح سویرے ہی شام نگر جا پہنچا۔ چچی نفیسہ اور عائشہ نے قدرے تعجب سے اس کا خیر مقدم کیا۔ بشیرے کا جی اس راز کو اگل دینے کے لئے مضطرب تھا، وہ اب اس ہیبت ناک راز میں کسی اور کو شریک کرنا چاہتا تھا کہ دل کو کچھ ڈھارس ہو لیکن پھر یہ خیال غالب آ گیا کہ اس کی باتوں پر کون یقین کرے گا، کیونکہ اسے تو اپنی ہی آنکھوں پر بڑی مشکل سے یقین آیا تھا۔ کسی سے کہہ

کر خواہ مخواہ مذاق کا نشانہ بننے سے کیا فائدہ۔ وہ کچھ دیر یوں ہی گم سم بیٹھا رہا۔ چچی تو کسی کام سے باہر چلی گئی اور عائشہ نے سرسوں کے ساگ میں پاؤ بھر تازہ مکھن ڈال کر چنگیری میں جوار کی تین چار گرم گرم روٹیوں کی تہہ لگا کر اس کے آگے رکھ دی۔

''کیا سوچ رہے ہو بشیر؟'' عائشہ نے بڑی اپنائیت سے پوچھا۔

''کچھ بھی تو نہیں!'' بشیرا چونک پڑا۔

''نہیں کچھ تو ہے......''

''ہے تو مگر......''

''مگر کیا......''

''بتانے کو جی نہیں چاہتا......!''

''کوئی ایسی ہی راز کی بات ہے۔''

''نہیں...... مگر...... بات عجیب ہے اسے سن کر تم تو کیا کوئی بھی عقل مند شخص یقین نہیں کرے گا۔''

''کیا کوئی بھوت دیکھ لیا ہے؟'' عائشہ بولی۔

''کیا ہر وقت نوک جھونک کرتے رہتے ہو تم دونوں......!''

چچی کی گرجدار آواز سنائی دی اور یہ دونوں شرما کر چپ سادھ گئے۔ چچی بشیرے کے پاس آ بیٹھی۔

''بشیرے...... کل سے لالو لوہار کا بڑا لڑکا نہ جانے کہاں غائب ہے؟'' چچی نے متاسف آواز میں کہا۔ ''اسے تو گاؤں بھر کے لوگ ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئے نہ جانے اسے زمین کھا گئی یا......''

بشیرا کسی فوری خیال کے زیر اثر اچھل پڑا اور لقمہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کبھی چچی اور کبھی عائشہ کو دیکھنے لگا اس کے چہرے کا رنگ اس قدر متغیر ہو گیا تھا کہ چچی گھبرا سی گئی۔

''کیا ہو گیا تجھے لڑکے؟'' وہ بڑبڑائی۔ ''یہ تو سہم کیوں گیا؟''

''چچی کیا بتاؤں......'' بشیرا بے بسی سے بڑبڑایا۔ پھر اس نے کھانا پرے دھکیل دیا۔

''ارے تو نے کھانے سے کیوں ہاتھ کھینچ لیا...... کھانا تو کھا۔'' چچی نے اسے ڈانٹا۔

''نہیں چچی...... پہلے میری بات سن لو......'' بشیرے نے ایک عزم سے کہا۔

''چچی...... تم یقین کرو نہ کرو...... میں یہ راز اب ظاہر کر کے رہوں گا۔'' بشیرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے چوہوں کے شور وغل کسی بھاری جانور کے ان پر جھپٹنے، ایک بلی کے ظاہر ہونے، یکے بعد دیگرے تمام بلیوں کے غائب ہونے سے لے کر اس لڑکے کے ظہور تک کی تمام داستان چچی اور عائشہ کو سنا ڈالی۔ بات بے حد ڈراؤنی تھی۔ مگر نتیجہ پھر بھی وہی نکلا جس کا بشیرے کو خدشہ تھا۔ عائشہ کے مترنم قہقہوں سے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اور چچی کی ترحم آمیز مسکراہٹ نے اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

''چچی...... میری بات پر یقین کرو۔ ہمارا گاؤں یا ہو سکتا ہے، ہمارے پڑوس کے گاؤں بھی کسی ناگہانی آفت میں پھنسنے والا ہو، لالو لوہار کا لڑکا بھی اس طرح غائب ہوا ہے۔ مجھے یقین ہے، اتنا یقین جتنا سورج کے نکلنے اور پھر ڈوبنے پر ہے۔''

''چل...... آرام سے بیٹھ پگلا۔'' چچی نے اس کے سر پر ہلکا سا دھپ جمایا۔ ''تیری باتیں کچھ اوٹ پٹانگ ہی ہوا کرتی ہیں۔''

بشیرا دل ہی دل میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

دوپہر ڈھلے وہ اپنے دوست حکیم سلیم الدین کے مطب جا پہنچا۔ ''بشیرے...... کیا بات ہے آج کچھ پریشان نظر آ رہے ہو!'' سلیم نے پوچھا۔

''نہیں...... میں بالکل ٹھیک ہوں...... خوش ہوں......'' بشیرے نے جیسے اپنے دفاع کیا۔

''نہیں...... میری نظر تمہارے بارے میں دھوکا نہیں کھا سکتی۔'' سلیم نے اس کا کاندھا تھپتھپایا۔ ''کہو کیا بات ہے۔ عائشہ سے لڑائی تو نہیں ہو گئی؟''

''نہیں......'' بشیرے نے کہا۔ ''تمہیں تو ہمیشہ

فضول باتیں سوجھتی ہیں۔“

”مجھے بیوقوف مت بناؤ بشیرے۔“ سلیم گرجا۔

”سچ بتاؤ کیا بات دل میں لئے بیٹھے ہو......؟“

”سن کر یقین بھی کرو گے؟“ آخر بشیرا پھٹ پڑا۔

”بشیرے اگر تو کہے کہ سورج مشرق کے بجائے مغرب سے نکلتا ہے تو میں یقین کرلوں گا، جھوٹ تو تیرے نصیب ہی میں نہیں لکھا!“

”تو سنو! اگر ہو سکے تو دل کھول کر میرا مذاق اڑاؤ۔“

پھر بشیرے نے اپنی کہانی بے کم و کاست دہرادی۔ سلیم سن ہوگیا۔ وہ گہری متجسس نگاہوں سے بشیرے کے چہرے کو یوں دیکھنے لگا جیسے جاننا چاہتا ہو کہ کہیں اس کے دوست کا دماغ تو نہیں چل گیا...... مگر اس کی باریک بین اور ماہر آنکھیں بتاتی تھیں کہ بشیرے کا دماغ سو فیصد صحت مند ہے۔

”ہنسو خوب ہنسو......! بشیرا سنجیدگی سے بڑبڑایا۔“ ان واقعات پر تو میں نے بھی بڑی مشکل سے یقین کیا تھا۔“

”تم پاگل نہیں ہو بشیر......!“ سلیم گہرا سانس لے کر بولا۔“ اگر تم نے جو کچھ سنایا ہے۔ وہ بھی قرین عقل نہیں۔ بہر کیف تم اب حویلی کو سدھارو آرام سے رات بھر سوؤ اور صبح ناشتہ میرے ہاں کرو سمجھے؟ میں تمہاری اس آپ بیتی پر غور کر کے کل ناشتے پر اپنے خیال سے تمہیں آگاہ کروں گا...... جاؤ خدا حافظ!“

بشیرے کے رخصت ہوتے ہی سلیم نے مطب بند کیا اور گھر چلا گیا، شام کے کھانے سے نمٹ کر وہ اپنی نشست گاہ میں گھس گیا اور آرام کرسی پر نیم دراز ہو کر بشیرے کی کہانی پر غور کرنے لگا۔ وہ جوں جوں واقعات کی کڑیاں ملاتا اسے ان کی صداقت پر یقین ہوتا جاتا مگر کسی مرحلے پر اچانک عقل سلیم آڑے آتی اور خلاف قیاس واقعات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتی۔ کبھی تو خوف اور دہشت سے سلیم کے رونگٹے کھڑے ہوتے اور کبھی اس کا جسم پسینے میں شرابور ہو جاتا، کبھی تو اسے شفاف گاڑھے سیال کا تو وہ سیلاب کی مانند کسی درز میں غائب ہوتا نظر آتا۔ کبھی کتے بلی اور لڑکے کی صورت میں مجسم ہو کر اپنی طرف بڑھتا نظر آتا۔ کئی بار اس کے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اسے اپنی اس ذہنی کشمکش کا شدت سے احساس تھا۔ وہ رہ رہ کر حیران ہوتا تھا...... کہ وہ تو کبھی اتنا ڈرپوک نہیں تھا وہ تو گھور اندھیرے میں بھی ہندوؤں کے شمشان اور پرانے قبرستان سے بے دھڑک گزر جایا کرتا تھا۔ پھر آج اس کے حواس پر اس قدر خوف طاری ہونے کا سبب کیا ہے۔ آدھی رات تک وہ اسی اذیت ناک ادھیڑ بن میں مبتلا رہا اور انجام کار اسے اس کہانی کی صداقت پر یقین آ گیا اور وہ بستر پر لیٹ کر کروٹیں بدلتے بدلتے سو گیا۔

دوسرے دن ناشتے سے قبل ہی بشیرا آدھمکا۔ اسے دیکھتے ہی سلیم کے خیالات میں ایک زبردست انقلاب برپا ہوا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ قہقہہ لگا کر ہنسے۔ مگر پھر بشیرے کی دل آزاری کے خیال سے ضبط کر گیا۔ دن کی روشنی میں بشیرے کی کہانی اپنی صداقت کھو بیٹھی تھی۔ اب وہ کہانی پر اس انداز میں غور کر رہا تھا کہ خواہ کیسے ہی عجیب اور محیر العقول واقعات کیوں نہ پیش آ رہے ہوں ان کا نتیجہ اس طرح سامنے آ جائے کہ اس پر شک کی گنجائش نہ ہو۔

”ہاں تو سلیم...... کیا سوچا تم نے......؟“

معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کوئی لمبا اور بھیانک خواب دیکھا تھا۔“ سلیم نے جواب دیا۔

بشیرے کے ہاتھ سے لقمہ گر گیا اور اس کے چہرے پر شدید ذہنی صدمے کے تاثرات ظاہر ہوئے۔ پھر اسے غصہ آ گیا اور سلیم کے اصرار پر بھی وہ وہاں پل بھی نہ رکا۔

بشیرے کو رخصت ہوئے ابھی مشکل سے بیس منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ چچی فضیلہ آ پہنچی۔ وہ کچھ پریشان سی نظر آتی تھی۔

”کیسے آئیں چچی......؟“ سلیم نے پوچھا۔

''سلیم......'' چچی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
''یہ تمہارے دوست بشیرے کو کیا ہو گیا ہے؟''
''کیا ہو گیا ہے اسے؟'' سلیم کے کان کھڑے ہو گئے۔
''عجیب بہکی بہکی سی باتیں کرنے لگا ہے۔'' چچی نے دونوں ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔ ''کیا اس نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟''
''بتایا تو بہت کچھ ہے۔ کہتا تھا اس کی بلیاں اور کتے غائب ہو گئے ہیں۔'' سلیم نے کہا۔
''اور ان بلیوں کتوں کو ایک بلا لے گئی ہے۔'' چچی نے کہا۔
''ہاں۔ یہی کہتا ہے۔''
''تو تم نے کیا اندازہ لگایا؟'' چچی نے سرگوشی کی۔ ''بھلا یہ باتیں یقین کرنے کے قابل بھی ہیں؟'' پھر وہ قدرے توقف کے بعد بولی۔ ''کہیں اس کا دماغ تو نہیں چل گیا، خدانخواستہ؟ عائشہ اور بشیرا دونوں میں سے ایک کو بھی کچھ ہو گیا تو دونوں کی زندگی تباہ ہو جائے گی......!''
''مگر تم نے یہ کیسے اندازہ لگا لیا کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے؟'' سلیم نے پوچھا۔
''اس کی اول جلول باتوں سے......!''
''اس کی باتیں خواہ کتنی ہی ناقابل یقین کیوں نہ ہوں۔ مگر اس کا دماغ بالکل ٹھیک ہے۔'' سلیم نے کہا۔
''تو پھر اس کی باتیں سچ ہیں؟'' چچی حیران ہو گئی۔
''یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' سلیم نے کہا۔ ''بہرحال تم خاطر رکھو کہ بشیرے کا دماغ خراب نہیں ہوا۔
''خدا کرے تمہاری بات سچ ہو۔'' چچی نے دعا کے لئے ہاتھ بلند کئے، مگر سلیم سن رکھو اگر میری طرح تمہیں بھی اس کی باتوں پر یقین نہیں آیا تو اس کا دماغ ضرور خراب ہے۔''

''چچی...... مجھ پر تم نے کبھی اس قدر بے اعتمادی نہیں کی تھی۔''
سلیم نے قدرے بھنا کر کہا۔ ''فکر مت کرو۔ اس کا دماغ بالکل ٹھیک ہے!''
''تو گویا تمہیں یقین ہے کہ اس گاؤں پر کوئی آفت نازل ہو چکی ہے؟''
''ہاں مجھے اس کی باتوں پر یقین ہے۔'' سلیم نے کہا۔ ''اتنا ہی جتنا اس کی دوستی پر یقین ہے......!''
کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ پھر چچی اٹھی اور رخصت ہو گئی۔
چند دن خاموشی سے گزر گئے اس دوران سلیم سے بشیرا ملنے نہ آیا، ایک دن گاؤں میں شور مچ گیا کہ بڈھے نمبردار کا لڑکا ارشد کہیں غائب ہو گیا ہے وہ راہٹ چلا رہا تھا کہ پیشاب کے لئے۔ گنے کے کھیت میں گھس گیا۔ مگر واپس نہ آیا اور کھیت میں بھی کوئی حرکت نہ ہوئی، تو مجید اس کی تلاش میں گیا، وہ ارشد کے پاؤں کے نشانات پر کھیت میں داخل ہوا، وہ اس جگہ تک جا پہنچا جہاں ارشد بیٹھا تھا۔ ارشد فارغ ہو چکا تھا مگر حیرت کا مقام ہے کہ وہ اس جگہ سے اٹھ کر کہیں نہیں گیا تھا کیونکہ مرطوب زمین پر اس کے پاؤں کے نشانات موجود تھے۔
سلیم نے یہ خبر سنی تو خوف سے اس کی رگوں میں خون منجمد ہو گیا اور اس کا دل دھک دھک کرنے لگا اب اسے بشیرے کی خلاف عقل کہانی پر کوئی شبہ نہ رہا، پہلے لالو لوہار کا لڑکا طیفو غائب ہوا، اور اب نمبردار کا ارشد اس بلا کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر گاؤں والوں کو اس آفت ناگہانی کے نزول سے آگاہ کر دے مگر اسے ہمت نہ ہوئی۔ کیونکہ آج تک تو وہ بھی بشیرے کی باتوں پر یقین کرنے پر تیار نہ ہوا تھا۔ پھر اس کی بات پر لوگ کیوں یقین کرنے لگے۔
سلیم خاموش رہا۔ اور دن گزرتے رہے، تین ہفتے تک کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔ البتہ اس دوران بشیرے اور سلیم میں ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ بشیرے نے نمبردار کے بیٹے کی گمشدگی کا سرسری تذکرہ کیا تھا

کہ سلیم نے فوراً اس کی گمشدگی کو اس بلا کا کارنامہ قرار دے دیا۔ اب دونوں دوست اس بلا کے وجود کو سنجیدگی سے تسلیم کر چکے تھے۔

ایک ہفتہ بعد عائشہ اور بشیرے کی شادی ہوگئی، شادی اس دھوم دھڑکے سے ہوئی کہ پڑوس آبادیوں تک خبر ہوگئی۔ اور عائشہ فارم والی حویلی میں چلی گئی، چچی بیچاری اکیلی رہ گئی۔ وہ سیدھی سلیم کے پاس پہنچی۔ اور اسے اپنے احساس تنہائی سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہ بشیرے کو اس بات پر مجبور کرے کہ عائشہ کو وہ سات دن حویلی میں رکھے اور سات دن گاؤں میں۔'' بشیرے نے یہ تجویز بے چوں وچرا مان لی۔

عائشہ ایک ہفتہ اپنی ماں کے پاس گزار کر حویلی میں چلی گئی تھی کہ ایک روز سلیم کے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ وہ بھی گھوڑے پر سوار ہوا اور بشیرے کی حویلی جا پہنچا۔ بشیرا ایک کھیت کے پاس کھڑا فصل کو دیکھ رہا تھا...... گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سن کر وہ پلٹا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا سلیم کے پاس آیا۔ بشیرے کے چہرے سے بے پناہ تھکاوٹ ٹپک رہی تھی جیسے وہ کئی دن تک سو نہ سکا ہو۔

''کیا حال ہے بشیرے؟'' سلیم نے پوچھا۔ ''بہت تھکے تھکے سے معلوم ہوتے ہو۔''

''بشیرا ایک قدم اور آگے بڑھا اور سلیم کے کان کے قریب منہ لے جا کر خوف زدہ آواز میں بولا۔

''سلیم...... میری حویلی زبردست خطرے میں گھری ہوئی ہے۔ میں بہت کچھ محسوس کر رہا ہوں۔ ہفتے بھر سے عجیب عجیب چیزیں دیکھ رہا ہوں۔ مگر میں نے عائشہ کو کچھ نہیں بتایا اب تک۔ میں اسے بتا بھی تو نہیں سکتا! میں نے فیصلہ کیا ہے کہ حویلی بیچ کر کسی محفوظ جگہ پر اچھا سا مکان خرید لوں۔ میں نے عائشہ پر یہ خیال ظاہر کیا اور اس سے صرف اتنا کہ یہاں خطرہ ہے کیوں نہ حویلی بیچ کر گاؤں میں رہ لیا جائے۔ میری بات سن کر وہ ہنسنے لگی۔ اسے ہنسنا ہی چاہئے کیونکہ اس نے وہ چیزیں نہیں دیکھیں جو میں دیکھ چکا ہوں۔''

''مگر تم نے کیا دیکھا ہے؟'' سلیم نے حیرت سے پوچھا۔

''تم بھی دیکھنا چاہتے ہو؟''

''ہاں...... کیوں نہیں؟''

''تو پھر ابھی واپس چلے جاؤ اور رات میں یہاں آؤ۔ جب عائشہ سو چکی ہو۔'' بشیرے نے سرگوشی کی۔

''بہت خوب...... میں رات کو آؤں گا۔'' سلیم نے جواب دیا۔

''جا کہاں رہے ہو۔ عائشہ سے تو مل لو۔'' بشیرے نے کہا۔ اور وہ دونوں حویلی کی طرف چل پڑے۔

عائشہ سے باورچی خانے میں ملاقات ہوئی، پرشباب عائشہ پھول کی طرح شگفتہ ہو چکی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے سلیم کا خیر مقدم کیا۔ اور سلیم اس کے حسن و شباب کے سحر میں ڈوبا بہت دیر تک ان سے باتیں کرتا رہا۔

شام کے وقت شمال کی جانب سے زبردست آندھی اٹھی۔ آندھی کیا تھی قیامت تھی، بڑے بڑے تناور درخت جڑوں سے اکھڑ گئے تھے۔ نصف شب تک آندھی کا زور نہ ٹوٹا۔ اس عالم میں سلیم وعدہ کے مطابق بشیرے کے پاس کیسے جا سکتا تھا۔ چنانچہ وہ سو گیا۔ صبح اٹھا تو فضا پرسکون تھی۔ آندھی گزر چکی تھی۔ مگر اس کی برپا کردہ تباہی کے آثار ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔

سلیم ناشتہ کرنے کے بعد مطب پہنچا۔ ابھی وہ چند ایک زخمیوں کی مرہم پٹی سے فارغ ہوا تھا کہ چچی فضیلہ ہانپتی ہوئی اس کے پاس آئی۔

''خیر تو ہے...... بہت گھبرائی ہوئی ہو چچی؟'' سلیم نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔

''آج رات گاؤں سے دو جوان لڑکیاں اور تین لڑکے غائب ہوگئے۔'' چچی نے کانپتی ہوئی آواز میں انکشاف کیا۔ یہ سب رات کو گھروں میں سو رہے تھے۔ یہ کیا ہو رہا ہے سلیم، کیا بشیرا سچ کہہ رہا تھا؟''

''ہاں چچی......'' سلیم صرف اتنا ہی کہہ سکا

اور آنکھیں موند کر کرسی پر نیم دراز ہوگیا۔ کچھ دیر اس عالم میں پڑا رہا، پھر وہ اٹھا اور سیدھا نمبردار کی بیٹھک میں جا پہنچا۔ نمبردار وہاں اکیلا نہیں تھا بلکہ تیس چالیس آدمیوں نے اسے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''السلام علیکم.....!'' سلیم نے آواز بلند کہا اور سب چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔

''وعلیکم السلام سلیم الدین۔'' اچھا ہوا تم خود ہی آگئے۔'' نمبردار نے کہا۔ ''بتاؤ یہ کیا ہو رہا ہے؟''

''سلیم نے کوئی جواب نہ دیا اور سر جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا، وہ شش و پنج میں پڑ گیا تھا کہ آیا انہیں اس ناقابل یقین حقیقت سے آگاہ کردے یا نہیں۔

''میری بات کا تم نے کوئی جواب نہیں دیا سلیم الدین۔'' نمبردار کی آواز میں اشتیاق اور امید کی جھلک تھی۔

''کیا بتاؤں نمبردار جی۔'' بالآخر سلیم نے سر اٹھایا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ.....''

ابھی وہ اپنا جملہ بھی پورا نہ کرپایا تھا کہ مہر دین بیٹھک میں داخل ہوا، وہ بہت پریشان تھا۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

''سلیم الدین..... آپ کا لڑکا بھی غائب ہوگیا۔'' مہردین چلایا۔ ''بھنگیوں کے محلے میں تین لڑکیاں بھی لاپتہ ہیں۔''

''اوہ میرے خدا.....!'' سلیم تڑپ کر اٹھا اور گھر کی طرف بھاگنا ہی چاہتا تھا کہ نمبردار نے اس کا بازو تھام لیا۔

''سلیم۔ یوں گھبرانے اور حواس کھودینے سے معاملہ نہیں سلجھے گا۔''

''تم ہمارے گاؤں میں سب سے زیادہ پڑھے لکھے آدمی ہو۔ ذرا سکون سے بیٹھو اور اس مصیبت سے چھٹکارے کی کوئی تدبیر سوچتے ہیں۔ آخر یہ لڑکے لڑکیاں کہاں غائب ہو رہے ہیں!''

''کیا.....؟'' نمبردار ایک جھٹکے سے کھڑا ہوگیا۔

''تو اب تک خاموش کیوں بیٹھے ہو؟'' بیٹھک میں شور سا مچ گیا۔ لوگ سخت مضطرب ہوگئے تھے۔

''تم لوگ میری بات پر یقین نہیں کرو گے۔'' سلیم نے کھڑے کھڑے سب لوگوں کا طائرانہ نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم لوگوں نے میری بات پر یقین نہ کیا تو تباہی سے بچ نہ سکو گے اس لئے میری باتیں دھیان سے سنو اور پھر صلاح مشورے سے اس بلا کے سدباب کی تدابیر کرو۔''

پھر سلیم نے جو کہانی سنائی، اسے سن کر چند لوگ استفہامیہ انداز میں مسکرانے لگے، کچھ خوف زدہ ہوگئے اور کچھ حیرت سے گنگ ہوگئے۔

''بہت عجیب سی بات سنائی ہے تم نے!'' نمبردار نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''خیر تو تمہی بتاؤ اس مصیبت سے چھٹکارا کیسے حاصل کیا جائے؟''

''سردست تو صرف یہ کام کیا جائے کہ رات کو ہر گھر میں ایک فرد پہرہ دے۔ سب کا سوجانا خطرے سے خالی نہیں۔ یہ بلا عموماً رات کو حملہ کرتی ہے اگر کسی کو خواب گاہ میں پانی کا سا بے رنگ اور گاڑھا سیال داخل ہوتا نظر آئے تو شور مچا دے!

رہا دن کا سوال تو روشنی میں یہ چیز ہر ایک کو صاف نظر آئے گی بشرطیکہ سب لوگ آنکھیں کھلی رکھیں۔''

''اس کے باوجود کسی کی جان گئی تو؟'' ایک نوجوان نے سوال اٹھایا۔

''تمہارا سوال معقول ہے۔'' نمبردار نے اس کی تائید کی۔ پھر وہ سلیم سے مخاطب ہوا۔ ''اس صورت میں کیا ہوگا۔''

''اسے دیکھتے ہی لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے اس پر حملہ کردیا جائے۔'' سلیم کے بجائے ایک اور شخص بول اٹھا۔

''ہاں..... یہ تجویز معقول ہے۔'' سب نے تائید کی۔ اور محفل برخاست ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد گاؤں

والوں کو اس اسکیم سے آگاہ کردیا گیا۔
''سلیم آج مطب میں نہ گیا۔ نوجوان بیٹے کی گمشدگی نے اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے کردیا تھا اور اس کی بیوی رو رو کر پاگل ہوئی جارہی تھی..... سہ پہر کو بشیرا آدھمکا۔
''صبر کرو سلیم.....!'' بشیرے نے اسے بازوؤں میں لیتے ہوئے کہا..... ''میں آج اس آفت کو ختم کردوں گا۔'' ''تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔'' بشیرے نے پرعزم لہجے میں کہا۔ ''اٹھو۔ میرے ساتھ حویلی چلو۔ آج رات ہم دونوں اسے تباہ کردیں گے۔ یا اسے مار بھگائیں گے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس گاؤں میں اس آفت سے میں نجات دلا دوں گا، بس مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔!''
''سلیم ایک معمول کی طرح بشیرے کے ساتھ ہولیا، وہ دونوں چچی فضیلہ کے گھر پہنچے، چچی بہت خوفزدہ اور افسردہ تھی اسے اپنی عائشہ کا غم کھائے جارہا تھا جو حویلی میں تنہا تھی۔
شام ہوئی تو وہ دونوں گھوڑوں پر سوار ہوئے اور حویلی کی جانب روانہ ہوگئے۔ سلیم کی کیفیت اس وقت عجیب تھی۔ وہ خائف بھی تھا اور اس چیز کو دیکھنے کا مشتاق بھی، وہ بیٹے کی گمشدگی پر غمگین بھی تھا اور اس آفت سے گاؤں کو نجات دلانے کا خواہاں بھی۔
دونوں حویلی میں پہنچ گئے۔ عائشہ نے انہیں گرم گرم دودھ پلایا اور ایک آدھ گھنٹہ باتیں کرنے کے بعد وہ اونگھنے لگی۔
''عائشہ جاؤ۔ آرام کرو۔ تمہیں نیند آرہی۔'' بشیرے نے کہا۔ عائشہ نے سلیم کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔ سلیم نے اثبات میں سر ہلادیا۔ عائشہ خواب گاہ میں داخل ہوئی اور دھڑام سے پلنگ پر گری۔ بشیرے نے اٹھ کر خواب گاہ کا برآمدے میں کھلنے والا دروازہ اندر سے بند کیا اور پھر باورچی خانے میں آکر باورچی خانے میں کھلنے والا دروازہ بھی بند کرلیا۔
''لو حقہ پیو!'' بشیرے نے حقے کی نے سلیم کے ہاتھ میں تھمائی اور خود کونے میں پڑے لکڑی کے ایک چھوٹے سے بکس کی طرف بڑھا۔ وہ بکس اٹھا کر سلیم کے پاس آبیٹھا۔
''اس بکس میں موم رکھا ہوا۔'' بشیرے نے بکس کھولتے ہوئے کہا۔ ''خواب گاہ کے دونوں دروازے نئے ہیں اور ان میں معمولی سی بھی درز نہیں ہے۔ پھر بھی میں احتیاطاً یہ موم پگھلا کر دروازے کے جوڑوں اور دہلیز کی درزوں پر ڈال دینا چاہتا ہوں۔ اس طرح ایک تو عائشہ سردی سے محفوظ رہے گی دوسرے اس چیز کو خواب گاہ میں داخل ہونے کا راستہ نہیں ملے گا۔''
''کیا تمہیں اس چیز کے آج رات یہاں آنے کا اتنا یقین ہے بشیرے؟'' سلیم نے گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا۔
''یقین کیوں نہ ہو۔'' بشیرے نے سلیم کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''یہ حویلی تو اس کا گھر ہے۔ میں اسے تقریباً ہر رات یہاں دیکھتا ہوں۔''
پھر اس نے موم کا ایک بڑا سا ڈھیلا ایک کھلے منہ والے دیگچے میں ڈال کر اسے چولہے پر رکھ دیا۔ پل بھر میں موم پگھل کر سیال بن گیا۔ اس نے کپڑے کی مدد سے دیگچے کو چولہے پر سے اتارا اور صاف شفاف موم کو ہلاتے ہوئے بولا۔
''وہ بلا بالکل ایسی ہے۔ اس پگھلے ہوئے موم کی طرح اگر یہ تھوڑا سا گاڑھا ہوتا تو بالکل ویسا ہی نظر آتا۔''
سلیم نے جھرجھری لی اور بشیرے نے ایک چمچے کے ذریعے دروازے کی جھریوں اور درزوں کو بند کرنا شروع کیا۔ آدھ گھنٹے تک وہ اس کام میں مصروف رہا اور سلیم بڑی بے چینی سے حقہ گڑگڑاتا رہا۔ اپنے کام سے فراغت پاکر بشیرا اس کے قریب آبیٹھا۔
''یہ چیز پرسوں رات آئی تھی۔ صرف کل نہیں آئی۔ آج ضرور آئے گی۔'' بشیرا نے کہا۔ ''اب میں بہت تھک گیا ہوں میرا انگ انگ ٹوٹ رہا ہے یوں لگتا

ہے اب مرجاؤں گا، تین راتوں سے اونگھ بھی نہیں سکا۔"
سلیم نے اس کے مضمحل چہرے کو دیکھا۔ بشیرے کی آنکھیں خون کی طرح سرخ ہو رہی تھیں اور پچکے ہوئے رخساروں نے اس کو ڈراؤنا بنا رکھا تھا۔
"تم سو کیوں نہیں جاتے۔" سلیم نے غیر معمولی جرأت کا مظاہرہ کیا۔ "میں پہرہ دوں گا۔"
"زیادہ خوفزدہ نہ ہونا۔" بشیرا زیر لب مسکرایا۔
"وہ چیز اس وقت تک یہاں نہیں آئے گی جب تک تم سو نہیں جاتے یا اسے خود اندر نہیں بلاتے، میرا تجربہ یہی بتاتا ہے، بہرکیف اس طرح کا کوئی واقعہ پیش آئے تو مجھے جگا دینا؟"
"اچھا میں سمجھ گیا۔" سلیم نے اثبات میں سر ہلایا۔ "تم بے فکر ہو کر سو جاؤ۔"
"بشیرا نڈھال سا ہو کر کرسی کی پشت گاہ سے ٹک گیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ سو چکا تھا۔
باہر تیز ہوا چل رہی تھی۔ اور ہوا کے جھکڑوں سے کھڑکی کے پٹ بار بار بھڑ بھڑا رہے تھے، سلیم نے کھڑکی کے شیشوں سے بڑی تجسس نگاہوں سے باہر کا جائزہ لیا۔ بشیرے نے اس کھڑکی کو بھی میخوں کے ذریعے بند کر رکھا تھا اور اس کے درزوں کو بھی موم سے اچھی طرح بند کر دیا تھا۔ سلیم بے چینی سے اٹھ کر برآمدے میں آ گیا۔ اس نے خواب گاہ کی کھڑکیوں کا بغور معائنہ کیا تو معلوم ہوا کہ ان کھڑکیوں کو بھی بڑی بڑی میخوں کے ذریعے بند کر کے درزوں میں موم بھر دیا گیا ہے۔
"خوب تو اس نے تمام راستے بند کر دیئے ہیں۔" سلیم زیر لب بڑبڑایا۔ "واقعی۔ اب خواب گاہ میں ہوا بھی داخل نہیں ہو سکتی، بڑے سکون سے سوئے گی عائشہ!"
وہ پھر باورچی خانے میں آ گیا اور اسے شدت سے یہ ناخوشگوار احساس ہوا کہ اسے آج رات یہاں پہرہ دینا ہے بہت دیر تک کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا، نہ سلیم کو کوئی چیز دکھائی دی۔ بشیرا بے سدھ سو رہا تھا۔ چولہے میں آگ جل رہی تھی اور کمرے میں مرگ سا سکوت چھایا ہوا تھا۔ سلیم اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔
اور...... پھر...... دفعتاً جیسے بجلی کا ایک جھماکا سا ہوا۔ کمرے کا سکون درہم برہم ہو گیا۔ سلیم کا احساس تحفظ یوں زائل ہو گیا جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔
کمرے کے ماحول میں بظاہر کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی کوئی چیونٹی تک اندر داخل ہوتی نظر آئی تھی بس ایک شدید احساس تھا۔ جس نے سلیم کی روح کو جکڑ لیا تھا کہ کسی انتہا فعال زبردست اور عنا پرست قوت نے اس حویلی پر اپنی تمام تر توجہ مرکوز کر دی ہے۔ سلیم ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا پھر اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا اور دروازے سے کان لگا کر کوئی آواز سننے کی کوشش کرنے لگا۔
مگر اسے ہوا کی سرسراہٹ کے سوا کچھ سنائی نہ دیا۔ وہ پانچ منٹ تک وہیں کھڑا رہا۔ اب تک عدم تحفظ کا احساس اپنی تمام تر شدت کے ساتھ اس پر طاری تھا۔ اچانک اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھولا اور صحن میں نکل گیا۔ مگر وہاں کچھ ہوتا تو نظر بھی آتا وہ پھر باورچی خانے میں لوٹ آیا اور...... پھر...... اسے کھڑکی کی دہلیز پر کوئی چیز حرکت کرتی نظر آئی، ایک لمحہ کے لئے اس نے شفاف سیال کو دہلیز پر بہتے دیکھا۔
وہ سیال بے رنگ گاڑھا تھا اور پگھلے ہوئے موم جیسا تھا۔ اس کی کوئی خاص شکل نہیں تھی پھر بھی اس کا وجود تھا، جو تیزی سے حرکت کرتا ہوا کھڑکی کی دہلیز کے نیچے جذب ہو گیا تھا۔ نظارہ بہت مختصر تھا۔ اس لئے سلیم کو شبہ سا ہونے لگا کہ کہیں اس کے حواس مختل نہیں ہو گئے۔ ممکن ہے اس نے جو کچھ دیکھا اس کے واہمے کی پیداوار ہو، یہی سوچتے سوچتے وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس پہنچا۔ اس نے لاشعوری طور پر کھڑکی سے باہر جھانکا تو اسے کھڑکی کی بیرونی دہلیز پر ایک خاص جگہ سے گرد و غبار ہٹا ہوا دکھائی دیا جیسے کسی شخص نے بالوں کے نرم برش سے اتنی جگہ بڑے اہتمام سے صاف کر دی ہو۔

سلیم کا دماغ سنسنا گیا اس آندھی میں بھلا یہ جگہ غبار سے کس طرح صاف رہ سکتی تھی اس سے ثابت ہوتا تھا کہ ابھی کوئی چیز کھڑکی کی دہلیز پر رینگتی ہوئی باہر اڑ گئی ہے اور اسے گرتے ہوئے ابھی ایک منٹ بھی نہیں گزرا۔ ظاہر ہے وہ چیز وہی سیال مخلوق تھی جو کمرے میں سلیم کی آنکھوں کے سامنے کھڑکی کی دہلیز میں جذب ہو کر خارج ہوئی تھی، سلیم کھڑکی سے ہٹا اور اس کے پاؤں خود بخود دروازے کی طرف اٹھنے لگے۔ دروازے میں کھڑے ہو کر وہ باہر دیکھنے لگا اور اس کے ہونٹ لاشعوری انداز میں حرکت کرنے لگے، اس کے منہ سے کچھ ایسے الفاظ برآمد ہونے لگے جو سنائی نہیں دے سکتے تھے وہ دروازے سے باہر نکلا اور اس کھڑکی کے قریب جا کھڑا ہوا جس کی دہلیز میں جذب ہو کر وہ سیال مخلوق پھر باہر کی دہلیز پر برآمد ہوئی تھی اب پھر اس مقام پر گرد و غبار کی تہہ جمنا شروع ہوگئی تھی مگر اب بھی واضح طور پر اس جگہ پر کسی نرم چیز کے گھسٹ کر اترنے کا نشان موجود تھا۔ اس نے زمین پر نظر ڈالی تو اسے عجیب منظر دکھائی دیا۔

زمین پر بھی کسی بھاری چیز کے رینگنے کا نشان موجود تھا جیسے کوئی موٹا سانپ بل کھاتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف بڑھ رہا ہو۔ نشان خاصا کشادہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ لوہے کا بہت بڑا گیند لڑھکتا چلا گیا ہو، جس کے گزرنے کا واضح نشان زمین پر رہ گیا تھا، اس نے غور سے اس نشان کو دیکھنا شروع کیا اور اس کے ساتھ ساتھ بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ جب وہ ڈیوڑھی کے قریب پہنچا تو گیند کا نشان غائب ہو گیا اور اس کے آگے اسے انسانی قدموں کے نشانات نظر آنے لگے۔

انسانی پاؤں کے نشانات جو صحن کی سخت زمین میں تین انچ تک دھنسے ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر سلیم کا حوصلہ اور ہمت یکسر جواب دے گئی اور وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ اس کے ذہن میں اس وقت صرف ایک ہی خیال گونج رہا تھا اور وہ یہ کہ جتنی تیزی سے ممکن ہو سکے بھاگ کر واپس باورچی خانے میں جا گھسے پھر وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اور پل بھر میں باورچی خانے کے اندر داخل ہو گیا۔

بشیرا بیدار ہو چکا تھا دروازہ جو چوپٹ کھلا تھا، سرد ہوا کے جھونکوں نے اسے جھنجھوڑ ڈالا ہوگا، اس نے پہلے تو سلیم کی طرف خالی خالی نگاہوں سے دیکھا اور پھر ایک بارگی چونک پڑا۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے، جیسے وہ معاملہ کی تہہ تک پہنچ گیا ہو۔ وہ کرسی میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور ہاتھ سر سے اوپر اٹھا کر طویل انگڑائی لے کر سلیم سے پوچھنے لگا۔

''کیا دروازے پر کوئی آیا تھا۔''

''سلیم نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہاں وہ سیال چیز مجھے دکھائی دی۔ وہ کھڑکی کی دہلیز میں جذب ہو گئی تھی۔ میں وقت ضائع کیے بغیر نکلا تو مجھے اس کے جانے کے نشانات زمین پر دکھائی دیئے۔''

''کیسے نشانات؟'' بشیرے نے شک آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''انسانی قدموں کے نشانات یا ایسے نشانات جو کسی رینگنے والی مخلوق کے دکھائی دیتے ہیں؟''

''دونوں طرح کے!'' سلیم خوفناک آواز میں جیسے چیخ سا پڑا۔

بشیرے نے بڑے معنی خیز انداز میں سر ہلایا مگر منہ سے کچھ نہ بولا۔ دونوں سپیدۂ سحر نمودار ہونے تک ایک دوسرے کے سامنے خاموش بیٹھے رہے۔ پھر بشیرا اٹھا اور دروازے سے موم کھرچنے میں مصروف ہو گیا۔ سلیم نے اس سے رخصت لی اور گاؤں کو چلا آیا۔ دوپہر تک وہ گہری نیند سویا اگرچہ اس کا اپنا لڑکا بھی اس بلا کی خوراک بن چکا تھا مگر نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے رات کو جاگنے کی وجہ سے وہ بہت تھک گیا تھا اتفاق سے اس روز گاؤں میں کسی فرد کے غائب ہونے کا شور بلند نہ ہوا، لوگ یہی سمجھے کہ شاید سلیم الدین نے اس بلا کا قلع قمع کر دیا ہے مگر نمبردار کے سوا سلیم نے کسی سے ملاقات

نہ کی اسے صورت حال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ وہ آج رات پھر بشیرے کی حویلی کی نگرانی کرے گا اور ممکن ہوا تو اس سیال مخلوق کو نیست و نابود کردے گا اس لئے فکر مند نہ ہو۔

سورج غروب ہونے کے بعد سلیم بشیر کے پاس جا پہنچا۔ دونوں میاں بیوی اس کے منتظر تھے۔ عائشہ کے حسین چہرے پر دلی جوش کے سے جذبات نظر آتے تھے، سلیم نے محسوس کیا کہ ہو نہ ہو بشیرے نے اپنی بیوی کو بھی اس ہولناک راز سے ضرور آگاہ کردیا ہے کیونکہ عائشہ کے چہرے سے ایسا عزم جھلک رہا تھا جیسے اس نے اس کریہہ اور خونخوار چیز کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کرلیا ہو۔

عائشہ اٹھی اور اپنے کمرے میں سے شطرنج اٹھا لائی۔ دراصل پروگرام یہ بنایا گیا تھا کہ دونوں رات بھر کھیلتے رہیں۔ ابھی انہوں نے کھیل شروع بھی نہیں کیا تھا کہ حویلی کی چار دیواری سے باہر گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی اور پھر گھوڑا حویلی کے دروازے پر پہنچا اور دروازے پر رک گیا۔ اس سے پیشتر کہ نووارد دستک دیتا بشیرا بھاگم بھاگ دروازے پر پہنچا اور دروازہ کھول دیا پھر وہ شمشیر علی کے ساتھ واپس آیا، وہ بھی شام نگر کا ایک زمیندار تھا۔ اس کا زرعی فارم بشیرے کی زمینوں سے دو میل شمال میں گاؤں کے قریب ہی واقع تھا۔ گزشتہ وہ خاندان سمیت فارم کی حویلی میں منتقل ہوگیا تھا، وہ مہینوں گاؤں کا رخ نہیں کرتا تھا۔

''عائشہ بیٹی......!'' وہ بیٹھتے ہی بولا۔ ''کہیں تم نے میری بیٹی نصرت کو تو نہیں دیکھا؟''

یہ سن کر سب کے چہرے زرد پڑ گئے۔

''نہیں چاچا۔ مجھے تو وہ کہیں دکھائی نہیں دی۔'' عائشہ نے لرزتی آواز کے ساتھ جواب دیا۔

''نہ جانے وہ کہاں چلی گئی۔ آج صبح بستر سے غائب تھی!''

''تو کیا آپ......!'' سلیم نے کچھ کہنا چاہا مگر بشیرے نے ہاتھ کے اشارے سے اسے چپ رہنے کی تلقین کی۔

''آپ زیادہ پریشان نہ ہوں، چچا ہم اسے تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔'' بشیرے نے اسے تسلی دی اور شمشیر علی غمگین صورت لئے ان سے رخصت ہوگیا۔ اس کے جاتے ہی سلیم نے گھبرا کر بشیرے سے پوچھا۔

''تو کیا نصرت بھی......؟''

''ہاں ہاں بے شک......!'' بسیرے نے بڑے وثوق سے جواب دیا۔

''پھر تو صورت حال انتہائی خطرناک ہوگئی ہے بشیرے۔'' سلیم کا چہرہ برف کی طرح سفید ہو چکا تھا۔

''دیکھو سلیم...... تمہارا عائشہ کے سامنے اس طرح ڈرنا باعث شرم ہے۔'' بشیرا پھنکارا۔ ''اس آفت کا سامنا کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کرو۔ موت سے کسی ذی روح کو مفر نہیں، اور تم جانتے ہو موت کا وقت معین ہے۔ پھر کیوں نہ بہادر لوگوں کی طرح جیا جائے۔''

''سلیم اس کی باتیں سن کر حیران رہ گیا۔ اس کے چہرے سے خوف کے آثار مٹ گئے۔

''ارے تم......؟'' سلیم نے اس کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''بشیرے تم چھپے رستم نکلے۔ تمہاری ذہانت کا تو میں ضرور قائل تھا مگر تمہیں اتنا شجاع اور بے باک ہرگز نہیں سمجھتا تھا۔

''چلو۔ تمہاری یہ غلط فہمی بھی دور ہوگئی۔'' بشیرا ہنسا۔ ''اچھا تو اب کھیل شروع کیا جائے۔''

دونوں کھیلنے میں مگن ہوگئے اور عائشہ چراغ کے پاس بیٹھ کر بشیرے کا سوئٹر بننے میں مصروف ہوگئی، رات گئے تک کھیل کا سلسلہ جاری رہا، اس دوران کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا۔ عارضی طور پر ان کے ذہنوں سے یہ احساس تک ڈھل گیا کہ اس مکان پر کسی مافوق الفطرت اور منحوس قوت کی توجہ مرکوز ہے، اس وقت کا گھر ماحول بہت پرسکون اور خوشگوار تھا۔ اس دوران سلیم کی طرف سے کبھی کسی بدحواسی یا

بوکھلاہٹ کا اظہار نہیں ہوا، وہ اپنی اس پرسکون حالت پر دل ہی دل میں حیران ہورہا تھا اور پھر کوئی حادثہ پیش آئے بغیر رات سکون سے گزر گئی۔
سلیم دن بھر سوتا رہا۔ دوپہر ڈھلے بیدار ہوا نہایا دھویا، پیٹ پوجا کی اور سیدھے نمبردار کے پاس جا پہنچا۔ نمبردار نے بھی کوئی بری خبر نہ سنائی اور اسے سلیم کی حکمت عملی کا خوشگوار نتیجہ قرار دیا۔ سلیم خاموشی سے گھر چلا آیا اور شام تک بیوی کی دلجوئی کرتا رہا۔
سورج غروب ہوا تو وہ گھوڑے پر سوار ہوکر بشیرے کی حویلی پہنچ گیا۔ یہ رات بھی کوئی خوفناک یادگار چھوڑے بغیر خاموشی سے گزر گئی، اس پر بشیرے نے یہ توجیہہ پیش کی کہ بلا کسی اور مقام پر تباہی مچارہی ہوگی یا ممکن ہے وہ آرام کررہی ہو۔
حالات پرسکون ہوچکے تھے اس لئے سلیم کو شدت سے احساس ہوا کہ وہ مطب کے کاروبار کو بری طرح انداز کرہا ہے کیونکہ وہ کئی دن بشیرے کی حویلی کی وجہ سے غیر حاضر رہا۔ لوگوں کو اس کی خدمات درکار تھیں اس لئے پورے انہاک اور اخلاص سے اس نے مریضوں کا علاج کرنے کے لئے مطب کھول لیا۔
اور ایک روز اسے بشیرے کا پیغام ملا جو ان الفاظ پر مشتمل تھا۔ ''وہ واپس آچکی ہے...... چلے آؤ......!''
رات کا کھانا زہر مار کرنے کے بعد سلیم دھڑکتے دل کے ساتھ گھوڑے کی پشت پر سوار ہوا اور چاروں طرف تجسس نگاہوں سے دیکھتا ہوا بشیرے کے فارم جا پہنچا۔ گزشتہ دو دن بارش ہونے کی وجہ سے راستے کیچڑ سے بھر گئے تھے۔ وہ گھر میں داخل ہوا تو دونوں میاں بیوی کی حالت دیکھ کر متعجب ہوا۔ وہ بری طرح تھکے ہوئے لگتے تھے جیسے کئی دن سے جاگ رہے ہوں۔ بشیرے کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی، بشیرے نے سلیم کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے مردہ سی آواز میں کہا۔
''ہم تمہیں تکلیف تو نہ دیتے مگر ہم دونوں اب تھکان سے ادھ موئے ہوچکے ہیں۔ راتوں کو تو پل بھر بھی نہ سوسکے اور تین دن تک، دن کے وقت بھی باری باری تھوڑی دیر کے لئے سوتے رہے ہیں، دراصل وہ شے دن میں بھی قرب وجوار میں اپنی موجودگی کا احساس دلارہی ہے۔ اب ہم بہت تھک چکے ہیں۔!''
''خاموشی سے بیٹھ جاؤ اور منہ سے کوئی آواز نہ نکالو۔'' عائشہ نے سرگوشی کی۔ ''تمہیں خود ہی اس کی موجودگی کا احساس ہونے لگے گا۔''
''سلیم اس کی ہدایت کے مطابق دم سادھ کر بیٹھ گیا اور دوسرے ہی لمحے سرسراتے اور رینگتے ہوئے خوف کی لہریں اس کے جسم میں سنسنی پیدا کرنے لگیں۔ بالکل وہی کریہہ اور مہیب خوف اس کے اعصاب پر طاری ہوگیا جو اس چیز کو دیکھ کر طاری ہوا تھا اس نے سراسیمہ نگاہوں سے دونوں کی جانب دیکھا۔ اور ڈوبی ہوئی آواز میں بولا۔
''ہاں میں محسوس کررہا ہوں۔ وہ واپس آگئی ہے۔ عائشہ تم دونوں بھی تو نڈھال ہورہے ہو۔ تم سکون سے سوجاؤ۔ میں پہرہ دوں گا...... جاؤ...... سوجاؤ؟''
''ہاں عائشہ تم اپنے بستر پر لیٹ جاؤ اور سونے کی کوشش کرو۔'' بشیرا بولا۔
''سلیم میرے پاس بیٹھے گا اس طرح تمہیں کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔''
عائشہ نے باری باری دونوں کے چہروں کو متردد نگاہوں سے دیکھا اور بے دلی سے خواب گاہ میں داخل ہوگئی۔ اس کے جاتے ہی بشیرے نے گرم گرم دودھ کا پیالہ سلیم کے ہاتھ میں تھمادیا۔ سلیم دودھ پینے کے بعد بولا۔
''بشیرے ہم اس شے کو دو طریقوں سے تباہ کرسکتے ہیں، ہم جانتے ہیں کہ یہ سیال انسانوں اور مختلف حیوانوں کے خلیوں سے ترتیب پایا ہے اور اسے کوئی خبیث ہستی کنٹرول کررہی ہے، وہ ہستی شاید موت سے ناآشنا ہے وہ زندہ سیال بھی انسانی فطرت کے مطابق آرام کی خواہش مند ہوتی ہوگی اور آرام کے لئے کسی مستقل ٹھکانے کی محتاج ہوگی۔ ہمیں اس کا

مستقل ٹھکانا معلوم کرنا چاہئے ممکن ہے کہ یہ کسی غار، کسی درخت کے کھوکھلے تنے، خرگوشوں کے کسی بھٹ یا ایسے ہی کسی ویران مقام پر پناہ لیتی ہو۔ اگر ہم اس کا ٹھکانا ڈھونڈ کر اسے وہیں بند کردیں، اور اس کے باہر نکلنے کی تمام راہیں مسدود کردیں تو ہم اس پر فتح پالیں گے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی انتہائی مضبوط اور ناقابل شکست قوت ارادی سے چیلنج کردے اور اپنے آپ کو اس کی خوراک کے طور پر پیش کردے۔ وہ چیز چونکہ خوف اور اسی نوعیت کے دوسرے انسانی جذبات سے عاری ہے اس لئے وہ اس کی دعوت کو بصد آمادگی قبول کرے گی۔ وہ شخص اس کی خوراک بن کر اس کا جزو بن جائے گا۔ اگر وہ شخص قوت ارادی کے بل پر اپنی ہستی کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوگیا تو اس چیز کو شکست دینے میں کامیاب ہوجائے گا ورنہ معمولی سی کمزوری کی صورت میں وہ مدغم ہوجائے گا اور وہ شے انسانوں اور حیوانوں کو شکار کرتی رہے گی اور اس کے سدباب کا انسان کوئی ذریعہ تلاش نہیں کرپائے گا۔''

اپنی بات ختم کرکے سلیم نے ایک نظر بشیرے کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں بند ہوچکی تھیں۔ تاہم سلیم کو خاموش پاکر بڑی مشکل سے یہ چند الفاظ کہہ سکا۔

''مجھے نیند آرہی ہے۔'' اور پھر اس کا سر بے قابو ہوکر بائیں جانب ڈھلک گیا۔

سلیم نے جیب سے ایک کتاب نکالی اور مطالعے میں معروف ہوگیا کیونکہ طویل شب بیداری اس کے سامنے تھی۔ وقت دبے پاؤں رینگتا رہا۔ رات کے سناٹے میں اسے خواب گاہ کے نیم درز، دروازے کے راستے عائشہ کے گہرے گہرے سانسوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور اور اس کے قریب کرسی پر ڈھیر بشیرے کے غیر مربوط خراٹے گاہے بگاہے اسے چونکا دیتے تھے۔

کوئی تین بجے کے قریب سلیم کے ہاتھ سے کتاب گر پڑی۔ اور وہ چوکس ہوکر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر ہمہ تن گوش ہوکر کوئی آواز سننے کی کوشش کرنے لگا کہ

اچانک باہر صحن سے قدموں کی چاپ ابھری۔ کوئی تیز تیز قدموں سے باورچی خانے کی طرف بڑھا چلا آرہا تھا۔ سلیم کا دل دھڑکنے لگا۔ مگر وہ کسی حادثے کا سامنا کرنے کے لئے بھی لاشعوری طور پر تیار ہوگیا چند لمحے بعد دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی تو سلیم نے ایک نظر پلٹ کر چولہے کی طرف دیکھا، وہاں اسے ایک شکاری چاقو اور تیز پھل والا بھاری کلہاڑا پڑا نظر آیا۔ مگر وہ ہتھیار بھی اس کی روح میں سرایت کرنے والے خوف وہراس کی شدت میں کوئی تخفیف نہ کرسکے، نہ جانے اسے کیوں اس امر کا پختہ یقین تھا کہ ہزار مزاحمت کے باوجود یہ خبیث شے نہایت آسانی سے مکان میں داخل ہوجائے گی۔

سلیم نے اٹھ کر لرزتے ہاتھوں سے دروازہ کھولا۔ جونہی اس کی نظر سامنے نیم تاریک صحن میں پڑی تو اطمینان اور مسرت سے کپکپاتی ہوئی آواز اس کے حلق سے نکلی اس کے سامنے اٹھارہ سالہ نصرت بھیگے کپڑوں میں کھڑی تھی اس کے بال الجھے ہوئے تھے۔ وہ سلیم کو دیکھتے ہی ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''ارے۔ ارے تم کہاں چلی گئی تھیں نصرت؟''

سلیم محبت آمیز آواز میں نصرت سے مخاطب ہوا۔ ''آگے آؤ تم نے تو ہم سب کو پریشان کردیا تھا۔ تمہارے بابا تمہیں ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ آؤ۔ اندر آجاؤ۔ یہ گیلے کپڑے اتاردو، ہاتھ پاؤں سینکو اور مجھے بتاؤ تم پر کیا گزری تھی؟''

وہ ایک قدم آگے بڑھی مگر وہ سلیم کے بجائے گہری نظروں سے محوِ خواب بشیرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''یہ بہت تھک گیا ہے بے چارہ۔'' سلیم نے نصرت کی الجھن رفع کرنے کے خیال سے کہا۔ ''کئی دن سے سو نہیں سکا غریب۔''

''تو کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں بستر سے غائب ہوگئی تھی؟'' نصرت نے بجھی بجھی آواز میں پوچھا۔

''ہاں ہاں مجھے معلوم ہوگیا تھا۔'' سلیم نے

شفقت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''تم اندر آجاؤ۔ اور آگ کے سامنے بیٹھ جاؤ۔ تمہارا جسم سردی سے سن ہوگیا ہوگا۔''

دفعتاً سلیم کے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ آخر وہ ساڑھے تین بجے رات کو بشیرے کے گھر پر کس غرض سے موجود ہے، اس کے ساتھ ہی اسے یاد آیا کہ بشیرے نے اسے پراسرار سفید بلی کے بارے میں عجیب باتیں بتائی تھیں پھر موتی سے مشابہ کے بارے میں اور پھر سڑک پر آوارہ پھرنے والے لڑکے کے بارے میں کچھ بتایا تھا۔ اس بیہودہ سے خیال پر سلیم کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ ''یہ تو نصرت ہے بے چاری۔ بے شک یہ نصرت ہے۔'' سلیم نے اپنے آپ کو بتایا۔ ''نصرت جو پہلے بھی ایسی تھی اور آج بھی ویسی ہے۔ بے چاری نہ جانے کہاں پانی میں گر پڑی تھی کہ سر سے پاؤں تک بھیگ چکی ہے۔''

اور پھر جیسے نصرت نے اس کے خیالات پڑھ لئے ہوں۔ بڑے اشتیاق سے بولی۔

''تو پھر میں عائشہ کے ساتھ ہی کیوں نہ لیٹ جاؤں۔ رات کے اس پہر تو میں گھر جانے سے رہی۔ مجھ میں اب اتنی ہمت کہاں۔''

سلیم اس کی جانب پشت کئے چولہے پر دودھ گرم کرنے میں مصروف ہوگیا تھا۔

''کیا کہا......؟'' سلیم نے اس کی بات سن کر کہا۔ ''عائشہ کے ساتھ لیٹنا چاہتی ہو؟'' پھر وہ لاشعوری طور پر بولا۔ ''ایک منٹ...... صرف ایک منٹ......''

ایک منٹ بعد دودھ گرم ہوگیا تو سلیم نے ایک پیالے میں شکر ڈالی اور اس میں دودھ انڈیل کر چینی حل کرنے میں لگ گیا پھر وہ پیالے کو ہاتھ میں پکڑے نصرت کی طرف گھوما۔ مگر نصرت غائب تھی۔

''نصرت......!'' سلیم نے اسے آہستہ آواز میں پکارا۔

رینگتے سرسراتے خوف کی لہر پھر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنانے لگی تھی۔ مگر نصرت کی تھکی تھکی سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو اس کا خوف زائل ہوگیا اور اس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا نصرت کہہ رہی تھی۔

''میں یہاں ہوں سلیم جی۔ عائشہ کے پاس۔ میں تھکاوٹ سے چور ہوچکی ہوں۔''

''آؤ پہلے دودھ تو پی لو۔'' سلیم نے اسے پیار سے پکارا۔ ''پھر مزے سے آرام کرنا پہلے تمہیں خوراک کی ضرورت ہے نصرت!''

''مجھے معلوم ہے۔'' وہ مدھم آواز میں بولی۔ ''مگر میں تھکی ہوئی ہوں پھر تم نے یہ بھی تو کہا تھا کہ صرف ایک منٹ بعد۔ ایک منٹ کب کا گزر چکا ہے۔ مجھے سونے دو۔''

''کیسا طفلانہ سا جواب تھا۔ معصومیت اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

''مگر نصرت تمہارے کپڑے تو بھیگے پڑے ہیں، اس حالت میں بھلا تم عائشہ کے صاف ستھرے بستر پر کیسے سو سکتی ہے۔ اس کی نیند خراب نہ کرو۔''

''میں اس کے آرام میں خلل نہیں ڈالوں گی۔'' نصرت نے مخمور آواز میں جواب دیا۔ ''دیکھو یہ کس مزے سے ہورہی ہے، یہ مجھ سے ہرگز خفا نہیں ہوگی۔''

سلیم دروازے میں آکھڑا ہوا۔ سامنے دیوار کے ساتھ تاریک ماحول میں خوب صورت پلنگ پر اسے دونوں عورتوں کے جسم پڑے نظر آرہے تھے جو ایک دوسرے سے پیوست تھے اسے یوں لگتا تھا جیسے ان دونوں کے جسم ایک دوسرے میں جذب ہوا چاہتے ہوں۔

''اٹھو نصرت۔ میرے پاس آؤ۔ تم تو عائشہ کے بستر کو بھی بھگو رہی ہو۔'' سلیم نے بڑے نرم لہجے میں اس سے کہا۔

اس بار اسے کوئی جواب نہ ملا اور جب اس کی آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوئیں تو اسے پلنگ پر پڑی عورتوں کے جسم واضح طور پر اکائی بن چکے تھے جیسے وہ پگھل کر باہم آمیز ہوگئے ہوں۔

سلیم کا دل وہ منظر دیکھ کر دھڑکنے کا انداز بھول گیا اس کا جسم برف کی طرح سرد اور بے جان ہو گیا اس کے دماغ میں سب سے پہلے جو خیال پیدا ہوا یہی تھا کہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے اور اس آسیب زدہ حویلی کی طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھے مگر پھر حوصلہ کرکے اس نے حواس پر قابو پانے کی کوشش کی اور اس میں کسی حد تک کامیاب بھی رہا پھر اپنی تمام تر قوت ارادی صرف کرکے وہ آہستہ آہستہ پلنگ کی طرف بڑھنے لگا۔ پلنگ کے قریب پہنچ کر وہ جھکا اور پوری قوت سے اس جسم میں اپنے پنجے گاڑ دیئے جو دیکھنے میں نصرت کی طرح نظر آتا تھا اور اب عائشہ کو تیزی سے کھا رہا تھا۔

محو خواب عائشہ کے جسم کو انتہائی طاقتور طرح سے پگھلا رہا تھا۔ مگر سلیم کو محسوس ہوا کہ اس کے پنجے بھیگے کپڑوں کے اندر چھپے ہوئے کسی زندہ انسانی جسم میں نہیں گڑے تھے بلکہ گاڑھے سیال میں ڈوب کر رہ گئے تھے۔

تب سلیم حلق پھاڑ کر چیخا اور اس کی ہیبت ناک چیخ سے حویلی کی فضائیں تھرا اٹھیں پھر وہ دیوانہ وار اس زندہ مٹی پر پل پڑا اور ایک نہ ٹوٹنے والے تسلسل کے ساتھ چیخنے لگا۔ اس کی وحشیانہ چیخوں سے پیدا ہونے والی بازگشت نے ماحول کی ہولناکی میں ہزار چند اضاف کردیا۔ وہ اس سیال کو نوچ رہا تھا، اٹھا اٹھا کر پٹخ دینے کی کوشش کررہا تھا اور پوری توانائیاں صرف کرکے چیخ رہا تھا۔ وہ پاگل ہو گیا تھا اور اسے چیخنے تک کی آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں، گلے کی تکلیف وہ خراش تھی جو اسے احساس دلا رہی تھی کہ وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا ہے اور بس!

وہ اس چیز کو پکڑنے کی کوشش میں ہاتھ چلا رہا تھا مگر وہ اس کی گرفت سے نکل نکل جاتی تھی، وہ کپڑوں میں یوں ادھر ادھر ڈھلک رہی تھی۔ جیسے کسی واٹر پروف تھیلے میں پانی ادھر ادھر چھلک رہا ہو اور اب اس کی آنکھیں ایک انتہائی مہیب منظر دیکھ رہی تھیں۔

نصرت کا جسم غیر انسانی صورت اختیار کررہا تھا اس کا چہرہ بدل رہا تھا خدوخال مٹ رہے تھے اور اس کے بازو پگھل کر سیال میں تبدیل ہورہے تھے، اس جسم کے مکمل طور پر پگھل کر سیال بننے سے ایک سیکنڈ قبل نصرت کے مسخ شدہ چہرے کو حرکت ہوئی اور اس کے منہ سے دردناک آواز برآمد ہوئی، وہ انتہائی اذیت سے چیخ رہی تھی۔

"سلیم...... یہ میں نہیں...... یہ میں نے نہیں کیا۔ میں خود کچھ نہیں کررہی ہوں۔!"

اس کے فوری بعد سلیم کو وہاں شفاف متحرک سیال کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا...... جو ایک کریہہ الصورت اور جسم جونک کی طرح عائشہ کی پشت اور کاندھوں سے لپٹا ہوا تھا۔

سلیم کا جسم تھرتھر کانپ رہا تھا پھر بھی نہ جانے اس میں اتنی قوت کہاں سے آگئی کہ اس نے عائشہ کا بازو پکڑ کر ایک زبردست جھٹکا دیا اور فرش پر پٹخ دیا۔

سلیم کے حلق سے اس بار جو چیخ بلند ہوئی وہ پہلے سے کہیں زیادہ دہشت ناک اور جنون آمیز تھی۔ اسے اپنے سامنے عائشہ کا جو جسم پڑا نظر آرہا تھا وہ نامکمل تھا۔ آدھا تھا۔ ریڑھ کی ہڈی مکمل طور پر عریاں ہو چکی تھی اور اس کی تمام پسلیاں الگ الگ نظر آرہی تھیں۔ صاف اور سفید پسلیاں جن پر گوشت یا خون کا نشان تک نہیں تھا، اس کی کھوپڑی میں بھیانک شگاف تھا اور اس کی آنتیں فرش پر ڈھیر ہو گئی تھیں۔

ایکا ایکی دروازے سے داخل ہونے والی روشنی کا انعکاس مدہم ہو گیا اور کمرے کا نیم تاریک ماحول گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ سلیم نے ایک دم پلٹ کر دیکھا تو اسے دروازے میں کوئی کھڑا نظر آیا اس کے حواس نے بڑی مشکل سے پہچانا کہ وہ اس کا دوست تھا بشیرا۔ جو اس کی جنون آمیز چیخیں سن کر بیدار ہو گیا تھا۔ بشیرے کے ہاتھ میں وہی تیز دھار اور وزنی کلہاڑا تھا جو انہوں نے اس آفت سے نمٹنے کے لئے رکھ چھوڑا تھا۔ دوسرے لمحے بشیرا ایک ہی جست میں پلنگ کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے پوری قوت سے پلنگ پر کلہاڑا چلانا

شروع کیا کلہاڑے کا پھل اس بے رنگ اور شفاف سیال میں ڈوب ڈوب جاتا مگر سیال......

اچانک حرکت میں آیا اور پلنگ کی پٹی سے بہتا ہوا فرش پر ڈھیر ہوگیا اور پھر تیز روی سے بہتا ہوا عائشہ کے ادھ کھائے جسم کی طرف بڑھنے لگا۔ سلیم نے پھرتی سے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس سیال کو دونوں ہاتھوں میں جکڑنے کی کوشش کی اور اس کا کچھ حصہ فرش سے اٹھانے میں کامیاب بھی ہوگیا مگر دوسرے ہی لمحے وہ اس کی انگلیوں سے بہہ کر فرش پر ڈھیر ہوگیا پھر اسی روانی سے عائشہ کے پاس پہنچ کر اس کے جسم سے چمٹ گیا۔ بشیرا بھی کلہاڑا ایک طرف پھینک کر سلیم کے قریب ہی گھٹنے ٹیکے بیٹھا تھا۔ مگر وہ اپنی بیوی کے ادھورے جسم سے اس شے کو الگ رکھنے کی کوشش میں سلیم سے تعاون نہیں کر رہا تھا۔ وہ کیا کرتا کیونکہ اس شے پر قابو پانا بھی تو ناممکنات تھا۔

پھر...... اچانک بشیرا تڑپ کر اٹھا اس کا چہرہ اس طرح سفید ہو رہا تھا جیسے اس کے جسم سے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لیا گیا ہو۔ اس کا چہرہ کسی لاش کا چہرہ معلوم ہوتا تھا، وہ دروازے کی طرف بڑھا اور عائشہ کے جسم پر رینگتی ہوئی اس بلا کو پلٹ کر دیکھے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا، اس نے چوبی صندوقچے سے موم نکال کر دیگچے میں ڈالی اور اسے پگھلا کر خواب گاہ میں آ گیا۔ پھر دروازہ بند کر کے اس پر موم سے لیپ کرنے لگا گویا اس نے اس چیز کے باورچی خانے میں گھسنے کے امکانات ختم کر دیئے تھے۔ سلیم بھی اس کے قریب کھڑا اس طرح کانپ رہا تھا جیسے تپ لرزہ کا شکار ہو۔

بشیرے نے اپنے کام سے فارغ ہوتے ہی کہا۔

''میں نے کمرے کو اس کا مدفن بنا دیا ہے سلیم۔ اب اسے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملے گا۔ سیال کی شکل میں یہ فرار نہیں ہو سکتی۔ اور انسانی شکل میں ہوگی تو ہم اس کا مقابلہ کر سکیں گے، یہ دروازہ کھولنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گی۔'' پھر اس نے نسیم کا ہاتھ تھاما اور اسے اس عفریت کے پاس لے گیا۔

لمحہ بھر کے لئے دونوں ساکت ہو گئے۔ سیال عفریت اپنا گھناؤنا اور ہولناک عمل مکمل کر چکا تھا۔ عائشہ کا جسم مکمل طور پر سیال بن چکا تھا اور حملہ آوروں کا وجود اس میں مدغم ہو کر اپنی الگ حیثیت کھو بیٹھا تھا، اب وہاں عائشہ کا پرشباب جسم کے بجائے اس کے کپڑوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ جن کے اندر وہ سیال جو پہلے سے دو چند حجم اختیار کر چکا تھا۔ کلبلا رہا تھا، لہرا رہا تھا، رینگ رہا تھا اور اپنی موجودگی کا ثبوت دے رہا تھا۔

اچانک بشیرے کے جسم میں حرکت ہوئی اس نے جھرجھری لی اور دروازہ کھول کر باورچی خانے میں گھس گیا۔ چند لمحے بعد پھر کمرے میں داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں مڑے تڑے ردی کاغذوں کا ایک پلندہ تھا، اس نے کاغذ ایک جانب فرش پر پھینکا، دروازہ بند کیا اور ایک کاغذ اٹھا کر اسے ماچس سے آگ لگا دی، شعلہ بلند ہوا تو اس نے کاغذ اس بے رنگ زندہ سیال پر پھینک دیا، کاغذ دھڑا دھڑ جلنے لگا اور سیال مادہ تھرکنے اور بل کھانے لگا۔ اور حیرت انگیز سرعت سے فرش پر ادھر ادھر رینگنے لگا۔

بشیرا ہاتھ میں ایک اور جلتا ہوا کاغذ لے کر اس کے پیچھے پیچھے دوڑا اور اسے جلانے لگا اس نے آگ بجھنے نہ دی اور کاغذ جلا جلا کر اس جان لیوا اور متحرک مادے پر حملے کرتا رہا، کمرے کی فضا دھوئیں اور انسانی گوشت کے جلنے کے بدبو سے بھر گئی۔ پھر سلیم بھی کاغذ جلا جلا کر اس پر حملے کرنے لگا۔ زندہ سیال آگ کی لپیٹ سے بچنے کے لئے نہایت تیزی سے ادھر ادھر پھسل اور بہہ رہا تھا اور اس کے بہنے کا یہ منظر اس قدر روح فرسا تھا کہ اگر وہ تکلیف سے حلق پھاڑ پھاڑ کر غیر انانی آواز میں بھی چیختا تو بھی اتنا ہولناک تاثر ہرگز نہ پیدا ہو پاتا، کچھ ہی دیر میں کمرے کی فضا دھوئیں سے اس قدر بوجھل اور تکلیف دہ ہوگئی کہ انہیں سانس تک لینا دشوار ہو گیا مگر انہوں نے اس خبیث شے کو لمحہ بھر کے لئے بھی آگ کی تپش سے فرار حاصل نہ کرنے دیا۔

اور پھر وہ سیال برق رفتاری سے بہتا ہوا پلنگ کے قریب عائشہ کے کپڑوں کے پاس پہنچا جو ایک بے ترتیب ڈھیر کی طرح فرش پر پڑے تھے۔ وہ رینگتا ہوا کپڑوں پر چڑھ گیا اور جونہی بشیرا اور سلیم نے کاغذ جلانے کے لئے لمحہ بھر کے لئے توقف کیا، وہ نیا روپ دھار گیا۔

وہ یوں فضا میں بلند ہوا جیسے زمین سے اچانک کوئی طاقتور فوارہ پھوٹ نکلا ہو، دیکھتے ہی دیکھتے اس میں دو بازو برآمد ہوئے پھر گوشت اور سڈول چھاتیاں نمودار ہوئیں صرف ایک سانس لینے کے مختصر سے عرصہ میں وہ ''چیز'' معدوم ہو چکی تھی اور اس میں سے ایک عریاں اور ہوشربا حد تک حسین اور پرکشش نسوانی جسم جنم لے چکا تھا اور وہ جسم عائشہ کا جسم تھا سو فیصد عائشہ کا حشر انگیز جسم، اس کی سیاہ زلفیں شانوں سے گزر کر کمر کو چھو رہی تھیں اور غزالی آنکھیں خوف سے پھٹی پڑ رہی تھیں۔

عائشہ کے روپ میں وہ خبیث ''قوت'' جھجکی اور بڑی سراسیمگی کے عالم میں کپڑے پہننے میں مصروف ہوگئی۔ دوسرے لمحے وہ عائشہ کے لباس میں عائشہ بنی کھڑی تھی پھر وہ ایک جھٹکے کے ساتھ حرکت میں آئی اور ننگے پاؤں دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

بشیرے نے جھرجھری لی اور پھر جیسے گہری نیند سے بیدار ہوگیا ہو، لپکتا ہوا وہ باورچی خانے کے دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوا اور ہاتھ میں پکڑے کاغذ کو آگ لگا کر عائشہ کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ بولی۔ اور اس کے منہ سے نکلنے والی آواز عائشہ کی آواز تھی۔

''میں باہر جانا چاہتی ہوں بشیر۔'' اس کے ساتھ ہی وہ ایک قدم آگے بڑھی۔

''بشیر کا چہرہ شدت غضب اور فرط خوف سے بھیانک ہوگیا تھا۔ اس نے جلتا ہوا کاغذ اس پر پھینکتے ہوئے گرج کر کہا۔

''اب تم کبھی اس گھر سے باہر نہیں نکل سکوگی ہم تمہیں جلا کر خاکستر کردیں گے۔''

اس چیز نے۔ جو عائشہ کی ہم شکل تھی اور اسی کی آواز میں بول رہی تھی۔ نفی میں اپنا حسین سر ہلایا اور اس کی لہراتی ہوئی زلفوں کو دیکھ کر سلیم کی روح پرواز کے لئے پر تولنے لگی۔ پھر وہ مسکرائی اور بولی۔

''تم مجھے ہرگز نہیں جلاؤ گے بشیرے۔ میں تو ایک قیدی ہوں تم تو اس چیز کو تباہ کرنا چاہتے ہو۔ جس نے مجھ پر قبضہ کرلیا ہے مگر مجھے تم جلا کر ہلاک کرنا نہیں چاہتے پھر...... ابھی تک مجھے کوئی روحانی اور جسمانی تکلیف بھی تو نہیں پہنچی۔ سوائے تمہاری آگ کے۔ مجھے کسی چیز نے اذیت نہیں پہنچائی بشیر! میں عائشہ ہوں تمہاری عائشہ!''

بشیرے کے ہاتھ کا کاغذ اس کی انگلیوں تک جل چکا تھا اور اس کا ہاتھ شعلوں کی لپیٹ میں تھا مگر اسے کوئی خبر نہیں تھی وہ یک ٹک سامنے کھڑی ''شے'' کو دیکھے جارہا تھا۔

''مگر مجھے کیسے معلوم ہو۔ میں کیسے یقین کرلوں؟'' بشیرے نے گلوگیر آواز میں پوچھا۔

''یہ تم نہیں جان سکتے بشیرے۔'' وہ مسکرائی۔ ''مگر یاد رکھو اگر تم نے مجھے تباہ کیا تو عائشہ تباہ ہوجائے گی...... ہٹو......!!''

''نہیں......!'' بشیرے نے سر کو جھٹکا دیا۔ ''ہم تمہیں یہیں اس وقت تک بند رکھیں گے جب تک کہ تم بھوک سے تڑپ تڑپ کر مر نہ جاؤ...... جب تک تم گل سڑ کر مٹ نہ جاؤ......!''

''انتہائی سنگدلی، بے رحمی اور بے مہری سے جواب ملا۔

''مجھے اذیت ملی تو عائشہ کو ملے گی۔ میں بھوکی مری تو عائشہ بھوک سے تڑپے گی۔''

بشیرے نے پریشان اور متذبذب سا ہوکر پر فکر نگاہوں سے سلیم کی طرف دیکھا تو سلیم کو یوں لگا جیسے بشیرا کسی خارج از قیاس فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر ایکا ایکی وہ سلیم سے مخاطب ہوکر پرعزم

آواز میں غرایا۔

''تو سلیم ..... خدا کی قسم پھر مجھے اسے تباہ کرنے کا دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔''

''عائشہ ..... تم میری بات سنو..... اگر تم اس خبیث قوت کی قیدی بن چکی ہو تو آگے بڑھو اور مجھے بھی اپنا جزو بنالو۔ مجھے اپنے جسم میں شامل کرلو۔ اس جسم میں..... جس میں عائشہ، نصرت، ارشد، طیفو، اسلم، اکرام، بشیر، ناصر اور خدا جانے کن کن حیوانوں کی روحیں مقید ہیں، مجھے بھی ان میں شامل کرلو مگر یاد رکھو میں تمہارے سامنے ہتھیار ہرگز نہیں ڈالوں گا۔ تم مجھے کبھی مغلوب نہ کرسکو گی۔ اس چیز کو آگے بڑھنے دو۔ اسے مجھ پر چھا جانے دو تا کہ یہ مجھے اپنے اندر حلول کرلے اور پھر عائشہ..... نصرت..... ارشد..... طیفو، اسلم اور دوسرے مجبور و مقہور حیوانو تم میری مدد کرنا، ہم سب مل کر اس چیز پر غلبہ پائیں گے اسے پچھاڑیں گے۔ تباہ کردیں گے..... میں تمہاری مدد کا طلب گار ہوں..... آؤ..... آؤ..... آگے بڑھو۔'' بشیرے نے اپنے بازو پھیلا دیئے۔

عائشہ کے رسیلے اور مرطوب ہونٹوں پر لطیف سی مسکراہٹ رقص کرنے لگی اور وہ گداز اور تراشیدہ بازو پھیلا کر ہولے ہولے بشیرے کی طرف بڑھنے لگی..... یہاں تک کہ وہ اس کے سینے سے جا لگی اور اس کے بازو بشیرے کی گردن کے گرد حمائل ہوگئے۔

جواب میں بشیرے کے فولادی بازوؤں نے اسے جکڑ لیا، دونوں کی آنکھیں ملیں اور پھر انتہائی بے قراری سے انہوں نے ایک دوسرے کے ہونٹوں میں ہونٹ پیوست کردیئے، وہ بہت دیر تک خود فراموشی کے عالم میں ہم آغوش وہیں کھڑے رہے۔

سلیم انہیں دم سادھے پلک جھپکائے بغیر دیکھے جارہا تھا اور وہ دل ہی دل میں صمیم قلب کے ساتھ دعا مانگ رہا تھا کہ خدا اس خبیث چیز کو نیست و نابود کردے۔

پھر سلیم کے پاؤں خود بخود حرکت میں آئے اور وہ آگے بڑھ کر عائشہ کی آنکھوں کو دیکھنے لگا۔ اور یہ دیکھ کر اس کے دل میں اطمینان آمیز مسرت کی لہر دوڑ گئی کہ اس چیز کی آنکھوں میں ریاکاری، فریب، مکر یا چالاکی کی جھلک تک نہیں تھی، وہاں اسے اخلاص اور محبت کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا گو اس جسم میں مقید لاتعداد جسموں میں صرف عائشہ اپنے شوہر سے ہم آغوش تھی اور وہ سچے دل سے اظہار محبت کررہی تھی۔ اور پھر اس کے ساتھ ساتھ سلیم کو اس حقیقت کا بھی شدید احساس ہورہا تھا کہ تمام مقید روحیں متحدہ طور پر اس نجس شے کے خلاف صف آرائیوں نے پر آمادہ ہوچکی ہیں۔

خوف و دہشت کے وہ جاں گسل جذبات جنہوں نے میاں بیوی کے فطری اظہار محبت کی وجہ سے سلیم پر اپنی گرفت ڈھیلی کردی تھی۔ اچانک تحریک میں آئے اور اس کے رگ و پے میں پھر خون کی سنسناہٹ برپا ہونے لگی اور جب عائشہ کا صحیح و سالم جسم ہولے ہولے غیر محسوس انداز میں اس کی نگاہوں سے غائب ہونا شروع ہوا تو خوف و ہراس کے عفریت نے پھر سلیم کو اپنے توانا بازوؤں میں جکڑ لیا۔

اور..... پھر..... اچانک اس کی نگاہوں کے سامنے بشیرا تنہا کھڑا رہ گیا۔ اس کے بازوؤں میں عائشہ کے لباس کے سوا اور کچھ نہیں رہا تھا۔ مگر بشیرا بہت دیر تک یوں ہی کپڑوں کو بازوؤں میں لئے آنکھیں موندے کھڑا رہا اس کا جسم ساکت تھا مگر سلیم محسوس کررہا تھا کہ جیسے بشیرے کے جسم میں کوئی انقلابی ہلچل برپا ہو، ایسا رد و بدل جاری ہو، انسانی بصارت جس کا احاطہ کرنے سے قاصر ہو..... اور پھر.....

بشیرا حرکت میں آگیا۔ اس کی آنکھیں کھلیں اس نے خالی خالی نگاہوں سے سامنے دیکھا اور پھر اسے اپنے بازوؤں میں کسی چیز کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے ایک ہاتھ سے کپڑوں کو ٹٹولا اور پھر بڑے پیار سے انہیں سمیٹ کر پلنگ کے پاس پہنچا..... مگر..... گھر کا پختہ فرش اس کے ننگے پاؤں تلے چیخ رہا تھا۔ سلیم چکرا کر دیوار کے سہارے کھڑا ہوگیا، بشیرے نے آہستہ سے



آسیبی گھر

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

رات کا نجانے کون سا پہر تھا کہ اچانک کمرے میں دل کو دہلاتا اور جسم و جان پر سکتہ طاری کرتا قہقہہ سنائی دیا تو بستر پر محوِ خواب نوجوان ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور پھر اپنے سامنے کا منظر دیکھ کر اس کی روح فنا ہونے لگی کیونکہ……

رگوں میں دوڑتے لہو کو منجمد کرتی برسوں دماغ سے محو نہ ہونے والی لرزیدہ لرزیدہ خونی کہانی

1980ء میں برطانیہ کی ایک ریسرچ سوسائٹی نے تحقیقات شروع کردی کہ لندن میں کس قدر مکانات ایسے ہیں جو آسیب زدہ ہیں اور وہ کون کون لوگ ہیں جنہوں نے پراسرار واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔

چنانچہ ایک سوالنامہ تحریر کیا گیا اور تقریباً سترہ ہزار شہریوں کو بھیج دیا گیا ان میں سے 5316 نے تو یہ جواب دیا کہ ''انہیں کسی ایسے حادثے سے واسطہ نہیں پڑا۔'' 1684 نے جواب دیا کہ ''انہیں اس قسم کے واقعات سے واسطہ پڑا ہے۔'' جن مکانات کے آسیب زدہ ہونے کی اطلاع ملی ان میں برکلے اسکوائر کا مکان نمبر 50 بھی تھا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اس مکان میں ایک ایسی چیز دیکھی جاتی تھی جو انسان تھی نہ جانور۔ بس اس وقت سے یہ بھوتوں کا مسکن مشہور ہوگیا۔ جو لوگ اس میں

رہتے تھے، خوف زدہ ہوکر بھاگ گئے اور ان کے بعد جس نے اسے کرائے پر لیا، اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔

واقعات یوں بیان کئے جاتے ہیں کہ بھوتوں کا مسکن مشہور ہونے سے پہلے یہ اس علاقے کی سب سے اچھی عمارت خیال کی جاتی تھی۔ پھر اس پر خوف کے سائے پھیلتے چلے گئے۔ اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ اس میں رہائش رکھنے والے ایک شخص مسٹر ڈیو پری نے اپنے ایک بھائی کو جس کا دماغی توازن درست نہیں رہا تھا، اس مکان کی ایک کوٹھری میں بند کردیا۔ یہ دیوانہ شخص اس قدر مغلوب الغضب اور وحشت ناک تھا کہ کوئی بھی اس کے نزدیک جانے کی جرأت نہ کرسکتا تھا، یہاں تک کہ اس کی خوراک بھی ایک نلکی کے ذریعے اندر پہنچائی جاتی۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ جو بھوت اس مکان میں دیکھا جاتا تھا وہ اسی پاگل آدمی کا تھا، کیونکہ اسے تو نچلی منزل میں بند کیا گیا تھا جبکہ بھوت دوسری منزل کے بیڈ روم میں نظر آتا۔

ایک مشہور رسالے ”نے خبر“ نے 1888 میں اس مکان کے متعلق لکھا تھا، برکلے اسکوائر کے مکان نمبر 50 میں کم از کم ایک کمرہ ایسا ہے کہ جسے دیکھ کر دل و دماغ پر ہیبت طاری ہوجاتی ہے اور ماننا پڑتا ہے کہ کسی مافوق الفطرت چیز کا اثر اس مکان میں ضرور ہے۔ یہ مکان مدت سے خالی پڑا ہے، البتہ ایک چوکیدار اور اس کی بیوی اس میں اب بھی رہتے ہیں مگر صورت حال یہ ہے کہ وہ دونوں بھی آسیب زدہ کمرے میں جانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ انہوں نے اس کمرے میں تالا ڈال دیا ہے جس کی چابی ایک گمنام شخص کے پاس ہے وہ کبھی کبھی اس گھر میں آتا ہے اور پراسرار کمرہ کھول کر چند گھنٹے قیام کرتا اور پھر چلا جاتا ہے۔

آسیب کے متعلق بھی بہت سی تاویلیں کی گئیں۔ مثلاً کسی نے یہ افواہ پھیلائی کہ اصل میں اس مکان میں ایک بچے کا بھوت ہے جو سسک سسک کر روتا دکھائی دیتا ہے۔

دوسری افواہ یہ بھی تھی کہ بالائی منزل میں ایک پاگل شخص کا بھوت نظر آتا ہے جو کسی پیغام کے انتظار میں عقل و خرد سے بیگانہ ہوکر مرگیا تھا۔

ایک افواہ یہ بھی تھی کہ اس مکان میں ایک لڑکی تھی اس نے اپنے ایک عزیز کی دست درازیوں سے تنگ آکر نیچے چھلانگ لگادی اور مرگئی۔ اب اس کا بھوت مکان میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ ان کے علاوہ کچھ اور کہانیاں بھی مشہور تھیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے ایک بھی درست نہ تھی اس کے بارے میں درست بات اگر کسی شخص نے بتائی۔ تو وہ لارڈ لٹن ہے، لارڈ اور اس کے خاندان کو ایسے واقعات سے اس قدر واسطہ پڑا تھا کہ لندن والے اسے بھوتوں کا ماہر خصوصی خیال کرنے لگے۔

لارڈ نے بتایا۔ ”ایک دن میں پستول سے مسلح ہوکر اس کمرے میں سویا، ساری رات کوئی قابل ذکر واقعہ رونما نہ ہوا۔ لیکن صبح ہونے سے ذرا پہلے کوئی چیز اڑتی ہوئی آئی اور کمرے میں داخل ہوگئی۔ میں نے فوراً اس پر فائر کیا جس سے وہ زخمی ہوکر گری، میں اس کی طرف بڑھا، لیکن وہ فوراً ہی غائب ہوگئی۔“

لارڈ موصوف سے اس چیز کا حلیہ دریافت کیا گیا تو وہ اس کا جواب نہ دے سکا۔

انیسویں صدی عیسوی میں دو اخباروں نے اس بھوت کا حلیہ بیان کیا۔ ایک نے لکھا۔ یہ گمنام بلا اصل میں ایک بہت ہی مکروہ شکل مخلوق ہے جس کی زبان منہ سے باہر لٹکی رہتی ہے۔ دانت بہت لمبے اور چہرہ الو کی طرح گول مٹول ہے۔

دوسرا اخبار نے لکھا کہ اصل میں یہ بلا ایک عجیب جانور نما ہے جس کی آنکھیں اور کئی ٹانگیں ہیں اور وہ کوئی جہنمی مخلوق معلوم ہوتی ہے مگر حیرت یہ ہے کہ یہ بلا صرف مکان نمبر 50 میں دکھائی دیتی ہے۔

لارڈ لٹن کے علاوہ دو اور اشخاص نے بھی اس مکان میں ایک ایک رات قیام کیا۔ ان میں سے سر رابرٹ علاقے کے نوجوان نواب زادہ تھے۔ ابھی انہوں

نے شادی نہ کی تھی۔ زندگی کے اوقات زیادہ تر سیر و شکار میں بسر کرتے اور اپنے طبقے میں بہت عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

ایک دن دوران گفتگو میں بھوتوں کا ذکر چھڑا تو سر رابرٹ نے سختی سے بھوتوں کے وجود کا انکار کیا اور ان لوگوں کا مذاق اڑایا جو ایسی چیزوں پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ اس پر اچھی خاصی بحث چھڑ گئی، یہاں تک کہ ان کے دوستوں نے تہیہ کرلیا کہ وہ ثابت کردیں گے کہ بھوت کوئی خیالی مخلوق نہیں۔ یہ گفتگو جاری تھی کہ کمرے میں وہ صاحب داخل ہوئے جن کی ملکیت میں برکلے اسکوائر کا مکان نمبر 50 تھا۔ انہیں دیکھ کر سب دوست خوشی کے مارے اچھل پڑے اور سر رابرٹ سے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ صاحب اسی مکان کے مالک ہیں جس میں بھوت موجود ہے اور بھوت ایسا کہ پورے انگلستان میں اس کے مقابلے کا کوئی بھوت نہیں۔

پھر انہوں نے جیسن (مکان کا مالک) سے کہا کہ وہ اپنے تجربات سے سر رابرٹ کو آگاہ کریں، لیکن قبل اس کے کہ وہ جواب میں کچھ کہتے، ایک نوجوان چلا اٹھا۔

”سر رابرٹ! آپ ایک جرأت مند اور کھلاڑی قسم کے آدمی ہیں...... کیوں نہ آپ آسیب زدہ مکان میں ایک رات بسر کریں اور بھوت پریت کے نظریے کو غلط ثابت کردیں؟“

”مگر میں ایسی خوف ناک مہم کی بھی اجازت نہ دوں گا۔“ مسٹر جیسن نے جلدی سے کہا۔

”سر رابرٹ عاقل و بالغ شخص ہیں بھئی۔ وہ اپنا برا بھلا بخوبی سوچ سکتے ہیں۔ اگر کوئی حادثہ ہوگیا، تو اس کی تمام تر ذمہ داری خود ان پر ہوگی، ہم میں سے کوئی بھی تمہیں الزام نہ دے گا۔ کیوں سر رابرٹ، آپ کی کیا رائے ہے؟“ اسی نوجوان نے کہا۔

میں اس مہم کو سر کرنے کے لئے بالکل تیار ہوں۔“ سر رابرٹ بولے۔ بلکہ میں تو 100 گنی کی شرط لگانے کے لئے بھی تیار ہوں کہ میں اس آسیب زدہ مکان سے صحیح سلامت برآمد ہوں گا۔“

قانون

صحافیوں کی ایک ٹیم جیل کا دورہ کررہی تھی۔ ”ایک کوٹھری میں ایک ایسے صاحب بھی بند تھے جو شکل و صورت سے ہی مسکین اور شریف نظر آرہے تھے۔“

ایک صحافی نے ان کے بارے میں جیلر سے پوچھا۔ ”ان صاحب نے کیا جرم کیا ہے۔“ جیلر نے بتایا۔

انہوں نے کوئی جرم نہیں کیا بلکہ ایک مشہور ڈاکو منگو غنڈا کو قتل کرتے ہوئے دیکھا ہے اور یہ واحد شخص ہیں جو اس واقعے کا چشم دید گواہ ہے اب انہیں حفاظت کے خیال سے جیل میں رکھا ہوا ہے۔“

صحافی نے پھر پوچھا۔ ”اب منگو غنڈا کہاں ہے۔“

”جناب وہ تو کب کا ضمانت پر رہا ہوگیا ہے۔“ جیلر نے اطمینان سے جواب دیا۔

(شرف الدین جیلانی۔ ٹنڈو الہ یار)

”بہت خوب، بہت خوب!“ لارڈ کالنڈی تالی بجا کر بولے۔ ”اب بتاؤ مسٹر جیسن! آپ کیا کہتے ہیں؟“

”میرے آقا! مجھے تو اب بھی اس تجویز سے اتفاق نہیں۔“ جیسن نے کہا۔ وہ خاصا خوف زدہ دکھائی دیتے تھے۔

لارڈ کالنڈی بولے۔ ”بھئی، اگر واقعی کسی طرح کا خطرہ ہے تو میں حفاظتی انتظام کرنے کو تیار ہوں۔“

سر رابرٹ مسکراتے ہوئے گویا ہوئے۔ ”اس تکلیف کی ضرورت نہیں، میں اپنی حفاظت خود کرسکتا ہوں۔“

جیسن بولے۔ ”حضرات! گو سر رابرٹ اپنی مرضی سے میرے غریب خانے کو نوازنے کا ارادہ رکھتے ہیں مگر مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ یہ کوئی معقول بات نہیں۔

بہرحال جو مزاج یار میں آئے میں چشم براہ رہوں گا۔"

"تو گویا آج تیار ہو ہی گئے؟" سر رابرٹ نے کہا۔

جیسن بولا۔ "جی ہاں، مگر اس شرط پر کہ ہم سب ساری رات جاگتے رہیں گے۔ آپ مسلح ہو کر مکان میں داخل ہوں گے اور جب بھی کوئی خطرہ محسوس ہو گھنٹی بجا کر ہمیں اطلاع کر دیں گے۔"

"مجھے یہ شرط منظور ہے لیکن محسوس کرتا ہوں کہ گھنٹی بجانے کی نوبت آنے کی [illegible] استعمال [illegible]۔"

اس گفتگو کے چند گھنٹے بعد یعنی تین دن بعد شب کے نو بجے سب دوست مکان نمبر 50 برکلے اسکوائر میں جمع ہو گئے [illegible] کھانا [illegible]۔

[illegible] آن پہنچے۔ [illegible] پر اسرار مکان میں [illegible] گئے اور [illegible]۔

اگرچہ وہ خود کو مطمئن ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن جیسن [illegible] آسیب زدہ مکان سے متاثر تھے۔

تھوڑی دیر بعد سب کھانے کے کمرے میں گئے۔ کھانا بہت لذیذ اور کئی قسم کا تھا۔ مگر سارے مہمان خاموشی سے اس طرح کھا رہے تھے جیسے محض فرض ادا کر رہے ہوں۔ وہ جلد ہی کھانے سے فارغ ہو گئے۔ سر رابرٹ نے اپنے میزبان جیسن سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اچھا اب مجھے اس کمرے میں چلا جانا چاہئے جس میں آج شب رہنا ہے۔"

سب مہمان اپنے میزبان کی قیادت میں دوسری منزل پر پہنچے جہاں وہ تاریکی کمرہ دکھایا گیا جسے تقریباً اس برس کے بعد سر رابرٹ کے لئے کھولا گیا تھا۔ یہ کمرہ تاریک سا تھا اور اس کا فرنیچر پرانے زمانے کی یادگار تھا۔

کمرے کے وسط میں ایک بڑی مسہری بچھی ہوئی تھی جس پر صاف شفاف بستر لگا تھا۔ مسہری کے دائیں بائیں تپائیوں پر لیمپ رکھے تھے اور سرہانے کی طرف گھنٹی کی رسی لٹک رہی تھی۔

جیسن نے اس رسی کو ہلایا تو نیچے گھنٹی بجی۔ اس نے سر رابرٹ سے کہا۔ "کوئی خطرہ محسوس ہو تو مہربانی کر کے گھنٹی بجا دیجئے گا۔ ہم فوراً آپ کی مدد کو پہنچ جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" سر رابرٹ بولے۔ "مگر آپ [illegible] جانے کا [illegible] گھنٹی نہ بجے تو آپ میرا [illegible] تکلیف نہ [illegible]۔"

[illegible] سر رابرٹ کو کمرے میں چھوڑ کر سب نے شب [illegible] نیچے آ گئے۔ سر رابرٹ نے [illegible] کھونٹی پر لٹکایا اور مسہری پر دراز ہو گئے۔ انہوں نے بھرا ہوا پستول دائیں طرف رکھا اور [illegible] گھنٹی کی رسی [illegible] دائیں میں آسانی سے [illegible] تھی۔ [illegible] تھا ان کا ارادہ بیدار رہنے کا تھا۔

[illegible] مکان نمبر 50 برکلے اسکوائر کا [illegible] ۔ ادھر ان کے دوست نیچے کی منزل میں چپ چاپ بیٹھے گھنٹی بجنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اسی [illegible] گھڑیال نے رات کے بارہ بجائے اور اس کے ساتھ ہی ڈرائنگ روم میں گھنٹی کی آواز گونجنے لگی۔ سب دوست ہوشیار ہو گئے۔ پھر گھنٹی کی آواز دوسری بار اس قدر زور سے گونجی کہ معلوم ہوتا تھا کوئی رسی کو توڑ دے گی۔

"اوہ میرے خدا!" جیسن چیخ مار کر اوپر کی طرف بھاگا اور اس کے پیچھے باقی تمام دوست بھی روانہ ہو گئے۔ وہ دروازے کے نزدیک ہی پہنچے تھے کہ بند دروازے کے پیچھے سے پستول کے فائر کی آواز سنائی دی۔ جیسن نے جھپٹ کر دروازہ کھول دیا۔

آہ! کیا دردناک منظر تھا۔ حسین و جمیل سر رابرٹ کا آدھا جسم بستر پر اور آدھا بستر سے نیچے لٹکا ہوا تھا، سیدھے ہاتھ سے چھوٹ کر پستول دور جا گرا تھا اور بائیں ہاتھ میں گھنٹی کی رسی تھی۔ سر رابرٹ کی آنکھیں خوف سے باہر نکل آئی تھیں اور منہ بھی کھلا ہوا تھا۔

یہ ایسا بھیانک منظر تھا کہ بہادر سے بہادر آدمی

کا پتہ پانی ہو جائے۔ جیسن نے آگے جھک کر نبض ٹٹولی۔ تو وہاں کیا رکھا تھا؟ برکلے اسکوائر کے بھوت نے سر رابرٹ کی جان لے لی تھی۔

جیسن پر سر رابرٹ کی موت کا اس قدر اثر ہوا کہ اس نے نمبر 50 برکلے اسکوائر کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہنے کا تہیہ کر لیا۔ پھر پچاس سال تک کسی ذی روح نے اس منحوس مکان میں قدم نہ رکھا مگر جب یہ مکان اپنی ویرانی کا پچاسواں سال منانے والا تھا تو اتفاقات سے ایسی شکل ہونے سے موجب کہ ایک بحری جہاز یعنی توپ بردار جہاز پنڈورا کے دورے سے ایک سال بعد پورٹ اسمتھ پہنچا۔ 1887ء کا دسمبر تھا۔

بندرگاہ پر پہنچتے ہی جہاز کے عملے کو چھٹی دے دی گئی تاکہ وہ اپنی خواہش کے مطابق کرسمس کی خوشیوں میں شریک ہو سکیں۔

یہ دونوں ملاح اسی جہاز سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے لندن پہنچ کر کئی دن پینے پلانے کا شغل جاری رکھا۔ جب ذرا ہوش آیا اور حساب کتاب کیا تو معلوم ہوا کہ پیسے بالکل ختم ہو چکے ہیں اور اب گھر پہنچنا بھی محال ہے۔ دونوں کے گھر لندن سے کافی فاصلے پر تھے۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی اور رات گزارنے کا مسئلہ اہمیت پکڑتا جا رہا تھا چونکہ دونوں کی جیب خالی تھی لہٰذا فیصلہ ہوا کہ گھوم پھر کر کوئی ایسا ٹھکانہ تلاش کیا جائے جہاں مفت میں رات بسر ہو جائے اور اسی تلاش میں وہ برکلے اسکوائر کے اس مکان کے سامنے پہنچ گئے۔ یک لخت ان کی نظر سڑک کے بائیں جانب اٹھ گئی۔ ایک دو منزلہ مکان پر کرائے کے لئے خالی ہے کا بورڈ لٹکا ہوا تھا۔ یہ نمبر 50 برکلے اسکوائر تھا۔ وہ دونوں احاطے کے باہر کھڑے ہو کر جنگلے سے اچک اچک کر اندر دیکھنے لگے اور یہ بھانپیں بھانپیں کرتا تاریک مکان شب باشی کے لئے انہیں بہت موزوں معلوم ہوا۔ دونوں چھلانگ مار کر اندر داخل ہو گئے۔

مارٹن نے جیب سے ایک ماچس نکالی اور اسے روشن کر کے مکان کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ بلنڈن باورچی خانے میں جا نکلا جہاں سر رابرٹ کی موت سے قبل ڈنر تیار ہوا تھا۔ وہاں برتن اور سامان اب تک بے ترتیبی سے پڑے تھے۔

مارٹن اور بلنڈن کی سمجھ میں آ گیا کہ یہ مکان کافی عرصے سے ویران پڑا ہے۔ وہ اب آگے بڑھے۔ خانے کا کمرہ اور ہال سب خالی پڑے تھے۔ ایک کونے میں ایک موٹا چوہا مٹر گشت کر رہا تھا۔

"اوہ دیکھو اس چوہے کو... کس قدر موٹا ہو رہا ہے اور اس نے تختے کو کاٹ کر کتنے سوراخ کر دیئے ہیں۔" مارٹن ہنسنے لگا۔

"چلو اچھا ہی ہے... ہمیں آگ جلانے کے لئے کوئی لکڑی مل جائے گی۔" بلنڈن بولا۔

"چلو اوپر چلیں۔" مارٹن نے رائے ظاہر کی اور پھر دونوں نے سیڑھیاں چڑھنا شروع کر دیا۔ گرد و غبار سے اٹا ہوا زینہ ان دونوں کے بوجھ سے چیخ اٹھا۔ خطرہ پیدا ہوا کہ ٹوٹ نہ جائے لیکن وہ رکے نہیں اور بالآخر اوپر اس کمرے میں پہنچ گئے جہاں سر رابرٹ کی موت واقع ہوئی تھی۔

اس کمرے کو دیکھ کر انہیں حیرت ہوئی۔ یہ کمرہ نسبتاً صاف ستھرا اور فرنیچر سے مزین تھا اور تو اور بستر سے آراستہ پلنگ بھی موجود تھا۔ یہ دیکھ کر مارٹن بہت خوش ہوا اور بولا "اب رات آرام سے گزرے گی۔"

بلنڈن کسی انجانے خوف سے پریشان تھا۔ کہنے لگا "نہیں میرے دوست! یہاں سے بھاگو۔ ہمیں یہاں نہیں ٹھہرنا چاہئے۔"

"تو کیا سردی میں ٹھٹھر کر مرو گے؟" مارٹن بولا۔

بلنڈن کہنے لگا۔ "ایسے ویران مکان میں قیام کرنا اچھا معلوم نہیں ہوتا اور دیکھو یہاں کا فرنیچر عجیب و غریب قسم کا محسوس ہوتا ہے۔ اس پلنگ ہی کو دیکھو یہ تو اس قدر بڑا ہے کہ چار آدمی اس پر آرام کر سکتے ہیں۔"

"بھائی تم تو بے تکی سی باتیں کر رہے ہو۔ یہ پلنگ تو ہمارے لئے بہت موزوں ہے۔ آؤ اس پر آرام کریں اور ہاں آتشدان میں آگ کیوں نہ جلائی جائے؟" یہ کہہ کر مارٹن نے پہلے سے رکھی ہوئی لکڑیوں

کو اکٹھا کیا اور آگ لگا دی۔ کمرہ گرم ہونے لگا۔

مارٹن بستر پر دراز ہوگیا مگر بلنڈن کرسی پر خاموشی سے بیٹھا ناچتے ہوئے شعلوں کو دیکھتا رہا، لیکن ساتھی کے سمجھانے سے وہ بھی بستر پر دراز ہوگیا۔

ابھی وہ دونوں تھوڑی ہی دیر سوئے تھے کہ یک لخت بلنڈن نے جھنجھوڑ کر مارٹن کو نیند سے اٹھا دیا۔ اس نے وجہ پوچھی بلنڈن کے لب ہل کر رہ گئے کوئی آواز نہ نکلی بہت کوشش سے اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور کمرے کے دروازے کی طرف اشارہ کیا، مگر مارٹن کو وہاں کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔

کمرہ اب بھی گرم تھا۔ آتش دان میں آگ کے شعلے نظر آرہے تھے اور موم بتی کی لو بھی ٹمٹما رہی تھی۔

مارٹن نے کسی قدر ناراض ہوکر پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ تم ڈر کیوں رہے ہو؟“

بلنڈن کی قوت گویائی لوٹ آئی۔ وہ بولا۔ ”خاموش رہو اور سنو۔“

مارٹن ہمہ تن گوش ہوگیا۔ مگر اسے کوئی آواز سنائی نہ دی، مگر تھوڑی دیر بعد ہی کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شخص زینے پر چڑھ رہا ہے۔

”اوہ! میں اب سمجھا.....“ یہ یقیناً کوئی اچکا ہے۔ اس نے کمرے میں روشنی دیکھی، تو اس طرف چلا آیا۔

”ٹھہرو، میں دیکھتا ہوں ارے بھئی کون ہے؟“ مارٹن نے اونچی آواز میں کہا۔ انہوں نے سانس روک کر سننا شروع کر دیا، یہاں تک کہ آنے والے نے زینہ طے کر لیا۔ اب وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر دروازہ آہستہ آہستہ کھلنا شروع ہوگیا اور جیسے ہی آدھا دروازہ کھلا کوئی چیز اندر آ گئی بلنڈن کے منہ سے چیخ نکلی۔ ان دونوں نے پلنگ سے چھلانگ لگا دی اور فرش پر پڑے ہوئے پردے کے ڈنڈے اٹھانے لگے۔

ایک سایہ نظر آیا یہ سایہ کس چیز کا تھا وہ پہچان نہ سکے... انہوں نے دیکھا بہت بڑے بڑے پنجے ان کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یہ پنجے بلنڈن کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ اس نے چیخ ماری اور ڈنڈا لے کر کھڑا ہوگیا۔

مارٹن چھلانگ لگا کر دروازے کے باہر جا پڑا اور پھر کئی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے اترنے لگا وہ مدد، مدد، پکار رہا تھا اور اسے کچھ پتہ نہ تھا اس کی منزل کون سی ہے۔ ہوش اس وقت آیا جب وہ ایک پولیس مین سے جا ٹکرایا پولیس مین کو دیکھا تو وہ بے اختیار بولا۔ ”خدا کے واسطے میرے ساتھ آؤ..... میری مدد کرو۔“ وہ بمشکل اتنا ہی کہہ سکا اور بے ہوش ہوکر گر پڑا۔

پولیس مین نے جھک کر مارٹن کو اٹھانا چاہا اسی وقت اس نے مکان کی اوپر کی منزل میں کسی بہت وزنی چیز کے گرنے کی آواز سنی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

پولیس مین نے مارٹن کو جھنجھوڑ کر کھڑا کر دیا اور سختی سے دریافت کیا کہ ”وہ رات کے اس آخری حصے میں اس طرح کیوں پھر رہا ہے؟“

”خدا کے واسطے میرے ساتھ چلو فوراً۔“ ہوش میں آکر مارٹن نے پولیس والے کو مکان نمبر 50 کے احاطے کی طرف گھسیٹنا شروع کر دیا۔

اس ویران اور تاریک مکان کو دیکھ کر پولیس مین کا دل بھی دھڑکنے لگا۔ وہ بولا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا کیا تم یہاں چھپے ہوئے تھے؟“

”جی ہاں ہم اس مکان کی بالائی منزل پر تھے کہ میرے ساتھی پر کوئی حملہ آور ہوا۔“ مارٹن نے کہا۔

”حملہ آور کون تھا؟“ یہ کہہ کر سپاہی نے اپنی ٹارچ روشن کی اور جیسے ہی ٹارچ کی روشنی پھیلی، مارٹن کو اپنے ساتھی کی لاش نظر آئی جو دہلیز پر پڑی تھی۔ بدنصیب بلنڈن کا چہرہ خوف سے مسخ ہو چکا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ لندن کی تعمیر نو تک یہ مکان اسی طرح آسیب زدہ رہا۔ البتہ بلنڈن کے بعد کوئی اور موت نہ ہوئی شاید اس لئے کہ کسی نے اس مکان میں جانے کی جرأت ہی نہ کی۔





حصار

ایس امتیاز احمد-کراچی

عمارت کے تین اطراف جنگل تھا۔ گھٹا ٹوپ اور بھیانک اندھیرا ہر سو مسلط تھا۔ تاریکی میں عمارت بھوتوں اور چڑیلوں کا مسکن معلوم ہورہی تھی۔ اچانک کئی الوئوں کی کریھہ اور دل دہلاتی آواز نے پورے ماحول کو لرزا کر رکھ دیا اور پھر ایک......

شیخی بگھارنے اور اترانے والوں کے لئے اس کہانی میں دل گرفتہ سبق موجود ہے

وہ سڑک ہائی وے کے برابر چوڑی نہیں تھی اور چھوٹے چھوٹے قصبوں سے گزرتی ہوئی فلوریڈا پہنچی تھی۔ اسے دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا تھا۔ ایک حصہ جانے والوں کے لئے دوسرا آنے والوں کے لئے۔ اسٹین اپنی بیوی بابرا کے ساتھ کار میں سفر کررہا تھا۔ اس نے ہائی وے سے اپنی کار صرف چند منٹ پہلے اس سڑک پر موڑی تھی۔ اسٹین اور بابرا سردی کے موسم میں اکثر نیویارک سے فلوریڈا جاتے تھے۔ رات ہوجاتی تو وہ ہمیشہ اپنے ایک پسندیدہ ہوٹل میں قیام کرتے۔ اس بار بھی انہیں اسی ہوٹل میں ٹھہرنا تھا۔ کار کی رفتار مقررہ رفتار سے زیادہ تھی کیونکہ اسٹین آدھی رات ہونے سے قبل ہی اپنے پسندیدہ ہوٹل پہنچ جانا چاہتا تھا اس کی نئی شاندار سیڈان تیزی سے سڑک پر دوڑ ہی تھی۔ وہ صبح سے مسلسل سفر کررہے تھے۔ اسٹین کے علاوہ بابرا بھی کار چلانا جانتی تھی۔ وہ باری باری کار

چلاتے تھے، اس طرح دونوں کو باری باری آرام کا موقع مل جاتا تھا۔

اسٹین نیو یارک کی ایک کمپنی کا اعلیٰ عہدے دار تھا۔ اس کی عمر صرف اڑتیس سال تھی اس نے اپنی ذہانت اور محنت سے خاصی رقم کمائی تھی۔ اگر وہ چاہتا تو ملازمت ترک کر دیتا اور اس رقم کے منافع سے باقی زندگی نہایت خوش حالی سے گزار لیتا مگر وہ مصروفیت کا عادی تھا اس لئے ملازمت کے علاوہ زمینوں کی خرید وفروخت بھی کرتا تھا۔ فلوریڈا جانے کا مقصد تفریح بھی تھا اور تجارت بھی۔

بابرا کھال کا ایک قیمتی کوٹ پہنے ہوئے اس کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ اس کی عمر اکتیس سال تھی۔ اسے بہت زیادہ خوبصورت نہیں کہا جا سکتا تھا پھر بھی اس میں ایک دل کشی تھی۔ اس نے تھرماس سے کپ میں کافی انڈیل کے اپنے شوہر کو دی۔ یہ کافی انہوں نے راستے میں خریدی تھی۔ اسٹین نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔ ''کافی پینے کو دل نہیں چاہ رہا ہے کیونکہ اس کا ذائقہ اچھا نہیں ہے۔ راستے کے تمام کیفے بدذائقہ کافی بیچتے ہیں۔ پرانی اور سستی کافی خریدتے ہوں گے۔''

''ان سب کا باورچی بھی ایک ہی معلوم ہوتا ہے۔'' بابرا نے کھنکتی ہوئی ہنسی سے کہا۔ ہر کیفے کے کھانے ایک جیسے لگتے ہیں۔''

''ان لوگوں کا بنیادی کاروبار کافی اور کھانے بیچنا نہیں ہے۔''

اسٹین نے کہا۔ ''یہ لوگ دراصل پیٹرول فروخت کرتے ہیں۔ کھانے پینے کا انتظام محض مسافروں کی آسانی کے لئے ہوتا ہے۔''

''اور پیٹرول میں پانی ملا کے بیچتے ہیں۔''

''یقیناً''۔ اسٹین بولا۔ ''ذرا مجھے ایک سگریٹ سلگا دو۔'' بابرا نے ایک سگریٹ سلگا کے اسٹین کو دیا۔ اسٹین نے پوچھا۔ کیا وقت ہوا ہے؟

''دس بجنے والے ہیں۔ بابرا بولی۔ کیا نیند آرہی ہے؟''

''نیند تو نہیں البتہ تھکن محسوس ہو رہی ہے۔'' اسٹین بولا۔

''تم یہاں آجاؤ۔ کار میں چلاتی ہوں۔'' بابرا بولی۔

''کوئی پیٹرول پمپ آجانے دو۔ پیٹرول بھروانا ہے۔'' اسٹین نے کہا۔ ''وہاں سے تم چلانا۔''

انہوں نے ایک پل پار کیا۔ پل کے کنارے ایک دوسری ریاست کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ قریب ہی گاڑیوں کی رفتار کے لئے یہ ہدایت درج تھی۔ رات کو سفر کی انتہائی رفتار پچاس میل فی گھنٹہ، اسٹین نے راستے کی دوسری ہدایتوں کی طرح یہ ہدایت بھی نظر انداز کر دی اور پینسٹھ میل سے زیادہ رفتار سے کار چلاتا رہا۔ چند منٹ بعد اسے عقبی شیشے میں سرخ روشنی نظر آئی اور ایک پولیس کار زن سے اس کی کار سے آگے نکل کے رک گئی۔ ایک کانسٹیبل نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ اسٹین کو جرمانے کی پروا نہیں تھی لیکن چالان کی کارروائی سے تاخیر ہو جانے کا امکان تھا۔ اس کی کار کا رجسٹریشن دوسری ریاست کا تھا۔ پولیس معمولی معمولی باتوں پر چالان کرتی رہتی ہے اس لئے اسٹین کو خطرہ تھا کہ وہ مقررہ وقت پر ہوٹل نہیں پہنچ سکیں گے۔ اس نے کار روکتے ہوئے اپنی بیوی سے کہا۔ ''ممکن ہے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت لگ جائے۔''

بابرا نے کہا۔ ''یہ بھی ممکن ہے کہ ہمیں صرف تنبیہ کر کے چھوڑ دیا جائے۔''

''ناممکن۔'' اسٹین نے ناگواری سے کہا۔ ''یہ لوگ ہماری شان دار کار دیکھیں گے پھر تمہارے قیمتی کوٹ پر نظر ڈالیں گے اور جرمانہ دگنا کر دیں گے۔ انہیں سیاحوں کو پریشان کرنے کی عادت پڑ گئی ہے۔''

پولیس کار میں دو کانسٹیبل تھے۔ ایک کانسٹیبل اتر کر ان کے قریب آیا۔ اسٹین نے کھڑکی کا شیشہ نیچے گرا دیا۔ کانسٹیبل دراز قد تھا۔ اس کے چہرے سے کرختگی ظاہر ہو رہی تھی۔ اس نے سخت لہجے میں اسٹین سے کہا۔

''لائسنس؟''

اسٹین نے بٹوے سے لائسنس نکال کے کانسٹیبل کو دے دیا۔ کانسٹیبل نے ٹارچ کی روشنی میں لائسنس کے

اندراجات سرسری نظر دیکھے۔ تمہیں تھانے چلنا ہوگا۔ وہ درشتی سے بولا۔

"جناب! میں اعتراف کرتا ہوں کہ میری رفتار تیز تھی۔ اسٹین نے نرمی سے کہا۔ لیکن ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ اس لئے میں آپ کو جرمانے کے علاوہ پچاس ڈالر مزید پیش کرسکتا ہوں۔" اس نے جیب سے پچاس ڈالر کا نوٹ نکالا۔

کانسٹیبل نے اسٹین کے ہاتھ میں دبا ہوا نوٹ دیکھا۔ اس کے ہونٹ سختی سے بھینچ گئے۔ "رشوت دینے کی کوشش مت کرو مسٹر! معاملہ محض تیز رفتاری کا نہیں ہے۔ ایک اور سنگین بات بھی ہے۔"

اسٹین کی پیشانی پہ بل پڑ گئے۔ اس نے نوٹ فوراً جیب میں رکھ لیا۔ "کیا آپ مجھے کوئی دھمکی دینا چاہتے ہیں؟"

میں کیا چاہتا ہوں یہ تمہیں تھانے چل کے معلوم ہوجائے گا۔ کانسٹیبل نے بابرا کو گھور کر دیکھا پھر اپنے ساتھی کو پولیس کار آگے بڑھانے کا اشارہ کیا اور اسٹین کی کار کا دروازہ کھول کے پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ پولیس کار کے پیچھے پیچھے چلو۔ اس نے حکم دیا۔

اسٹین نے سوچا کہ اس اجڈ کے ساتھ بحث کرنے سے کوئی فائدہ نہیں چنانچہ اسے تھانے پہنچ کے کسی اعلیٰ افسر سے بات کرنی چاہئے۔ اس نے اپنی کار پولیس کار کے پیچھے لگادی۔ بابرا نے ترش لہجے میں کانسٹیبل سے پوچھا۔ "مسٹر! کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ ہمیں تھانے کیوں لے جایا جارہا ہے؟ تمہارا طرز عمل تو ایسا ہے جیسے ہم نے کوئی بہت بڑا جرم کیا ہو حالانکہ تیز رفتاری کے سوا ہماری کوئی غلطی نہیں ہے۔"

"بابرا! اسٹین نے نرمی سے اپنی بیوی کو سمجھایا۔ ان سے کچھ نہ کہو۔ انہیں یقیناً کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے۔ ہم تھانے پہنچ کے ان کے کسی افسر سے بات کرلیں گے۔"

کوئی ڈیڑھ میل بعد دونوں گاڑیاں ایک کچی سڑک پر مڑ گئیں۔ یہ سڑک ایک تھانے کے پھاٹک پر جاکے ختم ہوئی۔ تھانے کی عمارت خاصی پرانی اور چھوٹی تھی۔ اسٹین اور بابرا کانسٹیبلوں کے ساتھ ایک مستطیل کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرے میں تین فٹ اونچے ایک جنگلے کے اندر دو پرانی میزیں پڑی تھیں۔ میزوں کے گرد لکڑی کی چند کرسیاں تھیں۔ ایک میز پر ٹائپ رائٹر رکھا ہوا تھا۔ اور ایک گوشے میں فائلوں کی الماری تھی۔ جو کانسٹیبل گشتی کار چلا رہا تھا اس نے ایک بٹن دبایا اور انتظار کرنے لگا۔ خاصی دیر بعد کمرے کی پشت کے دروازے سے ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ وہ انسپکٹر کی وردی پہنے ہوئے تھا اور اپنے بدنما بھدے ہاتھ سے بال سنوارتا ہوا آرہا تھا۔ وہ ایک بھاری بھرکم آدمی تھا۔ اس کی ناک بہت لمبی تھی اور چہرہ چوکور تھا۔ اس کی بھوری آنکھوں سے ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے وہ سوتے سوتے اٹھ کر آیا ہو۔ اس نے اسٹین اور بابرا کی طرف غور سے دیکھا۔ پھر اسٹین کی گاڑی میں آنے والے کانسٹیبل سے پوچھا۔ کیا معاملہ ہے فلائڈ؟

فلائڈ چپ رہا۔ فلائڈ کا ساتھی کانسٹیبل اب ایک گوشے میں سگریٹ پینے لگا تھا۔ انسپکٹر جنگلے میں داخل ہو کر ایک میز پر بیٹھ گیا۔ فلائڈ اس کے پاس پہنچا۔ ان دونوں میں آہستہ آہستہ کچھ باتیں ہوئیں۔ اسٹین کچھ نہیں سن سکا۔ فلائڈ کی باتوں سے انسپکٹر کی پیشانی پر بل پڑنے لگے۔ فلائڈ نے ایک نوٹ بک نکالی۔ وہ راستے بھر اس نوٹ بک میں کچھ لکھتا رہا تھا۔ انسپکٹر نے اس کے اندراجات دیکھے اور الماری تک گیا۔ خاصی تلاش کے بعد اس نے الماری سے ایک کاغذ برآمد کیا اور کرسی پر بیٹھ کر نوٹ بک سے اس کا موازنہ کرنے لگا۔ پھر اس نے سر اٹھا کے قہر آلود نظروں سے اسٹین کی طرف دیکھا۔ مجھے تیز کار چلانے والوں سے نفرت ہے۔ میری حدود میں ایسے لوگوں کے ساتھ بہت سختی کی جاتی ہے۔ ہم انہیں انتہائی عبرتناک سزائیں دیتے ہیں۔ انہیں پتہ چل جاتا ہے کہ مقررہ حد سے زیادہ تیز کار چلانا کتنا بڑا جرم ہے لیکن میرا خیال ہے تمہارے پاس اپنی تیز رفتاری کا معقول جواز ضرور ہوگا۔

"جی نہیں۔" اسٹین نے شرمندگی سے کہا۔ میرے پاس کوئی جواز نہیں ہے۔ محض عجلت میں ایسا ہوگیا۔ مجھے اپنی عجلت پر افسوس ہے۔ اب آپ جو بھی جرمانہ عائد

کریں گے۔ میں ادا کرنے کے لئے تیار ہوں۔

سوچ لو۔ کیا واقعی تمہارے پاس تیز کار چلانے کا کوئی جواز نہیں ہے؟ ویسے میں تم سے اختلاف کروں گا۔ انسپکٹر نے درشتی سے کہا۔ بات یہ ہے کہ جب کوئی شخص چرائی ہوئی کار لے جارہا ہوتو وہ تیز رفتاری کے لئے مجبور ہو جاتا ہے جب کہ کار کی قیمت بھی کم سے کم دس ہزار ڈالر ہو۔ ہر چور جلد از جلد بہت دور بھاگ جانا چاہتا ہے تاکہ اسے گرفتار نہ کیا جاسکے۔ میں سمجھتا ہوں یہ بہت مناسب جواز ہے۔

''چرائی ہوئی کار؟'' اسٹین نے حیرت سے کہا۔ جناب! یہ کار میں نے تین ماہ پہلے نیویارک میں خریدی تھی۔ میرے پاس اس کار جسٹریشن سٹرفکیٹ بھی موجود ہے۔ اس نے جیب سے اپنا شناختی کارڈ نکال کے انسپکٹر کے سامنے ڈال دیا۔

انسپکٹر نے شناختی کارڈ پڑھا پھر الماری سے نکالا ہوا کاغذ دوبارہ دیکھا۔ میری اطلاع کے مطابق یہ کار چوری کی ہے۔

''آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' اسٹین تیزی سے بولا۔

''غلط فہمی کی گنجائش ہی نہیں ہے۔'' انسپکٹر نے جواب دیا۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ تم نے اور تمہاری ساتھی عورت نے اسٹین نامی ایک شخص سے کار چھین لی ہے کوئی فریب دے کے یا دھمکی دے کے۔ ساتھ ہی تم نے اس کا شناختی کارڈ اور رجسٹریشن سرٹیفکیٹ بھی اڑا لیا ہے۔''

''جناب! اسٹین نامی شخص میں خود ہوں۔'' اسٹین نے بابرا کی طرف اشارہ کیا۔ اور یہ میری بیوی ہے بابرا۔

''جی ہاں'' بابرا بھی خاموش نہ رہ سکی۔ میرا نام بابرا ہے اور یہ میرے شوہر اسٹین ہیں۔ کیا ہم آپ کو چور نظر آرہے ہیں؟''

''انسپکٹر نے بابرا کا کوٹ دیکھتے ہوئے کہا۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس چرائے ہوئے قیمتی کوٹ میں تم ایک باوقار خاتون معلوم ہو رہی ہو لیکن ریاست کی زنانہ جیل میں کچھ مجرم عورتیں اور بھی ہیں۔ وہ دیکھنے میں تم سے کہیں زیادہ باوقار معلوم ہوتی ہیں۔''

''میں آپ کے اس مذاق پر احتجاج کرتا ہوں مسٹر انسپکٹر......'' اسٹین نے ناگواری سے کہا۔

''میرا نام انسپکٹر کلائڈ ہے۔'' انسپکٹر کو غصہ آ گیا۔ بہتر ہوگا کہ تم میرے مذاق سے لطف اندوز ہونے کی عادت ڈال لو کیونکہ میرا اور تمہارا ساتھ اب بہت دنوں تک رہے گا۔ اس نے ایک سگار سلگایا۔

گویا میں اپنی ہی کار چرانے کے الزام میں پکڑا جارہا ہوں؟ اسٹین نے کہا۔ لیکن انسپکٹر! آپ میرے دستخط کے متعلق کیا کہیں گے۔ آپ شناختی کارڈ پر دستخط غور سے دیکھ لیجئے۔ میں آپ کے سامنے بھی ویسے ہی دستخط کر کے دکھا سکتا ہوں۔

''ذہین مجرم اچھے جعل ساز بھی ہوتے ہیں۔ کیوں برٹ! میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟'' انسپکٹر نے دوسرے کانسٹیبل سے کہا۔ تم ریاستی جیل کے پہرے دار رہ چکے ہو۔ تمہاری معلومات کیا کہتی ہیں؟''

آپ کا خیال درست ہے سر! برٹ نے تائید کی۔

کانسٹیبل فلائڈ نے اسٹین سے کہا۔ اگر یہ تمہاری کار ہے تو ہمیں اس کی رسید یا اس کا بل یا اس کا کیش میمو دکھاؤ۔

''کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں یہ چیزیں اپنے ساتھ لئے پھرتا ہوں، کار کا کیش میمو میرے بینک میں محفوظ ہے۔ اسٹین نے جواب دیا۔

اسے تمہاری بدقسمتی کہا جاسکتا ہے۔ کیش میمو بینک میں رکھ کے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔

میں اپنے وکیل کو فون کرنا چاہتا ہوں۔ اسٹین نے کہا۔

''ضرور۔ کیا تمہارا وکیل اسی ریاست میں ہے؟''

''جی نہیں'' اسٹین نے جواب دیا۔ میرا وکیل نیویارک میں رہتا ہے۔''

''افسوس۔ ہم طویل فاصلوں کے لئے ٹیلی فون کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔''

''اس کال کا خرچ برداشت کرلوں گا۔''

''خرچ کا سوال نہیں ہے، یہ ہمارا اصول ہے۔ ہم اپنے اصول نہیں توڑتے۔ اس کے علاوہ نیو یارک کے وکیل کو فون کرنے سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ ایک دو دن سے پہلے یہاں نہیں پہنچ سکتا۔ ریاست کی عدالت خود تمہارے لئے وکیل مقرر کردے گی۔''

''خوب'' اسٹین نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔''اب براہ کرم یہ بتا دیجئے کہ اس فرضی الزام سے بچنے کے لئے ہمیں کتنی رقم پیش کرنی ہوگی!''

''مسٹر! تم ہمیں رشوت کا لالچ دے رہے ہو؟'' انسپکٹر کلائڈ غرایا۔''رشوت دینے کی ایک کوشش تم پہلے بھی کر چکے ہو۔ کلائڈ نے مجھے بتا دیا ہے کہ تم نے اسے پچاس ڈالر دینے کی کوشش کی تھی۔ اب بہتر یہ ہوگا کہ تم اپنا منہ بند رکھو ورنہ زبردست مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ نجات ملنا محال ہو جائے گی۔

میں اپنی ضمانت دینا چاہتا ہوں۔

رات کا وقت ہے۔ یہ کام بھی اس وقت نہیں ہوسکتا۔ کلائڈ نے نفی میں سر ہلایا۔ کار کی چوری سنگین جرائم میں شمار ہوتی ہے۔ تمہاری ضمانت صرف جج منظور کرسکتا ہے۔

''جج صاحب کب تک دستیاب ہوسکیں گے؟'' اسٹین نے زہر خند سے پوچھا۔

''یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ان کے پاس بے شمار مقدمات ہوتے ہیں پھر بھی اگر تمہاری قسمت اچھی ہوئی تو شاید کل کچھ ہوسکے۔ بہر حال میں کوئی وعدہ نہیں کرسکتا۔

''اس دوران میں ہمارے ساتھ سلوک کیا کیا جائے گا؟'' اسٹین نے غصہ ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔

مطمئن رہو۔ یہ جگہ تمہارے لئے ایک ہوٹل سے کم ثابت نہیں ہوگی۔ انسپکٹر کلائڈ بولا۔ عمارت کے عقبی حصے میں اچھے کمرے ہیں اور بالکل مفت۔ کھانا بہت اچھا تو نہیں ہوگا مگر ایسا برا بھی نہیں ہوگا۔ خیر ذرا آگے بڑھو اور تمہاری جیبوں میں جو کچھ ہے، وہ نکال کے میز پر رکھ دو۔

اسٹین ہچکچایا۔ کانسٹیبل فلائڈ نے اس کا بازو موڑتے ہوئے اسے ایک دھکے سے میز کے قریب کھڑا کردیا۔ نوٹوں سے بھرا ہوا بٹوا، چابیاں، رومال، سفری چیک بک، عام چیک بک، ایک قیمتی گھڑی اور ایک سونے کی انگوٹھی۔ یہ چیزیں اسٹین نے میز پر رکھ دیں۔ سفری چیک بک کی مجموعی رقم پندرہ سو ڈالر تھی۔ انسپکٹر نے ٹائپ رائٹر میں ایک سادہ کاغذ لگایا۔

''تمہارا نام''

''اسٹین کے لہجے میں طنز تھا۔''

''تمہارا اصل نام؟''

''اسٹین۔'' اسٹین کے لہجے میں دہرایا۔

نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارا اصل نام جان ہے۔ انسپکٹر نے یہی نام ٹائپ کیا اور پوچھا۔ پتہ؟''

''وہی جو رجسٹریشن بک اور ڈرائیونگ لائسنس میں ہے۔''

انسپکٹر نے ٹائپ کیا۔ پتہ نامعلوم

''پیشہ؟''

اسٹین نے اپنے دونوں پیشے بتا دیئے۔ ملازمت بھی، کاروبار بھی۔ انسپکٹر ٹائپ کرتا رہا۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی چیزوں کی فہرست ٹائپ کی۔ بٹوے کی رقم اور سفری چیک بک کی رقم ٹائپ کی پھر کاغذ مشین سے نکال کر اسٹین کو دے دیا۔ اسٹین نے غصے اور جھنجلاہٹ سے کاغذ پڑھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی پریشان کن خواب دیکھ رہا ہو۔ اسے توقع تھی کہ ابھی اس کی آنکھ کھل جائے گی۔ اس نے نگاہ اٹھا کے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ بابرا جنگلے کے دوسری جانب خوف زدہ سی کھڑی تھی۔ اسٹین کے دل میں اس کے لئے ہمدردی پیدا ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ بابرا کو ایسے حالات سے کبھی سابقہ نہیں پڑا۔ وہ کیا محسوس کر رہی ہوگی مگر اس موقع پر اسٹین اس سے ضبط اور استقامت کی توقع رکھتا تھا۔

انسپکٹر نے اسٹین کی طرف قلم بڑھایا۔ کاغذ پہ دستخط کردو۔ اسٹین نے حکم کی تعمیل کی۔ انسپکٹر نے کاغذ کی دراز میں رکھ لیا پھر اس کی خوں خوار آنکھیں بابرا کی طرف اٹھیں۔ اب تمہاری باری ہے۔

بابرا ساکت وصامت کھڑی رہی۔ کانسٹیبل برٹ نے اسے کلائی سے گھسیٹ کے انسپکٹر کے سامنے کھڑا کردیا۔ اسٹین نے تیزی سے کہا۔ کانسٹیبل! اپنے گندے ہاتھ میری بیوی سے الگ رکھو۔

''تم میں ہمت ہے تو اس کا ہاتھ چھڑالو۔'' برٹ کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔ اس نے بابرا کی کلائی اور مضبوطی سے پکڑلی۔ اس کے دوسرا ہاتھ ریوالور کے دستے پر رکھا ہوا تھا۔

''ہاں، مجھ میں ہمت ہے۔'' اسٹین دانت بھینچتے ہوا آگے بڑھا۔

''طیش میں آنے کی ضرورت نہیں اے مسٹر!'' انسپکٹر کلائڈ نے اپنے ہونٹوں سے سگار نکالتے ہوئے کہا۔''ایسی باتوں سے تم اپنے لئے مزید مشکلات پیدا کرلوگے۔'' اس نے بابرا کی جانب دیکھا۔ اپنی ہر چیز میز پر رکھ دو۔ بابرا ٹس سے مس نہ ہوئی۔ انسپکٹر نے ایک جھٹکے میں اس کے ہاتھ سے پرس چھین لیا اور بولا۔ تمہارے ہاتھ میں ایک گھڑی اور ایک انگوٹھی بھی ہے۔ یہ چیزیں بھی اتاردو۔ قانون کی رو سے قیدی اپنی کوئی چیز اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے۔ اور ہاں جس کوٹھری میں تمہیں رکھا جائے گا، وہاں خاصی گرمی ہوگی لہذا اپنا کوٹ بھی اتاردو۔ وہاں تمہیں اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

اسٹین کو یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کے علاوہ اس کی بیوی بھی جیل میں ٹھونس دی جائے گی۔ وہ چیخا۔ انسپکٹر! تم میری بیوی کو گرفتار نہیں کرسکتے۔ اس معاملے کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''ہاں، تم اگر چاہو تو اسے اپنی بیوی کہہ سکتے ہو۔ انسپکٹر نے اطمینان سے کہا۔ لیکن قانون کی نظر میں یہ تمہاری شریک جرم ہے اس لئے اسے بھی ضرور گرفتار کیا جائے گا۔

اسٹین نے انسپکٹر کی میز پر جھکتے ہوئے کہا۔ تم اور تمہارے نائب اس وقت جو چاہیں کرلیں لیکن جب مجھے یہاں سے نجات ملے گی تو میں تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو بخشوں گا نہیں۔ تم لوگ پوری ریاست میں کہیں صورتیں دکھانے کے قابل بھی نہیں رہو گے۔''

انسپکٹر نے سرسری انداز میں اپنے منہ سے سگار نکالا۔ ایک لمحے تک وہ اس کا جلتا ہوا سرد یکھتا رہا پھر اس نے ایک دم اچھل کے اسٹین کے بال پکڑ لیے اور جلتا ہوا سگار اس کے گال سے لگادیا۔ مجھے یقین نہیں کہ اب تمہیں یہاں سے نجات مل سکے گی۔ اسٹین کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس نے جھٹکے سے اپنے بال چھڑائے اور جلے ہوئے گال پہ ہاتھ رکھ لیا۔ انسپکٹر اس کی طرف سے بے تعلق ہو کے بابرا کا پرس کھولنے لگا۔ پرس کھول کے اس نے اسے میز پر الٹ دیا۔ نصف درجن کے قریب مختلف چیزیں میز پر گریں۔ ایک لپ اسٹک فرش پر لڑھک گئی۔ انسپکٹر نے ہاتھ بڑھا کے بابرا کا کوٹ بھی کھینچ لیا۔ پھر بابرا کا دستانہ اتار کر اس کی انگلی سے ہیرے کی قیمتی انگوٹھی اتارنے لگا۔

اسٹین نے آگے بڑھ کر اسے دھکا دیا اور اس کے منہ پر پوری طاقت سے ایک گھونسا مارا۔ انسپکٹر کرسی سمیت فرش پر گرا مگر فوراً لڑکھڑاتا ہوا اٹھ گیا۔ اس نے ایک ہاتھ اپنے منہ پر رکھا تو اس کی انگلیاں خون سے تر ہوگئیں۔ اس نے تیزی سے ریوالور نکال کے فائر کردیا۔ گولی اسٹین کے بائیں کان کی لو چھوتی ہوئی نکل گئی۔ پھر اس سے پہلے کہ انسپکٹر دوسرا فائر کرتا، کانسٹیبل فلائڈ نے اس کی کلائی پر ہاتھ مارا۔ ریوالور زمین پہ گر گیا۔ اسی لمحے کانسٹیبل برٹ نے آگے بڑھ کر ریوالور کے دستے سے اسٹین کے سر پر ضرب لگائی۔ اسٹین بے ہوش ہوگیا۔

اسٹین کو ہوش آیا تو وہ ایک کوٹھری میں پٹلی برتھ پہ لیٹا ہوا تھا۔ کوٹھری بے حد تنگ اور تاریک تھی۔ اس میں کھڑکی نہیں تھی۔ البتہ چھت میں بلب کے ساتھ ایک ہوا دان بنا ہوا تھا۔ دروازہ لوہے کا تھا۔ دروازے میں کھانے پینے کی چیزیں داخل کرنے کیلئے تھوڑی سی جگہ چھوڑ دی گئی تھی۔ عقبی دیوار کے ساتھ ایک کموڈ رکھا ہوا تھا۔ اسٹین نے لیٹے لیٹے ان چیزوں کا جائزہ لے لیا۔ اس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا اور بائیں کان کی لو پر ایک پٹی چپکی ہوئی تھی۔ اس کے گال میں بھی تکلیف ہو رہی تھی۔ اس کا اا

کوٹ اور دستانے اتار لیے گئے تھے۔ باقی لباس جسم پر موجود تھا۔ کمرے میں انتہائی تکلیف دہ حبس تھا۔ اسٹین نے سوچا کہ شاید کوٹھری میں کوئی اور قیدی بھی ہو۔ وہ اٹھ کے کھڑا ہوگیا مگر اوپر کی برتھ خالی تھی۔ اس نے اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ جیبیں بھی خالی تھیں۔ وہ ناگواری سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ کوٹھری ایک بڑے تابوت سے کچھ بڑی تھی۔ کیا بابر بھی کسی ایسے ہی مقبرے میں بند کی گئی ہے؟ اس خیال نے اسٹین کو اور افسردہ کردیا۔ کوٹھری کے باہر ایک بلب لگا ہوا تھا۔ اس کی روشنی بہت کم تھی۔ نیم تاریکی میں یہ جھانکنے کی کوشش کی۔ باہر ایک چھوٹی سی راہ داری تھی۔ سامنے کی دیوار میں تین دروازے اور تھے۔ ایک کوٹھری دائیں جانب بالکل آخر میں نظر آرہی تھی۔ وہاں لکڑی کی ایک کرسی پہ کوئی سنتری بیٹھا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔ کرسی کے قریب دیوار کے سہارے ایک شاٹ گن رکھی تھی۔ اسٹین نے کوشش کرکے اس تنگ جگہ سے اپنا سر باہر نکالا اور سنتری کو آواز دی۔ سنتری ایک دبلا پتلا نوجوان تھا۔ اس نے سگریٹ ہونٹوں سے نکالے بغیر پوچھا۔ کیا بات ہے؟ کیوں چیخ رہے ہو؟

''بھائی!'' اسٹین نے لجاجت سے کہا۔ کیا بجا ہوگا؟''

''گیارہ بج کر دس منٹ۔ سنتری نے اپنی دستی گھڑی دیکھ کر کہا۔''

''رات کے؟''

''اور نہیں تو کیا دن کے۔ تم آدھے گھنٹے سے زیادہ بے ہوش تھوڑی رہے ہو۔ اب کیا خیال ہے؟''

سنتری نے حال پوچھا تو اسٹین کو اس کے لہجے میں ہمدردی محسوس ہوئی۔ اس نے تڑپ کے کہا۔ بس بھائی! زندہ ہوں۔''

''تم بہت خوش قسمت ہو دوست!'' سنتری نے ایک کش لے کے کہا۔ ورنہ انسپکٹر اور اس کے نائب، قیدیوں کے ساتھ عموماً بہت سختی سے پیش آتے ہیں۔'' پھر وہ رازدارانہ انداز میں بولا۔ ''تم نے انسپکٹر کے منہ پر گھونسا خوب مارا۔ اس کے دو دانت ٹوٹ گئے ہیں۔''

اسٹین کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ اس نے دھیمی آواز میں سنتری سے کہا۔ تمہاری باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تم انسپکٹر سے خوش نہیں ہو؟'' سنتری نے ایک سرد آہ بھری۔ ظالم افسروں سے کون خوش ہوتا ہے اور جہاں تک میرا سوال ہے میں انسپکٹر سے نفرت کرتا ہوں۔ اگر میں تمہیں اپنی کہانی سنانے بیٹھ جاؤں تو ایک سال سے کم نہیں لگے گا۔ بہرحال یہ خیال رکھنا کہ انسپکٹر اور اس کے نائبوں نے تم سے اور تمہاری بیوی سے جو سلوک کیا ہے، اس میں میرا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اگر کبھی تمہیں یہاں سے چھٹکارا مل جائے تو تم میرے خلاف کوئی کارروائی نہ کرنا۔

''کیا تم بتا سکتے ہو کہ مجھے یہاں سے کب چھٹکارا ملے گا؟''

''کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ تم نے اسے گھونسا مارنے کی جسارت کی ہے اس لئے تمہیں شاید جلدی چھٹی نہ ملے۔ دو تین ماہ بھی لگ سکتے ہیں۔ وہ بہت غصے میں ہے۔ جب تک اس کا غصہ نہیں اترے گا۔ وہ تمہاری رہائی کے سلسلے میں کوئی بات نہیں سنے گا۔

''میری بیوی کہاں ہے؟ کیسی ہے وہ؟''

''اپنی جیسی حالت اس کی بھی سمجھ لو''

انسپکٹر ہمیں زیادہ دنوں تک قید نہیں رکھ سکتا۔ اسٹین کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ جہاں تک قانون کا تعلق ہے۔

''یہاں صرف انسپکٹر کلائڈ کا قانون چلتا ہے۔''

''مگر وہ اپنے اعلیٰ حکام کا حکم نہیں ٹال سکتا۔ ہم اس کے اعلیٰ حکام تک پہنچ سکتے ہیں۔''

''مگر کب؟'' غالباً اس وقت جب تمہاری داڑھی پیٹ تک پہنچنے لگے گی۔ اس کے علاوہ کلائڈ اور اس کے نائب خود کو بچانے کے لئے بڑے سے بڑا جھوٹ بول سکتے ہیں۔ اور ملزم کے خلاف جعلی ثبوت تیار کرسکتے ہیں۔

''دیکھا جائے گا۔ اسٹین نے کہا۔ کیا تم اپنا نام بتانا پسند کرو گے؟''

''کیوں نہیں۔ مجھے سام کہتے ہیں؟''

اسٹین چند لمحوں تک کچھ سوچتا رہا پھر اس نے تذبذب کے ساتھ سنتری سے کہا۔ سام! یقین کرو ہم قطعی

بے قصور ہیں۔ ہمیں محض کسی غلط فہمی کی وجہ سے قید کرلیا گیا ہے۔ کیا ایسی صورت میں تم ہماری کوئی مدد کر سکتے ہو؟ سام چپ ہوگیا جیسے اُس کی زبان گنگ ہوگئی ہو۔ اسٹین نے بے تابی سے اس کی طرف دیکھا۔ چند لمحوں بعد اس نے التجا کے انداز میں اپنا سوال دہرایا۔ سام! تم ایک اچھے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ یقین کرو ہم بھی کوئی برے لوگ نہیں ہیں۔ کیا تم ہماری کوئی مدد کر سکتے ہو؟"

خاصے سکوت کے بعد سام نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ مگر کس طرح؟ تم ریاست کے کسی بڑے آدمی تک ہمارا پیغام پہنچا سکتے ہو۔

"نہیں نہیں" سام سہم گیا۔ میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ انسپکٹر کو معلوم ہوگیا تو وہ میرے سر کے دو ٹکڑے کردے گا۔

"میں تمہیں نہایت معقول انعام دوں گا۔"

"مگر انعام سے پہلے ہی انسپکٹر مجھے مار ڈالے گا۔ ایک مردہ آدمی کے لئے بڑے سے بڑا انعام بیکار ہے۔ میں انسپکٹر کی دشمنی مول نہیں لے سکتا۔ وہ دیوانہ ہے۔ اس کا ذہنی توازن درست نہیں ہے۔ سام چند لمحوں تک خاموش رہا پھر بولا۔ انسپکٹر کے ساتھ چند روز پہلے ایک حادثہ پیش آیا تھا۔ اس حادثے نے اسے جانور بنادیا ہے۔"

"اسٹین نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ گویا تم ہماری کوئی مدد نہیں کرسکتے؟"

سام کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں۔ اس نے کہا۔ ممکن ہے کچھ غور کرنے کے بعد میں تمہاری مدد کا کوئی محفوظ طریقہ سوچ لوں۔"

"اس وقت میری بیوی کہاں ہے؟" اسٹین نے بے تابی سے پوچھا۔

"راہ داری کے آخر میں عورتوں کے لئے ایک مخصوص کوٹھری ہے؟" سام نے بتایا۔ کیا وہ واقعی تمہاری بیوی ہے؟"

"ہاں کیا عورتوں کی کوٹھری بھی ہماری کوٹھری جیسی ہے؟"

"تمام کوٹھریاں ایک جیسی ہیں" سام نے بتایا۔ البتہ عورتوں کوٹھری کچھ بڑی ہے۔ اس میں چار عورتیں قید ہیں۔ کبھی کبھی ایک وقت میں آٹھ دس عورتیں بھی قید ہو جاتی ہیں۔"

"آہ میری بیوی نے کبھی جیل کی صورت تک نہیں دیکھی تھی۔"

"سنا ہے کہ بہت جلد ایک نیا جیل خانہ تعمیر ہونے والا ہے۔ سام نے کہا۔ تمہیں سگریٹ چاہئے؟"

"اگر مل جائے تو مہربانی ہوگی"

سام نے جیب سے پیکٹ نکال کے اسٹین کو ایک سگریٹ دیا اور ماچس سے خود سلگایا پھر کچھ سوچ کے اس نے پورا پیکٹ اسٹین کو دے دیا۔ یہ تم رکھ لو لیکن ماچس نہیں ملے گی۔ قیدیوں کو ماچس رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ جب بھی سگریٹ پینا ہو، مجھے آواز دے لینا۔ یہ کہہ کے وہ چلا گیا۔

تھانے میں ایک تازہ شکار آیا تھا۔ وہ ایک طویل قامت باوقار بوڑھا تھا۔ اس کی عمر ساٹھ پینسٹھ سال کے درمیان ہوگی۔ اس کا لباس صاف ستھرا اور قیمتی تھا۔ انسپکٹر کلائڈ اور اس کے ماتحت اس سے مختلف سوالات کر رہے تھے۔ دفعتہً بوڑھے نے کہا۔ یہ ایک جھوٹا اور بے بنیاد الزام ہے۔ اس کی آواز غصے سے بھرائی ہوئی تھی۔ تم مجھے ایک منٹ کے لئے بھی حراست میں نہیں لے سکتے۔ آخر تمہارے پاس ثبوت کیا ہے؟ گواہ کہاں ہیں؟

"بکواس بند کرو۔ انسپکٹر غرایا۔ اس کا نچلا ہونٹ سوج گیا تھا۔ سوجے ہوئے ہونٹ کو آرام پہنچانے کے لئے اس نے ایک رومال تہہ کر کے منہ پر رکھ لیا تھا۔ رومال کی وجہ سے اس کے ٹوٹے ہوئے دانت نظر نہیں آرہے تھے۔ ہمیں اوپر سے ڈرائیور کو گرفتار کرنے کا حکم ملا ہے جو ایک عورت کو کچل کے بھاگ گیا تھا۔ یہ واقعہ یہاں سے ساٹھ میل دور ایک قصبے میں پیش آیا تھا۔ ہمیں حق حاصل ہے کہ مجرم کو گرفتار کر کے اس وقت تک بند رکھیں جب تک اس قصبے کی پولیس یہاں نہ پہنچ جائے۔"

"ہمارے پاس جو رپورٹ پہنچی ہے۔" انسپکٹر

لا۔ اس کے مطابق یہ حادثہ 68 ماڈل کی ایک ہلکی سبز یڈان سے ہوا ہے۔ اس کے پہیوں پر وھائٹ وال کے ر چڑھے ہوئے ہیں اور سامنے کی جانب دایاں ٹینڈر ڑھا ہے۔ یہ سب باتیں تمہاری کار سے مطابقت رکھتی ں۔ ہمیں مزید کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔''

''میں بتا چکا ہوں کہ وہ ٹینڈر کسی حادثے میں ڑھا نہیں ہوا بلکہ میری کار کے سامنے ایک کار کھڑی تھی ا پیچھے ہوئی تو ٹکر لگ گئی۔''

انسپکٹر نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا حادثے کے عینی گواہوں نے تمہاری کار کا رجسٹریشن بھی ٹ کرلیا تھا۔ 82347۔ ڈی آئی۔ اس بارے میں کیا لتے ہو؟ کیا یہ نمبر تمہاری کار کا نہیں ہے؟ کاغذات کے طابق وہ کار تمہارے ہی نام رجسٹر ہے۔''

''ہاں لیکن......''

''تمہارا حلیہ بھی رپورٹ میں درج ہے'' انسپکٹر نے پنے سامنے رکھے ہوئے کاغذ پر نگاہ دوڑائی۔ ''نا یشیا کار ہنے والا، عمر ساٹھ سال سے اوپر، بال سفید، جسم بلا، قد لمبا۔ یہ بالکل تمہارا حلیہ ہے۔''

تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے اپنی ندگی میں کبھی......''

''بس بہت ہو چکا مسٹر اسٹون۔'' انسپکٹر نے اس ی بات کاٹ دی۔ اپنی جیبوں سے تمام چیزیں نکال کر ز پر رکھ دو۔ بوڑھا اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ انسپکٹر نے اپنے حت سے کہا۔ فلائڈ! ذرا دیکھو کیا اس آدمی کے قدم زمین ں دھنس گئے ہیں؟ اسے میرے پاس لاؤ۔''

تین دن بیت گئے اور تین راتیں گزر گئیں۔ اسٹین ی کوٹھری میں ایک قیدی اور آ گیا۔ اس کا نام ڈینس ا۔ ڈینس چھوٹے قد کا ایک خاموش طبع آدمی تھا۔ اس کی ر پچاس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ اسٹیل کے فریم کا شمہ لگاتا تھا اور نیشنل فوڈ پروڈکٹس میں نائب صدر تھا۔ ٹین کی طرح اس کے پاس بھی ایک نئی کار تھی۔ گرفتاری ے وقت وہ بھی مقررہ رفتار سے تیز کار چلا رہا تھا۔ اس کی ار سے اسکاچ وھسکی کی ایک کھلی ہوئی بوتل بھی ملی تھی۔ انسپکٹر نے اس کی بیوی سے جرح کر کے یہ اگلوالیا تھا کہ کار چلاتے وقت انہوں نے وھسکی پی تھی۔ ان دونوں پر شراب کے نشے میں کار چلانے کا الزام تھا۔ انہیں بھی یہی کہہ کر حراست میں رکھا گیا تھا کہ جیسے ہی ریاست کے جج کو وقت ملا، وہ اس کے سامنے پیش کر دیئے جائیں گے۔

ڈینس نے اسٹین سے کہا۔ صاف ظاہر ہے کہ ہمیں پھانسا گیا ہے۔ شاید انسپکٹر کلائڈ کا ذہنی توازن درست نہیں ہے۔ خصوصاً آسودہ حال لوگوں سے اسے شدید نفرت معلوم ہوتی ہے۔ پتہ نہیں اس نے ہماری طرح کتنے شرفا کو بند کر رکھا ہو لیکن میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ اس سب کے پاس نئی کاریں ہوں گی۔ ایسی کاریں اس علاقے میں بہت کم نظر آتی ہیں۔''

''نہ معلوم اس مصیبت کا خاتمہ کب ہو'' اسٹین نے بیزاری سے کہا لیکن یہاں کا سنتری سام بہت اچھا آدمی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ انسپکٹر نفسیاتی مریض ہے۔ شاید ماضی میں اسے کوئی زبردست حادثہ برداشت کرنا پڑا ہے۔ ہم لوگوں سے وہ اسی حادثے کا انتقام لے رہا ہے۔''

''مجھے جب بھی رہائی ملی'' ڈینس نے جوش سے کہا۔ میں کلائڈ کو جیل بھجوا کے رہوں گا۔ خواہ اس کے لئے گورنر کے پاس جانا پڑے۔ یہ غیر قانونی ظلم وتشدد انسپکٹر کو راس نہیں آئے گا۔''

جب سے ڈینس آیا تھا۔ سنتری سام نے اسٹین سے مدد وغیرہ کی گفتگو ترک کر دی تھی۔ ایک بار تنہائی میں اس نے اسٹین سے کہا۔ دوست! مطمئن رہو۔ میں اس سلسلے میں برابر غور کر رہا ہوں لیکن تم اپنے ساتھی سے اس کا ذکر نہ کرنا سمجھے۔''

جیل کا غسل خانہ کوٹھری سے بھی زیادہ چھوٹا اور تنگ تھا۔ چوتھے روز اسٹین کی مایوسی اور افسردگی انتہا کو پہنچ گئی۔ سنتری سام ڈینس کو غسل کے لئے غسل خانے لے گیا۔ جاتے وقت اس نے آنکھ مار کر اسٹین کو اس طرح اشارہ کیا جیسے اس سے کوئی بہت خاص بات کہنی ہو۔ اسٹین بے چین ہو گیا۔ وہ سام کے اشارے کا کوئی مطلب نہیں نکال سکا تھا۔ پھر اس کی باری آئی تو اسے غسل خانے لے

جایا گیا۔ جب تک اس نے غسل نہیں کرلیا۔ سام غسل خانے کے باہر اپنی شاٹ گن لئے خاموش بیٹھا رہا۔ پھر جب اسٹین شیو بنانے لگا تو سام نے زبان کھولی۔ میں نے دانستہ تمہارا نمبر سب سے آخر میں رکھا تھا تاکہ ہمیں باتیں کرنے کا موقع مل سکے۔ میں پہلی بات تمہیں انسپکٹر کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔ وہ ذہنی طور پر معتدل نہیں ہے۔ اس کی ایک چھوٹی سی لڑکی تھی، نو سال کی ہوگی۔ اس کی ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔ انسپکٹر اسے بے حد چاہتا تھا۔ ایک دن کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ ایک شاندار کار میں ہائی وے سے گزر رہا تھا۔ اس نے انسپکٹر کی معصوم بچی کو کچل کے مار ڈالا۔ وہ نشے میں تھا اور نوے میل سے زیادہ تیز کار چلا رہا تھا حالانکہ اس ریاست میں رفتار کی حد تیس میل فی گھنٹہ ہے۔ لوگ اس پابندی کی پرواہ نہیں کرتے، خاص طور سے نیویارک کے لوگ۔ انسپکٹر کی بچی کا بھیجا پاش پاش ہو گیا تھا۔ اس کی صورت نہیں پہچانی جاتی تھی۔ وہ شخص حادثے کے بعد ٹھہرا تک نہیں، فوراً فرار ہو گیا اور آج تک گرفتار نہیں کیا جاسکا۔ کچھ لوگوں نے حادثہ ہوتے ہوئے دیکھا تھا مگر کار کی رفتار بہت تیز تھی اس لئے وہ نمبر نوٹ نہیں کر سکے تھے۔

''یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ نشے میں کار چلا رہا تھا؟'' اسٹین نے پوچھا۔

''جو شخص تیس میل کے علاقے میں نوے میل کی رفتار سے جا رہا ہو، وہ یقیناً نشے میں تھا۔

''گویا انسپکٹر اب نیویارک کے ہر نئی کار والے سے اپنی لڑکی کا انتقام لے رہا ہے؟''

''ہاں معلوم تو یہی ہوتا ہے'' سام نے تسلیم کیا۔ وہ ایسے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ دنوں تک قید رکھ کے بہت خوش ہوتا ہے۔''

''لیکن اب تک کسی نے اس کے خلاف رپورٹ کیوں نہیں کی؟''

''انسپکٹر بہت ہوشیار آدمی ہے'' وہ اپنی رپورٹ اس طرح تیار کرتا ہے کہ کسی کو اس پر ہاتھ ڈالنے کا موقع نہیں ملتا اور ظاہر ہے کہ ایک عام شخص کے مقابلے میں انسپکٹر اور اس کے نائبوں کی بات زیادہ درست مانی جاتی ہے۔''

''مجھے اس کی لڑکی کے حادثے پر افسوس ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ دوسروں سے زیادتی کرے۔ اسے اس سلسلے میں معاف نہیں کیا جاسکتا۔ اسٹین نے تولیئے سے چہرہ پونچھا۔ خیر تم یہ بتاؤ کہ ہماری مدد کے لئے تم نے کچھ سوچا؟''

اسٹین نے کچھ ہچکچا کے پوچھا۔ کیا تمہارا اشارہ رشوت وغیرہ کی طرف ہے؟ گو تمہاری طبیعت نیک ہے مگر تم تو پولیس والے''

میں رشوت لینا نہیں چاہتا۔ سام نے اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے جواب دیا۔ لیکن میری خدمات تمہیں مفت حاصل نہیں ہوسکتیں۔ ظاہر ہے کہ میں انسپکٹر کو تمہاری رہائی پر آمادہ نہیں کرسکتا اس لئے صرف یہ کیا جاسکتا ہے کہ تم لوگوں کو فرار ہونے کا موقع دیا جائے۔''

''کیا تم ایسا کرسکتے ہو؟'' اسٹین نے بے قراری سے پوچھا۔

''رات گئے انسپکٹر سو جاتا ہے اور اس کے دونوں ساتھی گشت پر ہوتے ہیں۔ میں ان کی نظر بچا کے یا کسی اور طریقے سے تمہیں فرار ہونے کا موقع دے سکتا ہوں مگر وہ فوراً سمجھ جائیں گے کہ یہ کام میں نے کیا ہے۔ یہاں صرف میں سنتری ہوں اور تقریباً ہر وقت ڈیوٹی پر رہتا ہوں۔ صرف دن کے وقت کچھ دیر کے لئے برٹ میری جگہ لے لیتا ہے مگر ایسا کبھی کبھی ہوتا ہے کیونکہ اسے اکثر کوئی دوسرا کام مل جاتا ہے اور میری مصیبت آجاتی ہے۔ وہ چند لمحوں تک خاموش رہا پھر آہستہ سے بولا۔ میرا کوئی گھر نہیں ہے دوست! میں یہ ذلیل ملازمت مجبوراً کر رہا ہوں۔

''اگر انہیں معلوم ہوگیا کہ ہمیں تم نے فرار کرایا ہے تو کیا ہوگا؟''

''وہ کسی تامل کے بغیر مجھے گولی مار دیں گے۔''

''تم نے اپنے بچاؤ کا بھی کوئی حل سوچا؟''

''ہاں ایک حل ہے'' سام نے جواب دیا۔

تمہارے ساتھ مجھے بھی فرار ہونا پڑے گا۔ تم مجھے اگلی ریاست میں اتار دینا یا اپنے ساتھ فلوریڈا لے چلنا۔ میں نے فلوریڈا کی سنہری دھوپ، ناریل اور حسین لڑکیوں کی بہت تعریفیں سنی ہیں۔

’’مجھے منظور ہے‘‘

’’فلوریڈا تک تو مجھے کوئی بھی لفٹ دے سکتا ہے۔ سام بولا۔ تمہیں اپنی رہائی کے لئے کچھ اور بھی کرنا پڑے گا کیونکہ ظاہر ہے فرار ہونے کی صورت میں مجھے معقول رقم کی ضرورت ہوگی۔ میں اپنی ملازمت چھوڑ کے تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ میری ہمیشہ سے خواہش ہے کہ میں اپنا کوئی کاروبار کروں۔ مثلاً کوئی کیفے یا ریستوران کھول لوں۔

’’صاف بات کرو۔ تم کتنی رقم چاہتے ہو؟‘‘

’’اندازاً دس ہزار ڈالر۔‘‘

’’دس ہزار ڈالر؟‘‘ اسٹین چونکا۔ ’’سام! کوئی قابل قبول بات کرو دوست! سام نے ایک سگریٹ سلگا کے گہرا کش لیا۔ دس ہزار ڈالر سے کم میں میرا کام نہیں چلے گا۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ منظور کرو یا نہ کرو۔ میرے لئے ایک سنہرا موقع ہے۔ ایسا موقع زندگی میں بار بار نہیں آتا اور تم جیسے دولت مند کے لئے دس ہزار ڈالر کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ وہ کھڑا ہوگیا۔ اگر تم چاہو تو غور کرنے کے بعد جواب دے دینا لیکن یہ سوچ لو، نہ معلوم تمہیں یہاں سے کتنے دن قید رہنا پڑے۔ ہوسکتا ہے چھ مہینے لگ جائیں۔ چھ مہینے تک جیل کی صعوبت کون برداشت کرسکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں دس ہزار ڈالر کی اہمیت ہی کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تم چھ مہینے گزارنے کی ہمت کرلو مگر تمہاری بیوی ہرگز اتنا وقت نہیں گزار سکتی۔ تمہیں اس پر رحم آنا چاہئے۔

’’اسٹین نے سنجیدگی سے سر ہلایا۔ لیکن میرے پاس یہاں اتنی رقم نہیں ہے۔‘‘

’’تم مجھے چیک دے سکتے ہو۔‘‘ سام نے کہا۔ میں اسے اپنے چھوٹے سے اکاؤنٹ میں جمع کرادوں گا۔ پھر وہ میرے حساب میں منتقل ہوجائے گا تو میں تمام رقم نکال لوں گا اور ہم تینوں یہاں سے روانہ ہوجائیں گے۔

’’اس کام میں تو تین چار دن لگ جائیں گے۔‘‘

’’میں کوشش کروں گا کہ یہ کام جلد از جلد ہو جائے۔‘‘

’’لیکن میرے پاس چیک بک نہیں ہے۔ وہ میری دوسری چیزوں کے ساتھ انسپکٹر نے لے لی تھی۔‘‘

’’وہ سب چیزیں ایک الماری میں بند ہیں۔ میں موقع پاکر الماری کی چابی غائب کرلوں گا۔‘‘

’’کیا تم میری اور بابرا کی باقی چیزیں بھی واپس لا سکتے ہو؟‘‘

’’ہاں دس ہزار ڈالر کے لئے میں یہ بھی کرسکتا ہوں‘‘

’’کار کی چابیاں بھی؟‘‘

’’ظاہر ہے، کار کے بغیر ہم فرار کیسے ہوں گے۔‘‘

اسٹین نے کچھ سوچ کے تذبذب سے کہا۔ معاف کرنا اگر تم نے رقم حاصل کرنے کے بعد ہمیں فریب دیا تو؟‘‘

’’تم کیا چاہتے ہو کیا میں تمہیں رقم کی رسید دے دوں؟ میرے سوا کوئی شخص ہے جس پر تم بھروسا کرسکو؟ مجھ پر اعتماد کرو دوست! میں تمہیں فریب نہیں دوں گا۔ تمہیں فریب دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ میں خود کو فریب دے رہا ہوں۔‘‘

’’ٹھیک ہے‘‘ اسٹین نے آہستہ سے کہا۔

میں آج رات پچھلے پہر تمہیں کوٹھری سے نکال کے انسپکٹر کے دفتر لے چلوں گا اور چیک بک تمہیں دے دوں گا۔ تمہارا ساتھی ڈینس اس وقت سو رہا ہوگا۔ اگر اسے معلوم ہوگیا تو ممکن ہے وہ انسپکٹر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے یہ راز فاش کردے۔ تم اس سلسلے میں کسی سے ایک لفظ بھی مت کہنا۔‘‘

’’اسٹین نے اثبات میں سر ہلایا۔ کیا تم مجھے میری بیوی سے ملا سکتے ہو؟‘‘

’’ناممکن‘‘ سام نے نفی میں سر ہلایا۔ اگر میں نے تمہیں اس سے ملوایا تو دوسری عورتوں کو اعتراض ہوگا۔ وہ

مطالبہ کریں گے کہ انہیں بھی ان کے شوہروں سے ملوایا جائے۔ اس نے اپنی شاٹ گن اٹھائی۔ اب تم اپنی کوٹھری میں چلو۔

رات کے دو بجے سام اسٹین کے پاس آیا۔ ڈینس گہری نیند سو رہا تھا۔ اسٹین دبے پاؤں کوٹھری سے نکلا۔ سام اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔ کمرہ بہت چھوٹا تھا۔ اس میں ایک بستر تھا۔ ایک چھوٹی میز تھی اور ایک کرسی۔ دیوار کی کھونٹی پر سام کی یونی فارم لٹکی ہوئی تھی۔ اس نے شاٹ گن بستر پر رکھ کے میز کی ایک دراز کھولی۔ میں تمہاری چیک بک نکال لایا ہوں۔ اس نے دراز ٹٹولتے ہوئے کہا۔ تم چیک پر دستخط کردو۔ میں چیک بک واپس وہیں رکھ آؤں گا۔ کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔

اسٹین کی نظریں شاٹ گن پر جمی ہوئی تھیں۔ شاٹ گن اس کی دسترس میں تھی اور سام اس کی جانب پشت کئے کھڑا تھا۔ چند لمحوں میں کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ اگر انسپکٹر اور اس کے نائب چوکی میں موجود ہیں تو ان سے بھی مقابل کرنا پڑے گا۔ ان میں سے کوئی مر بھی سکتا ہے اور زخمی بھی ہوسکتا ہے۔ بابر ابھی لپیٹ میں آسکتی ہے۔ دوسری جانب اگر سام نے اسے فریب دیا تو؟...... اسٹین نے ہاتھ بڑھا کے گن اٹھالی۔ میری طرف گھوم جاؤ سام! ذرا احتیاط سے۔"

سام ایک لمحے کے لئے جم کے رہ گیا پھر آہستہ آہستہ اسٹین کی طرف گھوم گیا۔ تم مجھ پر یہی اعتماد رکھتے تھے؟ میرا خیال تھا کہ ہم ایک دوسرے کے دوست ہیں؟"

"میں نے آج تک کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جس نے رقم لے کے دوستی بیچی ہو اور بعد میں دھوکا نہ دیا ہو" اسٹین نے جواب دیا۔ سوال رقم کا نہیں ہے۔ رقم تو میں دوبارہ کما سکتا ہوں۔ مجھے صرف اپنی بیوی کا خیال ہے۔ میں اسے ہر قیمت پر یہاں سے نکالنا چاہتا ہوں اور اس سلسلے میں مجھے تم سے زیادہ تمہاری شاٹ گن پہ اعتماد ہے۔ یہ فی الفور کام آسکتی ہے۔"

سام نے اطمینان سے ایک سگریٹ سلگایا اور میز کے ایک کونے پر بیٹھ گیا۔ وہ بہت پرسکون معلوم

ہو رہا تھا۔ اسٹین اس کی خود اعتمادی سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے کہا۔ مجھے چابیاں درکار ہیں سام! اپنی بیوی کی کوٹھری کی اپنی کار کی اور اس الماری کی جس میں ہمارا چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔

"تم مجھے باندھ کر چھوڑ جاؤ گے یا میرے ساتھ مار پیٹ کرو گے۔" سام نے نہایت بے فکری سے پوچھا۔

"میں یہ دونوں کام نہیں کروں گا۔" اسٹین نے جواب دیا۔ بلکہ تمہاری مدد سے فرار ہونے کا انتظام کروں گا۔"

"فرض کرو میں تمہیں چابیاں نہ دوں اور بندوق چھیننے کے لئے تم پر حملہ کردوں۔ کیا ایسی صورت میں تم مجھ پر گولی چلادو گے؟"

"نہیں سام! گولی چلانے سے شور ہوگا۔ میں بندوق کے دستے سے تمہارا سر توڑنا بہتر سمجھوں گا۔"

میں تمہیں صرف آزما رہا تھا۔ سام مسکرایا، اب یہ مذاق ختم کرو اور چیک پر دستخط کردو۔ بندوق میں گولیاں نہیں ہیں۔ اس نے بے پروائی سے گھوم کے چیک بک نکالی۔ اسٹین نے دیکھا کہ بندوق واقعی خالی ہے۔ اس نے اسے بیزاری سے ایک طرف پھینک دیا۔ سام نے کہا۔ میں بھری ہوئی بندوق اپنی ماں کے پاس بھی چھوڑنے کا عادی نہیں ہوں اور اگر بندوق بھری ہوئی بھی ہوتی تو تمہارے فرار ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میز کے نیچے ایک بٹن لگا ہوا ہے۔ میرا ہاتھ اس کے قریب تھا۔ گھنٹی بجتے ہی ایسا شور ہوتا کہ اگلی ریاست کے لوگ بھی جاگ جاتے۔ ویسے تمہیں بدگمان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہاری ہمت کو سراہتا ہوں۔ اب کرسی پر بیٹھ جاؤ اور میرے نام دس ہزار ڈالر کا چیک لکھ دو۔ اسٹین نے بے بسی سے کندھے اچکائے اور کرسی پر بیٹھ کے چیک لکھ دیا۔

"وقت بہت زیادہ ہوگیا ہے" سام نے چیک اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ اب تم اپنی کوٹھری میں چلو۔"

ایک اور رینگتا ہوا دن گزر گیا جیل کا کھانا سخت بے مزا ہوتا تھا۔ مگر مجبوراً حلق سے اتارنا پڑتا تھا۔ شام کے کھانے کے بعد ایک اور رات آگئی۔ سام ڈیوٹی پر آیا

تھا اور راہ داری کی بتی روشن ہوگئی تھی۔ پھر رات گزری اور صبح ہوئی۔ یہ نیا دن بھی گزشتہ دنوں سے مختلف نہیں تھا۔

اس پوری مدت میں اسٹین کو انسپکٹر کلائڈ کی صورت نظر نہیں آئی تھی۔ کانسٹیبل فلائڈ اور برٹ صرف پہلی دو راتوں کو راہ داری سے گزرتے ہوئے نظر آئے تھے۔ دونوں بار ان کے ساتھ کوئی نہ کوئی قیدی ضرور تھا، خواہ مرد ہو یا عورت۔

رات کی تاریکی پھیلتے ہی اسٹین گہری نیند سو گیا مگر مگر کچھ دیر بعد اس کی آنکھ اچانک کھل گئی۔ صبح ہونے میں خاصا وقت تھا۔ اسٹین بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگا۔ کچھ دیر بعد کوٹھری کا دروازہ کھلا۔ اس نے سر اٹھا کے دیکھا۔ اس کا ساتھی ڈینس اندر آرہا تھا۔ اور سنتری سام اسے کوٹھری تک پہنچانے کے بعد واپس جا رہا تھا۔ اسٹین ایک دم اٹھ کے بیٹھ گیا۔ ڈینس چونکا۔ اسٹین نے اس سے پوچھا۔ تم کہاں گئے تھے؟ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اسے اس سوال کا جواب خود معلوم ہے۔

"میں سام سے کچھ گفتگو کرنے گیا تھا۔" ڈینس نے ہکلاتے ہوئے بتایا۔ میں چاہتا تھا کہ اس کے ذریعے اعلیٰ حکام تک اپنی بپتا پہنچا دوں۔"

"اس نے کیا کہا؟"

"پھر تم نے اسے ایک چیک لکھ کر دیا ہوگا؟" اسٹین نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"چیک؟ کیسا چیک؟" ڈینس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اسٹین نے کہا۔ تم بہت شریف آدمی ہو دوست! تم جھوٹ کامیابی سے نہیں بول سکتے۔" ڈینس سر جھکا کے لیٹ گیا۔ اسٹین نے دریافت کیا۔ ڈینس! تمہیں اس سے بات کرنے کا موقع کب ملا؟ کیا اس وقت جب وہ تمہیں غسل خانے لے گیا تھا؟ مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ، میں تمہارا ساتھی ہوں۔ ڈینس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ اسٹین نے کہا۔ اس نے تمہیں تنبیہ کیا ہوگا کہ اس سلسلے میں مجھے کچھ نہ بتانا؟"

"شاید تم بھی اس مرحلے سے گزر چکے ہو؟" ڈینس بے دلی سے ہنسا۔

"ہاں میں بھی گزر چکا ہوں۔" اسٹین نے بتایا۔ ہمیں دراصل فریب دیا جا رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ڈراما ہر قیدی کے ساتھ کھیلا گیا ہے۔"

"ڈینس نے تائید انداز میں سر ہلایا اور پوچھا۔ اب ہمیں کیا کرنا چاہئے؟"

"صبر اور انتظار کے سوا ہم کیا کر سکتے ہیں۔" دیکھنا یہ ہے کہ ان کا آئندہ اقدام کیا ہوتا ہے"

"مگر یہ مدت چھ مہینے بھی ہو سکتی ہے۔ اور اگر سچ پوچھو تو انہیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ ہمیں آزاد کریں؟ ہم ان کے بارے میں بہت کچھ سمجھ چکے ہیں اور کئی آدمی ہیں اس لئے ہمیں آسانی سے جھٹلایا نہیں جا سکتا لہٰذا جلد ہی ہم ان بدنصیبوں میں شامل کر دیئے جائیں گے جو اس علاقے میں آئے اور نہ جانے کہاں گم ہو گئے۔ پولیس ہمیں تلاش ہی کرتی رہ جائے گی۔"

"اس کے باوجود ہمیں آزاد کرنے پر مجبور ہیں یا پھر......" ڈینس خاموش ہو کے کچھ سوچنے لگا۔

اسٹین نے کہا۔ فرض کروان کی جگہ تم ہوتے تو کیا کرتے؟ تم ایک مجرم پولیس والے ہوتے اغوا اور حبس بے جا کے الزام میں کوئی بھی ہوشیار سرکاری وکیل تمہیں زندگی بھر کے لئے جیل بھجوا سکتا تھا لہٰذا تم اپنے قیدیوں کو اتنی مہلت ہرگز نہ دیتے کہ وہ تمہارے خلاف کوئی کارروائی کر سکیں۔ ہم لوگوں سے جتنی جتنی رقم طلب کی گئی تھی وہ ہم نے ادا کر دی ہے۔ ایسی صورت میں انہیں ہم جیسے معزز شہریوں سے کیا سلوک کرنا چاہئے؟ بولو؟"

ڈینس سہم گیا۔ میں اس سوال کا جواب دینا نہیں چاہتا۔"

"اس سوال کا جواب تمہارے اسی جملے میں موجود ہے" اسٹین نے کہا۔

پانچ دن نہایت صبر آزما گزرے۔ انسپکٹر کلائڈ اور اس کے ساتھیوں کی طرف سے کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔ سام ایک دن اور ایک رات غائب رہا۔ اس کی جگہ برٹ نے پہرا دیا۔ پھر سام واپس آیا تو چار دن تک بالکل خاموش رہا۔ وہ کسی سوال کا جواب نہیں دیتا تھا۔ چھ

کوٹھریوں کے قیدی چیخ چیخ کر اس پر فریب دہی کا الزام لگا رہے تھے مگر اس نے کوئی پروا نہیں کی۔ وہ صرف کھانے کے وقت آتا اور خاموشی سے کھانے کی ٹرے کوٹھریوں میں کھسکا دیتا۔ اس کا چہرہ سپاٹ نظر آتا۔ پھر اس کی شکل دوسرے کھانے کے وقت دکھائی دیتی۔

پانچویں دن سام راہ داری کی بتی بجھنے تک شام کا کھانا لے کر نہیں آیا۔ بتی عموماً نصف شب کے بعد بجھائی جاتی تھی۔ سام پہرا دیتا ہوا بھی دکھائی نہیں دیا۔ اسٹین نے معنی خیز نظروں سے ڈینس کی طرف دیکھا۔ پھر وہ دونوں گلے پھاڑ پھاڑ کے سام اور اس کے ساتھیوں کو آوازیں دینے لگے مگر جواب میں صرف قیدیوں کی آوازیں آئیں۔ ان میں سے ایک آواز بابرا کی تھی۔ بابرا ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی۔ آخر قیدی چیخ چیخ کر تھک گئے۔ جیل پر قبرستان جیسی خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر بعد خاموشی میں ایک آواز ابھری۔ اسٹین کا خیال تھا کہ یہ کسی مشین یا کسی انجن کی آواز ہے۔ آواز ابھرتے ہی تمام بتیاں گل ہوگئیں۔ قیدیوں نے گھبرا کے کوٹھریوں کے دروازے توڑنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے اور جلد ہی تھک کے ہانپنے لگے۔ ڈینس ابھی تک دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسٹین نے اس سے کہا۔ کیا تم اب بھی نہیں سمجھے؟ وہ لوگ ہمیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔"

"کیا وہ ہمیں بھوکا مرنے کے لئے چھوڑ گئے ہیں؟" ڈینس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"یقیناً۔" اسٹین گہری افسردگی سے سوچ رہا تھا کہ بابرا اس سے صرف چند فٹ کے فاصلے پر موجود ہے لیکن اب وہ شاید اس تک کبھی نہ پہنچ سکے۔ وہ دروازے کے قریب جا کے زور سے پکارا۔ بابرا گھبرانا نہیں، پرسکون رہنا۔ ہم باہر نکلنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور سوچ لیں گے۔"

جواب میں اسے رونے اور سسکنے کے سوا کچھ سنائی نہیں دیا۔ وہ دوبارہ اپنے بستر پر آ کے بیٹھ گیا۔ ڈینس اس کے قریب ہی فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ تقریباً ایک منٹ بعد اس نے ناک سکوڑ کے کچھ سونگھا اور اسٹین سے پوچھا۔ کیا تمہیں دھویں اور پیٹرول جیسی کوئی بو محسوس ہو رہی ہے۔"

اسٹین نے سر اٹھا کر سونگھنے کی کوشش کی پھر بولا۔ نہیں، آگ صرف تمہارے تصور میں لگی ہوئی ہے۔

"میں نے دھواں صاف سونگھا ہے۔ شاید وہ ہمیں زندہ جلا دینا چاہتے ہیں کہ تاکہ ان کے خلاف کوئی ثبوت موجود نہ رہے۔ بعد میں وہ کہہ سکتے ہیں کہ جیل میں اچانک آگ لگ گئی تھی۔ سارے قیدی جل مرے۔"

اسٹین نے دوبارہ ہوا سونگھی۔ وہ بھی چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ اسے بھی دھویں اور پیٹرول کی ملی جلی بو آ رہی تھی۔ تمہارا اندازہ درست معلوم ہوتا ہے ڈینس! لیکن شور مت مچانا ورنہ قیدی باہر نکلنے کے لئے دروازوں سے سر ٹکرا ٹکرا کے مر جائیں گے۔

"سردی بڑھ رہی ہے۔" ڈینس بولا۔ انہوں نے غالباً حرارت پہنچانے والی مشین بند کر دی ہے تاکہ ہم ٹھٹھر کر مر جائیں۔ آہ، اب ہم اسی تاریکی میں ختم ہو جائیں گے۔ اب ہمیں سورج دیکھنا نصیب نہیں ہوگا۔"

"تمہاری باتیں میرے اعصاب پر سوار ہو رہی ہیں۔" اسٹین نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے بازو سمیٹ کے سینے سے لگا لئے تاکہ جسم میں کچھ حرارت پیدا ہو پھر اچانک اسے آنکھیں کھولنی پڑیں۔ فرش پر دھات کی کوئی چیز پڑی ہوئی تھی۔ اسٹین جلدی سے اٹھا اور ڈینس سے ٹکرا گیا۔ وہ فوراً سنبھل کے گھٹنوں کے بل جھکا اور دونوں ہاتھوں سے فرش پر کچھ ٹٹولنے لگا۔ اس کا ہاتھ ایک لمبی سی چابی پر پڑا۔ اسٹین نے جلدی سے چابی مٹھی میں بند کر لی جیسے وہ کہیں گم ہو جائے گا۔ چابی لے کر اسٹین دروازے پر پہنچا اور کھانے والے خانے سے ہاتھ نکال کر چابی کوٹھری کے قفل میں ڈالنے کی کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کی جدوجہد کے بعد قفل کھل گیا۔ "ہماری پریشانیوں کا خاتمہ ہو چکا ہے ڈینس!" وہ جوش سے بولا۔ اب ہم آزاد ہیں۔ اس نے چابی مضبوطی سے پکڑ لی اور دروازہ کھول لیا پھر ڈینس کا بازو پکڑ کے عمارت کے بیرونی حصے کی طرف لپکا۔ ہمیں کسی نہ کسی طرح روشنی کا انتظام کرنا ہے۔ خواہ ماچس کی ایک ڈبیا ہی کیوں نہ ہو۔"

وہ حوالات اور دفتر کا درمیانی دروازہ کھول کے اندر داخل ہو گیا۔ ایک روشن لالٹین نے ان کا استقبال کیا۔ لالٹین کلائڈ کی میز پر رکھی ہوئی تھی۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ ڈینس بڑبڑایا۔ خوب، گویا آخری لمحے میں ان لوگوں کو ہم سے ہمدردی ہو گئی۔

میز کی درازوں میں انہیں کوئی چیز نہیں ملی۔ الماری بھی خالی تھی۔ سیف بھی کھلا ہوا اور صاف تھا۔ البتہ ایک میز پر کوٹ اور دستانے ڈھیر تھے۔ بابرا کا قیمتی کوٹ بھی وہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔ اسٹین عمارت سے باہر نکلا۔ اس نے تاریکی میں ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کی۔ ان کی کاریں غائب تھیں۔ عمارت کے تین اطراف جنگل تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک کھلیان کی چھوٹی سی عمارت نظر آ رہی تھی۔ اسٹین نے عمارت کا ایک چکر لگایا۔ پھر واپس آ کے ڈینس سے بولا۔ یہ ایک ویران عمارت ہے۔ اب وہ یہاں کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ ہماری ہر قیمتی چیز وہ اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ کاریں، نقدی، زیورات اور گھڑیاں، سب کچھ۔ اسٹین نے لالٹین اٹھائی۔ خیر آؤ۔ ابھی ہمیں دوسرے قیدیوں کو آزاد کرانا ہے۔"

وہ رات کی سرد ہوا میں کھلے آسمان کے نیچے کھڑے تھے۔ چھ مرد اور پانچ عورتیں۔ اسٹین نے ایک ہاتھ سے لالٹین اٹھا رکھی تھی۔ اور دوسرے ہاتھ سے بابرا کو اپنے قریب کئے ہوئے تھا۔ تاریکی میں عمارت بھوتوں کا مسکن معلوم ہو رہی تھی۔ دور دور تک گہرا اندھیرا اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ باہر آ کے ان کے اوسان کسی قدر درست ہوئے اور جب انہوں نے وہاں اپنی گاڑیاں کھڑی ہوئی دیکھیں تو حیرت اور مسرت سے ان کی چیخیں نکل گئیں۔ ڈینس سب سے پہلے دوڑ کے اپنی گاڑی کے پاس پہنچا مگر جلد ہی اس کی شادمانی شکستگی اور پسپائی میں بدل گئی۔ تینوں گاڑیوں کی ٹنکیاں خالی کر دی گئیں تھیں اور اس کے باوجود نہ جانے کیوں ٹائروں کی ہوا بھی نکال دی گئی تھی۔ اسٹین نے پھونک مار کر فوراً لالٹین بجھا دی۔ فضا میں پیٹرول کی بو رچی ہوئی تھی۔ قصبہ یہاں سے کتنی دور ہو گا؟ ایک عورت نے کراہتے ہوئے پوچھا۔

سام نے بتایا تھا کہ قصبہ ہائی وے سے تین میل دور ہے۔ اسٹین نے پژمردگی سے جواب دیا مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ سچ ہی کہہ رہا تھا۔ بہر حال قصبہ، تین میل دور ہو یا تیس میل۔ ہمیں ہر حالت میں اب یہاں سے چلنا ہو گا۔

"اتنی سردی میں تین میل کا سفر ممکن نہیں ہے۔ ڈینس نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔"

"میری جوتیاں اونچی ایڑی کی ہیں۔ ایک دوسری عورت بولی۔ میں اس ناہموار زمین پر زیادہ دور نہیں جا سکتی۔"

"تم ضرور چلو گی" چاہے تمہیں جوتے اتار کے چلنا پڑے یا مجھے تمہیں اپنے کاندھوں پر اٹھانا پڑے۔"

ان کے جسم ٹوٹ رہے تھے۔ سردی سے وہ تمام کانپ رہے تھے تاہم وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے، ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے چلتے رہے۔ جب وہ قصبے کے پولیس اسٹیشن پہنچے تو رات کا آخری حصہ تھا۔ باہر بیٹھا ہوا سنتری سو رہا تھا۔ ان کی چیخ و پکار سے ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ اندر انسپکٹر بھی نیم خوابیدہ حالت میں تھا۔ بابرا عمارت میں داخل ہوتے ہی بے ہوش ہو گئی۔ انسپکٹر ان کی روداد سن کے مسکرانے لگا اور اس نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ان شکستہ حال لوگوں کو اس انداز سے دیکھا جیسے وہ سب پاگل ہوں یا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔

مگر جب وہ ان لوگوں کے احتجاج پہ ان کی روداد کی تصدیق کے لئے اسٹین کے ہمراہ وہاں پہنچا تو وہ اپنی آنکھیں مسلنے لگا۔ کسی زمانے میں یہ ایک رہائشی عمارت تھی جو آس پاس کی زمین کے دلدلی اور ناکارہ ہو جانے کے سبب سے خالی پڑی تھی اور اب ایک کھنڈر میں بدل گئی تھی۔ وہاں ایک بورڈ لگا ہوا تھا اور عمارت کا کچھ حصہ ایک چھوٹے دیہاتی پولیس اسٹیشن کے قابل بنا دیا گیا تھا۔ اپنی اس محنت کے عوض وہ نوے ہزار ڈالر کی نقدی، زیورات اور بیش قیمت سامان اپنے ساتھ لے گئے تھے اور انہوں نے اپنا کوئی نشان نہیں چھوڑا تھا۔





آخری قتل

ایس امتیاز احمد-کراچی

اچانک نوجوان پر دیوانگی سی طاری ہوگئی، وہ کمرے کی ایک ایک چیز ہٹاکر خوبرو حسینہ کو تلاش کرنے لگا، وہ پاگلوں کی طرح ہر سو اپنی نظریں گھمانے لگا مگر افسوس صد افسوس کہ چند لمحے پہلے اس کے پاس کھڑی حسینہ غائب تھی۔

سطر سطر خوف وہراس کے شکنجے میں جکڑی ہوئی لرزہ براندام کرتی سحرزدہ کہانی

پہاڑ کی اس بلندی پر گہرا سکوت تھا، پچھلے پہر کا زرد اور بیمار چاند کبھی کا غروب ہو چکا تھا اور اب ہر طرف دھند پھیل گئی تھی۔ اچانک اسے محسوس ہوا جیسے اس کے آس پاس کوئی شخص موجود ہے۔ اس احساس کے ساتھ ہی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرسراہٹ سی دوڑ گئی اور جسم کا رواں رواں کھڑا ہو گیا، یوں محسوس ہوا جیسے کوئی آہستہ آہستہ اس کے قریب آرہا ہے۔ قدموں کی چاپ سنی جارہی تھی۔ وہ بے حس کھڑا رہا۔ کوئی شخص اس کے آس پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ خوف کی وجہ سے وہ گردن گھما کر دیکھ بھی نہ سکا، ٹھنڈی اور کوہستانی ہوا کے باوجود اس کا سارا جسم پسینے میں نہا گیا۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی اور اعصاب کو قابو کرنے لگا۔

اس کے جسم پر ابھی تک قیدیوں کا لباس تھا اور وہ تھکن بھوک اور نیند سے بری طرح پریشان تھا، اور اب خوف بھی اس پر مسلط ہو گیا تھا، لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہوئی دھند نے سارے ماحول کو ڈھانپ لیا تھا۔ چند قدم کے فاصلے کے بعد کوئی چیز ٹھیک نظر نہ آتی تھی۔

رائف نے چاقو نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ یہ چاقو اس نے قید خانے میں ایک چمچے سے بنایا تھا اور ابھی تک اس کو استعمال کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا تھا۔ اس نے جیب سے چاقو نکالا ہی تھا کہ ایک بہت مدھم اور پرسکون آواز سنائی دی۔

''دفاع یا حملے کی کوئی ضرورت نہیں ہے!''

رائف، تیزی سے مڑا۔ اس کے سامنے ایک نوجوان لڑکی کھڑی تھی۔ لڑکی بے انتہا خوب صورت تھی۔ اس کے انداز سے اطمینان اور سکون ظاہر ہورہا تھا۔ متناسب جسم کی مالک تھی، خوب صورت اور لمبے بال بے ترتیبی سے پشت پر پھیلے ہوئے تھے۔ جلد ملائم اور صاف تھی۔ بڑی بڑی نیلی آنکھوں میں ہلکی سی مسکراہٹ تھی ایسی مسکراہٹ جو رائف کے خوف کا مذاق اڑا رہی تھی۔

''میں تمہیں خوفزدہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔'' لڑکی نے آہستہ سے کہا۔

رائف نے سوچا ممکن ہے یہ لڑکی تنہا ہو یا ہوسکتا ہے کہ آس پاس کوئی اور بھی موجود ہے، بہرحال یہ محسوس کرکے لڑکی اسے خوفزدہ کررہی ہے۔ اسے سخت طیش آ گیا مگر اس نے غصے کو چھپاتے ہوئے پوچھا۔

''یہاں کس کے ساتھ آئی ہو لڑکی؟''

''کسی کے ساتھ نہیں اکیلی ہی آئی ہوں۔''

''بہتر ہے سچ بولو۔ تم نے میرا تعاقب کیوں کیا؟''

''میں نے تمہارا تعاقب تو ہرگز نہیں کیا۔ یہ تو ایسے ہی اچانک مڈبھیڑ ہوگئی۔''

''لیکن میں نے تمہارے قدموں کی چاپ بھی نہیں سنی۔''

''یقیناً نہیں سنی ہوگی، ہم پہاڑی لوگ ہلکے پاؤں دھرنے کے عادی ہوتے ہیں!''

''آخر اس ویرانے میں اور اس وقت تمہارا کیا کام ہوسکتا ہے؟''

لڑکی ہنس پڑی گہری خاموشی میں اس کی آواز بڑی پراسرار معلوم ہوئی۔

''تم بہت جذباتی اور غصیلے ہو۔ میں نے تم جیسا آدمی پہلے نہیں دیکھا، تم کو مجھ سے ڈرنا نہیں چاہیے۔''

''روئے زمین پر کوئی ایسا نہیں ہے۔ جس سے میں ڈروں...... میں نے تم سے پوچھا تھا کہ یہاں کیا کرنے آئی ہو؟''

''تم اس قدر پریشان ہو اور بری طرح خوف زدہ ہو کہ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی؟''

''اوہ اچھا۔ تو یہ لو۔ اب تمہارے پریشان اور خوف زدہ ہونے کی باری ہے۔'' رائف نے اپنا چاقو سنبھالا۔

''کیا کرتے ہو؟'' لڑکی بڑی اطمینان سے بولی۔ ''کیا تم ایڈگر نہیں ہو۔ وہی آدمی جس نے آج جیل سے دوسری جیل میں منتقل ہوتے وقت اپنے محافظ کو مار ڈالا تھا اور مفرور ہوگیا تھا، میں نے آج تمہاری تصویر اخبار میں دیکھی تھی اور تمام تفصیل غور سے پڑھی تھی۔''

رائف نے سختی سے اپنے دانت بھینچے، اس کے جبڑے کی ہڈیاں ابھر آئیں۔ لڑکی اسی اطمینان اور سکون سے پوچھتی رہی۔

''اخبار والوں نے لکھا ہے کہ تم بڑے بے رحم اور خطرناک ہو، انہوں نے تمہارا بڑا ڈراؤنا نقشہ کھینچا تھا، تمہاری تصویر سے بھی وحشت ٹپک رہی تھی۔ مگر اس وقت تو تم خوفزدہ نظر آرہے ہو۔ بری طرح سہمے ہوئے بالکل بچے کی طرح۔''

''تمہیں اس وقت مجھ سے خوف محسوس نہیں ہوتا؟''

''ہرگز نہیں!''

''وہ کیوں؟''

''ظاہر ہے اس وقت جو لڑکی ان پہاڑوں میں تنہا گھومنے پھرنے آئے گی وہ بھلا کس سے خوف کھاتی ہوگی۔ میں تمام خوف پر غالب آجاتی ہوں۔''

لڑکی کمر لچکاتی بڑے اطمینان سے رائف کے قریب ایک پتھر پر بیٹھ گئی اور شانوں کو بڑے دلفریب انداز میں حرکت دیتے ہوئے بولی۔

''میں کسی سے نہیں ڈرتی تم سے تو بالکل خوف محسوس نہیں ہورہا۔''

''آخر تم مجھ سے چاہتی کیا ہو لڑکی؟''

''مجھے لڑکی نہ کہو۔ میرا نام ڈریم آمی ہے!''

''یہ کوئی خوب صورت نام نہیں ہے۔''

''اپنے اپنے رواج کی بات ہے اس طرف کے لوگ ''ڈریم آمی'' کو بہت اچھا نام سمجھتے ہیں۔''

''بہت خوب محترمہ ڈریم آمی! اب آپ بتائیں

آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟"

"مسٹر رائف تم یقیناً بھوکے ہوگے...... میں نے تمہارا صحیح نام لیا ہے ناں۔"

"ہاں میرا نام رائف ہی ہے۔"

"چار روز ہوگئے تم بھوکے پیاسے مارے، مارے پھر رہے ہو اور یقیناً تمہارے پاس ایک دھیلہ بھی نہیں ہوگا۔"

"میرے متعلق پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے اپنا مطلب بتاؤ۔"

"اور تم اس قیدیوں والے لباس میں پہاڑ سے اتر کر شہر کی طرف بھی نہیں جاسکتے، کیوں میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں......!"

رائف کو لڑکی کے اس اطمینان اور سرد مزاجی پر تاؤ آ گیا۔

"بکواس بند کرو۔ صرف اپنا مطلب بیان کرو۔ آخر تم کو مجھ سے کیا کام ہے؟"

ڈریم آمی نے رائف کے الفاظ پر کوئی توجہ نہ دی۔ اس نے رائف کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم خوراک کہاں سے حاصل کر سکتے ہو۔ اور اس لباس سے چھٹکارا پانے کے لئے کپڑے کہاں سے مل سکتے ہیں۔"

"وہ رائف کے قریب کھسک آئی اور اپنا سر اس سے ملاتے ہوئے بولی۔

"اور ایک کثیر رقم بھی ہاتھ لگ سکتی ہے تقریباً دو ہزار ڈالر!"

"تمہیں یقین ہے جو کچھ کہہ رہی ہو سچ ہے۔"

"بالکل!"

"اس میں شبہ نہیں کہ تم بہت خوب صورت ہو مگر مجھ جیسے آدمی کو بے وقوف بنانا ذرا مشکل ہے۔ بس بہت ہوا اب تم چپ چاپ یہاں سے کھسک جاؤ۔"

"خوراک، لباس اور ایک بھاری رقم، کیا تم نہیں چاہتے کہ تم ان چیزوں کو حاصل کر کے اطمینان سے کہیں چلے جاؤ۔"

"تم تو یوں کہہ رہی ہو جیسے یہ تمام چیزیں میرے سامنے رکھی ہوئی ہیں۔ بس ہاتھ بڑھانے کی دیر ہے!"

"یقین کرو ایسا ہی معاملہ ہے۔"

"اگر چہ اب مزید بے وقوف بننے کی طاقت نہیں ہے مگر پھر بھی کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ یہ چیزیں کہاں سے مل سکتی ہیں؟"

"یہاں سے صرف ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ایک گھر ہے!"

"تمام چیزیں اسی گھر سے مل جائیں گی؟"

"ہاں!"

"تم چاہتی ہو میں تمہارے ساتھ اس گھر تک جاؤں۔"

"ہاں!"

"آخر تم مجھ پر اس قدر مہربان کیوں ہو؟ تم میری مدد کیوں کرنا چاہتی ہو؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"

"سیدھی سی بات ہے!"

"یعنی؟"

"تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا!"

"ایک نہیں دس...... اگر یہ تو بتاؤ کہ تم مجھ سے کس قسم کا کام لینا چاہتی ہو؟"

"میں ایک آدمی کو اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہوں۔ میری خواہش ہے کہ تم اسے قتل کردو۔"

"آخر کیوں؟" تم کیوں چاہتی ہو کہ میں کسی آدمی کے خون سے اپنے ہاتھ رنگوں؟"

"وہ اسی کا حقدار ہے۔ اس حد تک کہ اسے قتل کرانا میرے لئے ایک اہم فرض کی حیثیت رکھتا ہے وہ بہت ظالم اور سنگدل انسان ہے بولو کیا تم اسے قتل کردو گے میری خاطر!"

رائف حیران رہ گیا۔ لڑکی کی آنکھیں وحشیانہ انداز میں چمک رہی تھیں۔ پتلیاں بڑی بے قراری سے گردش کر رہی تھیں لڑکی پھر بولی۔

"ڈر گئے۔ تمہارے جیسے آدمی کے لئے جو ایک

گارڈ کو قتل کر چکا ہو، کسی دوسرے انسان کو قتل کر دینا کوئی بڑی بات نہیں ہے، بس یہ تمہارا آخری قتل ہوگا۔ اس کے بعد تم آزاد ہو جاؤ گے جہاں چاہے جا سکتے ہو۔ سودا برا نہیں رہے گا!"

رائف نے پہلو بدلا بڑی مشکل سے لڑکی کی طرف دیکھا اور بولا۔

"بڑی عجیب خواہش ہے تمہاری، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا!"

"میں مذاق نہیں کر رہی تم جیسے آدمی سے مذاق کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، بس میری یہ آرزو ہے کہ اس آدمی کو انتہائی بے رحمی اور وحشیانہ طور پر قتل کر دیا جائے گا۔"

"وہ آدمی اس مکان میں رہتا ہے جس میں روپے اور کپڑے موجود ہیں؟"

"ہاں کپڑے بہت زیادہ تو نہیں ہیں۔ مگر جتنے بھی ہیں، سب تمہارے فٹ آئیں گے کیونکہ آدمی تمہارے ہی قد و قامت کا ہے۔ اس کے علاوہ دو ہزار ڈالر بھی اس مکان میں تکیے کے نیچے تھیلی میں محفوظ ہیں۔"

"رقم میں تمہارا حصہ کتنا ہوگا؟"

"مجھے رقم کی ضرورت نہیں ہے، سب کی سب تمہاری ہے۔ میں تو بس اپنی آنکھوں سے اس شخص کو قتل ہوتے دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"وہ شخص تمہارا شوہر ہے؟"

"نہیں۔"

"پھر کون ہے؟"

"اب کیا کہوں، میں اس کی محبوبہ تھی کبھی، سوچتی تھی مجھے بہت چاہتا ہوگا۔"

"مگر بعد میں تمہیں ٹھکرا دیا۔ اب تم اس سے انتقام لینا چاہتی ہو!"

"کچھ ایسا ہی معاملہ ہے جب اس کا دل مجھ سے سیر ہو گیا تو ٹھکرا دیا۔ اور دوسری لڑکی میں دلچسپی لینے لگا۔ حالانکہ میرے پیٹ میں اس کا دو ماہ کا بچہ پرورش پا رہا تھا۔"

رائف ذرا دیر تک سوچتا رہا پھر ایک مضبوط ارادے کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

"بہت اچھا محترمہ ڈریم آمی! مگر سوچ لو اگر کسی قسم کا دھوکہ ہوا تو میرا حشر جو ہو سو ہو مگر چاقو سب سے پہلے تمہارے ہی پیٹ میں اترے گا۔ میں تمہارے ساتھ چلے چلتا ہوں چونکہ تم نے انتہائی بے چارگی سے مدد کی درخواست کی ہے اس لئے تمہاری آرزو ضرور پوری ہوگی۔ تم اپنی آنکھوں سے اس شخص کو خون میں نہاتے دیکھو گی!"

لڑکی خوشی سے کھل اٹھی بڑے جذباتی انداز میں اس نے پوچھا۔

"تو تم واقعی اسے قتل کر دو گے۔"

"ہاں میرے لئے ایک قتل زیادہ یا ایک قتل کم سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"میں خوش ہوں بہت خوش اب وہ کسی دوسری لڑکی کو میرے حال تک نہ پہنچا سکے گا۔ تمہیں قتل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے گی کیوں کہ وہ گہری نیند سو رہا ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم؟"

"تمہیں اس سے کوئی بحث نہیں کہ مجھے کیسے معلوم؟"

"تم نے کہا تھا وہ مکان یہاں سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ہے!"

"ہاں کہا تھا!"

"بہت خوب میں تمہارے ساتھ چلوں گا اور اگر برا نہ مانو تو ایک بازو پکڑے رکھوں۔"

"اگر تمہاری نظر میں یہ ضروری ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

☆......☆......☆

لڑکی تیزی سے فاصلہ طے کر رہی تھی۔ ایک جگہ راستہ بہت تنگ تھا ایک ہی آدمی گزر سکتا تھا مجبوراً رائف کو لڑکی کا بازو چھوڑنا پڑا آگے راستہ کشادہ تھا۔ لڑکی وہاں سے جا کر رک گئی اور رائف کا انتظار کرنے لگی۔ رائف پہنچا تو لڑکی نے اپنا بایاں بازو اس کی طرف بڑھا دیا۔ مگر اس بار رائف نے لڑکی کا بازو نہیں پکڑا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ ذرا دیر بعد دور ایک چھوٹا سا سیاہ دھبہ سا دکھائی دیا۔ لڑکی نے اس دھبے کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ

رہا اس شخص کا مکان! میرا خیال ہے ذرا جلدی کرنا چاہیے لوگ جاگنے لگ گئے ہوں گے۔"

رائف نے آستین سے پیشانی کا پسینہ صاف کیا اور کہا۔ "ڈریم آمی! اگرچہ مجھے تمہارے متعلق کافی اطمینان اور اعتبار ہے مگر پھر بھی احتیاط کا تقاضہ ہے کہ تم میرے ساتھ مکان میں داخل ہو۔ اس قسم کے کاموں میں ذرا احتیاط برتتا ہوں۔"

"تم جو کہو گے وہی کروں گی مسٹر رائف، میں تو بس اس سنگدل انسان کے مرنے کا تماشہ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی ہوں۔"

رائف لڑکی کے ساتھ مکان میں داخل ہوا۔ لڑکی بڑے مطمئن اور نپے تلے انداز میں اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ رائف دل میں سوچ رہا تھا۔

"خوب صورت لڑکی! تجھے خواہش ہے تو بے وفا شخص کے آخری خونی لمحات کا نظارہ کرلے۔ پگلی! تیرا بھی تو آخری وقت آن پہنچا ہے۔ یہ مکان تیرا قبرستان ثابت ہوگا۔ ڈریم آمی تو کس قدر خوب صورت ہے مگر تجھے بھی مرنا پڑے گا۔ مجھے افسوس تو ہوگا مگر اس کے علاوہ چارا بھی کیا ہے، میں اپنے اصول سے مجبور ہوں میں قتل کے چشم دید گواہ کو کبھی نہیں چھوڑتا، میرے لئے ایک قتل زیادہ یا ایک قتل کم کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ میرے لئے اہم یہ ہے کہ میں کس طرح پرسکون اور مطمئن طریقے سے زندہ رہ سکتا ہوں!"

دروازے پر تالا نہیں پڑا ہوا تھا۔ رائف نے آہستگی سے دروازہ کھولا۔ دونوں اندر داخل ہوئے چھوٹا سا کمرہ بہت صاف ستھرا تھا۔ ضرورت کی تقریباً ہر چیز موجود تھی سامنے الماری میں شراب کی مختلف قسم کی بوتلیں بڑے قرینے سے سجی ہوئی تھیں۔

رائف نے کمرے میں طائرانہ نظر دوڑائی کھانے پینے کی کافی چیزیں موجود تھیں۔ ایک شخص بستر پر پڑا سو رہا تھا اور کمرے میں شراب کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ رائف بستر کے نزدیک گیا اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ بری طرح پئے ہوئے تھا اور نیند میں ڈوبا ہوا تھا، بو اس کے سانس کے ساتھ خارج ہو کر کمرے میں پھیل رہی تھی۔ رائف نے ڈریم آمی کی طرف دیکھا۔ "اب کیا دیر ہے؟ رقم سرہانے ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے، مجھے یقین ہے کہ تم مجھ سے جھوٹ نہ بولو گی۔ مجھے تم پر اعتماد ہے۔"

"شکر ہے مجھ پر اعتبار تو آیا مگر اب جلدی کرو۔"

رائف نے چاقو جیب سے نکالا اور بستر کے قریب پہنچ کر پے در پے وار دل کے مقام پر کئے۔ وہ شخص غالباً پہلے ہی وار میں ختم ہو چکا تھا۔ کیونکہ اس نے نہ کوئی حرکت کی۔ اور نہ کوئی آواز بلند کی۔ رائف نے چاقو کھینچا اور بستر کی چادر سے صاف کرنے لگا۔ پھر چاقو جیب میں ڈال کر لاش کو ذرا نیچے کھسکایا تکیہ ہٹا کر دیکھا تو نوٹوں سے بھری ہوئی تھیلی سامنے پڑی ہوئی تھی۔

رائف نے تھیلی جیب میں ڈالی۔ اور کرسی پر پڑے ہوئے شخص کے کپڑے دیکھنے لگا۔ پھر خون میں لت پت لاش کا جائزہ لیا۔ لڑکی نے غلط نہیں کہا تھا۔ لاش قد و قامت میں بالکل اس جیسی تھی۔ رائف کی طرح۔

رائف ایک بار پھر سوچ میں ڈوب گیا۔

"افسوس! اس خوب صورت اور بہادر لڑکی کو بھی مرنا پڑے گا۔ مگر کیا کیا جائے، قسمت کی باتیں ہیں۔"

رائف نے دو مرتبہ جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس کی خواہش تھی کہ ایک ہی وار میں لڑکی کا خاتمہ کردے۔ تاکہ بے چاری لڑکی کی موت کی اذیت اور جان کنی سے بچ جائے۔ اور اسے کم سے کم درد اور موت کی تکلیف کا سامنا کرنا پڑے۔

رائف نے بڑی سرعت سے چاقو والا ہاتھ پیچھے گھمایا جہاں لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔ مگر اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ لڑکی اپنی جگہ موجود نہیں تھی۔

رائف پر دیوانگی سی طاری ہوگئی۔ وہ کمرے کی ایک ایک چیز ہٹا کر اسے تلاش کرنے لگا۔ الماریوں کے پٹ کھول کر دیکھا مگر لڑکی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح باہر بھاگا اس کی حالت بڑی خراب تھی۔ پسینہ چوٹی سے ایڑی تک بہہ رہا تھا اور وہ غصے میں ہذیان بک رہا تھا۔

اسے سامنے دھند میں سے دو آدمی نمودار ہوتے ہوئے دکھائی دیئے۔ دونوں کے جسم پر وردی تھی اور ہاتھوں میں ریوالور رائف مڑ کر پیچھے کی طرف بھاگا مگر ایک معمر آفیسر

نے اسے للکارا۔ ''خبردار چاقو نیچے ڈال دو اور ہاتھ اوپر کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ ورنہ چھلنی کر دیئے جاؤ گے!''

چاقو اور نوٹوں کی تھیلی رائف کے ہاتھوں سے گر پڑی، وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔

''وہ لڑکی......'' رائف کمزور سی آواز میں بولا۔

پولیس افسران نے کوئی توجہ نہ دی اور اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔ رائف نے پھر کمزور سی آواز میں پوچھا۔

''وہ لڑکی کہاں گئی؟''

پولیس آفیسر نے حیرت سے پوچھا۔ ''کون سی لڑکی؟'' پھر اپنے ساتھی کی طرف مڑ کر بولا! ''ہاور! تم نے راستے میں کوئی لڑکی دیکھی؟''

''نہیں! اس نے بھی حیرت سے جواب دیا۔

ایک آفیسر کمرے میں داخل ہوا اور بستر پر پڑی ہوئی خون میں لت پت لاش کو دیکھ کر چونک پڑا پھر وہ رائف کے قریب آیا اور اسے غور سے دیکھنے لگا، وہ ایک بار پھر چونکا۔ ''ہاور آؤ جلدی سے۔'' اس کی آواز ہیجان اور جوش سے کانپ رہی تھی۔ ''ذرا غور سے دیکھو پہچان رہے ہو۔ ارے یہ وہی قاتل ہے جس نے گارڈ کو قتل کر ڈالا تھا اور روپوش ہو گیا تھا۔

''اچھا تو یہ دھند میں چھپ چھپا کر ادھر نکل آیا تھا۔ یہاں جو کو قتل کر کے اس کی رقم ہتھیالی۔ خوب بھئی بہت خوب۔'' دوسرا آفیسر بولا۔

''ہم جو کو پکڑنے آئے تھے مگر اس نے پہلے ہی جو کو مار ڈالا، خیر ایک تیر دو شکار اسی کو کہتے ہیں مگر یار میری خواہش تھی کہ میں جو کو زندہ پکڑتا اور ٹھنڈے مار مار کے اس کے جبڑے توڑ دیتا۔ اس نے جو کچھ اس لڑکی کے ساتھ کیا اس کا تقاضا تو یہی تھا کہ مار مار کے بھرکس نکال دیا جاتا۔ پھر بھلے ہی قتل ہو جاتا۔''

''پہلے تو اس کمبخت نے لڑکی کو محبت کا دھوکہ دے کر پھانسا جھوٹی محبت جتائی، رنگ رلیاں منائیں اور جب وہ حاملہ ہو گئی تو جان چھڑانے کے لئے اور بدنامی سے بچنے کے لئے خاموشی سے اس معصوم کو ٹھکانے لگا دیا۔ کم بخت کس آسانی سے بستر پر مر گیا، اسے تو کتے کی موت مرنا چاہیے تھا۔'' آفیسر نے نفرت سے فرش پر تھوک دیا۔

رائف حیران اور پریشان پولیس افسروں کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اب تک کی ساری باتیں اور تمام واقعات خواب سے معلوم ہو رہے تھے۔ اس نے تھکی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''لڑکی کو کب قتل کیا گیا تھا؟''

''کل رات!'' ''اس لڑکی کا کیا نام تھا؟''

''تمہیں اس سے کیا مطلب؟''

''میں آپ سے درخواست کرتا ہوں مجھے اس کا نام بتا دیجئے!'' ''اس کا نام ڈریم آمی تھا۔''

''یہ کیسے ممکن ہے، وہ تو اس قتل میں میرے ساتھ شریک ہے۔'' دونوں نے زوردار قہقہہ لگایا۔

''احمقانہ باتیں مت کرو۔ تم کسی کو اپنے جرم میں شریک ظاہر کر کے اپنے جرم کی اہمیت کم نہیں کر سکتے، تم نے جو گارڈ کو مارا ہے وہ جرم تمہیں بجلی کی کرسی پر بیٹھانے کے لئے کافی ہے۔''

''یہ تو مجھے معلوم ہے۔'' رائف نے سر جھکا کر کہا۔ ''مگر یقین کیجیے ڈریم آمی نے ہی مجھے اس قتل پر اکسایا تھا......!'' ''کس وقت؟''

''آج صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے۔''

دونوں افسران پھر ہنس پڑے۔ ''یقیناً وہ ڈریم آمی کی روح ہوگی۔ کیونکہ اس وقت تو اسے قتل ہوئے بھی دس گھنٹے گزر چکے ہیں۔''

''نہیں نہیں۔ وہ مری نہیں ہے، یہ ممکن ہی نہیں ہے!'' رائف پاگلوں کی مانند چلایا۔ ہاور نے اپنے ساتھی کو کہنی مارتے ہوئے کہا۔ ''پاگل بن کر سزا سے بچنا چاہتا ہے۔ لیکن کوئی اس کی باتوں کا یقین نہیں کرے گا۔''

''اور واقعی کسی نے رائف کی باتوں کا یقین نہ کیا، خود رائف بجلی کی کرسی پر بیٹھنے کے بعد زندگی کے آخری لمحات تک یہ ماننے سے انکار کرتا رہا کہ ڈریم آمی جو اسے پہاڑ پر ملی تھی۔ درحقیقت وہی لڑکی تھی جو مقتول کی محبوبہ تھی اور جو نے اسے بدنامی سے بچنے کے لئے قتل کر ڈالا تھا۔



شعلے کی موت

شیطان کی بیٹی

شیطانی کھوپڑی

شیطانی محل

عجیب کھوپڑی

قاتل مشین

قبرستان

لقمہ اجل

مجبوری

مندر کا حصار

موت کا تعاقب

موت کی آواز

موت کا گھر

موت کی جیت

موت کے پنجے

میں جن ہوں

نئی قبر

ناگ کا انتقام

ہولناک سانحہ

نیم شب

ہساپو کا بلیدان

مردوں کا جنگل

روحانی لگاؤ

حاضرات

موت کا حصار

آسیبی گھر

حصار

آخری قتل